Registered No. L. 4186

رجب المرجب ۱۳۵۷ھ — جلد ۱۳ — عدد ۱

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی وحقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دار الاسلام (پٹھان کوٹ - پنجاب)

قیمت سالانہ پانچ روپے — قیمت فی پرچہ ۸ آنے

ترجمان القرآن

کے

سابق پرچے

ترجمان القرآن کے سابق پرچوں کی بہت مانگ ہے
ان دنوں اکثر حضرات نے یہ پرچے طلب فرمائے
ہیں - اب بہت کم باقی رہ گئے ہیں

★

محرم ۱۳۵۲ھ سے لیکر اب تک کے تمام پرچے ماسوا
چند ایک اعداد کے اکثر موجود ہیں اور ۸ آنے
فی پرچہ کے حساب سے مل سکتے ہیں
ضرورت مند حضرات جلد طلب فرمائیں
کیونکہ پھر اکثر جلدیں ناقص رہ جائینگی

مینیجر

فہرست مضامین

ماہ رجب ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۳۸ء جلد ۱۳ - عدد ۱

باہتمام چودھری نیاز علی خاں صاحب پرنٹر و پبلشر گیلانی الکٹرک پریس

لاہور میں طبع ہو کر دارالاسلام

پٹھان کوٹ سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اعلان کیا گیا تھا کہ رجب کی اشاعت اس رسالہ کی اشاعت خاص ہوگی جس میں وہ تمام سیاسی مضامین یکجا درج کیے جائیں گے جو شعبان ۵۶ھ سے ابتک لکھے جاچکے ہیں۔ لیکن اوّل تو ان مضامین کی تدوین جدید کے سلسلہ میں نئے مباحث اس قدر کثرت سے پیدا ہوگئے کہ ان کو سمیٹنا مشکل ہوگیا، اور خوف ہوا کہ پرچہ کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہوجائے گی۔ دوسرے اسی زمانہ میں ادارہ دارالاسلام کی تاسیس عمل میں آگئی جس کے بعد ضرورت محسوس ہوئی کہ ناظرین ترجمان القرآن کو بلا تاخیر اس کی اطلاع دی جائے اور اس ادارہ کی اسکیم اور دستور العمل کو بھی ان تک پہنچا دیا جائے۔ لہٰذا اشاعت خاص کو ملتوی کرکے یہ پرچہ شایع کیا جا رہا ہے۔ انشاء اللہ شعبان کی اشاعت اُس مجموعہ مضامین پر مشتمل ہوگی جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔

دارالاسلام کی تحریک جن مقاصد کے لئے شروع کی گئی ہے ان کی توضیح وقتاً فوقتاً ان صفحات میں کی جاتی رہی ہے لیکن درحقیقت یہ تحریک ابتک لوگوں کے لئے ایک معمّا ہے۔ ہر انقلابی تصور ابتدا میں معمّا ہی ہوا کرتا ہے اور انقلابی تصوّرات کی فطرت ہی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے۔ مخالفین ہی نہیں بلکہ اس تحریک سے ہمدردی اور دلچسپی رکھنے والوں کے دل میں بھی اس کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے رہے ہیں اور ان کا جواب مانگنے کے لئے روز بروز زیادہ بے چینی کا اظہار کیا جاتا رہا ہے۔ پوچھا جاتا ہے کہ دارالاسلام سے آخر تمہاری کیا

مراد ہے؟ کیا غیر مسلم حکومت کے اندر کوئی دارالاسلام بن سکتا ہے؟ جہاں انگریزی فوج اور پولیس موجود ہے، انگریزی عدالتیں قائم ہیں، انگریزوں کا قانون چل رہا ہے اور انگریزی دستور پر حکومت کا نظم ونسق قائم ہے کیا وہاں کوئی ایسی چیز موجود ہوسکتی ہے جسے "دارالاسلام" کہا جاسکے؟ اور اگر یہ نہیں تو کیا تمہارا مقصد اسلامی حکومت قائم کرنا ہے؟ لیکن یہ ہو کس طرح سکتا ہے؟ اوپر انگریزی حکومت پوری قاہرانہ طاقت سے مسلط ہے۔ اس کے نیچے غیر مسلم اکثریت ہے۔ اور ان دونوں کے نیچے تم ہو، منتشر، بے بس، خستہ حال اور پراگندہ بال۔ اس حالت میں تم کس طرح اسلامی حکومت قائم کروگے؟ عقل وہوش کھو چکے ہو تو بات دوسری ہے۔ ورنہ ہمیں سمجھاؤ کہ ایسا عظیم انقلاب آخر رونما کیسے ہوسکتا ہے؟ اگر یہ محض آرزو اور تمنا کا اظہار ہے تو اس کے خوش آئند ہونے میں کلام نہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم بھی اس تمنا میں تمہارے ساتھ ہیں۔ مگر خوابوں کی دنیا سے نکل کر ذرا عملی دنیا میں آکر ہمیں بتاؤ کہ یہ کیونکر ممکن ہے؟ اور ممکن کا کیا ذکر، اس نام کو تو اس حالت میں زبان پر لانا بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ تم کہتے ہو ہم اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہندو کہیں گے ہم کو رام راج مطلوب ہے۔ سکھ اپنی حکومت چاہیں گے۔ اور ہر دوسری قوم یہی داعیہ لے کر اٹھے گی کہ حکومت ہماری ہو۔ درآنحالیکہ انگریز سب کے سر پر مشین گن لیے کھڑا ہے۔ اب ہندوستان کی مختلف قوموں کا اپنی اپنی قومی حکومتوں کے لیے الگ الگ جدوجہد کرنا اس کے سوا اور کیا نتیجہ دکھا سکتا ہے کہ یہ سب آپس میں دست بگریباں ہوں اور انگریز اطمینان کے ساتھ حکومت کرتا رہے۔

یہ شبہات اور اعتراضات ہیں جو ہمارے پڑھے لکھے، اسلامی جذبات رکھنے والے، اور اسلام کی ترقی و سربلندی کے لئے مخلصانہ بے چینی رکھنے والے افراد میں سے قریب قریب ۹۹ فی صدی لوگوں کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں۔

ایک دوسری جماعت کچھ اس سے بھی زیادہ قوی شبہات رکھتی ہے۔ اس کو اسی میں شبہ ہے کہ اس نظام میں کوئی اسلامی حکومت ـــــ مسلمانوں کی حکومت نہیں بلکہ قانون اسلام کی حکومت ـــــ چل بھی سکتی

ہے یا نہیں۔ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کا قانون، جو صحرائے عرب کے غیر متمدن بدوؤں میں پیدا ہوا، جو صدیوں پہلے کی سوسائٹی کے لئے وضع کیا گیا تھا جس میں ہاتھ کاٹنے اور کوڑے لگانے اور سنگسار کرنے کی سزائیں ہیں، جس میں نو سو برس سے نشو و ارتقاء کا دروازہ بند ہے، آج اس دور تمدن میں کسی ترقی پذیر سوسائٹی اور عہد جدید کی ریاست (Modern State) کے لئے کیسے موزوں ہوسکتا ہے؟ مالیات کے پیچیدہ مسائل جو آج پیدا ہورہے ہیں انہیں وہ کیسے حل کرے گا؟ صنعتی انقلاب نے جو پیچیدہ تر معاشی اور اجتماعی مسائل پیدا کردیے ہیں جنھیں حل کرنا اس زمانہ کے بڑے بڑے حکیموں اور مدبروں کے لئے مشکل ہو رہا ہے، ان کا حل وہ کہاں سے لائے گا؟ دورِ حاضر کی حکومت کے لئے دستور اور بین الاقوامی تعلقات کے لئے ضابطہ جو بہرحال درکار ہے، اس میں کہاں سے لائے گا؟ ـــــ یہ اور اس قسم کے بیسیوں سوالات ہیں جو آج غیر مسلموں ہی کے دلوں میں نہیں، خود مسلمانوں کے دلوں میں بھی پیدا ہورہے ہیں۔ کوئی انہیں برملا زبان پر لاتا ہے اور کوئی ان کو دل ہی دل میں اپنی خفیت مندی کے نیچے دبائے رکھتا ہے۔

جذباتی رنگ میں ان سب کو جواب دیدینا بہت آسان ہے۔ ایک گروہ سے کہدیجئے کہ تم پست ہمت ہو، مسلمان ہوکر ایسی کمزوری کی باتیں کرتے ہو! اٹھو اور اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کا نقشہ جما دو۔ دوسرے گروہ کو ڈانٹ بتائیے کہ تم بدعقیدہ ہو، جاہل ہو، اگر تمھیں اسلام کے ایک مکمل ضابطۂ زندگی اور دائمی قانون ہونے میں شک ہے تو اپنے آپ کو مسلمان کیوں کہتے ہو ـــــ ایسے جوابات سے سب کا نہیں تو کچھ لوگوں کا منہ ضرور بند کیا جاسکتا ہے، اور خطابت کا سکہ بھی جمایا جاسکتا ہے، مگر جب دارالاسلام کا نام لینے سے محض گرمیٔ محفل اور سستی شہرت مطلوب نہ ہو بلکہ فی الواقع سنجیدگی کے ساتھ اسے نصب العین بنایا گیا ہو اور اس کو حاصل کرنا حقیقت میں مطلوب ہو تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ دونوں قسم کے شبہات کو اطمینان بخش طریقہ سے دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایک گروہ کو بتایا جائے کہ یہ چیز جو بظاہر غیر ممکن نظر آتی ہے، اس طرح ممکن ہے، اور اس تک پہنچنے کا صحیح راستہ یہ ہے۔ اور

دوسرے گروہ کو بتایا جائے کہ اسلام نہ صرف ماڈرن بلکہ الٹرا ماڈرن اسٹیٹ کو چلانے کے لئے بھی ایک بہتر دستور اور ضابطہ رکھتا ہے جو ایک ایک جز میں موجودہ زمانہ کے جمہوری اور فاشستی اور سوویٹ دستوروں سے فائق تر ہے۔ موجودہ زندگی کا ایک ایک مسئلہ جس کو تم پیچیدہ سمجھتے ہو، اس کو اسلام نے زیادہ سائنٹفک اور زیادہ صالح طریقہ سے حل کیا ہے۔

یہ طرز جواب اختیار کرنا ہمارے لئے ناگزیر ہے اگر ہم اپنے نصب العین کی طرف مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ وسیع تر انسانیت کے معقولیت پسند اور کارکن اور کارفرما عنصر کو کھینچنا چاہتے ہیں۔ سراسر جذباتی لوگ بھی اگرچہ ایک حیثیت سے مفید ہوتے ہیں اور ایک موقع پر ان کی ضرورت ہوتی ہے لیکن محض ان کی ہاتھوں سے کوئی حقیقی اور پائدار انقلاب برپا ہو جانا ممکن نہیں۔ ان کے ساتھ تعمیری قابلیتیں رکھنے والوں کا اشتراک عمل ضروری ہے اور وہ حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ دل کے ساتھ دماغ سے بھی اپیل نہ کیا جائے۔

ہمارے متعلق لوگوں کے خیالات خواہ کچھ ہوں —— اور کون ہے جس کے متعلق مختلف خیالات لوگوں میں پائے نہیں جاتے —— مگر اپنی جگہ ہم اپنے مقصد میں بالکل سنجیدہ ہیں اور اسے حاصل کرنے کا قطعی ارادہ رکھتے ہیں، اس لئے ہم ان شبہات اور سوالات کو خطابت سے دبانا نہیں چاہتے بلکہ معقولیت سے جواب دینا چاہتے ہیں تاکہ ہماری قوت میں اضافہ ہو۔

ادارۂ دارالاسلام کے دستور العمل سے پہلے توضیح مقاصد و طریق کار کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مدعا یہی ہے۔ اس میں ہم نے پہلے گروہ کے تقریباً ہر سوال کا جواب دیا ہے، اور دوسرے گروہ کے سوالات کا جواب دینے کے لئے جس تیاری کی ضرورت ہے اس کا خاکہ پیش کر دیا ہے۔ پہلا گروہ ہم سے قریب تر ہے سب سے پہلے ہم اس کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مطمئن ہو تو ہمیں اپنے علمی اور عملی شعبوں کے لئے رنگروٹ ملیں۔ اور یہ فوج مرتب ہو تب کہیں ہم دوسرے گروہ کو فتح کرنے کے لئے آگے بڑھ سکیں گے۔

پہلے گروہ کے سوالات کا جو جواب ہم نے دیا ہے اگرچہ وہ ہمارے لئے واضح ہے، مگر ہم کو خود احساس ہے کہ وہ دوسروں کے لئے، اور خصوصاً شبہات رکھنے والوں کے لئے اتنا واضح نہیں ہے۔ بہت سی چیزیں ہیں جن کو سمجھنے میں وہ اب بھی الجھیں گے۔ مثلاً ہماری دفاعی پالیسی میں ان کو اس قسم کے سوالات پریشان کریں گے کہ مسلمانوں کی موجودہ سیاسی جماعتوں کے رویہ میں تم کیا نقائص پاتے ہو اور اس میں کس نوعیت کا تغیر چاہتے ہو؟ بین الاقوامی وفاق، مساویانہ حصہ داری اور کلچرل آٹانومی، جن کے مجموعہ کو تم شبہ دارالاسلام تعبیر کرتے ہو اس کی تفصیلی صورت کیا ہے؟ آخر وہ کونسے انقلابی ذرائع ہیں جو اس ابتدائی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کارگر، ممکن العمل اور ضروری ہیں؟ پھر اس مرحلے کو طے کرنے کے بعد تم آخری مرحلے کی طرف کس راستے سے بڑھوگے؟ یہ سوالات قدرتی طور پر پیدا ہوتے ہیں اور تفصیلی بحث چاہتے ہیں۔

ان شاء اللہ الکریم ترجمان کی آئندہ اشاعتوں میں ہم خود ان سوالات کو چھیڑ کر ایک ایک کی توضیح و تشریح کریں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم ان سب لوگوں سے جو ہمارے دستور العمل کے مقدمہ کا مطالعہ کریں درخواست کرتے ہیں کہ اس پر زیادہ سے زیادہ گہری تنقیدی نگاہ ڈالیں، اور جس قدر اعتراضات ان کے ذہن میں پیدا ہوں ان سے ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ ہر ممکن پہلو سے ان مسائل پر روشنی ڈالی جاسکے۔

دوسرے گروہ کا معاملہ اگرچہ نسبتہً موخر ہے، مگر اس سے بھی ہم غافل نہیں ہیں۔ ادارہ دارالاسلام کی تاسیس عمل میں آتے ہی اولین کام جو کیا گیا وہ علمی شعبہ کا قیام تھا۔ سردست اس میں صرف دو آدمی ہیں ایک مولوی صدرالدین اصلاحی۔ دوسرا ابوالاعلیٰ مودودی۔ اگرچہ بے سروسامانی قابل داد ہے۔ [ایک] عظیم الشان کام سامنے ہے اور صرف دو آدمی اس کی ابتدا کر رہے ہیں) اور وہ بھی اس حال میں کہ کتب خانہ گویا موجود ہی نہیں۔ لیکن اگر ہمارا عزم راسخ اور ہماری نیت خالص ہے تو یہی بے سروسامانی

جس پر شاید بعض لوگ مضحکہ اڑانے میں بھی تامل نہ کریں گے، ایک روز رحمتِ الٰہی کی مستحق ثابت ہوگی۔ اس شعبہ کے لئے ہم کو ایک اعلیٰ درجہ کا منتخب کتب خانہ درکار ہے، اور نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت مطلوب ہے جو بہترین ذہنی صلاحیتیں رکھنے کے ساتھ اونچے ارادے اور ان ارادوں میں اپنے آپ کو فنا کردینے کی قوت رکھتے ہوں۔ خصوصیت کے ساتھ ہماری آنکھیں علی گڑھ، دیوبند، جامعہ ملیہ، ندوہ، مدرسۃ الاصلاح، اور جامعہ دارالسلام کے نونہالوں کی طرف لگی ہوئی ہیں۔

اس کے ساتھ شعبہ اشاعت بھی قائم کردیا گیا ہے جس سے "مسلمانانِ ہند اور موجودہ سیاسی کشمکش" کا حصہ دوم عنقریب شائع ہوگا، اور اس کے بعد ان مضامین کے مجموعوں کی اشاعت شروع کردی جائے گی جو گذشتہ پانچ چھ سال کی مدت میں بہت سے فقہی، تمدنی، معاشی اور اعتقادی مسائل پر "ترجمان القرآن" میں شائع ہوچکے ہیں، مثلاً "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی"، "حقوق الزوجین"، "مسئلہ سود"، "مسئلہ حجاب"، "قومیتِ اسلام" وغیرہ۔ جن حضرات نے ان مضامین کی اشاعت کے لئے حیدرآباد میں مجھے روپیہ بھیجا تھا ان کی تمام رقمیں ادارہ کے بیت المال میں داخل کردی گئی ہیں اور عنقریب ان کو باقاعدہ حساب بھیجا جائے گا۔

یہ کہنے کی حاجت نہیں کہ اس موقع پر ہمارے لئے کم از کم ایک ہفتہ وار اخبار کی سخت ضرورت ہے۔ محض ایک ماہوار رسالہ ان مقاصد کے لئے بالکل ناکافی ہے جو ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ جب تک ہمارا ایک پرچہ تیار ہوکر نکلتا ہے دنیا کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ ہمارا اور حریف طاقتوں کا مقابلہ گویا چھکڑے اور موٹر کا مقابلہ ہے۔ روزانہ بیسیوں مسائل پیش آتے ہیں جن پر وقت کے وقت لکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، مگر ہمیں مجبوراً دوسرے مہینہ کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور ماہوار رسالہ کی اشاعت کا وقت آتے آتے وہ مسائل پرانے ہوکر رہ جاتے ہیں۔ علاوہ بریں اس رسالہ کی حیثیت بھی اس کی متقاضی ہے کہ اس کو صرف اصولی مباحث کے لئے مخصوص رکھا جائے اور اگر فروعی مسائل چھیڑے بھی جائیں تو صرف اس حد تک کہ ان سے اصول کی تشریح ہوسکے۔ اس سے زیادہ تفصیلی و جزئی

مسائل کا یہ تحمل نہیں ہو سکتا۔ بہرحال اس کے لیے ایک اخبار ہی کی ضرورت ہے۔

ابھی حال میں ایک عالم دین نے اس مخصوص جرأت کے ساتھ جو اس دور حریت کے علماء و اتقیاء ہی کو میسر آ سکتی ہے، اپنے اخبار کے ذریعہ سے دنیا کو اطلاع دی ہے کہ ادارہ دار الاسلام کو پچاس ہزار روپیہ ملا ہے۔ کاش یہ خبر سچی ہو گئی ہوتی! ۔

دستور العمل کے باب میں بھی چند شبہات پیدا ہو سکتے ہیں جنہیں اس موقع پر صاف کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک دوست نے لکھا اور بعض حضرات نے مجلس مشاورت میں بھی اس خیال کا اظہار کیا کہ اس دستور العمل میں بہت زیادہ قوانین و ضوابط بنائے گئے ہیں، اور تفصیلات و جزئیات کے استقصا میں غلو برتا گیا ہے حالانکہ ضوابط کو عملی زندگی اور تجربہ کی ترقی کے ساتھ فطری طور پر نشو و نما پانے اور جڑ پکڑنے کے لئے چھوڑ دینا چاہئے ــــــ یہ اعتراض کافی وزن رکھتا ہے۔ میں خود بھی دستور العمل کی تسوید کے وقت اس پہلو سے خالی الذہن نہ تھا۔ مگر اس کے ساتھ ایک دوسرا پہلو بھی میرے سامنے تھا جس نے مجھے تنی تفصیلات بیان کرنے پر آمادہ کیا اور وہ اس سے زیادہ وزن رکھتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہم ایک ایسا انقلابی تصور لے کر اٹھے ہیں جو تمدن و اجتماع کے موجودہ نظم و ترتیب اور اجتماعی زندگی کے رائج الوقت طریقہائے عمل کو قریب قریب الٹ دینا چاہتا ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی فطرت اور اپنے مزاج کے مطابق ایک نئی ذہنیت، نئی ترتیب، نیا نظام، اور نیا طرز عمل مانگتا ہے۔ جن لوگوں کے پیش نظر صرف یہ چیز ہے کہ مسلمان ـــــ جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہونے کی وجہ سے مسلمان کہلاتے ہیں اور مردم شماری میں مسلمان لکھے جاتے ہیں ـــــ ان کا قومی تشخص برقرار رہے اور ایک مستقل قوم ہونے کی حیثیت سے وہ ترقی اور سربلندی حاصل کریں، ان کی انقلاب پسندی کا تقاضا تو اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ جہاں غیر مسلم کو تمکن حاصل ہے وہاں مسلمان متمکن ہو جائے، قطع نظر اس سے کہ اس کی ذہنیت کا سانچہ اور

اس کی زندگی کا نظام کوئی بھی ہو۔ ان کے پیش نظر نظام ہے ہی نہیں۔ وہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کی تقلید بھی کرسکتے ہیں، اشتراکی سوفیات (Soviets) کی نقل بھی اتار سکتے ہیں، اور ہٹلریت و مسولینیت کو بھی اسوہ بناسکتے ہیں لیکن ہماری انقلاب پسندی محض مادی انقلاب نہیں چاہتی بلکہ اخلاقی اور نظمی انقلاب چاہتی ہے۔ ہم موجودہ غیر اسلامی نظام کو الٹ کر ایک نئی اجتماعی زندگی کی تعمیر چاہتے ہیں جس کی بنا اسلامی ذہنیت اور اسلامی اصولوں پر ہو۔ اس لئے موجودہ زمانہ کے جمہوری ادارات یا فاشستی نظامات کا ڈھنگ اختیار کرنا ہمارے لئے مشکل بلکہ محال ہے۔

اب ایک بڑی دشواری یہ پیش آتی ہے کہ اسلامی طرز ادارہ مدتہائے دراز سے معطل ہے۔ صرف غیر مسلم ہی نہیں بلکہ عموماً مسلمانوں کی طبائع بھی اس سے مانوس نہیں رہی ہیں۔ موجودہ زمانہ کے ادارات کا طریق کار کچھ اس طرح فضا پر چھایا ہوا ہے کہ اچھی خاصی اسلامی ذہنیت کے مسلمان بھی مشکل اس امر کا تصور کرسکتے ہیں کہ اسلامی جمہوریت کس طرز پر کام کرتی ہے۔ اس کے بنیادی اصولوں کا ایک دھندلا سا خاکہ تو ان کے ذہن میں آسکتا ہے، مگر عملی تفصیلات میں کہیں فاشستی آمریت (ڈکٹیٹرشپ) کے طور طریقے ان کے سامنے آجاتے ہیں، اور کہیں جمہوری ادارات کے طریق کارروائی کی طرف بلا ارادہ ان کا ذہن منتقل ہوجاتا ہے۔ اگر دستور العمل میں محض اتنا لکھ دیا جائے کہ "یہ ادارہ اسلامی جمہوریت کے طرز پر کام کرے گا" تو روزمرہ کے کاروبار میں ارکان کے لئے اس کی تعبیر و تفسیر کرنا مشکل ہوجائے گا، اور آئے دن جزئی معاملات میں کارکنوں کی پراگندگی فکر و عمل سے اتنی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی کہ ان کے حل کرنے ہی میں صدر ادارہ کا سارا وقت کھپ جائے گا۔ اسی خرابی کو دور کرنے کے ضروری سمجھا گیا کہ دستور العمل میں اسلام کے جمہوری طرز ادارہ کی تفصیلی صورت پیش کردی جائے۔ یہ مصلحت اس وقت اور زیادہ واضح ہوگئی جب ہماری مجلس مشاورت میں دستور العمل کے مسودہ پر کامل تین روز تک مباحث کا سلسلہ جاری رہا۔ ان مباحث سے اندازہ ہوا کہ اسلامی جمہوریت کے طریق کارروائی کو سمجھنا ہمارے موجودہ ماحول میں لوگوں کے لئے کس قدر مشکل ہے اور اس کے جزئیات ہی نہیں، اصول

اور کلیات تک کے متعلق کتنے غلط تصورات دماغوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

دستور العمل کا تفصیلی مطالعہ کرتے وقت بعض چیزوں کو دیکھ کر لوگوں کو شبہ ہوگا کہ یہ زمانہ حال کے جمہوری ادارات کی نقل ہے، اور بعض دوسری چیزوں کو دیکھ کر وہ گمان کریں گے کہ شاید یہاں ڈکٹیٹر شپ کو اسوہ بنایا گیا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اسلامی جمہوریت کے اصولوں کی بھی تھوڑی سی تشریح کر دی جائے۔ اگرچہ یہ موضوع ایک اشارہ نہیں بلکہ ایک کتاب مانگتا ہے، مگر العاقل تکفیہ الاشارہ۔

علم السیاست کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ حاکمیت (Sovereignty) کس کی ہے۔ اس کے حل کی مختلف صورتیں انسان نے اختیار کی ہیں۔ ایک صورت بادشاہی کی ہے جس میں حاکمیت سمٹ کر ایک شخص کی ذات میں مرتکز ہو جاتی ہے۔ دوسری شکل جمہوریت کی ہے جس کی اساس عمومی حاکمیت (Popular Sovereignty) پر رکھی گئی ہے۔ پہلی صورت میں جو فساد تھا اسے دور کرنے کے لئے دوسری صورت اختیار کی گئی مگر یہ بھی فساد سے لبریز نکلی۔ ظاہر ہے کہ عامۃ الناس کی حاکمیت عملاً قائم نہیں ہو سکتی۔ عملی اغراض کے لئے بہرحال اس کو کہیں نہ کہیں مرکوز کرنا پڑے گا اور جہاں بھی وہ مرکوز ہوگی وہیں سے فساد رونما ہوگا عام اس سے کہ وہ سرمایہ دار طبقہ میں مرکوز ہو، یا عمال کے طبقہ میں، یا ایک منظم پارٹی میں، یا کسی مقبول عام ڈکٹیٹر میں۔ اس فساد کے اسباب کی بہت کچھ چھان بین کی گئی ہے لیکن اصلی سبب تک لوگوں کی نظر نہیں پہنچی۔ اس کا اصلی سبب حاکمیت کا غیر محدود ہونا ہے۔ حاکمیت مطلقہ (Unlimited Sovereignty) خواہ عوام کی ہو یا ایک خاص طبقہ کی یا ایک شخص کی، بہرصورت تمام خرابیوں کی جڑ یہی ہے۔ ایک ایسی حد کا ہونا ہر حال میں ضروری ہے جو انسان کے اختیارات کو حدِ اعتدال میں رکھے، اور یہی حد انسانی کوششیں آج تک فراہم نہیں کر سکیں۔ اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے

کہ اس نے وہ چیز فراہم کردی ہے جو انسانی اختیار کی صحیح حد بندی کر دیتی ہے یعنی **حدود اللہ**۔ ان حدود میں کسی کی حاکمیت نہیں، نہ کسی شخص کی نہ پوری جماعت کی۔ کوئی قانون ان کے خلاف وضع نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی حاکم ان کے خلاف حکم نہیں دے سکتا۔ کوئی ان کو توڑنے کے بعد اطاعت کا مستحق نہیں رہتا۔ یہ ایسا کانسٹی ٹیوشن ہے جس میں کوئی ترمیم ممکن نہیں۔

ان حدود کی نگہداشت پر اجتماعی معاملات کی درستی کا تمام تر انحصار ہے، کیونکہ یہ انسانی آزادی کا میگنا کارٹا، انسان کے بنیادی حقوق کا اعلان، اور انسانی تعلقات کی ایسی ٹھیک ترتیب (Setting) ہے جس میں ذرا سا فرق آجانے سے فساد کو گھس آنے کا راستہ مل جاتا ہے۔ اس نظم کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک طرف تو جماعت میں اتنا علم اور تقویٰ اور مضبوط کیرکٹر موجود ہو کہ وہ ان حدود کو سمجھے اور ان کو توڑنے سے ڈرے اور سختی کے ساتھ ان کی حفاظت کرے۔ اور دوسری طرف اس میں وہ طاقت موجود ہو جس سے وہ ان کی حفاظت کر سکے۔ پہلی چیز تعلیم و تربیت کے اس نظام سے پیدا ہوتی ہے جسے اسلام نے تجویز کیا ہے۔ اور دوسری چیز اسلام کا نظام جمہوریت ہے جس میں حدود اللہ کو مستثنیٰ کر کے تمام مسلمانوں کو بلا امتیاز طبقہ و گروہ، عام حاکمیت دی گئی ہے۔ ہر مسلمان اس حاکمیت میں یکساں حصہ دار ہے۔ ہر مسلمان اس دولت مشترکہ کا یکساں مالک ہے۔ ہر مسلمان کا مفاد اس میں دوسرے مسلمان کے برابر ہے۔ ہر مسلمان کو حق رائے دہی حاصل ہے۔ ایک کروڑپتی کے ووٹ اور ایک فقیر کے ووٹ میں اصلاً کوئی فرق نہیں، البتہ اگر فقیر زیادہ علم اور تقویٰ رکھتا ہے تو کروڑپتی کے ووٹ سے اس کا ووٹ زیادہ وزنی ہے۔ حق اور صواب کا مدار کثرت و قلت پر نہیں ہے۔ نہ کوئی چیز اس بنا پر صواب ہے کہ اس کے حق میں ہزار ہاتھ اٹھتے ہیں اور نہ کوئی اس لئے خطا ہے کہ اس کے حق میں ایک ہاتھ اٹھتا ہے۔

اس جمہوریت کو چلانے کے لئے جو نظام تجویز کیا گیا ہے وہ مغرب کے جمہوری دستوروں سے بالکل مختلف ہے۔

اس لئے کہ اس کی فطرت ان سے مختلف ہے۔ وہاں حدود اللہ موجود نہیں ہیں، اور غیر محدود حاکمیت کو ایک جگہ مرکوز کر دینے سے تلخ تجربے ہوئے ہیں اس لئے ہر دستور کی تشکیل عدم اعتماد (Distrust) کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ واضعین دستور کی تمام تر کوشش یہ رہتی ہے کہ حاکمیت کہیں مرکوز نہ ہونے پائے اور ہر جگہ جہاں حاکمیت مجتمع ہو وہاں تحفظات (Safe-guards) اور موانع (Checks) بھی ہوں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مغرب میں جمہوریتیں ناکام ہو رہی ہیں اور ان کی جگہ ملوکیت کی ایک دوسری شکل یعنی آمریت (Dictatorship) لے رہی ہے جس کو محدود کرنے والی چیز رعایا کی بغاوت یا اندیشۂ بغاوت کے سوا کوئی نہیں ـــــ بالفاظ دیگر وہ ایک ایسا فساد ہے جسے ایک عظیم تر فساد کے سوا کوئی دوسری چیز دفع نہیں کر سکتی ـــــ اس کے برعکس اسلام میں حدود اللہ موجود ہیں، اور اجتماعی اخلاق کی بنا تقویٰ پر رکھی گئی ہے نہ کہ معاشی مفاد پر۔ اس لئے یہاں دستور کا نقشہ بالکل بدلا ہوا ہے۔ یہاں عمومی حاکمیت کی تنظیم اس طرح کی گئی ہے کہ قوم اپنے میں سے ایک شخص کو منتخب کرے جس کے علم، تقویٰ اور حسن تدبیر پر اس کو اعتماد ہو۔ اپنی حاکمیت کو بطور امانت اس کے سپرد کر دے جب تک وہ حدود اللہ کا پابند رہے سب اس کی اطاعت کریں۔ شوریٰ اس لئے ہو کہ اسے حق اور صواب تک پہنچنے میں مدد دی جائے نہ اس لئے کہ تحفظات اور موانع سے اس کو جکڑ بند کیا جائے۔ جب تک قوم کو اس پر اعتماد رہے، عمومی حاکمیت کی یہ امانت اس کے سپرد رہے، اور جب وہ حدود اللہ سے تجاوز کرے، یا اس امانت میں غلط تصرف کر کے قوم کا اعتماد کھو دے تو وہ اس سے واپس لے لی جائے۔ اس نظام میں تنقید کے عمومی حق اور امانت واپس لینے (Recall) کے اختیار کے سوا کسی تحفظ کی حاجت نہیں۔

ہم نے اپنے دستور میں اسی طرز جمہوریت کو اختیار کیا ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ یہ نظام صرف اسی وقت چل سکتا ہے جبکہ جمہور قوم میں حدود اللہ کا علم، ان کی نگہداشت کا مضبوط ارادہ اور تقویٰ کی روح موجود ہو۔ یہ کچھ اسلامی دستور ہی پر موقوف نہیں، دنیا کا کوئی دستور بھی قائم نہیں رہ سکتا اگر اس کی پشت پر رائے عام کی طاقت نہ ہو۔ ہر دستور اپنے حق میں رائے عام کی حمایت چاہتا ہے۔ انگلستان کا پارلیمنٹری نظام حکومت صرف اس وجہ سے چل رہا ہے کہ انگریزی قوم اس کو برقرار رکھنے

کا غیر متزلزل ارادہ رکھتی ہے اور کوئی شخص اپنے سر کو خطرے میں ڈالے بغیر اس کو توڑنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ اٹلی اور جرمنی کے دستوری نظام صرف اسی لئے ٹوٹ گئے کہ قوم میں ان کی حفاظت کا کوئی اجتماعی ارادہ موجود نہ تھا۔ بالکل اسی طرح اسلام کا جمہوری نظام بھی اپنی پشت پر صالحین و متقین کی جماعت چاہتا ہے جن میں اس نظام کی صحیح اسپرٹ اور اس کو برقرار رکھنے کی عزیمت موجود ہو۔ ابتدائی دور میں یہ نظام اسی لئے ٹوٹ گیا کہ نومسلموں کی بہت بڑی تعداد اسلامی جماعت میں داخل ہوگئی تھی جس کو اسلام کی اخلاقی تربیت کافی نہ ملی تھی اور اس انبوہ میں صالحین و متقین کا تناسب اس قدر کم رہ گیا تھا کہ قوم بحیثیت مجموعی خلافت راشدہ کے دستور کی حفاظت نہ کر سکتی تھی۔ اگر اسلامی جماعت میں توسیع (Expansion) اور استحکام (Consolidation) کا توازن قائم رہتا تو یہ صورت ہرگز پیش نہ آتی۔ اس سے بہت زیادہ، بدرجہا زیادہ کمزور اخلاقی حالت آج ہماری قوم کی ہے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ ایک صحیح اسلامی نظام جمہوریت کا سنبھالنا ایسی قوم کے کس قدر مشکل ہے۔ اسی بنا پر ہم نے اپنے دستور العمل میں حلف رکنیت اور اخلاقی تربیت کو لازم کیا ہے اور رکنیت کے لئے کڑی شرطیں لگائی ہیں تاکہ قوم میں جو صالح عناصر کمیاب یا نادر الوجود ہیں وہ ہر طرف سے کھنچ کھنچ کر اس نظام میں داخل ہوتے چلے جائیں اور بتدریج اخلاقی تربیت حاصل کر کے وہ طاقت پیدا کریں جو ایسے ایک نظام کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے ضروری ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس طرح ہمارے ہاں اسلامی جمہوریت کی روایات پرورش پائیں اور رفتہ رفتہ ایک جماعت روز افزوں تعداد میں پیدا ہوتی جائے جو آگے چل کر اسلامی اصولوں پر ایک نئے انقلابی نظام سیاست کو قائم کرنے اور چلانے کے قابل ہو۔

ایک دوست نے علمی شعبہ کی اسکیم میں صدر کی ہدایت و رہنمائی پر اعتراض کیا ہے۔ انہیں اس میں ذہنی استبداد (Intellectual despotism) اور "ملّاشاہیت" کی بو آتی ہے جو حقیقی اجتہاد، فکر و رائے اور علمی تحقیق کے لئے سم قاتل ہے۔ لیکن ہم انہیں یقین دلاتے ہیں کہ یہاں اس چیز کا تو خیال بھی نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم اس کام کا دروازہ کھول رہے ہیں جو نہایت ضروری ہونے کے ساتھ نہایت نازک بھی ہے یعنی اجتہاد۔ آج کل لوگوں کو اس کی ضرورت کا تو ایک حد تک احساس ہو گیا ہے مگر اس کی نزاکت کا احساس نہیں ہے۔ وہ اجتہاد کو بچوں کا کھیل سمجھتے ہیں، اور ناکافی معلومات، اور اس سے بھی زیادہ ناکافی علمی تربیت

کے ساتھ اس میدان میں دادِ تحقیق دینے لگتے ہیں جس کے مضحکہ انگیز نمونے کمیاب نہیں ہیں۔ ایسے اجتہاد کا دروازہ کھولنے سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ جو شخص اس شعبہ میں داخل ہو وہ خواہ درجۂ اول ہی کا دماغ (First rate mind) کیوں نہ رکھتا ہو، بہرحال اسے محقق و مجتہد بننے سے پہلے ایک طالب علم کی حیثیت اختیار کرنی چاہیے اور وہ ضروری استعداد بہم پہنچانی چاہیے جس کے بغیر آدمی مجتہد نہیں بن سکتا۔ آخر مغرب کی یونیورسٹیوں میں بھی تو ریسرچ اسکالرس کو ابتداءً پروفیسر کی رہنمائی ہی میں کام کرنا پڑتا ہے اور انہیں میدانِ اجتہاد میں قدم رکھنے کی اجازت اس وقت ملتی ہے جب کافی مدت تک تربیت پانے کے بعد وہ اپنے محقق ہونے کا ثبوت دیدیتے ہیں۔ شاید کوئی علمی حلقہ بھی اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا کہ جب کوئی شخص اپنے متعلق خود سمجھ لے کہ میں محقق ہو گیا ہوں تو بس وہ محقق ہو گیا اور اسے حق حاصل ہو گیا کہ جس فن میں چاہے مجتہدانہ آراء دے۔ پس جب ساری دنیا کے علمی حلقوں میں اس کام کے لیے کچھ شرائط اور اصول ہیں اور وہ قابل اعتراض نہیں ہیں تو ہمارے علمی شعبہ ہی نے کیا قصور کیا ہے کہ یہاں اس قسم کی شرائط اور اصول مقرر کرنا ذہنی استبداد قرار پائے؟ ہمیں اسلام کو بازیچۂ اطفال تو بنانا نہیں ہے۔ ہم کس طرح ایک شخص کو پختگی حاصل کرنے سے پہلے اجازت دے سکتے ہیں کہ وہ اسلام کے احکام کی من مانی تفسیر و تعبیر کرنے لگے۔ البتہ اس شعبہ میں ہدایت اور رہنمائی کے معنی یہ بھی نہیں کہ طالبانِ تحقیق صدر کے غلام اور اس کی رعیت ہوں، اور وہ ان کی آزادیِ فکر و نظر کو سلب کر کے انہیں اپنا مقلد بنالے۔ اگر یونیورسٹیوں کی تحقیقی شعبوں میں پروفیسر کی ہدایت و رہنمائی کے یہ معنی نہیں ہوتے تو یہاں بھی اس کے یہ معنی نہیں ہیں۔

میرے رفقاء نے مجھے اس ادارہ کا صدر منتخب کیا ہے اور میری اپنی درخواست پر یہ صدارت اس وقت تک کے لیے عارضی رکھی گئی ہے جب تک چالیس ارکان فراہم نہ ہوں۔ میرا یہ خیال نہیں ہے کہ جو شخص کسی ادارہ کی بنا رکھے وہی اس کی صدارت کا حقدار ہے۔ میں اس غلط فہمی میں بھی مبتلا نہیں ہوں کہ یہ ادارہ جس قابلیت کا صدر چاہتا ہے وہ مجھ میں موجود ہے۔ اور میرے نزدیک جو شخص اس کام کی ذمہ داریوں کو سمجھتا ہو وہ بیوقوف ہوگا اگر اس بار کو خود اپنے سر لینے کیلئے آگے بڑھے۔ یہ پھولوں کی سیج نہیں ہے کہ اس کی تمنا کی جائے۔ یہ کانٹوں کا بستر ہے۔ جو اس پر لٹا دیا گیا وہ گویا جیتے جی ہلاک کر دیا گیا اور ہمیشہ کیلئے زندگی کے لطف سے محروم ہو۔ لہٰذا میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ آنیوالے ۳۵ اشخاص میں اگر کسی ایسے بندے کو بھیجدے جس میں میرے رفقاء کی نظرِ انتخاب ٹھیر جائے یا جسے میں خود اصلح پا کر بیعت کیلئے ہاتھ بڑھاؤں۔ اگر میری جگہ کوئی عبد حبشی بھی اس ادارہ کا صدر ہوگا تو باللہ العظیم اس کی ویسی ہی اطاعت کروں گا جس کا حدیث نبوی میں حکم دیا گیا ہے۔

ادارۂ دارالاسلام کی تاسیس

الحمد للہ کہ ۱۹ر شعبان ۵۷ھ (۱۴ر اکتوبر ۳۸ء) کو بروز جمعہ ادارۂ دارالاسلام کی تاسیس باقاعدہ عمل میں آگئی اور پانچ ارکان سے کام کا آغاز کر دیا گیا۔ اس موقع پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عمل تاسیس کی مختصر روداد بیان کر دی جائے۔

محرم سے رجب تک کامل ۷ مہینے غور و خوض اور حالات کا مطالعہ اور اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے ساتھ تبادلۂ خیال کرنے کے بعد پیش نظر کام کی اسکیم اور دستور العمل کا ایک خاکہ مرتب کیا گیا اور اس کی نقلیں تقریباً چالیس اصحاب کے پاس استصواب کے لئے بھیج دی گئیں۔ یہ اصحاب زیادہ تر وہ تھے جنھوں نے گذشتہ ایک سال کی مدت میں دارالاسلام کی تجویز کے ساتھ خاص طور پر دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ اور ان میں بعض ایسے بزرگ بھی تھے جن کے علم و فضل اور اصابت رائے سے استفادہ کرنا ضروری سمجھا گیا۔ مثال کے طور پر چند نام حسب ذیل ہیں :۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی۔ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر الفرقان۔ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی۔ مولانا سید سلیمان ندوی۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب۔ مولانا احمد سعید صاحب۔ مولانا احمد علی صاحب۔ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی۔ ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب۔ سید نذیر نیازی صاحب۔ مولوی سید محفوظ علی صاحب بدایونی۔ چودھری غلام احمد صاحب پرویز۔ مولوی سید عبدالرؤف شاہ صاحب ایم ایس ایل (برار) مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب ایم ایل اے (برار) جناب راغب احسن صاحب ایم اے، وغیرہم۔

ان حضرات میں سے اکثر کو دعوت دی گئی کہ ۱۷ر شعبان (۱۲ر اکتوبر) کو مجوزہ ادارہ کے صدر مقام میں تشریف لا کر مجلس مشاورت میں شریک ہوں۔ اور بعض حضرات کی مشغولیتوں کا لحاظ کر کے صرف تفصیلی اظہار رائے کی تکلیف دی گئی۔ تاریخ مقررہ پر حسب ذیل حضرات مجلس مشاورت میں شریک ہوئے :۔

مولانا محمد منظور صاحب (بریلی)، جناب نذیر احمد صاحب قریشی (دہلی)، جناب عبدالعزیز شرقی صاحب (جالندھر)۔ جناب مستری محمد صدیق صاحب (سلطان پور لودھی ریاست کپورتھلہ)، جناب شیخ محمد نعیب صاحب بار ایٹ لا (گورداسپور)، جناب چودھری رحمت علی صاحب (دینانگر)، جناب شیخ محمد شریف صاحب طوسی بی اے (وزیرآباد)، جناب منظور احمد صاحب بی اے (وزیرآباد)، جناب چودھری نیاز علی خاں صاحب۔ جناب سید محمد شاہ صاحب ایم اے۔ مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی۔ ابوالاعلیٰ مودودی۔

حسب ذیل اصحاب نے باہر سے اپنی آراء بصورت تحریر ارسال فرمائیں:۔

جناب محمد اشرف صاحب ایم اے (وزیرآباد)۔ ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب (علی گڈھ)۔ چودھری غلام احمد صاحب پرویز (دہلی)۔ جناب محمد یوسف صاحب (سیتاپور۔ اودھ)۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی۔ جناب راغب احسن صاحب ایم اے (کلکتہ)۔ جناب محمد اکبر خاں صاحب (کیمبلپور)۔ جناب حافظ منظر حسن صاحب (مغلپورہ)۔ جناب محمد شفیع صاحب باڑی (دہلی)۔

۱۷ سے ۱۹ شعبان تک تین روز مسلسل اجتماع رہا جس میں اسکیم اور دستورالعمل پر ہر ممکن پہلو سے تنقید کر کے زیادہ سے زیادہ صحیح اور منقح چیز حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اور اس میں بیرونی اصحاب کی آراء سے بھی پورا استفادہ کیا گیا۔ بالآخر کافی ترمیم و اصلاح کے بعد دونوں مسودات اس شکل میں منظور کئے گئے جس میں اب وہ شائع کئے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد پانچ اشخاص نے اپنے آپ کو رکنیت کے لئے پیش کر کے باقاعدہ حلف لیا جن کے نام یہ ہیں۔

(۱) مستری محمد صدیق صاحب (۲) سید محمد شاہ صاحب (۳) عبدالعزیز شرقی صاحب (۴) صدرالدین اصلاحی صاحب (۵) ابوالاعلیٰ مودودی۔

انہی پانچ ارکان سے مجلس شوریٰ کی ترکیب عمل میں آئی اور مجلس نے بالاتفاق طے کیا کہ جب تک چالیس ارکان فراہم نہ ہوں اس وقت تک عارضی طور پر ابوالاعلیٰ مودودی فرائض صدارت انجام دے۔ مستقل صدر کا انتخاب تعداد مقررہ کی فراہمی کے بعد عمل میں آئے گا۔

(ابوالاعلیٰ مودودی (عارضی صدر ادارہ) ۲۰ شعبان ۵۷ھ

مقالات

واردھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان

ایک عظیم الشان خطرے سے آگاہی

(۲)

(منقول از رسالہ طلوع اسلام دہلی)

اس تفسیر کا اثر آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ وہی چیز جو کبھی دینِ الٰہی کی شکل میں سامنے آئی تھی، پھر وہ برہمو سماج کے رنگ میں نمودار ہوئی، اور جسے اب مہاتما گاندھی تعلیمی نصاب میں پیش کر رہے ہیں، لفظاً لفظاً وہی ہے جو مولانا آزاد نے اپنے دورِ قوم پرستی کی تفسیر میں بیان فرمائی ہے یعنی تمام مذاہب اپنی بنیادی سچائیوں کے اعتبار سے یکساں ہیں، فرق شریعتوں میں ہے اور شریعتیں کچھ اہمیت نہیں رکھتیں۔ اس بات کے اعلان کے لئے مہاتما جی نے اتنے عرصہ پیشتر سے زمین ہموار کرنی شروع کر دی تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء میں جب یہ تفسیر شائع ہوئی ہے تو مہاگاندھی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک تقریر فرمائی اور اس میں کہا کہ مجھے ایک عرصہ سے خیال تھا کہ اسلام ایسا تنگ نظر مذہب نہیں ہو سکتا کہ وہ نجات وسعادت کو اپنے پیرووں تک ہی محدود رکھے اور سچائیاں صرف اپنے اندر ہی بتلائے۔ لیکن مجھے اس بات کی سند کہیں سے نہ ملتی تھی۔ اب جو مولانا آزاد نے تفسیر شائع کی ہے تو مجھے اپنے

اس خیال کی سند مل گئی ہے کہ اسلام تمام مذاہب میں یکساں سچائیوں کا مدعی ہے۔ لہٰذا ہم نے اس تفسیر کے متعلقہ ٹکڑوں کا (ہندی) میں ترجمہ کرکے عام شائع کرایا ہے ؎۱"

اس کے بعد پانچ چھ برس تک مختلف قوم پرست مسلمانوں کی طرف سے اسی اسلام کا اعلان ہوتا رہا۔ ان کی طرف سے مضامین شائع ہوتے رہے۔ تقریریں ہوتی رہیں۔ جب یوں میدان صاف ہوگیا تو اب مہاتما جی نے اس نظریہ کو اپنی تعلیمی اسکیم میں شامل کردیا۔ اگر اتنی زمین ہموار کئے بغیر پہلے ہی یہ نظریہ مہاتما جی کی طرف سے پیش ہوتا تو مسلمان بدک جاتے لیکن مہاتما نے نہایت حُسنِ تدبر سے اپنی مخصوص شاطرانہ چالوں سے مسلمانوں کے ذہن کو اس کے قبول کرنے کے لئے تیار کرایا، اور اس کے بعد اس کا اعلان کیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ آج خود مسلمان اس اسکیم پر احسنت و مرحبا کے نعرے لگا رہے ہیں۔

آپ کے علماء حضرات، جو کل تک آمین بلند و آہستہ کہنے پر ایک دوسرے کو کافر بناتے رہتے تھے، جن کے نزدیک شریعت کے جزئیات تک کی اتنی اہمیت تھی کہ وہ ٹخنوں سے نیچے پاجامہ پہننے والے کو نجات و سعادت سے محروم قرار دیتے تھے، آج قوم پرست بننے کے بعد وہ اسلام کی اس جدید تعریف (Definition) کی رو سے اس شخص کو جسے کل تک وہی کافرِ مشرک کہا کرتے تھے، اسی طرح نجات و سعادت کا مستحق قرار دیتے ہیں جس طرح مسلمان کو، بلکہ مسلمان کو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں سمجھتے ہیں کہ یہ اپنی "مذہبی گروہ بندی" الگ قائم رکھنا چاہتا ہے، اور ہندوان کے نزدیک صحیح اسلام کا پیرو ہے جو ان گروہ بندیوں کو توڑ کر ایک متحدہ قومیت بنانا چاہتا ہے۔ ذرا خدا کے لئے پوچھئے کسی عالم سے، پوچھئے کسی فقیہ سے، پوچھئے کسی مولانا سے، پوچھئے کسی امیرِ شریعت سے کہ کیا فی الواقع اسلام وہی ہے جو مولانا آزاد نے اپنی تفسیر میں پیش کیا ہے؟ کیا ہندومت اور اسلام واقعی

ص۱ مسٹر مہادیو ڈیسائی کو ہمیں اطلاع ملی ہے کہ مولانا آزاد کی اس تفسیر کا ہندی ترجمہ بابو راجندر پرشاد (پٹنہ) سے مل سکتا ہے۔
"طلوعِ اسلام"

اپنی بنیادی سچائیوں کی رو سے بالکل یکساں ہیں؟ کیا مذاہب کے "ظواہر و رسوم" فی الحقیقت بیکار و مہمل ہیں کہ بچوں کو ان کی تعلیم دینا انہیں اصل دین سے بیگانہ کر دینا ہے؟ کیا واقعی شریعتِ محمدیہ کو نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں؟ پوچھیے ان سے کہ آج ان کی اس حمیتِ دینی کو کیا ہوا جو شریعت سے ذرا اختلاف کو برداشت نہ کر سکتی تھی؟ دریافت کیجئے ان سے کہ ان کے فتاویٰ کی ان مہروں کو کون چرا لے گیا جو "ظواہر و رسوم" کے اختلافات کے فیصلوں کے لئے ہر وقت سجدہ ریز رہا کرتی تھیں؟ کس نے ان کے قلموں کی سیاہیاں خشک کر دیں؟ کیا چیز آج ان کے گلوگیر ہوگئی کہ یہ سب کچھ دیکھتے ہیں لیکن نہ کچھ لکھ سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں؟۔

آپ ایک دفعہ یہ تسلیم کر لیجئے کہ سچائیاں جو اصلِ دین ہیں ہر مذہب میں یکساں ہیں، اور شرائع جن میں اختلاف ہے وہ کچھ اہمیت نہیں رکھتیں، پھر اپنے آپ سے سوال کیجئے کہ یہ جو آپ کے علماء حضرات منبروں اور اسٹیجوں پر اسلام کی خصوصیات پر خطبے اور لکچر دیتے ہیں، ان کے کیا معنی رہ جاتے ہیں؟ کیا یہ سب کچھ، بقول مہاتما گاندھی صرف اس لئے کیا جاتا ہے کہ آپ محض سیاسی اغراض کی خاطر غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کی کوشش کرتے ہیں؟ پھر پوچھیے کہ جب آپ کے بچوں کو کامل سات برس تک جبری طور پر اس عقیدہ کی تعلیم دی جائے گی تو ان کے نزدیک اسلام میں کون سی کشش باقی رہ جائے گی جس کی خاطر وہ اس سے متمسک رہیں؟ وہ بچہ جب ہندوؤں کو بھی اسی قسم کی سچائیوں کا حامل سمجھے گا، جس قسم کی سچائیاں قرآنِ کریم میں ہیں، تو وہ پھر مسلمان رہنے پر اصرار کیوں کرے گا؟ اس ہندو قوم میں شامل ہونے سے کیوں احتراز کرے گا جس کے پاس مسلمانوں سے کہیں زیادہ دھن دولت بھی ہے اور عالمگیر سچائیاں بھی؟ لاکھوں بھنگی اور چمار (اچھوت) عیسائیوں کی کمتی فوج میں اس لئے شامل ہوگئے کہ ان کے اپنے مذہب میں انہیں کوئی تفوق نظر نہیں آتا تھا اور جس مذہب کی انہیں دعوت دی جاتی تھی وہ حاکم قوم کا مذہب تھا۔ کیا یہی چیز مسلمان بچوں کے ساتھ بھی نہ ہوگی؟ سوامی شردھانند

کی تحریک شدھی تو یونہی بدنام ہوگئی کہ وہ کھلے بندوں نام لے کر شدھی ہوتی تھی۔ مہاتما جی اس وقت سمجھتے ہوں گے کہ کیا دورِ جہالت کا سا طریق عمل اختیار کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کو شدھ کرنے کا طریقہ اس سے جداگانہ ہے۔ انھوں نے اُسی زمانہ سے خاموش شدھی کی اسکیم کا خاکہ تیار کرلیا جس کا سنگِ بنیاد مولانا آزاد کے مقدس ہاتھوں سے رکھوایا گیا، اور اب شیخ الجامعہ ملیہ اسلامیہ کے پاک ہاتھوں سے اس پر عمارت تیار کرائی جا رہی ہے!۔

کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم نجی طور پر دلائیں۔ لیکن ذرا اس پر بھی غور فرمائیے کہ اسکول میں تو اسے پڑھایا جائے گا کہ تمام مذاہب اصولی طور پر یکساں ہیں اور گھر پر اسے پڑھایا جائے گا کہ اسلام دیگر مذاہب سے بلند و بالاتر مذہب ہے بلکہ خدا کا سچا مذہب ہے۔ یہی نہیں بلکہ پھر اسے گھر پر نجی طور پر مذہبی تعلیم کی تعلیم بھی دی جائے گی، اور یہ وہ تعلیم ہوگی جس کی نسبت مہاتما جی نے فرمایا ہے کہ تمام لڑائی جھگڑوں کا باعث ہی یہ تعلیم ہے۔ تو یہ دونوں باتیں ساتھ ساتھ کیسے چلیں گی؟ یہ بھی واضح رہے کہ اسکولوں میں مذہبی تعلیم کتابوں کے ذریعے سے نہیں ہوگی اس لئے کہ مہاتما جی کو خوب علم ہے کہ وید کسی طرح قرآن کے سامنے لائے ہی نہیں جا سکتے۔ تعلیم ہوگی استادوں کی زندگی کے ذریعہ سے۔ اور ظاہر ہے کہ کانگریسی حکومت کے مقرر کردہ استاد کوئی ڈاکٹر اشرف کوئی جوش ہی ہوں گے جہاں وزیر تعلیم ڈاکٹر سید محمود جیسے ہوں جو مسلمانوں کا سا الگ نام رکھنا بھی ہندی قومیت کے خلاف سمجھتے ہیں[1]۔ وہاں کے استاد جس ڈھنگ کے ہوں گے وہ ظاہر ہے۔

باب دوم

فلسفۂ زندگی

مذہب کے متعلق تو آپ دیکھ چکے اب فلسفۂ حیات کو لیجئے۔ مسلمانوں کے نزدیک فلسفۂ زندگی مذہب سے الگ

[1] (ملاحظہ ہو سوراجی اسلام۔ مطبوعہ طلوع اسلام بابت جون)

ستے نہیں۔ یوں سمجھئے کہ مذہب جس رنگ میں انسان کو رنگنا چاہتا ہے وہی اس کا فلسفۂ زندگی ہوتا ہے۔ ہندو یوگیوں کا فلسفۂ حیات اہنسا ہے، جس کے معنی عدم تشدد (Non-violence) کئے جاتے ہیں لیکن عدم تشدد سے اس کا صحیح مفہوم ذہن میں منتقل نہیں ہوسکتا۔ اس سے مفہوم وہ فلسفۂ زندگی ہے جو حضرت مسیحؑ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ یعنی جو ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی سامنے کر دو۔ ماحصل یہ کہ ہمیشہ مار کھائے جاؤ۔ لیکن سامنے سے ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ جب ہاتھ اٹھاؤ گے تو وہ ہنسا ہو جائے گا۔ قوت وطاقت کا استعمال ہنسا ہے اور مار کھاتے جانے کا طرز عمل اہنسا ہے۔ یہ وہ فلسفہ ہے جس کے "اوتار" آج مہاتما گاندھی سمجھے جاتے ہیں۔ اور وہ اس فلسفہ کو انسانیت کی بہترین تعلیم قرار دیتے ہیں۔ واردھا اسکیم جس کے متعلق دعویٰ یہ ہے کہ اس کو مذہب سے کچھ علاقہ نہیں فلسفۂ زندگی کے اعتبار سے اس کی بنیاد اہنسا پر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ رپوٹ زیر بحث میں سب سے مقدم "بنیادی اصول" کے ماتحت لکھا ہے کہ "ہمارے بچوں کو یہ سکھانے کی ضرورت ہے کہ اہنسا کا طریقہ ہنسا سے اچھا ہے"۔ (رپورٹ صلا) پھر "سماج کے علم" کے عنوان میں درج ہے:۔

"جن لوگوں نے قوموں کو آزاد کرایا ہے اور امن کے ذریعہ سے صلح حاصل کی ہے ان کی کہانیاں کورس کی کتابوں میں خاص طور پر ہونی چاہئیں۔ انسانوں کی زندگی سے ایسے سبق سکھانے چاہئیں جن سے اہنسا اور اس کے ساتھ کی خوبیوں کا ہنسا، دھوکے اور دغا سے اچھا ہونا ثابت ہو" (صلا)

ہنسا یا اہنسا ہمیں دیکھنا ہے کہ کیا قرآن کریم کی رو سے، اسوۂ حسنہ کی رو سے، صحابۂ کبارؓ کی حیات مقدسہ کی رو سے، مسلمان کے لئے فلسفۂ زندگی یہی ہے، جس کی تعلیم جبراً ان کے بچوں کو دی جائے گی؟ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام امن وسلامتی کا مذہب ہے، وہ خواہ مخواہ دوسروں کو ستانے کی تلقین نہیں کرتا بلکہ اسے بڑی سختی سے روکتا ہے، وہ اپنے بیگانے سب کی عزت، عصمت، جان، مال، مذہب کی حفاظت کرنا سکھاتا ہے اور اس کے لئے وہ برائی کو بھلائی سے روکنے کا سبق دیتا ہے۔ (اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ)۔ لیکن اس کے نزدیک صرف تا حصہ فلسفۂ زندگی کا ایک شعبہ ہے۔ زندگی صحیح فطرتِ انسانی کی

مطابق نہیں ہو سکتی تا وقتیکہ اس عاجزی اور نرمی کے حصے کے ساتھ دوسرا حصہ، اور نہایت اہم حصہ، بھی شامل نہ ہو۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ دنیا میں عفو، درگذر، نرمی، لینت، رواداری بڑے عمدہ اصول ہیں لیکن جب ایسا وقت آ جائے کہ شریر النفس انسان دوسروں کی شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھائیں اور کمزوروں اور ناتوانوں پر خدا کی یہ وسیع و عریض زمین تنگ کر دیں، جب ایسا وقت آ جائے کہ نرمی اور عاجزی، عفو اور درگذر سے ظالم کی سرکشی، اس کا ظلم و استبداد اور بڑھتا چلا جائے، تو اس وقت یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ دنیا میں عدل و انصاف قائم رکھنے کے لئے، قوانینِ الٰہی کی محافظت کے لئے، ظالم کے ظلم کو قوت سے روکو، اس کی سرکشی اور دراز دستی کو پوری طاقت اور زور کے ساتھ کچل کے رکھ دو اور اس کے تکبر و نخوت، اس کی فرعونیت اور نمرودیت کو چور چور کر دو کہ اَلْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ فتنہ و فساد، ظلم و استبداد، سرکشی و طغیان، قتل سے کہیں زیادہ شر انگیز ہیں۔ جب انگلی پر ایسا ناسور ہو جائے جو ناقابلِ علاج ہو، اور اس کا زہر سارے جسم میں پھیل جانے کا اندیشہ ہو تو اس انگلی کا کاٹ کر پھینک دینا ہی عین مصلحت ہے۔ اگر آپ کو مظلوم کی حفاظت مقصود ہے تو ظالم کے ظلم کو ہر طرح سے روکنا ہوگا۔ اگر پرامن انسانوں کی عزت، عصمت، جان، مال کا تحفظ مطلوب ہے، تو قاتلوں کو حوالۂ دار و رسن کرنا ہوگا، مجرموں کو سزائیں دینی پڑیں گی، عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے محکمۂ عدالت ناگزیر ہے، اور محکمۂ عدالت کے قیام و بقا کے لئے شمشیر جگردار کا ساتھ ہونا بھی لاینفک ہے۔ کوئی قانون ایسا نہیں جو دنیا میں قوت کے بغیر نافذ العمل ہو سکتا ہو۔ قرآن کریم نے اسی حقیقتِ کبریٰ کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ

قَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝ ۲۵/۵۷

"ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتابیں یعنی قوانین عدل وانصاف نازل کئے تاکہ لوگ اپنے ٹھکانے پر اعتدال سے رہیں۔ اور (اس کے ساتھ ہی) ہم نے فولادی شمشیر (لوہے) کو بھی نازل کیا جس میں سخت قوتوں (کے راز) پوشیدہ ہیں اور لوگوں کے لئے (اور بھی) فائدے ہیں، تاکہ اللہ دیکھ لے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی بلا دیکھے مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بڑی قوت والا زبردست (غالب) ہے۔"

حضرت علامہؒ فرماتے ہیں:۔

سوچا بھی ہے اے مرد مسلماں کبھی تو نے کیا چیز ہے فولاد کی شمشیر جگر دار
اس بیت کا یہ مصرع اوّل ہے کہ جس میں پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

خدا کی کتاب یعنی قوانین الٰہی کے ساتھ ساتھ تلوار بھی نازل ہوئی ہے کہ لوگوں کو ٹھیک اپنے ٹھکانے پر رکھا جائے۔ جاوید نامہ میں حضرت علامہؒ، خاتونِ محترمہ شرف النساء کے متعلق تحریر فرماتے [2] ہیں کہ اس نے وصیت کی تھی کہ اس کی قبر پر تلوار اور قرآن رکھ دیا جائے کہ:۔

ایں دو قوت[1] حافظ یک دیگر اند کائناتِ زندگی را محور اند
مومناں را تیغ با قرآں بس است تربتِ ما را ہمیں ساماں بس است

آیت کے آخر میں فرمایا کہ مسلمانوں کا خدا قوی عزیز ہے۔ بے انتہا قوتوں کا مالک اور غالب وزبردست ہے، اس لئے اس کے رنگ میں رنگی ہوئی قوم بھی قوت وسطوت کی مالک ہونی چاہئے۔

[1] تلوار قرآن کریم کی حفاظت کرنے والی ہے، یہ تو ظاہر ہے لیکن نکتہ بلیغ یہ ہے کہ قرآن کریم بھی تلوار کا محافظ ہے۔ تلوار کو اس محافظ کے بغیر آزاد چھوڑ دیا جائے، تو وہ تلوار چنگیز خاں، ہلاکو، کیزر، ہٹلر اور مسولینی بن جاتی ہے لیکن جب اس کے ساتھ قرآن محافظ ہو تو یہ عمرؓ و خالدؓ کی صورت اختیار کرتی ہے، اور دونوں میں فرق ظاہر ہے۔

اہمسا کی پرستار تو اس خدا کی قوم ہو سکتی ہے جو اس درجہ بے بس اور مجبور ہو کہ اسپر کوئی پتھر بھی پھینک دیا جائے تو وہ ہاتھ نہ اٹھا سکے۔ مٹی کے بت اور ایک خدائے حیّ و قیوم میں جتنا فرق ہے، اتنا ہی فرق اہمسا کے "اوتار" اور مرد مجاہد میں ہے۔ مسلمان کا ہیولیٰ تو اہمسا اور ہمسا دونوں سے مل کر بنتا ہے

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں!

نبی اکرمؐ نے عفو و درگذر کا جو نمونہ اپنی حیاتِ مقدسہ میں پیش کیا اس کی نظیر دنیا کے کسی بڑے سے بڑے مدعیِ امن و صلح کے ہاں نہیں مل سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جب قوت اور طاقت کے استعمال کی ضرورت پڑی تو کم و بیش (ستر) لڑائیوں (مغازی و سرایا) میں خود شمشیر بدست شریک ہوئے یا ان قدسیوں کی جماعت کو روانہ فرمایا جو دنیا میں انسانیت کی معراجِ کبریٰ کے مظہر اتم تھے۔ وہ مسلمان جن کے متعلق قرآنِ کریم کا ارشاد ہے :۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۝ ۹/۱۱۱

بے شک اللہ نے مومنین سے بعوض جنت اُن کی جانیں اور اموال خرید لئے ہیں اور (اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ) وہ لوگ اللہ کے راستے میں (میدان جنگ میں) لڑتے ہیں۔ سو یا تو دشمن کو تہ تیغ کرکے (فاتح و مظفر لوٹتے ہیں) یا وہیں خاک و خون میں غلطاں ہو کر رسم شہادت کی بنیاد ڈالتے ہیں۔"

مومن کی تو شان یہ ہے کہ اگر دنیا قوانینِ الٰہی کے مطابق نہ چلے تو اس دنیا کو زیر و زبر کر دے، اس زمین و آسمان کو الٹ دے، اس جہانِ آب و گل کو درہم برہم کر دے۔

گفتند جہانِ ما۔ آیا بتو می سازد گفتم کہ نمی سازد۔ گفتند کہ برہم زن

مومن دنیا میں پانی کی طرح ہر قالب میں ڈھل جانے کے لئے نہیں پیدا ہوا، بلکہ یہ تو دنیا کو اپنے خدا کے وضع کردہ قالب میں ڈھالنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اگر وہ پانی ہے تو خود بخود اس کے

قالب میں ڈھل جائے گی، اور اگر لوہا ہے تو اسے یہ اپنے جلال کی آتشِ سوزاں میں پگھلائے گا، تا آنکہ وہ مائع بن کر اس کے قالب میں ڈھل جائے۔ یہ دنیا میں قوانینِ الٰہی کا نافذ کرنے والا ہے۔ اگر شریف النفس انسان انہیں نرمی اور محبت سے مان لیں، تو اس سے بڑھ کر مہربان کوئی نہ ہوگا۔ لیکن اگر سرکش و ضدی انسان اس قانون سے بغاوت کرے تو اس جیسا سخت گیر کوئی نہ ہوگا۔ مومن وہ ہے کہ:۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۗ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ

اہنسا کا فلسفہ تو ان کا ہے جو آسمان میں بجلی کڑکی تو اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے، بادل گرجا تو اس کے سامنے سجدہ میں جھک گئے، سانپ دیکھا تو ڈنڈوت کرنے لگے، اپنے ہاتھوں سے بت تراشا اور اسے خدا بنا کر بیٹھ گئے۔ لیکن جو اس تمام کائنات کو مسخر کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہو، وہ اہنسا کا پرستار کیسے ہوسکتا ہے؟ (وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِیْعًا)۔ اہنسا تو ان کا فلسفہ ہے کہ جنھوں نے جب سے آنکھ کھولی اپنے آپ کو دوسروں کا غلام ہی دیکھا۔ لیکن جو بارہ برس کے اندر چالیس ہزار شہر اور قلعے فتح کرنے والی قوم ہو، اس کو صرف اہنسا سے کیا واسطہ؟ نبی اکرمؐ سے دریافت کیا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے۔ فرمایا کہ جب جہاد ہو رہا ہو تو وہ میدانِ جنگ میں ہو۔ اور جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو۔ میدانِ جہاد کا نقشہ تو آپ نے آیت مندرجہ صدر (وَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ) میں دیکھ لیا۔ تیاری میں مصروف رہنے کے متعلق ارشاد ہے:۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ ... ﴿۶۰﴾

"اور جس قدر قوت (وسامان) تم سے ہوسکے اس سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے تم اپنے اور اللہ

کے دشمنوں (کے مقابلہ) کی تیاری رکھو تاکہ (اس قوت و شرکت سے) اُن پر

تمھارا رعب قائم رہے۔"

کہئے کہ وہ قوم جس کا رازِ حیات ان احکام کے اندر پوشیدہ ہو، اُس کا فلسفۂ زندگی اچھا ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا یہ فلسفۂ زندگی جس میں جمال کے ساتھ جلال کا عنصر بھی شامل ہے غیر مسلموں کے دل میں ہمیشہ سے کھٹکتا رہا ہے۔ کوئی ڈاکو کسی کوتوال کو اچھا نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے انھوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ اس فلسفۂ زندگی کو گھناؤنا بنا کر دکھایا جائے، اس کی ایسی تصویر کھینچی جائے کہ جو دیکھے اس سے نفرت کرنے لگ جائے۔ عیسائی مستشرق ایک عرصہ تک اس کی نشر و اشاعت کرتے رہے ہیں (اور اب بھی کر رہے ہیں)۔ نتیجہ اس پروپیگنڈا کا یہ ہوا کہ غیر تو غیر، خود مسلمان بھی اس قوت و شوکت کے فلسفۂ حیات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگ گیا۔ گذشتہ پچاس برس سے آپ ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھیے، بالعموم جہاد کے مسئلہ میں وہ کچھ ایسے جھینپے ہوئے سے نظر آئیں گے، ان کا کچھ ایسا (Apologetic Attitude) ہوگا کہ اوّل تو ان کی خواہش یہ ہوگی کہ کسی طرح قرآن کریم سے یہ آیتیں خارج ہی ہو جائیں تو اچھا ہے لیکن چونکہ اس پر ان کا بس نہیں چلتا اس لئے وہ آیات کی ایسی مضحکہ انگیز تاویلیں کرتے ہیں جن سے کسی طرح یہ ثابت ہو جائے کہ یہ اس زمانے کے احکام ہیں جس میں ابھی دنیا اتنی "مہذب" نہ ہوئی تھی۔ وہ دورِ وحشت و بربریت تھا۔ یہ احکام وقتی تھے۔ اُس زمانے کے مخصوص حالات کے ماتحت عربوں کی اس جنگجو قوم کے مقابلہ میں اس قسم کے طرزِ عمل کی ضرورت پڑ گئی۔ لیکن اب یہ تمام آیات "منسوخ" ہو چکی ہیں۔ اور اب جہاد صرف "اشتہار نویسی" اور "مناظرہ بازی" کا نام رہ گیا ہے۔ اسی پروپیگنڈے کی تکمیل کے لئے قادیان میں ایک "نبی" مبعوث کرایا گیا اور اس نے فیصلہ ہی کر دیا کہ جہاد بالسیف اب قطعاً ممنوع ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ؎

ہوا گر قوتِ فرعون کی درپردہ مرید

قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم الٰہی

ایک مثال اس منظم سازش کے متعلق حضرت علامہؒ اپنی مثنوی اسرار و رموز میں تمثیلاً بیان فرماتے ہیں کہ کسی جنگل میں ایک شیر رہتا تھا۔ وہاں کی بھیڑیں جب اس سے تنگ آ گئیں تو انھوں نے مل بیٹھ کر مشورہ کیا کہ اس آفت کا علاج کیا کیا جائے؟ ان میں جو سب سے زیادہ سیاستداں بھیڑ تھی اس نے کہا کہ دیکھو بھئی! اگر تم تمام بھیڑیں بھی اکھٹی مل جاؤ۔ تب بھی ایک شیر نہیں بن سکتیں۔ لہذا اپنے آپ کو شیر بنانے کا خیال محض وہم ہے۔ البتہ کوشش یہ ہونی چاہئے کہ اس شیر کو کسی طرح بھیڑ بنا دیا جائے۔ چنانچہ اس بھیڑ نے گیروے رنگ کے کپڑے پہنے۔ ماتھے پر تلک لگایا۔ پاؤں میں کھڑاویں پہنیں۔ اور ایشور بھگتی، ایشور بھگتی کا منتر جپتی ہوئی شیر کی طرف چلی۔ شیر نے دیکھا کہ ایک دیوتا سروپ مہاتما چلا آرہا ہے۔ ڈنڈوت کیا اور پاس بیٹھ گیا۔ بھیڑ نے اشیر باد دی اور نہایت مسکین سی شکل بنا کر اپدیش دینا شروع کیا کہ بابا! یہ دنیا چند روزہ ہے، مایا کا جال ہے، یہ خونریزی اور گوشت خوری کی زندگی بھلے مانسوں کا کام نہیں، دشمن سے پریم کرو، اپنے آپ کو مارو، آتما کی شانتی اس سے حاصل ہوگی:۔

ایکہ می نازی بذبح گوسفند | ذبح کن خود را کہ باشی ارجمند
زندگی را می کند ناپائدار | جبر و قہر و انتقام و اقتدار
غافل از خود شو اگر فرزانہ | گر ز خود غافل نہ دیوانہ
چشم بند و گوش بند و لب بہ بند | تا رسد فکر تو بر چرخ بلند

گوسفند کی یہ خواب آور فسوں سازی کارگر ہوگئی، اور شیر اس کا چیلہ بن گیا۔ اب ہنسا کی جگہ اہنسا کا فلسفہ اس کی زندگی کا طرز عمل تھا۔ گوشت چھوڑ کر گھاس پات پر گذران ہونے لگی۔ وہ قوت و ہیبت، وہ تندی و تیزی، وہ جلال و جبروت مسکینی و عاجزی، کمزوری و ناتوانی، بزدلی و دوں ہمتی میں بدل گئی۔ رفتہ رفتہ یہ حالت ہوگئی کہ:۔

از علف آں تیزیٔ دنداں نماند | ہیبتِ چشمِ شرر افشاں نماند
دل بتدریج از میانِ سینہ رفت | جوہرِ آئینہ از آئینہ رفت
آں جنونِ کوششِ کامل نماند | آں تقاضائے عمل دردل نماند
اقتدار و عزم و استقلال رفت | اعتبار و عزت و اقبال رفت
پنجہ ہائے آہنی بے زور شد | مردہ شد دلہا و تنہا گور شد
صد مرض پیدا شد از بے ہمتی | کوتہ دستی، بیدلی، دوں فطرتی

نتیجہ یہ کہ :۔ شیر بیدار از فسونِ میش خفت ۔

اور قیامت یہ کہ :۔ انحطاطِ خویش را تہذیب گفت ۔

ناصحانِ مشفق | یہ گوسفندی ناصحانِ مشفق پہلے پادریوں کی صورت میں جلوہ فرما ہوا کرتے تھے، انگلستان سے چلتے تو اپنے اسلحہ بنانے والے کارخانوں کو تاکید کر آتے کہ دیکھنا تمھاری بھٹیاں کہیں ٹھنڈی نہ پڑ جائیں۔ وہ سولہ انچ دہانے کی توپیں، چار چار من کے گولے، ڈھلتے چلے جائیں، لیکن مشرق میں مسلمانوں کو مسیح کی منادی" سنائی جاتی کہ خدا کی بادشاہت کمزوروں، ناتوانوں اور ضعیفوں کا حصہ ہے۔ افیون کھا کر سور ہو تا کہ ملوکیت کے شکنجے اچھی طرح سے تم پر کسے جائیں۔ وہ ان کو آسمانی بادشاہت کے خواب اور افسانے سناتے رہے حتیٰ کہ زمین کی بادشاہت یکسر دوسروں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ وہ دور ختم ہوا تو وہی بھیڑ اب سادھو مہاتما کے چولے میں مسلمانوں کے سامنے اہنسا کا پرچار کرنے لگی۔ ڈاکٹر مونجے ملٹری کالج کھول رہے ہیں، بھائی پرمانند سنگھٹن کے اکھاڑے قائم کر رہے ہیں اور مہاتما گاندھی کا نازک دل انسانیت کے ظلم و ستم سے اس قدر متاثر ہو رہا ہے کہ سرحد کے پٹھانوں کو اہنسا کا سبق دینے جاتے ہیں :۔

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندانِ مکتب سے

سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

"پٹھان کا ہوا" بھارت ماتا کے سر پر جن کی طرح سوار تھا۔ اس کے دفعیہ کا یہی موثر طریقہ سمجھا گیا کہ اپنے ہاں ملٹری کالج کھولے جائیں اور وہاں کے "خان" کو گاندھی بنا کر ہاتھ باندھ کر ڈنڈوت کرنا سکھایا جائے۔ اس کے بعد جو جبری تعلیم رائج کی جائے، اس میں بچوں کے دلوں پر یہ نقش ثبت کیا جائے کہ اہنسا کا نظریہ زندگی ہمیشہ ہنسا سے اچھا ہوتا ہے۔ یہی نہیں۔ ہنسا کی برائیاں اچھی طرح سے واضح کی جائیں اور تاریخ عالم سے اُن مشاہیر کی کہانیاں پڑھائی جائیں جنھوں نے اہنسا کے ذریعے سے دنیا میں امن حاصل کیا ہے، یعنی مہاتما بدھ کی سوانح حیات اجاگر کر کے دکھائی جائے اور محمد رسول اللہ کی زندگی (نعوذ باللہ) گھناؤنی بتائی جائے۔ ہندوستانی غلاموں کا دستور حیات درخشندہ نظر آئے، اور عمرؓ و خالدؓ کا طرز عمل (خاکم بدہن) مردود قرار دیا جائے۔ ذرا تصور میں لائیے اس وقت کو کہ آپ کے بچے سات برس کی عمر سے چودہ برس کی عمر تک اس تعلیم کے لئے مجبور کئے جائیں گے جس کی رو سے نبی اکرمؐ سے لے کر شاہ اسمٰعیل شہیدؒ تک تمام مجاہدینِ اسلام کا فلسفۂ حیات نفرت انگیز ہوگا اور اس کے برعکس ہندوستان کے تمام یوگی، سنیاسی اور ان کے سرخیل مہاگاندھی خدا کے اوتار سمجھے جائیں گے۔ غور فرمائیے کہ نتیجہ کیا ہوگا؟ ہندوؤں کی تو سلطنت ہوگی، اس لئے اس کے بچوں کو اہنسا پڑھائیے یا ہنسا، اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا، بلکہ اہنسا سے ان کے دلوں میں اپنے بزرگوں کی عزت، اپنے مذہب کی عظمت اور مسلمانوں کے مشاہیر سے نفرت اور ان کے مذہب سے حقارت کے جذبات پیدا ہوں گے۔ لیکن غور فرمائیے کہ مسلمان بچوں کی ذہنی اور قلبی کیفیت کیا سے کیا بن جائے گی؟

مہاتما جی کس قدر معصومانہ انداز سے فرماتے ہیں کہ موجودہ انداز پر مذہبی تعلیم سے چونکہ اختلافات بڑھتے ہیں، اس لئے مذہبی تعلیم کو واردھا اسکیم سے خارج کر دیا گیا ہے۔ لیکن ان سے کوئی پوچھے

کہ اہنسا کی خوبیاں اور ہنسا کی برائیاں بتانے سے کوئی اختلاف نہ پیدا ہوگا؟ اس "مہاتمیت" کے چھلکے کو اتار دیجیے تو نیچے سے صاف نظر آجائے گا کہ مقصد اصلی کیا ہے؟ مقصد یہ ہے کہ مذہبِ اسلام کی تعلیم جبراً روک دی جائے اور اس کے بجائے ہندومت کی تعلیم عام کر دی جائے۔

اعترافِ حقیقت تنہا اہنسا اور اسلامی تعلیم میں اتنا کھلا ہوا فرق ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب پچھلے دنوں جب واردھا اسکیم کے سلسلہ میں شملہ تشریف لائے تو انھوں نے اسکیم کے متعلق صندل ہال میں تقریر فرمائی۔ تقریر کے بعد ایک پرائیوٹ صحبت میں اُن سے اہنسا اور اسلامی فلسفۂ حیات کے متعلق کچھ سوالات کیے گئے تو انھوں نے دو ہی قدم پر جا کر کھلے الفاظ میں اقرار کر لیا کہ فی الواقع یہ غلطی ہے۔ اسلام کا فلسفۂ زندگی صرف اہنسا نہیں بلکہ ہنسا اور اہنسا دونوں کا امتزاج ہے۔ اب پتہ نہیں کہ جناب ڈاکٹر صاحب اس غلطی کا اعلان بھی فرماتے ہیں یا نہیں لیکن ہم تو بالکل واضح الفاظ میں اعلان کر دینا چاہتے ہیں کہ اسلام نرمی اور انکساری کے ساتھ ساتھ سختی اور درشتی کا بھی مذہب ہے۔ یہ جلال اور جمال کا مذہب ہے۔ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ بھی اسی خدا کا حکم ہے جس کا حکم رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ہے۔ فَاقْتُلُوْھُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ (فتنہ پردازوں کو جہاں پاؤ کچل دو) بھی اسی خدا کا ارشاد ہے، جس کا ارشاد فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا (معاف کرو اور درگذر کرو) ہے۔ مسلمان کو حکم یہ ہے کہ:-

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر ۔۔۔ شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گذر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاں سے ۔۔۔ گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

یہ ہے وہ تعلیم جو اُن بچوں کے شایانِ شان ہے جو تیغوں کے سائے میں پل کر جوان ہوتے ہیں۔ وہ کہ اہنسا کی خود فریبی۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ہندوستان میں مسلمان کی آج کیا حالت ہے۔ ہمیں تو اس سے غرض ہے کہ وہ مذہب جسے مسلمان خدا کا سچا مذہب سمجھتا ہے اس کی تعلیم کیا ہے۔

اب ذرا سماج کے علم کے ان دو ٹکڑوں کو ملائیے۔

(۱) تمام مذاہب، اسلام اور ہندومت۔ اصولی طور پر یکساں ہیں کسی کو دوسرے پر تفوق نہیں۔

(۲) فلسفۂ زندگی کے اعتبار سے اہسا کو ہمسا پر فضیلت ہے۔

فرمائیے نتیجہ کیا نکلا؟ اس پر اعلان ہو رہا ہے کہ یہ اسکیم مشترکہ تعلیم کی اسکیم ہے۔ اسے کسی مذہب کی تعلیم سے واسطہ نہیں۔ اللہ اکبر! کس قدر کھلا ہوا فریب!!

بنیادی نقش "سماج کے علم" کی ایک اور شق میں تحریر ہے کہ "تعلیم ایسی دی جائے جس سے بچے کے دل میں وطن کی محبت پیدا ہو۔ وہ ہندوستان کے پچھلے زمانہ کی عزت کرے" (رپورٹ ص۱۱۸)

بجا! مذہب کے اعتبار سے اسلام اور ہندومت یکساں۔

فلسفۂ زندگی کے اعتبار سے اہسا کو ہمسا پر فوقیت۔

اس کے بعد، ہندو مذہب اور ہندو فلسفہ کا جس عہد میں زور تھا اس زمانے کی عزت بھی بچے کے دل میں بٹھادی جائے۔

اس طرح متحدہ قومیت کی تشکیل ہوگی۔ الگ الگ مذہب کی تعلیم چونکہ لڑائی جھگڑے کا موجب ہوتی ہے اس لئے اہسا کے ودیا مندر میں اس کا گذر کیوں ہو؟ ان جھگڑوں کے مٹانے کا واحد علاج یہ ہے کہ تعلیم ایسی دی جائے جس کی رو سے ہندو فلسفۂ زندگی کی عظمت اور ہندو دورِ تہذیب کی عزت دلوں میں نقش ہو جائے۔ اسلام کے فلسفۂ زندگی کی مذمت اور اس فلسفہ کے علمبرداروں کی طرف سے دل میں نفرت پیدا ہو جائے۔ جھگڑے خود بخود مٹ جائیں گے۔ جھگڑے تو اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ہندو سمجھتا ہے کہ اسلام اور مسلمان صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لائق ہیں اور مسلمان ایسا سُن نہیں سکتا لیکن جب ہندو اور مسلمان دونوں بچے اس باب میں متفق اللسان ہوں گے کہ ہاں واقعی اسلام کا فلسفۂ حیات اور اس کے علمبردار انسانیت کے سب سے بڑے دشمن ہیں تو پھر جھگڑا کیسے پیدا ہوگا؟ جب سر ہی نہ رہے گا تو سر درد کہاں ہوگا؟۔

یہ ہے وہ "اندرونی روشنی" جو نوعِ انسانی کے اس "مصلحِ اعظم" کو براہِ راست "خدا" کی طرف سے ملتی ہے جس کے دل میں تمام مذاہب کے پیرووں کے لئے "جذبۂ ہمدردی" یکساں موجزن ہے! یہ اُس دیش کے مہاتما ہیں جس کے "ہیرو" کا سب سے بڑا کارنامہ یہ گنا یا جاتا ہے کہ جب وہ افضل خاں سے صلح و محبت کا معانقہ کرنے کے لئے آگے بڑھا تو زیرِ آستین تیز، نوکدار، آہنیں، پنجہ چھپا رکھا تھا جو اس دوست سے بغلگیر ہونے پر اس کے قلب و جگر میں پیوست کر دیا گیا۔ اس دیش کے مہاتما سے آپ کس قسم کے سلوک کی توقع رکھ سکتے ہیں!۔

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود گرچہ از آدمی بزرگ شود

جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے شملہ کی اس پرائیوٹ صحبت میں جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے فرمایا تھا کہ "پچھلے زمانے" سے ان کی مراد صرف ہندوؤں کا زمانہ ہی نہیں بلکہ اس میں مسلمانوں کا زمانہ بھی شامل ہے لیکن جب یہ عرض کیا گیا کہ مسلمانوں کے زمانہ میں تو اہنسا کے علمبردار ہی نظر آئیں گے۔ اس زمانہ کی عزت بچے کے دل میں کیسے بٹھائی جائے گی؟ تو انھوں نے فرمایا کہ اس زمانہ کے صوفیائے کرام کے حالات بتائے جائیں گے جنھوں نے اہنسا کے مطابق زندگی بسر کی ہے۔

ہم اس وقت اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتے کہ وہ حضرات جن پر حقیقی معنوں میں "اولیاء اللہ" کا لقب صادق ہوتا ہے، وقت آنے پر وہ کس طرح تسبیح و مصلّٰی کے ساتھ ساتھ شمشیر و سنان کو بھی عین اسلام سمجھتے تھے لیکن ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے اندر بھی خوبی صرف اسی چیز میں رہ گئی ہے جو ہندوؤں کے نظریۂ زندگی کے مطابق ہو۔ اسلام کا دوسرا حصہ یعنی مجاہدانہ حرارت کا شعبہ چونکہ اہنسا کے نظریہ کے مطابق نہیں ہے، اس لئے اس میں برائیاں ہی برائیاں ہیں۔ یہ ہے عملی تفسیر (یُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَ یَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ) کی یعنی قرآن کے اُتنے حصے پر ایمان جو اپنے نظریے کے مطابق ہو اور باقی حصہ سے انکار۔

باب سوم

زبان کا مسئلہ

اس کے بعد زبان کا مسئلہ آتا ہے۔"ہندوستانی" زبان نصاب میں لازمی رکھی گئی ہے(رپورٹ صفحہ ۱۲۳) زبان کا مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اسے ضمنی طور پر چھیڑا نہیں جاسکتا۔ یہ مضمون بہت طویل ہورہا ہے، اس لئے ایسے اہم سوال پر ہم کسی دوسری صحبت میں مفصل بحث کریں گے۔ انشاء اللہ۔ مگر اتنا یاد رہے کہ کسی قوم کی موت وحیات کا سوال اس قوم کی زبان اور اس کے رسم الخط سے وابستہ ہوتا ہے۔ مسلمان اُس کی اہمیت سے ناواقف ہیں۔ اور ہندو چپکے ہی چپکے وہ سب کچھ کیے جارہے ہیں کہ جب اس کے نتیجہ پر نگاہ پہنچتی ہے تو روح کانپ اٹھتی ہے کہ یا اللہ مستقبل قریب میں مسلمانوں پر یہاں کیا کچھ گذرنے والا ہے۔ اس وقت تو اتنا دیکھئے کہ ہندوؤں کی اس تحریک کا اثر کہ "ہندوستانی" زبان سے عربی وفارسی کے "غیر مانوس" الفاظ کو نکال دینا چاہیئے کس قدر سرعت سے پھیلتا جارہا ہے۔ رپورٹ زیر نظر میں انگریزی الفاظ تو جگہ جگہ آپ کو ملیں گے۔ مثلاً ٹریننگ، کورس، پالیسی، نارمل، ورنیکلر وغیرہ۔ لیکن عربی اور فارسی کے اُن الفاظ کے بجائے جنھیں سمجھنے میں کسی اردو داں کو بھی دقت نہیں ہوسکتی، ایسے الفاظ ٹھونسے گئے ہیں جنھیں، نہ عبارت کی روانی قبول کرتی ہے، نہ مذاقِ سلیم۔ حالانکہ بعض غیر عربی الفاظ بجائے خویش ایسے غیر مانوس استعمال کئے گئے کہ اردو دان طبقے نے شاید ہی کبھی سنے ہوں۔ مثلاً۔ نئی سماج کا ڈول ڈالے جس کی نیو ہمدردی پر رکھی گئی ہو۔ پچھم کے ملکوں میں۔ کسی مفید سیوا کے ذریعے۔ دھیرے دھیرے اتنی مشق ہوجائے۔ جس کی نیو . . . . نیائے پر رکھی جائے۔ . . وغیرہ۔ کہیئے کہ طرح ڈالنا، بنیاد، مغرب، خدمت، آہستہ آہستہ، انصاف ان میں کونسا لفظ ایسا ہے جو عام فہم نہیں؟ ان کی جگہ خواہ مخواہ "پوربیوں کی بولی" گھسیٹ لانا

اس بات کی کھلی کھلی غمازی کر رہا ہے کہ ہر بات میں ہندوؤں کی خوشنودی کا جذبہ کس قدر غالب آرہا ہے۔ یہ اگر "مرعوبیت" نہیں تو اور کیا ہے۔

باب چہارم

معاشرت

اب مقطع کا بند سنیئے۔ ارشاد ہے۔

"گانا۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ بچوں کو اچھے گیت یاد ہو جائیں اور انہیں اچھے گانے کی پہچان اور شوق ہو جائے۔ بچوں میں تال کا جو قدرتی احساس ہوتا ہے اسے ترقی دینے کے لئے انہیں دونوں ہاتھوں سے تالی دینا سکھایا جائے" (ص ۱۲۵)

آپ کو معلوم ہے کہ اچھے برے گانے کی پہچان کے لئے کس قدر راگ ودیا کی ضرورت ہوتی ہے، اور پھر سر تال سے سیکھنے کے لئے اور کیا کچھ سیکھنا پڑتا ہے۔ رقص و سرود ہندوؤں کی قدیم تہذیب کا ایک ضروری جزو ہے۔ ڈاکٹر ٹیگور کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ باوجود پیرانہ سالی کے ریش و فش نوجوان لڑکیوں کو ساتھ لے کر شہر بشہر ناچ اور گانے کا تماشا دکھاتے پھرتے تھے۔ اودے شنکر اور اس کی پارٹی رقص و سرود کے ذریعے "کرشن لیلا" کی یاد تازہ کرتے پھرتے ہیں۔ ہندو کنیا مہا ودیالوں میں راگ وغیرہ نصاب میں داخل ہے۔ لہٰذا اگر ہندو لڑکے اور لڑکیوں کے لئے راگ کا نصاب رکھا جائے تو انہیں عین مسرت ہوگی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ چودہ برس کی عمر میں مسلمان لڑکیوں کو راگ اور تال سکھا کر کیا بنانا مقصود ہے؟ حضرت اکبر مرحوم نے فرمایا تھا کہ

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر — خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں
دین دار متقی ہوں جو ہوں ان کے منصرم — استاد اچھے ہوں مگر استاد جی نہ ہوں

مسلمانو! ذرا غور سے دیکھو کہ آزاد ہندوستان میں جبری تعلیم کی رو سے آپ کی بیٹیاں اور بہنیں کس قسم کی تعلیم حاصل کیا کریں گی؟

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

نتائجِ مستخرجہ

علتِ مرض | یہ ہے مختصراً واردھا اسکیم جو مہاتما گاندھی کے مجلہ دماغ سے نکل کر جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی مساعیِ جمیلہ کے صدقے مسلمانوں کے بچے اور بچیوں کے لئے جبری تعلیم کا نصاب بننے والی ہے۔ شملہ میں اسکیم پر آخری مرتبہ غور و خوض ہو چکا ہے۔ اور اس کے بعد یہ نافذ العمل ہو جائے گی۔ مسلمانوں نے دیگر اہم مسائل کی طرح تعلیمی مسائل میں بھی ہمیشہ بے رخی برتی ہے جس کا نتیجہ ان کے سامنے ہے۔ لیکن وہ یاد رکھیں کہ اگر انھوں نے اس مرتبہ بھی ایسا ہی کیا تو پچاس برس کے اندر وہ دیکھیں گے کہ ان کا ہندوستان میں وہی حشر ہوگا جو سپین میں ہوا تھا۔ اور پھر یہ ڈھونڈیں گے کہ وہ قوم کیا ہوئی جو اپنے آپ کو مسلمان کہا کرتی تھی لیکن یہ سب باتیں فروعی ہیں۔ اصل نقص کہیں اور ہے۔ یہ تو یوں سمجھئے کہ یہاں پھوڑا نکل آیا۔ وہاں پھنسی ہو گئی۔ کہیں خارش نمودار ہو گئی۔ کہیں جنبل پھوٹ نکلا۔ یہ امراض نہیں ہیں بلکہ علاماتِ مرض ہیں۔ علتِ مرض یہ ہے کہ خون خراب ہو چکا ہے۔ ان پھوڑے پھنسیوں کا علاج مرہم سے نہیں ہوگا۔ خون صاف کر دینے سے ہوگا۔ یہ واردھا اسکیم، یہ مخلوط طریق انتخاب، یہ ہندی اردو کے جھگڑے، سب علاماتِ مرض ہیں۔ اصل مرض یہ ہے کہ ہندو ہندوستان میں ایک "متحدہ قومیت" بنانا چاہتے ہیں تاکہ مسلمان اپنی ملی خصوصیات کھو کر کانِ نمک میں پہنچ کر نمک بن جائیں۔ جب تک آپ اس بنیادی اصول کو پاش پاش کر کے نہ رکھ دیں گے آپ کے کسی مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔ مسلمان ہندوستان میں ایک الگ قوم کی حیثیت سے

رہے گا۔ اس کی الگ جماعتی زندگی ہوگی۔ اور جب قوم الگ ہوگی تو پھر اس کی زبان بھی اپنی ہوگی۔ تہذیب بھی الگ ہوگی۔ مذہب بھی الگ ہوگا اور تعلیم بھی الگ ہوگی۔ نہ ان کی مشترکہ قومیت ہوسکتی ہے اور نہ مشترکہ تعلیم۔ ہندوؤں سے کہئے کہ وہ اپنے بچوں کے لئے تعلیمی اسکیمیں تیار کرتے رہیں۔ انہیں کیا حق حاصل ہے کہ مسلمان بچوں کے لئے تعلیمی تجاویز سوچتے پھریں، اور پھر ان پر انہیں جبراً عائد کر دیں، اور اس طرح جو کام سوامی شردھانند نے اٹھایا تھا اور جو پروان نہ چڑھ سکا اسے مہاتما گاندھی پورا کر دیں۔

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

ہمیں یقین ہے کہ مسلمانوں کے لئے جو مہلک اثرات اس اسکیم کے اندر چھپا کر رکھے گئے ہیں، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی نگاہوں کے سامنے وہ بے نقاب ہوکر نہیں آئے اور انھوں نے اس کو محض سطحی اور عمومی نظر سے دیکھا ہے، ورنہ یہ باور کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا کہ جناب ڈاکٹر صاحب دیدہ و دانستہ ہندوؤں کی چھری سے یوں مسلمانوں کے بچوں کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کرنے پر تلے بیٹھے ہوں۔ خدا کرے کہ اس اسکیم کے ساتھ ان کی تائید غلط فہمی پر مبنی ہو، اور جس طرح انھوں نے شملہ میں اہنسا کے متعلق اپنی غلطی کو تسلیم کیا تھا، اسی طرح وہ باقی اسکیم کے متعلق تفصیلات بالا کی روشنی میں غور فرما کر اس سے اپنی بریت کا اعلان فرما دیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس اسکیم کا ان کے نام سے انتساب ملت اسلامیہ کا قتل نہیں تو اعانت قتل کے جرم سے انہیں کبھی بری نہیں قرار دے سکے گا۔

(تکملہ) یہ مضمون پریس میں جا چکا تھا کہ مہاتما گاندھی کا ذیل کا بیان اخبارات میں شایع ہوا۔

"مختلف طبقات و مذاہب کے بچوں میں رواداری اور دوستی کی جو روح پیدا ہو رہی ہے میں اس کے پیش نظر اس بات کو سخت مہلک و خطرناک سمجھتا ہوں کہ ان کو یہ سکھایا جائے کہ ان کا مذہب دیگر تمام مذاہب پر برتری رکھتا ہے یا جس مذہب کے وہ قائل ہیں ان کے نزدیک بس وہی مذہب سچا ہے۔ اگر یہ تفرقہ انگیز روح قوم میں سرایت کر گئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر فرقہ کا علحدہ

اسکول ہو جس میں ہر ایک کو دوسرے کی مذمت کرنے کی پوری آزادی حاصل ہو۔ یا پھر ایسی درسگاہوں میں مذہب کے تذکرہ کو بالکل ہی ممنوع قرار دیا جائے (اسٹیٹسمین ۷ جولائی ۱۹۳۸ء صفحہ ۱ کالم ۲) (نیز ہندوستان ٹائمز ۷ جولائی ۳۸ء)

دیکھ لیجئے جس چیز کی طرف ہم نے اپنے مضمون میں اشارہ کیا تھا وہ لفظاً لفظاً سامنے آگئی یا نہیں! اور ابھی آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا! جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں مہاتما گاندھی کا مسلک شیر کا مسلک نہیں جو بے نقاب گرجتا بپھرتا سامنے آجائے، بلکہ ان کا مسلک ہمیشہ گھات میں رہنے کا ہے، اور مسلمانوں کی تباہی کے معاملات میں تو وہ خاص طور پر شاطرانہ چالوں سے کام لیتے ہیں۔

پھر یہ بھی دیکھ لیجئے کہ جو کچھ مہاتما جی چاہتے ہیں وہ لفظاً لفظاً وہی ہے جو مولانا آزاد نے اپنی تفسیر میں پہلے ہی سے لکھ رکھا ہے اور اس طرح مہاتما گاندھی کے مقصد کے حصول کے لئے پہلے ہی سے زمین تیار کر چھوڑی ہے۔

اندازہ فرمائیے کہ جب مسلمان بچوں کو یہ سمجھا دیا جائے گا کہ دیگر مذاہب بھی اسلام کی طرح سچے اور خدائی مذہب ہیں تو پھر اسلامی توزمین کی حفاظت، اسلامی تمدن و تہذیب کی حفاظت اور اسلامی حقوق کی حفاظت کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ اگر صحابہ کرامؓ کو مذہب کا یہ فلسفہ معلوم ہوتا، اگر خالد بن ولیدؓ، عمرو بن العاصؓ اور سلطان صلاح الدین کو اپنے زمانہ میں کوئی گاندھی مل جاتا تو آج اسلام کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ یعنی سرے سے اسلام کا وجود ہی نہ ہوتا اور مسلمان بہت جلد اس کیمیاوی عمل سے تحلیل ہو کر فنا ہو جاتا۔ لیکن مہاتما گاندھی یا اور ہندوؤں کا کیا گلہ؟ ان کو تو مسلمانوں سے انتقام لینا ہے اور اس کے لئے وہ ہر حربہ استعمال کریں گے۔ رونا تو آتا ہے ان مسلمان اکابر پر جو ان کے مقاصد کے حصول میں اس قدر "جہاد عظیم" میں مصروف ہیں۔ از باغباں شد است کہ صیاد نہ آں کرد۔

معرکۂ اسلام و جاہلیت

بَدَءَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَّسَیَعُوْدُ غَرِیْبًا

(۶)

از جناب مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی

جنگ و جہاد اور صلح و معاہدہ کے متعلق اسلامی تعلیمات کی اخلاقی رفعت، حدود نظر سے آج بھی اسی قدر ماورا ہے جس قدر قرونِ مظلمہ میں تھی۔ آج کسی مہذب ترین سلطنت سے کہو کہ دشمن سے اس وقت بھی صلح کرنے میں پس و پیش نہ کرو جب وہ مغلوب اور تم غالب ہو، امن پسندی اور انسانیت کا تقاضا ہے کہ حریف کو تم خود اس وقت صلح و آشتی کی دعوت دو جب اس کے بازو تھک کر چور ہوچکے ہوں، اس کی جنگی تدبیریں نامراد اور حوصلے پست ہو رہے ہوں، اور فتح و کامرانی ہر طرف سے تمھیں کو ڈھونڈھ رہی ہو، پھر جب تم اس سے صلح کرلو اور تمھارے درمیان معاہدہ ہوجائے تو خبردار مدتِ معاہدہ ختم ہونے سے پہلے اس کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی نہ کرو، حتی کہ اگر تمھارے عزیزوں، قرابت داروں، اور دینی بھائیوں کے خلاف بھی وہ دشمنِ معاہد صف آرا ہو اور معاہدہ ان لوگوں کی حمایت اور مدافعت کرنے کی اجازت نہ دیتا ہو تو تم معاہدہ کی حرمت پر سب کچھ قربان کردو کہ دنیا کی ساری متاع کھو کر انسان کچھ نہیں کھوتا، مگر اخلاق اور انسانیت کھو کر سب کچھ کھو دیتا ہے۔ یہ باتیں سن کر آج اس سطح ارض پر بسنے والی کوئی "متمدن" قوم تمھیں سلیم العقل اور باہوش انسان تسلیم کرنے

کے لئے تیار نہ ہوگی۔ اس کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ شکست کھانے والا فریق صلح و مسالمت کی پیش کش کیسے تو کرے لیکن فاتح اور غالب سے یہ توقع کس طرح کی جا سکتی ہے؟ اونچے سر کا جھکنا کس قدر عجیب بات ہے!

آج تم ہر دنیوی مقصد کے لئے تلوار اٹھا سکتے ہو اور انسانی خون بہا سکتے ہو۔ تمھارے لئے جائز ہے کہ چین کو افیون کھلانے کے لئے فوجیں لے کر چڑھ جاؤ۔ تم اپنی سلطنت کے راستوں کی حفاظت کے لئے جبرالٹر سے ہانگ کانگ تک ہر ملک اور ہر قوم کو غلامی کی زنجیریں پہنانے میں حق بجانب ہو، اور اس غرض کے لئے فلسطین کی سرزمین کو لالہ زار بھی بنا سکتے ہو۔ تمھیں اس کا بھی حق ہے کہ خام پیداوار حاصل کرنے اور اپنی تجارت کے لئے نئی منڈیاں تلاش کرنے کے لئے جس ملک پر چاہو حملہ کر دو۔ تم وطن اور قوم اور بادشاہ کے نام پر بھی لڑنے کے حق دار ہو۔ لیکن اگر تم نے خدا کے نام پر تلوار اٹھائی اور زمین میں خدا کا کلمہ بلند کرنے کے لئے جنگ کی تو تم سے بڑھ کر وحشی، مذہبی دیوانہ، خونخوار درندہ اور کوئی نہیں۔ یہ ہے جاہلیت جدیدہ کا فلسفۂ جنگ!۔

آج تم (نعوذ باللہ) خدا کی الوہیت و حاکمیت کا انکار کر دو، جاہلیت تم پر مرحبا و آفریں کے پھول برسائے گی۔ نبوت، وحی اور شریعت کا استخفاف کرو، تہذیب تمھیں مدبر، مفکر، فلسفی اور حکیم کا خطاب دے گی۔ دامن عفت و انسانیت کے پرزے اڑا دو زمانہ تمھیں روشن خیالی کا دیوتا کہہ کر پکاریگا۔ لیکن اگر تم نے وطنیت اور قومیت کے بتوں کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو پھر تم اپنی بخشش کیلئے کوئی راہ نہیں پا سکتے۔ کفار قریش نے نبی صلعم سے متعجبانہ گلہ کیا تھا کہ اپنی قوم کا خون بہا کر تم کیونکر سرخرو ہو سکتے ہو۔ عبد اللہ ابن اُبَی حیرت سے بے خود اور فرط غیظ سے بے تاب تھا کہ مکّے سے آئے ہوئے غیر ملکی ہماری یثربی قومیت اور وطنیت کی بے حرمتی کر کے کس طرح بھائی کو بھائی سے لڑا رہے ہیں۔ لیکن آج جبکہ علم و حقیقت کی کرنیں دورِ جاہلیت کی تمام جہالتیں آشکارا کر چکی ہیں اور تہذیب زمانہ ہر اس چیز کو جس پر قدامت کا "داغ" لگا ہوا ہے مردود قرار دے کر ان جہالتوں

پر مغرورانہ ہنسی ہی ہے، آپ کو معلوم ہے کہ داعی اسلام کا سب سے بڑا قصور اور (نعوذ باللہ) وحشیانہ فعل کیا ہے؟ اس کا جواب فرانس کے مشہور ادیب سیاست داں والٹیر کی زبانی سنیے۔ نہایت متعجب ہو کر کہتا ہے۔

"سیل وغیرہ کو آخر عرب کے اس شتربان (روحی فداہ) میں عظمت کا کونسا پہلو نظر آیا؟ قوم نے اسے سردار منتخب کیا ہوتا یا اپنے ملک اور وطن کی حمایت میں اس نے اغیار سے جنگ کی ہوتی تو خیر ایک بات بھی تھی لیکن جو شخص خدا کے نام کو آڑ بنا کر خود اپنے ملک والوں سے جنگ کرے، اسے کوئی اچھا کس طرح کہے!"

"نئی روشنی" اور "پرانی جہالت" کا موازنہ کر کے نتیجہ نکال لیجئے۔

زمانہ کے موجودہ نظام معاشرت کو دیکھتے ہوئے ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ اسلام کے معاشرتی نظریات اور تصورات سے کس قدر متوحش اور بیگانہ ہو گا۔ سوسائٹی کا اسلامی نظام عفت، عصمت، حیا، پاکیزگی اور اخلاق کی بنیادوں پر رکھا گیا ہے۔ مرد و عورت کے فرائض ان کی فطری خصوصیات کے مطابق الگ الگ متعین کئے گئے ہیں، کیونکہ ان میں سے ایک سراپا فعل ہے، دوسرا مجسم انفعال۔ گویا یہ دونوں صنفیں ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں جو ایک خاص تعامل کے ذریعہ نظام انسانی کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ مرد کو اس گاڑی کا نگراں بنایا گیا ہے۔ انسانی ترقی کا راز انہیں دو قوتوں کے باہمی تعاون اور فرائض خصوصی کے امتیاز پر منحصر ہے۔ اسی بنیادی تخیل کے ماتحت نکاح، طلاق، پردہ، تعدد ازدواج وغیرہ کے احکام قرآن نے بنی نوع انسان کو دیے ہیں، جن کے اندر انسان کی تمام فطری مصلحتوں کا نہایت حکیمانہ انداز میں لحاظ رکھ کر انسانیت کو ہمیشہ کے لئے حیوانیت کی دست برد اور نفسانیت کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ کر دیا گیا ہے لیکن جاہلیت جدیدہ ان حکمتوں کو سمجھنے کے لئے کب تیار ہے۔ وہ تو ان تمام قیود کو دور وحشت کی یادگار بتاتی ہے اور انصاف و مساوات کے نام پر عورت کو "ترقی کے میدان"

یں لا کھڑا کرتی ہے۔ ایک طرف مرد و عورت کے خلقی فرق کو بھی تسلیم کرتی ہے، دوسری طرف انہیں ایک ہی اسٹیج پر بھی لا کھڑا کرتی ہے۔ نکاح اور پردے کی قید کو انسانیت کی توہین بتلاتی ہے، اور عورت کے تمام فطری امتیازات کو اٹھا کر، مرد کو قوّامیت سے معزول کر کے، آزادیٔ نسواں کا وعظ کہہ کر، اباحت اور ہوس رانی کا وہ مہیب جہنم زار بنا رہی ہے جس میں آج سارا عالم انسانیت جل جل کر خاکستر ہو رہا ہے۔ اور جاہلیت کی سحر آفرینی ملاحظہ ہو کہ عصمت و اخلاق اس کے نزدیک محض بے معنی الفاظ ہیں۔ آج تجدد اور روشن خیالی کی دنیا میں بھائی بہن کے درمیان حرمت کے پردے نہ صرف عملاً بلکہ اعتقاداً بھی اٹھ چکے ہیں۔ آزاد محبت (Free Love) اس کے صنفی تعلقات کا اصل الاصول ہے۔ اس کا اعلان ہے کہ "بیوی سب کی بیوی اور شوہر سب کا شوہر ہے" اور "جس لڑکی پر کسی نوجوان کی نظر انتخاب پڑے وہ بلا حیل و حجت اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دے"۔ اس کا خیال ہے کہ نفس کی تسکین کا ہر ممکن ذریعہ انسان کے لئے ذریعہ سعادت ہے۔ ایک روسی مصنف اپنے ایک ناول میں لکھتا ہے:۔

"شراب خوری اور زنا کوئی قابل شرم چیزیں نہیں ہیں۔ گناہ کوئی چیز نہیں۔ محبت کرنا، خوب پینا اور عورت کا تعاقب کرنا خاصۂ مردانگی ہے، ایک فطری جذبہ ہے اور فطری جذبہ گناہ نہیں ہو سکتا۔"

لیکن یہ نہ سمجھو کہ جاہلیت کے کمال ارجمندی کا یہ سب سے اعلیٰ شاہکار ہے۔ نہیں، اور آگے چلو۔ اور علم و تمدن کے عین مرکز میں پہنچ کر اس صنفی انارکی اور اخلاق و انسانیت کی تباہی کا اندازہ کرو۔ اسی بیسویں صدی کی تیسری دہائی کا واقعہ ہے کہ جرمنی کا ایک فاضل ڈاکٹر ہرشفلد (Herschfeld) اس نظریہ کی حمایت کے لئے اٹھا جس پر آج سے چار ہزار برس پہلے حضرت لوط کی قوم عمل پیرا تھی، اور اس نے چند سال کی مسلسل تبلیغ سے رائے عام کو اپنا ہم نوا بنا لیا، یہاں تک کہ جرمن پارلیمنٹ میں کثرتِ آراء سے عملِ قوم لوط ایک جائز قانونی فعل بن گیا۔ چار ہزار برس کی ترقی سے پرانی جاہلیت اور نئی جاہلیت میں اگر کوئی فرق ہوا

تو وہ صرف اس قدر تھا کہ حضرت لوط کی قوم عام لائسنس کی قائل تھی، مگر جرمن پارلیمنٹ نے اس کام کے لئے یہ شرط لگانی ضروری سمجھی کہ فاعل و مفعول کے درمیان عمر کا تناسب ملحوظ رکھا جائے، اور غیر فطری تعلقات قائم کرنے سے پہلے مفعول کے والدین سے اجازت لے لی جائے!

آج کل دنیا کی سب سے مشکل مسئلہ معاش کا ہے۔ اقوام متمدنہ کی اکثر علمی و فکری صلاحیتیں اسی پیٹ کی چاکری میں لگی ہوئی ہیں اور قریب قریب تمام مسائل حاضرہ اسی محور کے گرد گھوم رہے ہیں لیکن انسانی فکر ونظر کی یہ کیسی عبرتناک کوتاہی ہے کہ وہ اپنی پیہم کوششوں کے باوجود اپنے اس اہم معاشی مسئلہ کی گتھی اب تک نہ سلجھا سکی اور آج نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ جس انسان کو خدا کے نام پر اکٹھے ہونے کا حکم دیا گیا تھا وہ روٹی کے نام پر امتیں بنا رہا ہے، معاشی طبقات کے درمیان جنگ کا صور پھونکا جا رہا ہے، وَيَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ کی حکیمانہ سنت ربانی کو باطل کرنے پر تلا ہوا ہے، اور اس طرح اپنی معاشی ابتری اور اجتماعی بدحالی کی جڑوں کو اپنی نادانی کی وجہ سے اور زیادہ مضبوط کیے چلا جا رہا ہے۔ اسلام تحریم ربوٰا اور فرضیت زکوٰۃ کا اٹل اور عادلانہ نظام پیش کرکے ان تمام مصائب اور مشکلات رزق کا بہترین حل بتا چکا ہے جنھوں نے عقل جدید کو حیرانی میں ڈال رکھا ہے۔ مگر یہ عقل جدید! اس کو جاہلیت کی غلامی نے ایسا اندھا بنا دیا ہے کہ اسے بے روزگاری، معاشی کساد بازاری (Economic Depression) ہڑتالیں، ہنگامے، کشت وخون، انقلابی بحران، اشتراکی انقلاب، مزدوروں کی ڈکٹیٹرشپ، سوسائٹی کے نظام کی برہمی، اخلاقی انحطاط، اباحت مطلقہ اور حیوانی بے قیدی، سب کچھ قبول، مگر یہ قاعدہ کلیہ قبول نہیں کہ سود حیاتِ اجتماعی کے لئے بدترین لعنت ہے اور زکوٰۃ ہی میں انسانی جماعت کے لئے حقیقی فلاح ہے۔ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ کی فطری صداقت جس طرح ۱۳ سو برس پہلے عرب کے جاہل بدو کی سمجھ میں نہ آتی تھی، اسی طرح آج بیسویں صدی میں بھی وہ معاشیات کے ایک ڈاکٹر کی کھوپری میں نہیں آتی۔ یہ بھی اسی چکر میں پھنسا ہوا ہے جس میں عرب کا جاہل سود خوار پھنسا ہوا تھا کہ اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا۔

اس کا دماغ بھی اس وسیع نظریہ کے لئے اپنے اندر کوئی سمائی نہیں رکھتا کہ سود سے انسان کی اجتماعی دولت گھٹتی ہے اور زکوٰۃ سے ترقی کرتی ہے۔

معاش کے بارے میں جاہلیتِ جدیدہ کو ایک اور نظریہ اپنے اسلاف سے ملا ہے۔ عرب کا وحشی بدو اپنی اولاد کو کمی رزق کے خوف سے قتل کر ڈالتا تھا۔ آج نئی روشنی اور تہذیب کا امام بھی یہی کر رہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ اس جہالت کو علم و فلسفہ کے لباس میں لپیٹ کر دنیا کی مسحور نگاہوں کے سامنے پیش کرتا ہے، اور دنیا اس کو بدو کہنے کے بجائے ڈاکٹر کہتی ہے۔ بدو اور اَن پڑھ انسان نے یہی جرم کیا تو تہذیبِ حاضرہ کی زبان لاحول پڑھتے پڑھتے خشک ہوگئی، اس کی یہ جاہلانہ حرکت "قتل اولاد" تہذیب جدیدہ کی نظر میں سب سے بڑی وحشت تھی۔ مگر جب وہی جاہلانہ تخیل خود اس نے پیش کیا تو تمدن کا ذوق ارتقا اس پر عش عش کرنے لگا اور اب جاہلیت کا نام برتھ کنٹرول رکھ دیا گیا۔ یورپ تو یورپ اب ہندوستانی حریت کے ٹھیکیداروں کو بھی آبادیٔ ہند کی روز افزوں کثرت سے فکر دامنگیر ہوگئی ہے اور وہ بھی اپنے استادوں کی پیروی میں خدا کی رزاقیت کا درد اپنے سر میں محسوس کرنے لگے ہیں۔ کس کی ہمت ہے کہ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ کی غریب صدا ان کے کانوں تک پہنچائے؟ اور آخر کس توقع پر؟

تہذیب جدیدہ کے بنیادی اصول کا یہ ایک سرسری خاکہ ہے۔ تم اگر چاہو تو اپنی نگاہ تصور میں اس اجمالی داستان حقیقت کو اور پھیلا لو اور بیک نظر اس نظام تہذیب کے ایک ایک خط و خال کو دیکھو جو سیف و قلم کی متحدہ حمایت کے زیر سایہ بسیط ارض پر چھایا ہوا ہے۔ کیا تمہیں ــــ بشرطیکہ تمہاری نگاہ مرعوب نہ ہو ــــ اس پورے خاکہ میں جاہلیت کے نقوش کے علاوہ کچھ اور نظر آ سکتا ہے؟ لیکن ہاں غلطی ہوگی اگر جاہلیت حاضرہ کو کسی قدیم جاہلیت کے ساتھ مشابہت دی جائے، یا اس بیسویں صدی میں اسلام کو صرف اتنا ہی غریب کہا جائے جتنا وہ تاریخ عالم کے کسی پچھلے دور میں تھا۔ آج کا معرکۂ اسلام و جاہلیت صرف یہی نہیں کہ ساڑھے تیرہ سو برس کے قدیم تاریخی صفحات کو دہرا رہا ہے بلکہ "حسن دشمنی"

کے دور میں وہ تمام تاریکیاں جمع ہوگئی ہیں جنھیں نفس کی شیطانی قوت ابتدائے آفرینش سے اب تک پیدا کرسکی ہے۔ آج حق و باطل کے موجودہ تصادم میں باطل کے پیکر پر وہ تمام اسلحہ سجے ہوئے ہیں جنھیں نئی اور پرانی تمام جاہلیتیں مل کر ایجاد کرسکی ہیں۔ فرعون کا افساد فی الارض، قوم ثمود کا علو و استکبار، اہل مدین کا تجارتی و کاروباری مکر و فریب، قوم لوطؑ کا فاحشہ، قوم شعیب کا مذہبی تصور انفرادیت، کفار عرب کا نظریۂ حیات، غرض کونسی جاہلیت ہے جو اس دور میں موجود نہیں اور اسلام کا کونسا پہلو ہے جس کی غرابت میں شک کیا جائے۔

دوسروں کے نقطہ ہائے نظر کا جائزہ تو لے چکے۔ آئیے ذرا اب اپنے جیب و دامن کو بھی ٹٹولیں کیونکہ یہ تلخ داستان نامکمل رہے گی اگر اس کے اُس سب سے زیادہ دردناک پہلو کا ذکر نہ کیا جائے جو ہم اسلام کے نام لیواؤں کی بدولت نمایاں ہو رہا ہے۔ یقیناً یہ حقیقت نہایت ہی جانگداز ہے لیکن ہے حقیقت اور حقیقت کا وجود ہمارے آپکے انکار سے معدوم نہیں ہوسکتا۔ اغیار کی مادہ پرست اور جہل آشنا نگاہیں اگر اسلام کے روحانی حسن اور عقلی جمال کو نہیں دیکھ پاتیں تو اس کا گلہ ہی کیا کہ وہ تو ہیں ہی کور ذوق اور نامحرم ہاں ماتم اگر ہے تو اپنوں اور یگانوں کا۔ ہمیں غیر مسلموں کو یہ طعنہ دینے کا کیا حق کہ اسلام جیسا عقلی و فطری مذہب ان کی نظروں میں "غریب" دکھائی دے رہا ہے، جبکہ خود پیروان اسلام کے اقوال و افعال سے اس کی غرابت کا دن رات ثبوت بہم پہنچ رہا ہو۔ اور یہ لازمی نتیجہ ہے مسلمانوں کے اس سیاسی اختلال اور فکری جمود کا جس کی طرف ہم کہیں اوپر اشارہ کرچکے ہیں۔ دنیا کی زمام قیادت جب قرآنی تہذیب کے ہاتھوں سے نکل کر جاہلیت اور مادیت کے ہاتھوں میں چلی گئی تو فطرۃً مسلمانوں کی فعال ذہنیت اسکوہ جاہلیت سے مرعوب و متاثر ہونے لگی، اور اس مریض جسم کی طرح جو اپنی قوت کھو کر ہر بیماری کو قبول کرنے کے لئے تیار رہتا ہے، پیکر اسلامی جاہلی امراض کا آماجگاہ بن گیا۔ اس کے منفعل قویٰ جاہلی اوہام اور غیر اسلامی افکار و تصورات کے سانچے میں ڈھلنے لگے خواہ ان کا تعلق قدیم جاہلیتِ عرب و ہند سے

ہو یا جدید جاہلیت روم و فرنگ ست۔

توحید و معاد کے نظریات کا وجود کیا مشرکین عرب میں نہ تھا؟ یا دیگر اقوام ضالہ اس اعتقاد سے خالی تھیں؟ لیکن پھر بھی قرآن نے انہیں خدا اور یوم آخر کا منکر کیوں کہا؟ بات صرف اتنی ہی تو تھی کہ ان کا اقرار انکار کے ہم معنی تھا۔ وہ زمین و آسمان کا خالق اور حاکم علی الاطلاق تو خدا ہی کو مانتے تھے لیکن نگاہ میں پستی اور تنگی تھی، اس لئے اس کی قدرت، عظمت اور کبریائی کا معیار دنیوی سلاطین کے اقتدار کو ٹھیرا تے تھے۔ وہ دیکھتے کہ دنیا کے عام بادشاہوں کے دربار میں تقرب حاصل کرنے کا واحد ذریعہ امرائے دربار اور اعیان حکومت کی رضا جوئی ہوا کرتا ہے اور مراحم خسروی کا طالب پہلا سجدہ انہیں درباریوں کو کرتا ہے۔ اس پر قیاس کر کے ان تنگ نظر جاہلوں نے تصور الوہیت کو بھی بشریت کا نقاب اڑھا دیا اور ہر پیر اور ولی کو اس کا درباری مان کر پوجنا شروع کر دیا کہ خدا کے دربار میں یہ ہماری شفاعت کریں گے۔ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَا اِلَی اللّٰهِ زُلْفٰی ان کے مشرکانہ تخیل کا سنگ بنیاد تھا۔ ظاہر ہے کہ اس تخیل کے ماتحت توحید اور قیامت کے عقائد بلحاظ نتائج بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ایسے جاہلانہ تخیلات مختلف بھیسوں میں انسانی دماغوں پر چھائے ہوئے تھے۔ کوئی اوتار اور حلول کے وہم میں گرفتار تھا۔ کوئی (معاذ اللہ) خدا کی بیوی بچوں کی پناہ ڈھونڈھ رہا تھا۔ کوئی اس کے بیٹے کے خون سے اپنے اعمال کی سیاہی دھو کر بے فکر بیٹھا تھا۔ کوئی نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ کے خواب گراں میں مست انگڑائیاں لے رہا تھا۔ جاہلیت کی ایک روح نہ معلوم کتنے قالبوں میں چھپی ہوئی زمین کے دامن پر اپنے قدم جمائے بیٹھی تھی کہ قرآن کی صدائے غریب نے ان سب خیالات کی تکفیر و تضلیل کر کے الوہیت اور قیامت کا وہ عقلی اور ٹھیٹھ فطری نظریہ پیش کیا جس کی تفصیل قرآن کے صفحوں میں اب بھی اسی طرح محفوظ ہے جس طرح عہد رسالت میں تھی۔ مگر بتائیے تو سہی آج اہل قرآن کے ذہنوں میں بھی ان بلند حقائق کا وہی نقشہ موجود ہے جو خیر القرون میں تھا؟ پتھر کے مجسموں کا پجاری گمراہ تھا، جاہل تھا، کج فطرت اور طاغوت پرست

تھا، مگر یہ مزاروں پر پیشانیاں رگڑنے والا، یہ اہل قبور سے حاجتیں مانگنے والا اور یہ "یا حضرت فلاں" کی جے لگانے والا مسلمان کتنا راست کیش، کتنا سلیم الفطرت اور کتنا وسیع الدماغ ہے؟ عرب کا جاہل شفاعت اور تقرب کی خاطر غیر اللہ کو پوج کر اگر بندۂ جاہلیت کہلایا تو انہیں تاویلوں کے ساتھ رسول پرست، ولی پرست، امام پرست اور پیر پرست مدعیانِ اسلام کو کس کا بندہ کہا جائے؟

انبیاء کے متعلق جاہلیت کا مستقل نظریہ یہ رہا ہے کہ بشر خدا کا رسول نہیں ہو سکتا۔ اور اس جاہلی نظریے نے خدا کے ہر نبی پر دو طریقوں سے حملہ کیا ہے۔ جب کوئی نبی مبعوث ہوا تو اس پر پہلا حملہ اس شکل میں کیا گیا کہ تم بشر ہو، اور بشر خدا کا رسول نہیں ہو سکتا، اس لئے تم رسول نہیں ہو۔ پھر جب نبی اپنے کارناموں کی دھاک بٹھا کر دنیا سے رخصت ہو گیا تو جاہلیت نے پینترا بدل کر دوسرا حملہ اس طرح کیا کہ وہ چونکہ رسول تھا اور بشر خدا کا رسول نہیں ہو سکتا، لہٰذا وہ بشر نہ تھا۔ یہود نے اسی طریقہ سے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا دیا اور نصاریٰ نے اسی ہتھیار سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر حملہ کر کے انہیں ابن اللہ بلکہ اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ الْمَسِیْح کے مقام تک پہنچا دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی جاہلیت کا پہلا اعتراض یہی تھا کہ بشر خدا کا رسول کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس اعتراض کے جواب میں خداوند عالم نے بار بار باصرار فرمایا کہ رسول جب ہوگا بشر ہی ہوگا۔ لیکن آج ہمارے علم و عرفان کے مناروں سے صدا بلند ہوتی ہے کہ ہاں بشر خدا کا رسول تو ہو سکتا ہے مگر خدا کا آخری رسول بشر نہیں تھا اور آنحضرت صلعم کو جو بشر کہے وہ مسلمان نہیں۔ اس صدا پر قرآن کی روح مضطرب ہو تو ہوا کرے، مگر جاہلیت کی روح اپنی دیرینہ تمنا سے ہم آغوش تو ہو گئی۔

قرآن نے جب ہمیں منکرینِ اسلام کا یہ عجیب نظریہ بتایا کہ ہدایت کا معیار صرف دنیوی وجاہت اور تمکن فی الارض ہے تو ہم متحیر تھے کہ انسان اتنا پست نظر اور نادان بھی ہوتا ہے! مگر قدرت نے اعجاز نمائی کی یہ تصویر آج واقعیت کے پردے پر دکھلا دی، چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارا ایک حکیم امت علی الاعلان اسی نظریہ کو پیش کر رہا ہے۔ اس کے نزدیک ملحد فرنگی اللہ کا خلیفہ اور اس کا محبوب ہے، ہدایت یافتہ اور

حق پرست ہے محض اس وجہ سے کہ اس کے پاس مال و زر ہے، تاج و تخت ہے، دنیوی اقتدار اور مادی قوت ہے، اور اسے تمکن فی الارض حاصل ہے لیکن مسلمان بے دین ہے، باطل پرست ہے، ہدایت نا آشنا ہے، خدا کا مغضوب اور نافرمان ہے، کیونکہ وہ مفلس ہے، قلاش ہے، غلام ہے، محکوم ہے، کمزور اور ضعیف ہے کوئی شخص اگرچہ کتنا ہی پاک طینت اور متقی ہی مگر برسرِ ہدایت ہونے کے لئے سند میں جو چیز پیش کی جاسکتی ہے وہ نورِ نبی کی روشنی اور فاران کی تجلی نہیں ہے بلکہ فرعون کا تاج و تخت اور ابولہب کا مال و زر ہے۔ یہ حکیم وقت جب بے نوا مسلمانوں کو دیکھتا ہے تو آقائے فرنگ کی زبان سے وہی کہتا ہے جو عرب کے جاہلوں نے ۱۳۵۰ برس پیشتر کہا تھا کہ اَهٰؤُلَاءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۝

اسی طرح جاہلیت اولیٰ کی جن مردہ سنتوں کو مسلمانوں نے زندہ کرکے اپنے نظامِ مذہب میں داخل کرلیا ہے ان میں سے ایک سنت ظاہر پرستی اور آبا پرستی کی ہے جس سے قدرتاً فرقہ پرستی پیدا ہوئی۔ قدیم جاہلیت میں قرآن کی ہر سچائی اس لئے ناقابلِ قبول تھی کہ اہل عرب کے آباؤاجداد سے وہ منقول نہ تھی۔ جو لایعنی رسوم باپ دادا کی وراثت میں ملی تھیں وہی اصل دین سمجھی جاتی تھیں۔ ہر ایک اپنی رسموں کو دانت سے پکڑے ہوئے تھا، انھیں کو سچائی اور ہدایت سمجھے بیٹھا تھا، اپنے کو سچا اور تمام دوسرے گروہوں کو گمراہ یقین کرتا تھا۔ وَكُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ میں ان کی اسی جہالت کی طرف اشارہ ہے۔ ان کے ہاں اصل چیز مظاہر تھے، معانی سے انھیں کوئی بحث نہ تھی۔ مظاہر کی کسی تبدیلی کو دین کی موت خیال کرتے۔ تحویل قبلہ کے وقت اس جاہلانہ ذہنیت نے جو ہنگامہ بپا کیا اس سے کون ناواقف ہے؟۔ آج کی جاہلیت میں وہی ٹریجڈی پھر دہرائی جارہی ہے۔ اسلام کے پیرو وہی رسم پرستی اور فرقہ پروری پر جتھے بنا رہے ہیں۔ وحدتِ اسلامی اسی آبا پرستی پر قربان کی جارہی ہے۔ اکابر کے اقوال و افعال معیارِ صداقت قرار پا رہے ہیں۔ دین کی رگ جاں پر چھری چل جائے

تو کچھ نہیں بگڑتا مگر مظاہر کی ادنیٰ سی تبدیلی میں اسلام کی ہلاکت اور ایمان کا زیاں تبلایا جا رہا ہے۔ ہر نئی یا غیر
چیز جو کتاب آبا میں موجود نہیں، باطل اور ضلالت ٹھیرائی جا رہی ہے۔ نیکی اور تقویٰ کو کوئی نہیں پوچھتا
مگر ظواہر کی حفاظت میں ـــــ خواہ وہ نماز میں ہاتھ اٹھانے اور نہ اٹھانے ہی تک کیوں نہ محدود ہو ـــــ
خونِ مسلم تک کی حرمت پامال کر دی جاتی ہے۔ کوئی ایک جماعت نہیں جو اس جہل میں مبتلا ہو۔
پوری امت اسی کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ کی لعنت اوڑھے ہوئے ہے۔ اور کوئی نہیں جو خدا کے
بندوں کا ماتھا جاہلیت کے آستانہ سے اٹھائے۔

مذہب کی وہ حقیقت بھی جو مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ کے ذریعہ بتلائی
گئی تھی اسی تنگ نظری اور جاہلی تصورِ مذہب سے دوچار ہے جس نے ابتدائے اسلام میں اس سے ٹکر لی تھی۔
اسلام نے جب مذہب کو رسوم کے نرغے اور معبد کے گھیرے سے نکال کر سیاست، حکومت، معاشرت،
معیشت، خانگی تعلقات، انفرادی اعمال اور اجتماعی افکار و معاملات تک پھیلا دیا تو انسان اس
وسعت و ہمہ گیری کے خلاف بغاوت کر بیٹھا، کیونکہ اس طرح اباحت نفسانی کے تمام دروازے
بند ہوئے جا رہے تھے۔ بعینہٖ یہی نفسیاتی رکاوٹ آج ہم مسلمانوں کو درپیش ہے۔ اِس وقت جاہلیت نے
زندگی کا جو میدان دنیا کے سامنے تیار کر رکھا ہے اس میں دوسروں سے بازی لے جانے میں اسلام کا
یہی نظریۂ مذہب سخت رکاوٹ پیدا کر رہا ہے، لہٰذا مسلمانوں نے نہ صرف تجدد کے بالاخانوں پر بلکہ
خانقاہ کے تاریک حجروں میں بھی مذہب کا مثلہ کرنا شروع کر دیا۔ عرصۂ حیات کے ایک ایک گوشے سے
مذہب کے دامن کو سمیٹا جا رہا ہے اور بوالعجبی دیکھیے کہ اسلام کی عالمگیری کے ادعا ہی سے اس کی عالمگیری
کی نفی کی جا رہی ہے۔ اس فریب یا خود فریبی کو چھپانے کے لئے کہیں "عالمگیر صداقت" کا خوشنما نقاب
تیار کیا گیا ہے اور ارشاد ہوتا ہے کہ "اسلام چند عالمگیر سچائیوں کا نام ہے۔ اسے مٹنے کا کوئی خطرہ نہیں،
وہ ہر قالب میں زندہ رہ سکتا ہے۔" اور کسی طرف سے یہ حکیمانہ آواز آتی ہے کہ مذہب کو دنیوی معاملات

کے ہر شعبے پر حاوی کرنا اس کے عالمگیر موقف کا انکار کرنا ہے" مغرب زدہ مسلمان ابھی صرف اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ "سیاست اور معاشرت وغیرہ کو مذہب سے کیا تعلق"، کہ معارف پرور ائمہ دین نے اعلان کر دیا کہ "نہ صرف یہی بلکہ ایمان بالرسالت بھی چنداں ضروری نہیں"۔ پھر اسی کوتہ نظری نے ہم ہی مسلمانوں سے یہ کہلا کر کہ اسلام کا کوئی مخصوص تہذیب و تمدن نہیں، حدیث کا انکار کرایا تاکہ قرآن کے اصول کو جس طرح چاہیں توڑ مروڑ کر جاہلیت کے قالب میں ڈھال لیں، اور جب نوجوان مسلمان اشتراکیت کے فریب میں آکر کارل مارکس کا کلمہ پڑھنے لگیں تو یہ کہنے میں باک نہ ہو کہ "خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں کا مستقبل روشن ہے کیونکہ مسلم نوجوان اشتراکیت کی طرف آ رہے ہیں"۔

یہ اور اسی قسم کی صدہا آوازیں اسلام کے نام سے بلند ہو رہی ہیں، اُسی اسلام کے نام سے جو ایک جزئی و مسئلہ قصاص بیان کر کے کہتا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ — ہاتھ کے بدلے ہاتھ کاٹنے کا حکم نہ ماننا اسلام کی نگاہ میں فسق ہے مگر اسلام کے ہر عضو کی قطع و برید پر ایک نئی خوشی محسوس کرنا اہل اسلام کے نزدیک سب سے بڑی ملی خیر خواہی ہے!۔

اس غیر اسلامی تصور مذہب کے مہلک جراثیم نے ہماری خانقاہوں میں ایک اور ہی مگر اسی نوعیت کا مرض پیدا کر رکھا ہے۔ وہاں سارا دین نماز روزے اور ذکر و مراقبہ تک محدود ہے۔ روحانیت کے ان آئینہ خانوں میں جدھر دیکھئے چند مخصوص عبادتوں کی تصویریں نظر آئیں گی۔ کسی سیاسی، معاشی، معاشرتی یا تمدنی معاملہ کا ذکر ہوا کہ للّٰہیت کی پیشانی شکن آلود ہوئی۔ ان کے نزدیک یہ سب دنیا داری کی باتیں ہیں۔ دین داری یہ ہے کہ دنیا اور اسکے معاملات کو کفار و فاسقین کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے اور اللہ والا مسلمان ایک گوشے میں بیٹھا ہوا بس تسبیح و تہلیل اور ذکر و شغل کرتا رہے۔ اس کے حجرے سے باہر ساری دنیا پر طاغوت کی حکومت قائم ہو جائے تو کچھ حرج نہیں۔ خدا کی شریعت کے بجائے شیطانی قوانین پر انسانی تمدن کی بنا رکھ دی جائے، حرام حلال ہوا اور حلال حرام ہو کر رہ جائے، اخلاق کے معیار الٹ جائیں اور

عدل و تقویٰ ایک لفظ بے معنی بن جائے، ہمارے اس دین دار بزرگ کو اس سے کچھ بحث نہیں۔ وہ تو اللہ والا ہے۔ اُس کو ان جھگڑوں سے کیا سروکار؟ اس کا کام تو اللہ کی عبادت کرنا ہے، اور اللہ کی عبادت یہ ہے کہ اوراد و وظائف اور نوافل اور مراقبہ اور حلقۂ ذکر میں زیادہ سے زیادہ وقت صرف کیا جائے ـــــ دین داری کے اس راہبانہ تصور نے اسلام کی روح کو مسخ کرکے رکھ دیا ہے۔ ذکر، عبادت، صبر، توکل، تقویٰ، عمل، مجاہدہ، غرض تمام اسلامی الفاظ کے معنی الٹ گئے ہیں۔ اب خالص بے عملی کا نام "عمل" ہے، اور عمل اب کرنے کی چیز نہیں بلکہ پڑھنے کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ ذکر کے معنی اب یہ ہیں کہ تسبیح چلے، ہونٹ ہلیں اور رات دن میں ہزاروں لاکھوں مرتبہ اللہ کا نام زبان پر جاری ہو۔ باقی رہا وہ ذکر جس کی طرف فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ[۱] میں اشارہ کیا گیا ہے، تو اس کا تصور تک دماغوں سے نکل چکا ہے، اور اسے اب عین دنیا داری سمجھا جاتا ہے۔ عبادت کے معنی اب چند مخصوص اعمال کے ہیں، اور ان اعمال کی بھی روح کے نہیں بلکہ محض ظاہری شکل کے۔ اگر کوئی شخص صرف فرائض ادا کرتا ہو اور اس کے بعد اپنا سارا وقت کفر و جاہلیت کی طاقتوں کے خلاف جنگ کرنے اور اسلام کی سربلندی کے لئے کوشش کرنے میں صرف کر دے تو وہ عبادت گذار نہیں بلکہ دنیا دار ہے، کیونکہ وہ مسجد کے

[۱] یہ آیت سورۂ جمعہ میں آئی ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ "جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اپنے کاروبار میں اللہ کا فضل (رزق حلال) تلاش کرو اور اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہو"۔ یہاں اللہ کو یاد کرنے کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ دنیوی کاروبار کے ہنگامے میں اللہ کے حدود اور شریعتِ الٰہی کے احکام کا خیال رکھو۔ جہاں قدم قدم پر شیطانی وسوسے اور خواہشاتِ نفس کے خدشے سامنے آتے ہیں، جہاں جھوٹ، اور خیانت اور حرام خوری اور بدنظری کے بے شمار مواقع پیش آتے ہیں اور شیطان ان کے اندر فائدے کی صورتیں دکھاتا ہے، وہاں تمہیں یاد رہے کہ خدا تم کو دیکھ رہا ہے اور ایک دن تمہیں اس کی عدالت میں حاضر ہونا ہے۔ ہر مرتبہ جب حرام اپنی ظاہری منفعتوں اور لذتوں کے ساتھ اور حلال اپنے ظاہری نقصانات اور تکلیفوں کے ساتھ دوش بدوش تمہارے سامنے آئیں تو خدا کا خوف تمہیں حرام کو چھوڑنے اور حلال کو اختیار کرنے پر آمادہ کر دے۔ یہ ہے اصل یادِ الٰہی، اور اس میں مجاہدہ، صبر، توکل، تقویٰ، سب شامل ہیں۔

بجائے دفتر میں بیٹھا ہوتا ہے، رکوع و سجود کے بجائے قلم و کاغذ کے کام میں مشغول نظر آتا ہے، اور عبادت کی اس صورت سے ہمارے دین دار لوگ قطعی ناآشنا ہیں۔ ان کے نزدیک عبادت صرف وہ شخص کرتا ہے جو فرائض کے ساتھ تہجد اور اشراق اور چاشت کی نمازیں بھی پڑھے، تسبیح کے دانوں کو بھی گردش دے اور اِلّا اللہ کی ضربیں بھی لگائے۔

تصورات کا انقلاب بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ جو سیدھا سادہ مسلمان فرائض ادا کرنے کے بعد رزق حلال کمانے اور اپنے حق داروں کے حقوق ادا کرنے میں لگا رہتا ہے وہ تو دنیا کا کتا ہے، اور جو بزرگ اللہ والے بن کر خانقاہ میں شب و روز مشغول عبادت رہتے ہیں اور لگی بندھی فیس لے کر لوگوں کیلئے دعائیں کرتے ہیں، یا تعویذ گنڈوں کی قیمت وصول کرتے ہیں، یا وعظ کہنے کے لئے آمد و رفت کا کرایہ اور نذرانہ طلب فرماتے ہیں وہ کمال درجہ کے دین دار ہیں!۔

خانقاہوں سے گذر کر مدرسوں کی طرف آئیے تو یہاں جاہلیت کی کارفرمائی ایک دوسرے ہی رنگ میں نظر آتی ہے۔ یہاں ظاہر پرستی اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ اسلام ان کے نزدیک ایک محسوس اور مرئی چیز ہے جس کو ناپا اور تولا جا سکتا ہے۔ انھوں نے مسلمان کا ایک پیمانہ بنا رکھا ہے۔ جہاں کوئی شخص سامنے آیا اور انھوں نے فوراً اپنا پیمانہ اس پر رکھ کر ناپ لیا۔ اگر وہ پیمائش میں پورا اترا تو اسے تشرع اور دین داری کا سٹرٹیفکیٹ دے دیا گیا۔ پھر چاہے وہ اپنے اعمال اور اخلاق میں خفیہ اور علانیہ قانونِ الٰہی کی کتنی ہی خلاف ورزیاں کرتا رہے، مگر "دینداری" بہرحال اس کے ساتھ چپکی رہے گی۔ اس کا شمار متشرع لوگوں ہی میں ہوگا، اور وہ اپنی ظاہری ہیئت سے عام مسلمانوں کو اور شائد خود اپنے نفس کو بھی عمر بھر دھوکا دیتا رہے گا۔ برعکس اس کے اگر کوئی شخص اس مقررہ پیمانہ سے ایک انچ کا سولھواں حصہ بھی کم نکلے تو بلا تامل اس کو فاسق، فاجر، بد دین قرار دے دیا جائے گا۔ پھر اس کی نماز، اس کا روزہ، اس کی پرہیزگاری، اس کی اخلاقی طہارت، سب ان کے نزدیک بے معنی ہیں، حتیٰ کہ اگر وہ فاسق کسی اجر و معاوضہ کے بغیر اللہ کے دین کی خدمت کرے، اور راہِ خدا میں اپنے نفس اور مال کی قربانی

دے تب بھی مذہب کے یہ اجارہ دار اس کی تمام خدمات پر پانی پھیر دیں گے محض اس لئے کہ چند جزئیات میں اس کا عمل ناقص ہے، اور ان کے مذہب میں اصل دین بس یہی جزئیات ہیں ــــ اگر ابومحجن ثقفی ان حضرات کے دور میں ہوتے تو یقیناً یہ شراب خوری کے جرم میں ان کی پیٹھ کے ٹکڑے ہی اڑا دیتے، اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو، جنھوں نے میدانِ جہاد میں ابومحجن کی جانفشانی دیکھ کر حد شرعی معاف کر دی تھی، نہ معلوم کیسے تند و تیز الفاظ میں مطعون کرتے!۔

اصل یہ ہے کہ انھوں نے حقائق اور معانی کو بالکل فراموش کر دیا ہے اور صرف اعمال کی ظاہری صورتوں ہی کو یہ دین سمجھتے ہیں۔ اس غلط تصور کا نتیجہ یہ ہے کہ احبار یہود نے جس طرح ظاہر پرستی میں شریعتِ الٰہی کی روح اور اس کے مقاصد کو گم کر دیا تھا، اسی طرح یہ حضرات بھی اس کو گم کر بیٹھے ہیں۔ ظاہری شکلوں کے الٹ پھیر سے حرام کو حلال اور ناجائز کو جائز کر دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، اور یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کے نزدیک بھی ان تغیرات سے حقیقت بدل جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کے عقیدہ میں زکوٰۃ کے لئے تملیک شرط ہے اور مدرسے کے فنڈ میں زکوٰۃ داخل نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر کوئی شخص ان کے پاس زکوٰۃ لائے تو یہ اس کو چھوڑیں گے نہیں بلکہ ایک غریب طالب علم کو بلائیں گے اور اسے کہیں گے کہ تو ایک ہاتھ سے زکوٰۃ لے اور دوسرے ہاتھ سے مدرسے کو ہبہ کر دے۔ اس طرح جو چیز ناجائز ہے وہ محض ہاتھ بدلنے سے جائز ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک یہ بھی بالکل جائز ہے کہ ایک شخص کو روپیہ دے کر اس بات پر تیار کیا جائے کہ وہ مطلقہ عورت سے نکاح کر کے اسے طلاق دیدے اور اس تدبیر سے وہ شوہر اول کے لئے حلال ہو جائے۔ جو لوگ اپنی بیویوں کو طلاق دے کر پشیمان ہوتے ہیں اور انہیں دوبارہ اپنے نکاح میں لانا چاہتے ہیں انہیں حلالہ کرنے کی یہ تدبیر علانیہ ہمارے دارالافتاؤں میں سکھائی جاتی ہے اور کوئی نہیں سوچتا کہ اس سے قرآن کا اصل مقصد ہی فوت ہوا جاتا ہے۔ وہاں تو تحلیل کی شرط لگائی ہی اس لئے گئی تھی کہ اس کڑی شرط کی وجہ سے لوگ طلاق دیتے ہوئے ڈریں مگر اس حیلہ نے مالدار اور بااثر لوگوں کے لئے اس چیز کو

آسان بنا دیا جسے اللہ مشکل بنانا چاہتا تھا۔ ختم سال سے پہلے روپے کو بیوی کے نام ہبہ کرنا اور پھر ختم سال سے پہلے اپنے نام ہبہ کرا لینا اور اس طرح فریضۂ زکوٰۃ سے بچ جانا، یہ بھی ایک معروف حیلہ ہے جس کو اچھے خاصے متشرع حضرات خود استعمال فرماتے ہیں اور دوسروں کو سکھاتے ہیں۔ ان حرکات پر دراصل حضرت ایوب کے تحنث کی نہیں بلکہ اصحاب السبت کی مثال راست آتی ہے جن کی دینداری کو آزمانے کے لئے اللہ نے ہفتہ کے روز مچھلیاں پکڑنا حرام کیا تھا تو انھوں نے یہ تدبیر نکالی کہ جمعہ کے روز جال پھینک کر چھوڑ دیتے، اور اتوار کے روز جاکر مچھلیاں پکڑ لیتے تاکہ ان کی خواہشِ نفس بھی پوری ہو جائے، اور فرمانبرداری کی ظاہری شکل بھی بنی رہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان تدبیروں سے اللہ تعالیٰ بھی دھوکا کھا جائے گا، مگر اللہ نے اس بدترین فسق کو طاعت اور تقویٰ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ ه۔

جاہلیت ہی کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو چھوڑ کر اپنے رجحانِ نفس اور میلانِ طبع کو دین و شرع کا پیمانہ بنا لیا گیا ہے۔ اَخذِ علم میں شارع نے یہ ترتیب رکھی تھی کہ پہلے کتاب اللہ، پھر سنت رسول اللہ، پھر راسخین فی العلم کے اجتہادات۔ لیکن یہاں اس ترتیب کو الٹ کر یوں کر دیا گیا کہ پہلے اُن ائمہ کے اجتہادات جن سے ہم کو عقیدت ہو۔ پھر سنت رسول اللہ جس کا علم صرف اس لئے حاصل کیا جاتا ہے کہ اپنے پسندیدہ مذہب کی تائید میں دلائل فراہم ہوں۔ سب سے آخر میں کتاب اللہ جس کو پڑھنے کا مقصد علم دین کی تحقیق نہیں بلکہ محض حصولِ ثواب ہو یا پھر کلام الٰہی کی بلاغت اور اس کے محاسن لفظی سے لطف اندوز ہونا۔ اسی طرح عقائد میں شارع نے یہ ترتیب رکھی تھی کہ سب سے اول ایمانیات، پھر وہ اعتقادی جزئیات جن میں تعبیر و تاویل کے اختلاف کو خود صاحبِ شریعت علیہ السلام اور صحابہ اور ائمہ نے جائز رکھا ہے۔ مگر اس ترتیب کو الٹ کر ہر گروہ نے اپنے اہواء کے مطابق یوں کر دیا کہ سب سے پہلے وہ جزئی عقیدہ جس سے ایک فرقہ کو خاص دلچسپی ہے۔ پھر ایمانیات جن پر اعتقاد رکھنے کے باوجود ایک شخص صرف

اس لئے کافر، ملحد، زندیق، فاسق اور گمراہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس خاص جزئی عقیدہ میں ان سے متفق نہیں۔ اسی طرح اوامر میں شارع نے یہ ترتیب رکھی تھی کہ سب سے اول فرائض، پھر سنن مؤکدہ پھر مستحبات و مستحسنات علیٰ اختلاف مدارجہا۔ اس ترتیب کو بھی ہر گروہ نے اپنی دلچسپیوں کے لحاظ سے الٹ کر رکھ دیا۔ اب وہ اوامر جو استحسان و استحباب کے درجہ میں ہیں، سب سے بڑھ کر اہمیت رکھتے ہیں، ان کے بعد مؤکدات کا درجہ آتا ہے، اور آخر میں فرائض ہیں۔ یہی صورت معاملہ منہیات کے باب میں بھی پیش آئی ہے۔ شارع نے سب سے بڑھ کر محرمات اور کبائر کی ممانعت پر زور دیا ہے۔ اس کے بعد صغائر کا مرتبہ آتا ہے اور آخر میں وہ منکرات و مکروہات ہیں جن کی ممانعت بتصریح نہیں کی گئی ہے بلکہ تخریج و استنباط کے طور پر اشارۃ النص یا دلالۃ النص سے نکالی گئی ہے۔ مگر ہر جماعت نے اپنے رجحان طبع کے زیر اثر اس ترتیب کو بھی الٹ دیا۔ اب تیسرے درجہ کے مکروہات پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے، اس کے بعد صغائر کا مرتبہ آتا ہے اور آخر میں محرمات اور کبائر ہیں جن کا ذکر زبانوں پر کم ہی آتا ہے ـــــ یہ سب سے بڑی اور سب سے بدتر بدعت ہے جس کو ام البدعات کہنا چاہئے! یہ تمام بدعات سے بڑھ کر خطرناک ہے، کیونکہ اس کو علم دین اور تشرع اور للہیت کا لباس پہنا دیا گیا ہے، حالانکہ اس کی بنا در اصل اس نہایت گہری ہوا پرستی پر قائم ہے جو نفس کے چور خانوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اس فتنۂ عظیم کی شاخیں بے شمار، اور اس کے نتائج بے حد و حساب ہیں۔ علم دین میں جمود، قابلیتِ اجتہاد کا فقدان، فرقہ بندی میں غلو، تکفیر و تفسیق کی گرم بازاری، مہمات سے بے پروائی اور لاطائل فضولیات میں انہماک، کرنے کے کاموں کو چھوڑ دینا اور لایعنی باتوں میں اپنی ساری قوتوں کو ضائع کر دینا، یہ سب اسی ایک فتنہ کے نتائج ہیں۔ حاملانِ دینِ متین مطمئن ہیں کہ اِنَّھُم یُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا۔ اور شیطان بغلیں بجا رہا ہے کہ جو قوم قرآن جیسی خطرناک کتاب رکھتی تھی جس سے خوف تھا کہ جاہلیت کا تختہ الٹ کر رکھ دے گی، اس کو وہ اس ذوقِ فضول میں لگا دینے میں کامیاب ہو گیا۔

ایک طرف سے جاہلیت اولیٰ مسلمانوں کی ذہنیتوں پر یوں بار بار حملے کر کے انہیں اسلامی تصورات سے بیگانہ بنا گئی، اور دوسری طرف سے جاہلیتِ فرنگ نے اپنے جدید ہتھیاروں سے قرآنی تہذیب کی رہی سہی یادگاروں پر بھی یلغار کر دی۔ قدیم جاہلیت کی فتحمندیوں نے اندر سے دین کے نظام کو مسخ کیا اور جدید جاہلیت نے اجتماعی خیالات اور سیاسی، معاشرتی، اور معاشی نظریات کو الٹ کر رکھ دیا، حتیٰ کہ آج ہم بحسرت دیکھ رہے ہیں کہ اللہ کی اس پھیلی ہوئی زمین پر ایک گوشہ بھی ایسا موجود نہیں جہاں اسلامی نظامِ زندگی اپنی کامل صورت اور بے آمیز ہیئت اجتماعی کے ساتھ نافذ ہو۔ اگر کہیں اس نظام کا کوئی دھندلا سا خاکہ ہے بھی تو تہذیب حاضر کے موجودہ سیلاب کے سامنے اس کی حیثیت بالکل وہی ہے جو کسی پرشور سمندر کی طوفانی لہروں میں ایک کشتی کے ٹوٹے ہوئے تختوں کی ہوتی ہے اور یہ نتیجہ ہے اپنی اُس وقت کی خود فراموشی کا جب ہم نے یورپ کو ایک ہاتھ سے قلم اور دوسرے سے تلوار بخشتے ہوئے کہا تھا کہ تُو

یہ تیغ ہے یہ طشت ہے یہ ہم ہیں کشتنی

لہٰذا اب سعادت تو اسی میں ہے کہ مادّی تہذیب کا نشتر جب اسلامی نظام کی ایک رگ کاٹ لے تو دوسری اس کے سامنے کر دی جائے، اور الحمد للہ کہ ہم اس فریضۂ سعادت کو بڑی تندہی اور خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ مغرب سے آواز آئی کہ ۱۳۵۰ برس کا پرانا مذہب خواہ کیسا ہی کامل اور وسیع کیوں نہ ہو، موجودہ دورِ تمدن میں کام نہیں دے سکتا۔ ہم نے کہا اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا۔ ایک مادہ پرستانہ نظام غربا پروری کا جامہ پہن کر روس سے چلا تو ہم نے یہ کہتے ہوئے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا کہ اسلامی مواساۃ تو اسی اشتراکیت کا نام ہے۔ مغرب نے اپنا معاشی نظام بینکنگ اور انشورنس پر قائم کیا تو ہمارا مفتی بول اٹھا کہ ہندوستان دار الحرب ہے، یہاں سود لینا (جس کی شان میں فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ کی تہدید نازل ہوئی تھی) جائز ہے، مستحسن ہے، بلکہ سراپا رحمت ہے، وَمَنْ يُّقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا الآیۃ کا شانِ نزول ہی سودی کاروبار ہی تو ہے۔

تمدن اور معاشرت نے نئے نئے فیشن ایجاد کیے تو ہمارے "تعلیم یافتہ" حضرات نے اسلامی وضع قطع پر قدامت پرستی کے فتوے لگائے اور اسے دیکھ کر وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ کی یاد تازہ کی۔ اباحتِ نفس کے اشاعت پر مغرب نے پردہ کو خلافِ انسانیت ٹھیرایا تو ہم نے بھی سُر میں سُر ملا کر کہا کہ پردہ تو نسوانیت کی تحقیر بلکہ اسلامی نظریہ مساوات کی صریح خلاف ورزی ہے۔ وطنیت اور قومیت کے نظریے پیدا ہوئے تو ہم نے حب الوطن من الایمان سے اس کی تصدیق شروع کر دی۔ مصر میں اسی تخیل نے ہم سے فراعنہ پرستی کرائی، اسی کے عشق میں ایران وٹرکی نے اسلامی نظریہ قومیت کے ایک ایک نشان کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مٹایا اور وہاں کی دو ہزار برس پہلے کی مٹی ہوئی تہذیب کو زندہ کرنے میں اپنی سربلندی دیکھی۔ اسلامی قوانینِ حکومت کو چھوڑ کر مغرب کے بنائے ہوئے آئین و قانون اختیار کئے۔ حتیٰ کہ ترکی نے مغربی تصور کے اتباع میں اتنا بھی گوارا نہ کیا کہ وہاں کی حکومت نام کو بھی اسلامی خلافت رہ جائے۔ اور جب اس پر بھی صبر نہ ہو سکا تو اسلامی تصور کا رہا سہا داغ بھی اس نے اپنے دامن سے مٹا دیا، اور اس دفعہ کو، جس کے ذریعہ حکومت کا مذہب اسلام قرار پایا تھا، اڑا کر یہ دفعہ مرتب کی گئی کہ آئندہ سے ترکی حکومت اسلامی حکومت کے بجائے قومی اور جمہوری حکومت کہلائے گی۔

اسلامی تصورات سے یہ بُعد اور تنفر کچھ ایک سلطنت یا ملک تک محدود نہیں ہے۔ ممالک اسلامیہ میں سے جو بھی ترقی کا ولولہ لے کر اُٹھتا ہے کعبۂ فرنگ کی طرف منہ کر لیتا ہے، خواہ غلام ہو یا نام کا آزاد۔ آج قریب قریب تمام مسلمانوں نے اپنے دل و دماغ مغرب کے حوالہ کر دیے ہیں۔ مغربی نقطۂ نظر ہمارے نظامِ زندگی کے ایک ایک جزو میں سرایت کر گیا ہے۔ ہماری اجتماعی ذہنیت پر جاہلیت جدیدہ کا ایسا گہرا زنگ چڑھ گیا ہے کہ اسلامی نظریات کا کوئی نقش اس پر اترتا ہی نہیں۔ صبغۃ اللہ جس امت کا قومی نشان تھا وہ یورپین اصطباغ لینے کے لئے والہانہ دوڑی چلی جا رہی ہے۔ اس کے نزدیک اب صداقت کا معیار اور نجات وسربلندی کا ذریعہ مغربی قول و فعل ہے۔ گویا جس طرح قرآن

مہیمن تھا پچھلی کتابوں کی ناقص اور محرف تعلیمات کا، اب سمائے مغرب سے نازل ہونے والی وحی مہیمن ہے (العیاذ باللہ) قرآنی نظریات و تصورات کی۔ جاہلیت کی جو سب سے بڑی تمنا ہو سکتی ہے وہ یہی ہے جسے پورا کرنے کے لئے ہم جی رہے ہیں۔ امت مرحومہ کے اخلاف و اسلاف میں اگر کوئی نسبت ہے تو یہی کہ ایک "طوبیٰ للغرباء" کی پیشین گوئی کا مظہر ہے، دوسرا "وسیعود غریبا" کی پیشین گوئی کا۔

لیکن ہاں مایوسی اور نامرادی کی اس ہمہ گیر تاریکی میں ابھی امید کی ایک کرن باقی ہے۔ باطل کی فطرت ثبات ناآشنا ہے۔ وہ پھیلتا جاتا ہے مگر ثابت قدم رہنا نہیں جانتا۔ متمدن انسان جاہلیت کے سیلاب میں بہ تو گیا مگر اس کے تھپیڑے کھا کھا کر موجودہ نظام تہذیب سے وہ پریشان بھی ہو رہا ہے۔ جہل پرستی کے تلخ نتائج ایک ایک کر کے اس کے سامنے آرہے ہیں اور وہ امن و سلامتی کی جستجو میں دیوانہ وار سرگرداں ہے۔ مگر چونکہ اس کے سامنے عملی دنیا میں کہیں یہ شے اپنی اصلی صورت اور بے نقاب ہیئت میں موجود نہیں اس لئے جب کوشش کر کے جاہلیت کے ایک پھندے سے وہ اپنی گردن چھڑاتا ہے تو دوسرا پھندا اسے اپنے حلقہ میں لے لیتا ہے۔ امپیریلزم اور سرمایہ داری کی ظالمانہ سخت گیریوں سے گھبرایا تو اشتراکیت کی لعنت میں جا پھنسا۔ جمہوریت سے تنگ آیا تو ڈکٹیٹر شپ کی خندق میں جا گرا۔ نکاح و طلاق وغیرہ معاشرتی قوانین میں (جن کے بارے میں کل تک وہ اسلام پر خندہ زن تھا) اپنی غیر فطری اور خیالی بندشوں کو توڑ کر اباحتِ مطلقہ (Licentiousness) نسوانیت (Feminism) اور برتھ کنٹرول کے مہالک میں گرفتار ہو گیا۔ غرضیکہ ایک عام بیقراری اور اضطراب کے دور سے دنیا گذر رہی ہے۔ جاہلیت کے دباؤ سے اس کی روح بے تاب ہو رہی ہے۔ گویا زمین تیار ہو چکی ہے، بیج ڈالنے کی ضرورت ہے۔ سرابِ جاہلیت میں بھٹکتی ہوئی دنیا پیاس سے بے قرار ہے، کاش سینۂ عرب سے ابلے ہوئے سرچشمۂ حیواں کو خس و خاشاک سے پاک کر کے اس کے سامنے کر دیا جائے۔ یعنی وہ اسلام جس سے ساری دنیا بیگانہ ہے اور جو ساری دنیا سے اجنبی جاہلی افکار و تصورات کے غبار میں چھپا پڑا ہے، پھر اسے

از سر نو دنیا سے مانوس اور اس کے الٰہی نظام کی برکتوں کو نمایاں کرکے دنیا سے روشناس کرایا جائے۔ آج ضرورت ہے اسلام کو ایسے ہی مردان کار اور اصحاب عزیمت کی جو مشرق و مغرب کی ذہنیتوں کے خلاف صف بستہ ہو سکتے ہوں اور تلاش ہے اسلام کو ایسے ہی "غرباء" کی جو ہوا پرستی اور جاہلیت کے اس طوفان میں قدم جما کر کھڑے ہو جائیں۔ اسلامی نظریات و تصورات کو اپنی زندگی کا رہنما بنائیں۔ قرآن کی روح میں جذب ہو جائیں اور اسلامی نظام حیات کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر نافذ کرکے اسلام کے چہرہ سے غربت کا پردہ اٹھا دیں۔ یہی تجدید ملت ہے۔ یہی احیاء دین ہے۔ یہی اعلاء کلمۃ اللہ ہے۔ یہی نصرت اسلام اور یہی وراثت رسول ہے۔ قدرت "طوبیٰ للغرباء" کی بشارت دینے کے لئے منتظر کھڑی پکار رہی ہے۔ اگر مسلمانوں کو اپنی کھوئی ہوئی عظمت کی جستجو ہے تو انہیں اس پکار کا جواب دینا پڑے گا۔

ضروری اطلاع

سررشتہ تعلیمات حیدرآباد دکن کی جانب سے ۸۱ مدارس اور دفاتر کے نام جو پرچے سال گذشتہ جاری کرائے گئے تھے ان کی مدت اس ماہ رمضان میں ختم ہو رہی ہے اب محکمہ تعلیمات نے ہم کو اطلاع دی ہے کہ مذہبی و سیاسی پرچوں کی خریداری اس کی پالیسی کے خلاف ہے۔ لہٰذا آئندہ شوال سے یہ پرچہ ان مدارس و دفاتر میں حاضر نہ ہوگا۔ جو مدارس اسے خریدنا چاہیں وہ خود اپنے بجٹ سے خرید سکتے ہیں۔

منیجر

تنزیل و تاویل

قصۂ داؤد علیہ السلام اور اسرائیلی خرافات

کچھ مدت ہوئی، ناظرین ترجمان القرآن میں سے ایک صاحب نے اس قصے کے متعلق اپنے تشکک کا اظہار کیا تھا جو سورہ صٓ کے دوسرے رکوع میں حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق بیان ہوا ہے۔ اگرچہ ان کو ایک مختصر جواب بروقت دے دیا گیا، مگر بعد میں خیال آیا کہ یہ قصہ قرآن مجید کے ان مقامات میں سے ہے جن کے حسن و جمال کو اسرائیلی خرافات کے غبار نے اکثر لوگوں کی نظروں سے چھپا دیا ہے، اور جن کے متعلق عام طور پر متداول تفسیروں یا ترجموں کی مدد سے قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والوں کو شبہات اور سخت شبہات پیش آتے ہیں، لہذا اس پر ایک مستقل مضمون لکھنے کی ضرورت ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ قصہ قرآن حکیم میں کس فائدے کے لئے بیان کیا گیا ہے، اور اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

سورہ صٓ اس مضمون سے شروع ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سن کر کفار ضد و ہٹ دھرمی، اور تقلید آبائی کی بنا پر آپ کو جھٹلاتے ہیں، اور ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ قوم نوحؑ، اور عاد، اور فرعون، اور ثمود اور قوم لوطؑ اور قوم شعیبؑ کا حوالہ دے کر انہیں متنبہ کرتا ہے کہ یاد رکھو! ہمارے قانون میں کسی کے لئے رو رعایت نہیں ہے، تم سے پہلے جس جس نے ہمارے فرمان سے سرتابی کی ہے اس کو سخت سزا دی جا چکی ہے، اور اب اگر تم سرکشی کرو گے تو کوئی چیز تم کو ہمارے عذاب سے نہ بچا سکے گی۔

اسی تنبیہ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ آگے چل کر بیان فرماتا ہے کہ ہمارا قانون تو ایسا بے لاگ ہے کہ

معمولی درجہ کے انسان تو کیا چیز ہیں، بڑے بڑے عالی مرتبہ لوگ حتیٰ کہ نبی اور پیغمبر بھی اگر ہمارے مقرر کیے ہوئے طریق حق سے بال برابر جنبش کرتے ہیں تو ہم ان کو بھی گرفت کیے بغیر نہیں چھوڑتے۔ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُدَ۔ اے نبی! ان کو ذرا ہمارے خاص بندے داؤد کا حال سناؤ۔ یہ کس پائے کا شخص تھا؟ ذَا الْأَيْدِ۔ بڑی قوتوں کا مالک۔ بڑی نعمتوں سے سرفراز کیا ہوا۔ إِنَّهُ أَوَّابٌ۔ اور اس کے ساتھ نہایت خدا ترس۔ دائماً اپنے مالک کی طرف رجوع کرنے والا۔ إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً كُلٌّ لَهُ أَوَّابٌ۔ تسبیح و ثنا م خدا کا ذکر اس جوش، اس جذبہ کے ساتھ کرتا تھا کہ پہاڑ اور پرندے تک اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے تھے۔ وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ۔ ہم نے اس کو نہایت مضبوط، طاقتور سلطنت عطا کی تھی، حکمت اور دانشمندی کی نعمت سے نوازا تھا، اور اس کو فیصلہ کن بات کہنے کی قابلیت بخشی تھی۔ مگر تمھیں معلوم ہے کہ جب اس سے ایک معاملہ میں لغزش ہو گئی تو ہم نے کیا کیا؟۔

وَهَلْ أَتَاكَ نَبَأُ الْخَصْمِ۔ إِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ، إِذْ دَخَلُوا عَلَىٰ دَاوُدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ، قَالُوا لَا تَخَفْ خَصْمَانِ بَغَىٰ بَعْضُنَا عَلَىٰ بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَا إِلَىٰ سَوَاءِ الصِّرَاطِ۔	کیا تمھیں ان مقدمہ والوں کی خبر پہنچی ہے جو دیوار پھاند کر داؤد کی خلوت گاہ میں گھس گئے تھے؟ ان کے اس طرح اچانک ایسی جگہ پہنچ جانے سے جب داؤد گھبرا گئے، تو انھوں نے کہا آپ پریشان نہ ہوں، ہم دو فریق مقدمہ ہیں جن میں ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔ آپ ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیں، حق سے تجاوز نہ کریں اور ہمیں عدل کا سیدھا راستہ دکھائیں

مقدمہ کیا تھا؟ ایک فریق نے دوسرے فریق کی طرف اشارہ کرکے کہا:۔

إِنَّ هَٰذَا أَخِي لَهُ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ نَعْجَةً وَلِيَ نَعْجَةٌ وَاحِدَةٌ۔ فَقَالَ أَكْفِلْنِيهَا وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ۔	بیشک یہ میرا بھائی ہے (دینی بھائی اور ہم قوم) اس کے پاس ۹۹ دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دنبی۔ یہ مجھ سے کہتا ہے کہ یہ اپنی ایک دنبی بھی مجھے دے دے۔ اور اس مطالبہ میں اپنی شان و

شوکت سے مجھے دبا لیتا ہے۔

داؤد علیہ السلام اس روداد مقدمہ کو سن کر فرماتے ہیں:۔

قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ إِلَىٰ نِعَاجِهِ ۖ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ ۗ

داؤد نے کہا، بلاشبہ اس شخص نے ظلم کیا کہ اتنی دنبیاں رکھتے ہوئے بھی تیری ایک دنبی مانگ بیٹھا۔ اور اکثر ہمسایوں کا یہی حال ہے کہ ایک دوسرے پر زیادتیاں کرتے ہیں، بجز ایسے لوگوں کے جو ایمان دار اور نیکوکار ہیں، مگر ایسے لوگ کم ہی ہیں

یہ فیصلہ دینے کے بعد حضرت داؤد کو یکایک خیال آیا کہ ایسی ہی ایک لغزش مجھ سے بھی ہو چکی ہے، چنانچہ فوراً وہ خدا کے خوف سے لرز اٹھے، اور توبہ و استغفار کرنے لگے:۔

وَظَنَّ دَاوُودُ أَنَّمَا فَتَنَّاهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّ رَاكِعًا وَأَنَابَ ۩

داؤد کو معاً یہ گمان ہوا کہ یہ مقدمہ بھیج کر ہم نے اس کو آزمائش میں ڈالا ہے۔ چنانچہ اسی وقت اس نے اپنے پروردگار سے عفو و بخشش کی دعا کی، اور سجدے میں گر پڑا اور بار بار توبہ کی۔

جب حضرت داؤد نے اس طرح اپنی لغزش کا اعتراف کر لیا اور سچے دل سے توبہ کی تو اللہ تعالے فرماتا ہے کہ:۔

فَغَفَرْنَا لَهُ ذَٰلِكَ ۖ وَإِنَّ لَهُ عِندَنَا لَزُلْفَىٰ وَحُسْنَ مَآبٍ

ہم نے اس کی وہ خطا معاف کر دی اور یقیناً وہ ہمارے ہاں مقرب ہے اور اس کی اچھی منزلت ہے۔

مگر اس کے ساتھ ہی ہم نے اس کو ان الفاظ میں سختی کے ساتھ تنبیہ کی کہ:۔

يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ

اے داؤد! ہم نے تجھ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ لہذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر۔ اور اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی نہ کر، کہ یہ خواہشات

اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ بِمَا نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ

کہیں تجھ کو خدا کے راستہ سے بھٹکا نہ دیں۔ جو لوگ اللہ کے راستے سے بھٹکتے ہیں، یقیناً ان کے لئے سخت عذاب ہے، کیونکہ وہ روزِ حساب کو بھول گئے۔

جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں، اس قصے کو بیان کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ جو لوگ خدا سے بے خوف اور اس کے بے لاگ قانون سے ناواقف ہیں، انہیں متنبہ کر دیا جائے کہ اس احکم الحاکمین کے ہاں کسی کے ساتھ رعایت نہیں۔ اس کے قانون سے بال برابر انحراف بھی اگر ہوگا تو اس پر گرفت ضرور ہوگی اور کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی اس کی گرفت سے نہ بچے گی، اِلّا یہ کہ سچے دل سے توبہ کرے، اخلاص کے ساتھ اس کی جناب میں رجوع لائے اور اپنے آقا کے مقابلہ میں کبر کے بجائے عجز اختیار کرے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اور مقصد بھی ہے جس کے لئے یہ قصہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، اور وہ ایک جلیل القدر نبی کے حق میں یہود کی غلط بیانیوں کو دور کرنا ہے۔

یہود کے متعلق معلوم ہے کہ انھوں نے خود اپنی قوم کے انبیاء پر ناپاک الزامات لگانے، اور ان کی سیرتوں کو داغدار کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں کیا ہے۔ حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، غرض کوئی ان کی بدگوئیوں سے نہ بچ سکا۔ لیکن سب سے زیادہ ظلم انھوں نے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام پر کیا کہ ان کو انبیاء کی صف سے نکال کر معمولی بادشاہوں کی صف میں اتار لائے، اور ان کو اس حیثیت سے پیش کیا کہ وہ ڈپلومیٹ ہیں، فاتح اور مدبر ہیں، جھوٹ، فریب، ظلم، اور ان تمام وسائل سے توسیع مملکت کرتے ہیں جن سے دنیا کے دوسرے فاتحوں اور جہانگیروں نے کام لیا ہے، اور اپنے نفس کی خواہشات پوری کرنے کے لئے وہ سب کچھ کر گذرتے ہیں جو عام بادشاہوں کا شیوہ ہے۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے حضرت داؤد پر زنا اور حضرت سلیمان پر شرک اور ساحری کا الزام لگانے میں بھی باک

نہیں کیا۔ یہ اس قوم کا برتاؤ اُن بزرگوں کے ساتھ ہے جنھوں نے اس کو ذلت کی خاک سے اٹھا کر عزت کے آسمان پر پہنچایا۔ آج جن تاریخی مفاخر پر یہ قوم ناز کرتی ہے وہ سب انہی بزرگوں کی بدولت اسے نصیب ہوئے ہیں، اور انہی کی پاک سیرتوں پر اس نے سیاہی کے چھینٹے پھینکے ہیں۔

دنیا میں صرف ایک قرآن ہی ایسی کتاب ہے جس نے ان انبیاء کرام میں سے ایک ایک کی پوزیشن صاف کی، اور ان کے اصل مرتبہ و مقام سے دنیا کو روشناس کیا۔ اگر قرآن نہ آتا تو آج کوئی شخص ان بزرگوں کو نبی ماننا تو درکنار، عزت سے ان کے نام لینا بھی گوارا نہ کرتا۔ بنی اسرائیل چاہے اس احسان کو نہ مانیں، مگر احسان کا احسان ہونا اس کا محتاج نہیں کہ اس کا اعتراف بھی ہو۔

سیدنا داؤد علیہ السلام کے متعلق یہود کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ ان کی نبوت ہی کے قائل نہیں ہیں، بلکہ ان کو محض اپنی قوم کا ایک ہیرو سمجھتے ہیں۔ قرآن اس کی صفائی کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ وہ ایک جلیل القدر نبی تھے، اور اللہ نے ان کو بڑا مرتبہ عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کے سلسلہ میں وہ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کا بھی ذکر کرتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ "یہ سب صالح لوگ تھے" وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔ "ان سب کو ہم نے دنیا جہان والوں پر فضیلت عطا کی" وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ "اور ہم نے ان کو برگزیدہ کیا اور ایک سیدھے راستے کی طرف ان کی رہنمائی کی" اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ۔ "یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت سے سرفراز کیا" اور یہ سب کچھ کہہ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کرتا ہے کہ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ۔ "ان لوگوں کو اللہ نے راہ راست دکھائی تھی، لہذا جس راستے پر وہ چلے ہیں اس پر تم بھی چلو" (الانعام - ۱۰)

دوسرا زبردست داغ جو حضرت داؤد کی سیرت پر یہودیوں نے لگایا ہے، وہ اوریا حتی

کی بیوی کے معاملہ میں ہے۔ کتاب سموئیل دوم باب ۱۱ و ۱۲ میں اس کی پوری تفصیل درج ہے جس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے :-

"ایک روز شام کے وقت داؤد اپنے محل کی چھت پر ٹہل رہا تھا کہ اس کی نظر ایک عورت پر پڑی جو نہا رہی تھی۔ بے حد خوب صورت عورت تھی۔ داؤد نے دریافت کرایا کہ یہ کون ہے؟ معلوم ہوا بتشیع بنت الیعام اس کا نام ہے، اوریا حِتّی کی بیوی ہے۔ داؤد نے اس کو بلا بھیجا اور رات اپنے پاس رکھا۔ اسی رات وہ حاملہ ہوگئی اور بعد میں داؤد کو اس نے اپنے حمل کی اطلاع دے دی۔

"اس کے بعد داؤد نے اوریا کو یوآب کے پاس بھیج دیا جو اس وقت بنی عمون سے لڑ رہا تھا، اور شہر ربّہ کا محاصرہ کیے پڑا تھا۔ اس نے یوآب کو لکھا کہ اوریا کو جنگ میں کسی ایسی جگہ مامور کر جہاں سخت معرکہ ہو اور پھر اس کو چھوڑ کر الگ ہو جا تاکہ وہ مارا جائے۔ چنانچہ یوآب نے ایسا ہی کیا اور وہ لڑائی میں مارا گیا۔

"اس طرح اوریا کو ٹھکانے لگانے کے بعد داؤد نے اس عورت سے نکاح کر لیا اور اسی کے پیٹ سے سلیمان پیدا ہوا۔

"خدا کو داؤد کا یہ فعل ناگوار ہوا اور اس نے ناتن نبی کو داؤد کے پاس بھیجا۔ ناتن نے اس سے کہا کہ ایک شہر میں دو شخص تھے۔ ایک مالدار تھا۔ دوسرا فقیر۔ مالدار شخص کے پاس بہت سی بکریاں اور گائیں تھیں۔ فقیر کے پاس صرف ایک چھوٹی سی دنبی تھی جس کو وہ بڑی محبت سے پالتا تھا۔ ایک مرتبہ مالدار شخص کے پاس کچھ مہمان آئے۔ اس نے نہ چاہا کہ اپنی بکریوں اور گایوں میں سے کسی کو کاٹے۔ فقیر کی دنبی لے لی اور اس سے ضیافت کا سامان کیا۔ یہ قصہ سُن کر داؤد بہت غضبناک ہوا اور کہا کہ ایسا شخص ضرور مارا جائے گا اور اس فقیر کو ایک کے بدلے چار

دنبیاں دلوائی جائیں گی۔ ناتن نبی نے کہا کہ وہ شخص تو ہی ہے، اور اسے اوریا حتی کا واقعہ یاد دلایا۔"

اس قصے میں حضرت داؤد علیہ السلام کے اخلاق کی ایسی تصویر کھینچی گئی ہے جو ایک نبی تو درکنار، ایک معمولی بادشاہ کے لئے بھی انتہائی شرمناک ہے۔ یہودیوں میں یہ قصہ بچے بچے کی زبان پر چڑھا ہوا تھا۔ حضرت داؤد کی زندگی کے نمایاں واقعات میں اس کو شمار کیا جاتا تھا، اس پر عجیب عجیب حاشیے چڑھائے گئے تھے، اور مزے لے لے کر اس کو بیان کیا جاتا تھا۔ غیر ممکن تھا کہ قرآن ایک عالی مرتبہ پیغمبر کی سیرت پر اس داغ کو گوارا کرتا۔ اس نے مذکورہ بالا آیات میں حکمت و عظمت و موعظت کا درس دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ اصل واقعہ کیا ہے اور اس پر جھوٹے حاشیے کتنے چڑھائے گئے ہیں۔

قرآنِ مجید کے بیان سے واقعہ کی حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ سیدنا داؤد علیہ السلام نے اوریا (یا جو کچھ بھی اس کا نام رہا ہو) سے محض یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ ان کی شخصی عظمت کو پیشِ نظر رکھ کر وہ ایک طرح سے اپنے آپ کو طلاق دینے پر مجبور پا رہا تھا مگر قبل اس کے کہ وہ طلاق دیتا، قوم کے دو نیک آدمی حضرت داؤد کے پاس اچانک پہنچ گئے، اور انھوں نے اس معاملہ کو ایک فرضی مقدمہ کی صورت میں ان کے سامنے پیش کیا۔ مقدمہ سن کر حضرتِ داؤد نے وہی فیصلہ دیا جو ایسے معاملہ کا برحق فیصلہ ہو سکتا تھا لیکن معاً ان کو خیال آیا کہ یہ تو میرا رب میری آزمائش کر رہا ہے، چنانچہ فوراً انھوں نے توبہ کی اور غایت درجہ کی عاجزی کے ساتھ خدا سے اپنے قصور کی بخشش چاہی۔

اس بیان کو سامنے رکھ کر جب ہم توراۃ کی روایت کو دیکھتے ہیں تو بادنیٰ تامل یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اصل واقعہ جب مشہور ہوا ہوگا تو اس پر حاشیے کس طرح چڑھ گئے ہوں گے۔

شریر النفس اور خبیث طینت لوگوں کا قاعدہ ہے کہ جب کسی آدمی اور خصوصاً بڑے آدمی کے متعلق کسی چھوٹی سی بات کی بھنک ان کے کان میں پڑ جاتی ہے تو فوراً ان کی قوتِ متخیلہ اپنا کام شروع کر دیتی

ہے۔ اور وہ محض اپنے ذہن سے بہت سی امکانی صورتیں فرض کرکے ان کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ گویا یہ محقق واقعات ہیں۔ ہر انسان سے خواہ وہ کیسے ہی بڑے درجہ کا آدمی ہو، کبھی نہ کبھی کوئی ایسا فعل ضرور ہوجاتا ہے جس کو آسانی کے ساتھ برے معنی پہنائے جاسکتے ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے جو کچھ کیا تھا اگرچہ وہ بنی اسرائیل کے ہاں ایک عام دستور تھا[۱] اور اسی دستور سے متأثر ہوکر نبی اللہ سے یہ لغزش سرزد ہوئی تھی، مگر چونکہ ایک بڑے آدمی کا فعل تھا، اس لئے فوراً شہرت پکڑ گیا، اور اس پر لوگوں نے حاشیے چڑھانے شروع کردیے۔ اُوریاہ سے طلاق کا مطالبہ کرنا یہ گمان کرنے کے لئے کافی تھا کہ حضرت داؤد اس کی بیوی کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ اب لوگوں کے ذہن نے ٹٹولنا شروع کیا کہ یہ میلان آخر ہوا کیونکر۔ کسی ذاتِ شریف کو یہ بات سوجھ گئی کہ غالباً اپنے محل پر سے اس کو نہاتے میں دیکھ لیا ہوگا۔ مگر ان کی صداقت شعاری نے "ہوگا" کو محض "ہوگا" کی صورت میں بیان کرنا پسند نہ کیا، اس لئے انھوں نے "ہوگا" کو "ہے" میں تبدیل کرکے لوگوں سے بیان کیا۔ رفتہ رفتہ یہ ایک واقعہ بن گیا حالانکہ میلان ہونے کے بہت سے اسباب ہوسکتے تھے۔ ممکن ہے کہ حضرت داؤد نے اس عورت کی قابلیت اور اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کا حال سُن کر اسے پسند کیا ہو، لیکن برے نفوس کی شرارت ہمیشہ ایسے واقعات میں برے امکانات ہی کی طرف مائل ہوتی ہے۔

پھر جب لوگوں کو یقین ہوگیا کہ حضرت داؤد اس عورت کی طرف مائل ہیں، تو ان کی نالائق فطرت یہ بات ماننے کے لئے کسی طرح تیار نہ ہوئی کہ ایک بادشاہ کسی عورت کی طرف مائل ہو، اور وہ اس کو حاصل نہ کرے۔ چنانچہ انھوں نے یہ بھی فرض کرلیا کہ بادشاہ نے اس عورت کو بلایا ہوگا اور اس سے زنا کی ہوگی۔

---

[۱] اسرائیلیوں کے ہاں یہ کوئی معیوب بات نہ تھی کہ کوئی شخص کسی کی بیوی کو پسند کرکے اس سے طلاق کی درخواست کرے۔ نہ درخواست کرنے والا اس میں تکلف کرتا تھا، اور نہ وہ شخص جس سے درخواست کی جاتی، اس پر برا مانتا تھا۔ اور یہ تو ایک عمدہ اخلاق کی بات سمجھی جاتی تھی کہ کوئی شخص کسی دوست کو خوش کرنے یا اس کی تکلیف رفع کرنے کے لئے اپنی بیوی کو طلاق دیکر اس کے نکاح میں دیدے۔ چنانچہ یہودی اخلاق ہی کا اثر تھا کہ مدینہ میں بعض انصار اپنے مہاجر بھائیوں کی مواسات کے لئے اپنی بیویوں کو طلاق دے کر ان سے بیاہ دینے پر آمادہ ہوگئے تھے۔

"یہ ہوگا" بھی بہت جلدی "ہے" میں تبدیل ہوگیا اور اس پر حمل کا مزید حاشیہ چڑھا دیا گیا۔

اسرائیلی قوم اس وقت تک ایک زندہ قوم تھی، اور اس میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو کسی بڑے سے بڑے آدمی کو بھی اس کی غلطی پر ٹوکنے میں تامل نہیں کرتے۔ جب یہ قصہ مشہور ہوا تو اس قسم کے لوگوں میں سے دو آدمی حضرت داؤد کے پاس پہنچ گئے اور انھوں نے تمثیل کے پیرایہ میں ان کو متنبہ کیا۔ چنانچہ آنجناب فوراً اپنے فعل سے تائب ہوگئے۔ لیکن یا تو اس توبہ کا علم لوگوں کو نہیں ہوا، یا اگر ہوا بھی تو بدفطرت لوگوں کو اس کا یقین نہ آیا۔ بہرحال توبہ کے بعد حضرت داؤد تو اپنی جگہ اوریاہ کی بیوی کا خیال چھوڑ چکے تھے، مگر لوگوں نے اس کا خیال نہ چھوڑا۔ اوریاہ ایک فوجی افسر تھا۔ اس کا کسی مہم پر جانا کوئی انوکھا فعل نہ تھا، اور جنگ میں اس کا مارا جانا بھی کوئی نرالی بات نہ تھی۔ مگر چونکہ لوگوں کے ذہن میں وہ واقعہ تازہ تھا، اور وہ ایک نبی کی بادشاہت اور ایک نفس پرست آدمی کی بادشاہت میں فرق کرنے سے اپنی طبیعت کی فتور کی بنا پر عاجز تھے، اس لئے جب اوریاہ جنگ میں گیا اور مارا گیا، تو انھوں نے اس طرح قیاس قائم کیا کہ داؤد علیہ السلام اس کی بیوی پر مائل تھے، اور وہ بادشاہ ہونے کی حیثیت سے اوریاہ کا قصہ پاک کرکے اس کی بیوی کو حاصل کرنے پر قدرت بھی رکھتے تھے، اس لئے ضرور انھوں نے قصداً اوریاہ کو جنگ پر بھجوایا ہوگا، اور قصداً ایسی تدبیر کی ہوگی کہ وہ مارا جائے۔ "یہ ہوگا" بھی بآسانی "ہے" میں تبدیل کردیا گیا، اور بڑھتے بڑھتے یوآب کو خط لکھنے کا قصہ تصنیف ہوگیا۔

کوئی شخص کسی عورت کو پسند کرتا ہو، اور وہ عورت بیوہ ہوجائے، تو اس شخص کا اس عورت سے نکاح کرلینا کوئی نرالی یا معیوب بات نہیں ہے۔ مگر جب حضرت داؤد نے بتشبع سے نکاح کیا (جیسا کہ توراۃ کا بیان ہے) تو اسرائیلی عوام نے سمجھا کہ یہ ان تمام افواہوں کی صداقت کا قطعی ثبوت ہے جو اس سلسلہ میں اڑ رہی تھیں۔ یہاں پھر اسرائیلیوں نے اپنی اصلی طینت کا اظہار کیا۔ گو ایسے معاملہ میں ہمیشہ دو مساوی الدرجہ امکان ہوا کرتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص نے اپنی پسندیدہ عورت کو

حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہ کی ہو، اور اس کے بیوہ ہو جانے کے بعد کوئی اخلاقی و قانونی مانع نہ پا کر اس سے نکاح کر لیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے اسے حاصل کرنے کے لئے مجرمانہ تدبیریں کی ہوں۔ کسی شہادت کی غیر موجودگی میں ایک امکان کو دوسرے امکان پر قطعی ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ لیکن ایسے مواقع پر انسان کی طینت اپنے آپ کو بے نقاب کرتی ہے۔ نیک طینت آدمی کا میلان ہمیشہ اچھے امکان کی طرف ہوتا ہے، اور اگر وہ شخص جس سے ایسا واقعہ متعلق ہو، صالح اور نیک چلن ہو تو نیک طینت آدمی یہی حکم لگائے گا کہ اس کا دامن پاک ہے۔ لیکن بد طینت آدمی ہمیشہ ہر طرف گندگی ہی گندگی ڈھونڈتا ہے۔ اس کی فطرت خود گندگی مانگتی ہے، اس لئے ایسے معاملات میں وہ ہمیشہ برے امکان ہی کو ترجیح دیتا ہے، حتیٰ کہ اگر شہادت سے اس کی تردید ہو جائے تب بھی اندر سے اس کا دل نہیں مانتا۔

یہاں پہنچ کر قرآن اور بائبل کا فرق اتنا نمایاں ہو جاتا ہے جتنا روشنی اور تاریکی کا فرق ہے۔ قرآن بنی اسرائیل کے ایک ہیرو کی زندگی کو روشن کر کے دکھاتا ہے، اور اس کے دامن پر ایک معمولی لغزش کا داغ بھی دھوئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ مگر خود بنی اسرائیل جس کتاب کو کتاب مقدس کہہ کر پیش کرتے ہیں، وہ ان کے ہیرو کی وہ تصویر بھی پیش نہیں کرتی جو پاک طینت انسانوں کے ذہن میں آنی چاہئے، بلکہ ایسی تصویر پیش کرتی ہے جیسے اس قوم کے نہایت بد طینت سفہاء نے کھینچا تھا! یہودی اور عیسائی اس کتاب کو خدا کی کتاب کہتے ہیں، حالانکہ اس میں ایک جگہ نہیں سیکڑوں مقامات پر ایسے بیانات اور ایسے خیالات ملتے ہیں جو خدا تو درکنار، شریف انسانوں کے نفس کی بھی ترجمانی نہیں کرتے۔

اسرائیلی کیرکٹر کے کمالات یہیں ختم نہیں ہوتے۔ اس کی معراج آپ کو دیکھنی ہو تو یہ دیکھئے کہ جب قرآن نے اس قوم کے انبیاء کی صفائی پیش کی، اور اس کا لگایا ہوا ایک ایک داغ ان کے دامنوں پر سے دھویا، تو یہ خوش ہونے کے بجائے الٹے کبیدہ خاطر ہوئے، احسان مند ہونے کے بجائے مقابلے پر اتر آئے، اور انہوں نے ان سب دامنوں کو جنہیں قرآن نے دھویا تھا، پھر سے داغدار کرنے کی کوشش کی۔ قرآن جب نازل ہوا

تو مدینہ میں یہودی موجود تھے، اور نزول قرآن کے چند سال بعد جب مسلمان ایشیا اور افریقہ کے وسیع علاقوں پر پھیلے تو یہودیوں کی ایک کثیر تعداد کو ان سے میل جول کا موقع ملا۔ ان لوگوں نے ہر نبی کے متعلق وہی تمام پرانے قصے جو ان کے ہاں مشہور تھے، مسلمانوں میں بھی پھیلا دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن مجید کی بہت سی تفسیریں جو مسلمانوں نے لکھیں، ان کے اثر سے مسموم ہو کر رہ گئیں۔ یہ معاملہ متداول تفاسیر کا مطالعہ کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے، اور حضرت داؤد کے قصے میں بھی یہی صورت پیش آئی ہے۔ مدینہ کے یہودیوں نے اوریاہ کی بیوی کا قصہ اس کثرت سے مسلمانوں میں پھیلایا تھا کہ عام طور پر لوگ قرآن پاک کے اس کوع کی تفسیر، توراۃ اور اسرائیلی خرافات ہی کے رنگ میں کرنے لگے تھے، حتیٰ کہ قرآن کی معنوی تحریف کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ آخر کار سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو یہ اعلان کرانے کی ضرورت پیش آئی کہ جو شخص اوریاہ حتی کا قصہ روایت کرے گا اس کو ۱۶۰ کوڑے لگائے جائیں گے، سو کوڑے حد قذف کے، اور مزید ۶۰ کوڑے ایک نبی کی توہین کے۔[۱]

اب ہم ان تاویلات پر ایک نظر ڈالیں گے جو اس قصہ کے سلسلہ میں مفسرین نے بیان کی ہیں:۔

(۱) عام طور پر مفسرین اور اہل الروایت وہی اوریاہ کا قصہ بیان کرتے ہیں جو یہودیوں سے منقول ہے، اور ان کے نزدیک داؤد علیہ السلام سے وہی معصیت کبریٰ سرزد ہوئی تھی، جس سے انھوں نے استغفار کیا۔ لیکن قرآن کے الفاظ اس تاویل کا ساتھ نہیں دیتے۔ قرآن نے مستغیث کا جو بیان نقل کیا ہے۔ اس میں وہ صرف یہ کہتا ہے کہ قَالَ أَكْفِلْنِيهَا وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ (اس نے کہا کہ اپنی یہ دنبی بھی مجھے دیدے، اور گفتگو میں اپنی شان و شوکت سے مجھے دبا لیا) یہ نہیں کہتا کہ اس نے دنبی مجھ سے چھین لی یا مجھ کو قتل کر دا کر چھیننے کی تدبیر کی۔

(۲) بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اوریاہ نے بتشبع کی صرف منگنی ہوئی تھی اور حضرت داؤد کا قصور

---

[۱] ملاحظہ ہو کشاف، تفسیر کبیر اور تفسیر بیضاوی۔

یہ تھا کہ انھوں نے اپنے ایک مسلمان بھائی کی منگنی پر اپنی منگنی بھیجی۔ لیکن قرآن کے الفاظ اس کی تائید نہیں کرتے۔ تمثیل میں لی نعجۃ کا لفظ آیا ہے جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ دنبی اس کی ملک تھی۔ یہ نہیں کہ وہ اس کو خریدنا چاہتا تھا، اور اس کے مالدار بھائی نے اس کی بولی پر بولی دیدی۔

(۳) بعض مفسرین کے نزدیک حضرت داؤد کی لغزش یہ تھی کہ جب اس عورت کا شوہر مارا گیا تو ان کو وہ رنج نہ ہوا جو ہونا چاہئے تھا، محض اس لئے کہ وہ اس عورت کی طرف میلان رکھتے تھے لیکن یہ ایک بے سرو پا بات ہے، اور اس سے وہ تمثیل بالکل بے معنیٰ ہو جاتی ہے جو ان سے متنبہ کی زبان بیان ہوئی ہے۔

(۴) ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ عورت کے قصہ کی سرے سے کوئی اصلیت ہی نہیں ہے۔ دراصل حضرت داؤد کے قتل کی سازش ہوئی تھی اور کچھ لوگ دیوار پھاند کر آگئے تھے۔ مگر جب حضرت داؤد ہوشیار ہوگئے تو انھوں نے محض بات بنانے کے لئے یہ مقدمہ گھڑ لیا۔ حضرت داؤد ان کی نیت تاڑ گئے اور انھوں نے ان لوگوں سے انتقام لینا چاہا۔ پھر بعد میں یا تو وہ اس بنا پر نادم ہوئے کہ انتقام کی خواہش ہی ان کے مرتبے سے گری ہوئی چیز تھی، یا اس پر نادم ہوئے کہ بغیر کسی ثبوت کے انھوں نے محض گمان پر ان لوگوں کو دشمن سمجھ لیا اور انہیں سزا دینی چاہی۔ بہرحال ان دو وجوہ میں سے کوئی ایک وجہ تھی جس پر انہیں ندامت ہوئی اور انھوں نے توبہ و استغفار کیا۔ لیکن اس تاویل پر متعدد اعتراض وارد ہوتے ہیں:۔

اوّلاً، یہ کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں کہ قرآن میں اس موقع پر اس شان سے اس کا ذکر ہوتا۔

ثانیاً، قرآن میں کوئی لفظ اس واقعہ پر دلالت نہیں کرتا کہ یہ لوگ قتل کے لئے آئے تھے اور حضرت داؤد اس بات پر نادم ہوئے تھے کہ انھوں نے ان سے انتقام لینا چاہا تھا یا بلا ثبوت ان پر بدگمانی کی تھی۔

ثالثاً، قرآن کی عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اپنا فیصلہ سناتے ہی حضرت داؤد کو یہ گمان ہوا کہ ان کے رب نے ان کو آزمائش میں ڈالا ہے۔ اس سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ اس تمثیل اور

اس فیصلہ کا آزمائش سے کوئی تعلق ضرور تھا اور اسی پر انھوں نے استغفار کیا۔

رابعاً، اگر وہ لوگ حقیقت میں دشمن تھے اور قتل کی نیت سے آئے تھے تو ان سے انتقام لینے کی خواہش ناجائز نہ تھی اور اس پر وہ تنبیہ غیر ضروری تھی جو یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً الخ میں کی گئی ہے۔ اور اگر وہ دشمن نہ تھے تو ان کا تمثیلی مقدمہ محض بات بنانے پر محمول نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس میں لامحالہ کوئی معنویت ہونی چاہیے۔

(۵) بعض مفسرین کا خیال ہے کہ حضرت داؤد نے دراصل اپنے لئے استغفار نہیں کیا تھا بلکہ ان لوگوں کے لئے استغفار کیا تھا جو ان کے قتل کو آئے تھے۔ لیکن اس صورت میں آزمائش کا ذکر بے معنی ہو جاتا ہے، اور یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً کی تنبیہ قطعاً بے محل ٹھیرتی ہے۔

(۶) موجودہ زمانہ کے بعض مفسرین کہتے ہیں کہ استغفار دراصل قاتلوں کے لئے نہ تھا بلکہ جب حضرت داؤد نے دیکھا کہ یہ لوگ قتل کے لئے آئے ہیں تو انھوں نے اللہ سے حفاظت اور پناہ کی دعا کی تھی۔ اس تاویل کی بنا یہ ہے کہ وہ استغفار کو لغوی معنوں میں لیتے ہیں، یعنی "اس امر کی دعا کہ اللہ ان کو اپنی حفظ و امان میں چھپالے"۔ مگر اول تو یہ تاویل عربیت کے خلاف ہے، دوسرے یہ نہایت رکیک بات ہے کہ داؤد علیہ السلام جیسا بہادر سپاہی محض دو دشمنوں کو دیکھ کر مقابلہ کرنے کے بجائے رکوع و سجود میں لگ جائے، تیسرے اس تاویل میں ظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰہُ اور فَغَفَرْنَا لَہٗ ذٰلِکَ اور یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً الخ کے فقرے بے معنی ہو جاتے ہیں۔

(۷) بعض حضرات کے نزدیک حضرت داؤد کی لغزش یہ تھی کہ انھوں نے محض ایک فریق کا بیان سُن کر فیصلہ صادر کر دیا اور دوسرے فریق کا بیان نہ لیا۔ لیکن یہ تاویل بھی مہمل ہے، کیونکہ اول تو قرآن میں دوسرے فریق کا بیان درج نہ ہونے سے لازماً یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اس کا بیان نہیں لیا گیا۔ ممکن ہے کہ اس نے اقرار کر لیا ہو، اس لئے اس کے ذکر کی ضرورت ہی نہ سمجھی گئی ہو،

اور قرآن کا یہ عام انداز بیان ہے کہ وہ کسی واقعہ کی غیر ضروری تفصیلات نہیں دیتا بلکہ صرف مطلب کی بات بیان کر دیتا ہے۔ دوسرے اس تاویل کے لحاظ سے وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہیں یہ تجھ کو خدا کے راستہ سے بھٹکا نہ دے) کی تنبیہ بے محل ہو جاتی ہے کیونکہ ایک فریق کا بیان سُن کر فیصلہ کر دینے میں حضرت داؤد کا کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہ تھا کہ اس سے اتباع ہویٰ لازم آئے۔ زیادہ سے زیادہ اس کو اصولِ عدالت سے ایک نادانستہ انحراف کہا جاسکتا ہے جس پر تنبیہ کی دوسری صورت ہونی چاہیے تھی۔

(۸) کچھ لوگوں نے ایک دوسری ہی تاویل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے اوقات کو چار حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک دن محض عبادت کرتے تھے۔ ایک دن مقدمات کے فیصلے فرماتے تھے۔ ایک دن اپنے خانگی معاملات کو دیکھتے تھے۔ اور ایک دن بنی اسرائیل کو وعظ و تلقین کرتے تھے۔ یہ تقسیم چونکہ وحی الٰہی کے بغیر کی گئی تھی، اور نبی کو وحی کے خلاف کوئی کام نہ کرنا چاہیے اس لئے، اور اس لئے کہ نبی کو زیادہ تر اپنا وقت وعظ و نصیحت اور فصل معاملات میں صرف کرنا چاہئے، اللہ تعالیٰ نے ان کو تنبیہ فرمائی۔ لیکن اس تاویل میں متعدد کمزوریاں ہیں:۔

اولاً تقسیم اوقات کی روایت محض ایک شاذ روایت ہے جو بعض مفسرین نے حضرت ابن عباس سے نقل کی ہے۔ اور خود حضرت ابن عباس سے جو قوی روایتیں مسروق اور سعید بن جبیر نے نقل کی ہیں وہ اُس تاویل کی تائید کرتی ہیں جو ہم نے اختیار کی ہے، یعنی مازاد داؤد علی ان قال انزل لی عنھا (حضرت داؤد نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا تھا کہ اس سے طلاق کی درخواست کی)۔ اسی کی تائید قرآن کے الفاظ قَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ سے بھی ہوتی ہے۔

ثانیاً، اگر کسی شخص کے پیشِ نظر حضرت ابن عباس کی یہ روایت نہ ہو تو وہ صرف یہی نہیں کہ قرآن مجید کی ان آیات کا یہ مطلب نہیں سمجھ سکتا، بلکہ ظاہر الفاظ سے وہ اس کے بالکل خلاف مطلب نکالے گا یہ

بات کتاب الٰہی تو درکنار معمولی انسانی تصنیفوں کے لئے بھی معیوب ہے کہ اس کے اپنے الفاظ اس کا مدعا ظاہر کرنے سے اس درجہ قاصر ہوں کہ اگر ایک خاص روایت اس کی تشریح کرنے والی سامنے نہ ہو تو ناظر اس کا بالکل الٹا مطلب لے نکلے۔ روایت اگر اصل متن کے متبادر مفہوم کی مزید تشریح کرتی ہو تو اس کے مفید ہونے میں کلام نہیں لیکن اگر وہ متبادر مفہوم سے ہٹا کر بات کو کسی اور طرف پھیر لے جائے تو ایسی روایت کو شارح کے بجائے متمم کہنا پڑے گا، اور اس سے لازم آئے گا کہ اس متمم کے بغیر قرآن ناقص ہے۔

ثالثاً، خود حضرت ابن عباس نے بھی اپنی اس روایت کو وجہ عتاب کی تفسیر میں بیان نہیں کیا ہے بلکہ صرف اس امر کی تشریح میں بیان کیا ہے کہ خصمین کو دیوار پھاند کر محراب میں جانے کی ضرورت کیا پیش آئی تھی ۔ اس کی شرح میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ دن حضرت داؤد کی عبادت کا تھا اور وہ اپنی محراب میں تشریف رکھتے تھے جو ان کے مکان کے بالائی حصہ میں واقع تھی۔ باقی رہی یہ بات کہ عبادت کے لئے ایک دن مخصوص کرنے پر اللہ تعالیٰ نے عتاب فرمایا تھا، تو اس کا اشارہ تک ابن عباسؓ کی روایت میں نہیں ہے۔

رابعاً، اگر بات یہی تھی جو یہ مفسرین بیان کرتے ہیں تو خصمین کے پورے مقدمہ کو نقل کرنے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ یہ بات قرآن کے اسلوب کے خلاف ہے کہ وہ کسی واقعہ کی ایسی تفصیلات نقل کرے جن سے اصل مقصود پر کوئی روشنی نہ پڑتی ہو۔ اس مقصد کے لئے صرف یہ بیان کرنا کافی ہو جاتا کہ لوگ ایک دوسرے پر ظلم کرنے لگے اور اس قسم کا ایک معاملہ ہم نے داؤد کو متنبہ کرنے کے لئے اس کے پاس بھی بھیج دیا۔

خامساً، عبادت میں افراط اور کثرت ایسی چیز نہیں ہے جس کو "ہویٰ" سے تعبیر کیا جائے۔ قرآن نے کہیں بھی اس فعل کو ہوائے نفس کی طرف منسوب نہیں کیا ہے، اور نہ کوئی ایک مثال ایسی ملتی ہے کہ کثرتِ عبادت

پر کسی کو عتاب فرمایا گیا ہو۔ پھر کس طرح تصور کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ایک عبادت گزار بندے کو عبادت کی زیادتی پر ان الفاظ میں تنبیہ فرماتا کہ "خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ یہ تجھے گمراہ کر دے گی"۔

ان وجوہ سے ہمارے نزدیک یہ تاویل بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔

ان تمام احتمالات کے ساقط ہو جانے کے بعد وہی تاویل باقی رہ جاتی ہے جس کو ہم نے اختیار کیا ہے اور جس کی طرف بعض قدیم مفسرین بھی گئے ہیں، یعنی یہ کہ معاملہ اوریاہ کی بیوی ہی کا تھا مگر اس کی اصلیت صرف اس قدر تھی کہ حضرت داؤد نے اپنے عہد کی اسرائیلی سوسائٹی کے عام رواج سے متاثر ہو کر اوریا سے طلاق کی درخواست کی تھی۔ یہ تاویل اس لحاظ سے بھی مرجح ہے کہ اگر اوریاہ کی بیوی کے معاملہ کی سرے سے کوئی اصلیت ہی نہ ہوتی تو قرآن مجید اس موقع پر صاف الفاظ میں اس کی تردید کرتا، جس طرح اس نے حضرت سلیمان کے حق میں کفر و شرک اور ساحری کے الزام کی تردید کی، کیونکہ یہودیوں میں یہ قصہ ایک امرِ واقعی کی طرح مشہور تھا اور قرآن کے لئے یہ غیر ممکن تھا کہ ایک نبی کا ذکر تو کرے مگر اس کے دامن پر ایسے شدید الزامات کا داغ بدستور رہنے دے۔ اس تاویل کو قبول کرنے میں لوگوں نے صرف اس بنا پر تامل کیا ہے کہ انبیاء کی طرف اس قسم کی لغزشوں کا انتساب، عصمتِ انبیاء کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ان حضرات نے شاید اس امر پر غور نہیں کیا کہ عصمت دراصل انبیاء کے لوازمِ ذات سے نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصبِ نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے مصلحۃً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے، ورنہ اگر اللہ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لئے بھی ان سے منفک ہو جائے تو جس طرح عام انسانوں سے بھول چوک اور غلطی ہوتی ہے، اسی طرح انبیاء سے بھی ہو سکتی ہے۔ اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں سرزد ہو جانے دی ہیں تاکہ لوگ انبیاء کو خدا نہ سمجھ لیں، اور جان لیں کہ یہ بشر ہیں، خدا نہیں ہیں۔

اس قصہ میں دو چھوٹی چھوٹی غلط فہمیاں اور بھی ہیں جو زبان زد عام ہو گئی ہیں:-

ایک یہ کہ سیدنا داؤد علیہ السلام کی ۹۹ بیویاں تھیں۔ اس کی بنا یہ ہے کہ تمثیل میں ۹۹ دنبیوں کا ذکر ہوا ہے۔ لیکن در حقیقت ۹۹ سے محض کثرت مراد ہے نہ کہ بعینہ یہ عدد۔ مستغیث نے دراصل تمثیل کے پیرایہ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ آپ کے پاس بہت سی عورتیں موجود ہیں، اور بہت سی عورتوں سے بیاہ کرنے کی آپ قدرت رکھتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ جو اشخاص خصم بن کر حضرت داؤد کے پاس پہنچے تھے وہ انسان نہیں بلکہ فرشتے تھے۔ اس گمان کی بنا اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ دیوار پھاند کر محراب میں پہنچ گئے تھے لیکن یہ ایک بہت کمزور بات ہے۔ فرشتوں کا انسانی صورت میں آنا بجائے خود مستبعد نہیں، مگر یہاں نہ تو فرشتوں کے آنے کی کوئی خاص ضرورت نظر آتی ہے، اور نہ دیوار پھاندنا کوئی ایسی عجیب بات ہو کہ انسان کو لئے غیر ممکن ہو، اور صرف فرشتوں سے ہی بن آئے۔ پس جب اللہ نے تصریح نہیں کی کہ وہ فرشتے تھے، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے دل سے ان کو فرشتہ بنا دیں۔

بعض لوگوں نے خصمین کے ملک ہونے کی ایک دلیل یہ بھی بیان کی ہے کہ حضرت داؤد ان کے آنے سے گھبرا گئے تھے لیکن یہ استدلال بھی کمزور ہے۔ جب کوئی شخص اپنی خلوت گاہ میں ہو جہاں کسی غیر کے آنے کا سان گمان بھی نہ ہو، اور اچانک کوئی شخص پھاند کر اس کے پاس پہنچ جائے تو فطرت کا تقاضا یہی ہو کہ وہ گھبرا جائے۔ اس میں ایسی کونسی انوکھی بات ہے کہ آنے والوں پر فرشتہ ہونے کا گمان کیا جائے۔

هٰذَا مَا عِنْدِیْ وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰہِ

رسائل و مسائل

نماز میں آلۂ مکبّر الصّوت کا استعمال

جمادی الاخریٰ کے پرچے میں آلۂ مکبر الصوت پر جو فقہی بحث کی گئی تھی اس کو دیکھ کر ایک صاحب نے حضرت مولانا تھانوی مدظلہ العالی کا ایک فتویٰ مجھے بھیجا ہے جو اسی مسئلہ کے متعلق ہے۔ ذیل میں اس کو لفظ بلفظ نقل کیا جاتا ہے :-

سوال

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک مشین ایسی ایجاد ہوئی ہے کہ مقرر کی آواز کو بہت فاصلہ تک اسی طرح پہنچا دیتی ہے جس طرح پاس کے اشخاص کو پہنچتی ہے۔ پس کیا یہ جائز ہے کہ ان مشینوں کے ذریعہ سے خطیب کی آواز کو تمام سامعین تک پہنچا دیا جائے؟"

الجواب

"اوّل ایک قاعدہ سمجھ لیا جاوے جو کہ عقلی بھی ہے اور نقلی بھی۔ اور فقہائے حنفیہ نے اس قاعدہ پر بہت احکام کو متفرع کیا ہے۔ وہ یہ کہ جو مباح یا مندوب درجہ ضرورت و مقصودیت فی الشرع تک نہ پہنچا ہو، اور اس میں کوئی مفسدہ باحتمال قریب محتمل ہو تو اس مباح یا مندوب کا ترک اور اس سے منع کرنا لازم ہے۔ عقلی ہونا تو اس کا ظاہر ہے۔ اور قول فقہاء کے بعد اس کے ماخذ نقلی کی نقل ضروری نہ تھی۔ مگر تبرعاً اس کو بھی نقل کرتا ہوں۔ سوا اس کے نقلی ہونے کی تقریر

یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ سب آلہہ باطلہ مباح تو ضرور ہی ہے۔ اور بعض حالات میں مندوب بھی۔ مگر مقصود مستقل نہیں کیونکہ اس کی غایت دوسرے طریق سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ یعنی حکمت و موعظت و مجادلہ حسنہ سے۔ اور اس میں مفسدہ سب مشرکین للالہ الحق کا ہے۔ اس لئے اس سے نہی فرمادی گئی۔ اور اس قاعدہ کی تمہید کے بعد جواب ظاہر ہے کہ تبلیغ صوت سامعین بعید تک شرعاً غیر ضروری ہے کیونکہ بعیدین کو دوسرے غیر مخدوش ذریعہ سے تبلیغ ممکن ہے اور اس میں یہ مفسدہ محتمل کہ لوگ اس سے گنجائش سمجھ جاویں گے اس آلہ کو لہو میں استعمال کرنے کی، یا دوسرے آلاتِ لہو کے استعمال کرنے کی۔ لہٰذا ترک اور منع لازم ہوگا۔ یہ تو اس وقت ہے جب خطیب سے مراد مطلق واعظ اور لکچرار ہو۔ اور اگر اس سے مراد خطیب جمعہ و عیدین کا ہے تو اس وقت تبلیغ صوت کا غیر ضروری ہونا اظہر ہے، اس لئے کہ خطبہ میں حضور مقصود ہے نہ کہ سماع صوت، اور مفسدہ اقوی ہے کیونکہ اس آلہ کو مسجد میں داخل کرنا ہوگا جو کہ اس کے احترام کے خلاف ہے نیز تشبہ ہے مجالس غیر مشروعہ کے ساتھ۔ اسی تشبہ کی بنا پر فقہا نے غرس اشجار فی المسجد کو منع فرمایا ہے اور تشبہ بالبیعہ والکنیسہ سے معلل کیا ہے۔ واللہ اعلم۔"

یہ ایک ایسے جلیل القدر عالم کا فتویٰ ہے جو اس وقت دنیائے اسلام کے ممتاز ترین علماء کی صف اول میں ہیں۔ میرے علم کو ان کے علم سے وہ نسبت ہے جو ذرے کو آفتاب سے ہوتی ہے۔ اگر اس نسبت کا لحاظ کروں تو مجھے نہ صرف یہ کہ اس پر کلام نہ کرنا چاہئے بلکہ اپنی تحقیق کو چھوڑ کر حضرت ممدوح کی تحقیق قبول کر لینی چاہئے لیکن جب میں سلف کے طریق پر نظر ڈالتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہاں من قال کو نہیں بلکہ ما قال کو دیکھنے کا قاعدہ جاری تھا۔ شاگرد، استاد کی تحقیق کے مقابلہ میں، اور چھوٹے بڑوں کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے اور تحقیق بے تکلف پیش کیا کرتے تھے، نہ اس زعم کے ساتھ کہ بڑوں کے علم سے ان کا علم زیادہ یا ان کے برابر ہے، بلکہ یہ سمجھ کر کہ حق کی تلاش و تحقیق ہر طالب العلم کا فرض ہے، اور اس تلاش و تحقیق میں اس کو شخصی عظمتوں کے تصور سے خالی الذہن

ہو کر نفس حقائق کو دیکھنا چاہئے۔ ان کے نزدیک یہ ضروری نہ تھا کہ ایک شخص دوسرے شخص کے برابر یا اس سے زیادہ علم رکھتا ہو تب ہی اس کے مقابلہ میں اپنی تحقیق پیش کرے، ورنہ چپ رہے اور اپنی فکر و نظر کو معطل کر کے اس کی تحقیق کو مان لے۔ اگر یہ ذہنیت اس زمانہ میں ہوتی تو امام ابوحنیفہ کے مقابلہ میں امام شافعی اور امام شافعی کے مقابلہ میں امام احمد کوئی مذہب اختیار ہی نہ فرماتے۔ رحمہم اللہ۔ یہ حضرات رشد و ہدایت کے امام تھے اور ان کا طریقہ ہر زمانہ میں طالبانِ علم کے لئے بہترین نشانِ راہ ہے، اسی لئے ان کی پیروی کرتے ہوئے میں بھی حضرت مولانا تھانوی کے مقابلہ میں اپنی علمی بے مائیگی کو جاننے کے باوجود اس فتوی پر کلام کر رہا ہوں۔

فتوی کی بنا جس قاعدہ پر رکھی گئی ہے وہ یقیناً مسلم ہے۔ صرف فقہائے حنفیہ ہی نے نہیں بلکہ دوسرے ائمۂ اسلام نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے، اور ایک آیت نہیں بلکہ کتاب و سنت کی متعدد تصریحات اس کا ماخذ ہیں۔ لیکن یہ امر محل نظر ہے کہ آیا اس خاص جزئیہ میں بھی یہ قاعدہ جاری ہو سکتا ہے یا نہیں۔ آلہ مکبر الصوت کو کسی حیثیت سے بھی آلۂ لہو نہیں کہا جا سکتا۔ آلۂ لہو کا اطلاق اصلاً تو اس آلہ پر ہوتا ہے جو لہو ہی کے لئے بنایا گیا ہو، اور اس کا کوئی دوسرا استعمال بجز لہو کے نہ ہو، مثلاً بانسری یا ہارمونیم۔ اور تبعاً اس کا اطلاق ایسے آلہ پر بھی ہو سکتا ہے جو اگرچہ بجائے خود لہو کے لئے موضوع نہ ہو لیکن اس کا غالب استعمال لہو ہی میں ہو، مثلاً گراموفون۔ مکبر الصوت ان دونوں صنفوں میں سے کسی صنف میں بھی داخل نہیں۔ اس کو صرف اس لئے بنایا گیا ہے کہ چھوٹی آواز کو بڑا کر دے اور دور تک پہنچائے۔ اس کا استعمال لہو اور غیر لہو دونوں میں ہوتا ہے، اور غیر لہو میں بہ نسبت لہو کے زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے شیشے کا گلاس کہ اس میں شراب بھی پی جاتی ہے اور حلال مشروبات بھی، یا بجلی کا لیمپ اور برقی پنکھا کہ یہ چیزیں تھیٹروں اور رقص خانوں اور فحش کدوں میں بھی استعمال ہوتی ہیں اور پاک مجلسوں میں اور مباح اغراض میں بھی۔ اب اگر ناجائز استعمال کی وجہ سے ان چیزوں کو آلۂ لہو یا آلۂ منکر نہیں کہا جا سکتا، تو مکبر الصوت کو بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اگر گلاس اور پنکھے اور لیمپ کے استعمال میں مجالس غیر مشروعہ سے تشبہ نہیں ہے تو مکبر الصوت میں بھی نہیں ہے۔ اگر شیشے کا گلاس استعمال کرنے سے اس مفسدہ کا احتمال نہیں ہے کہ لوگ اس کو شراب نوشی میں استعمال کرنے کی گنجائش نکال لیں گے، اور اگر مسجد میں بجلی کی روشنی اور پنکھا لگانے سے یہ مفسدہ پیدا نہیں ہوتا کہ لوگوں کے لئے رقص خانوں میں جانے کی گنجائش نکل آئے گی، تو مکبر الصوت کے استعمال میں بھی ایسے کسی مفسدہ کا احتمال نہیں۔ جب برقی پنکھے اور روشنی کے قمقمے لگانا احترام مسجد کے خلاف

نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مکبر الصوت لگانا اہانت مسجد کا موجب ہو۔

اس میں شک نہیں کہ مکبر الصوت اس زمانہ میں زیادہ تر بلکہ تمام تر معروف کے بجائے منکر کی خدمت کر رہا ہے لیکن آج کونسی چیز ہے جو منکر کی خدمت نہیں کر رہی ہے؟ قلم و دوات سے لے کر چھاپہ کی مشین، ریل، موٹر، ہوائی جہاز اور ریڈیو تک ہر چیز کا غالب استعمال آج فحش و منکرات کے لئے ہو رہا ہے، ہر چیز سے ظلم و عصیان کی خدمت لی جا رہی ہے، اور ان سب سے اس تہذیب کو فروغ دیا جا رہا ہے جس کی بنیاد ناخدا شناسی بلکہ خدا سے بغاوت پر رکھی گئی ہے۔ اس کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ خدا کی پیدا کی ہوئی طاقتوں کو دریافت کرنے اور ان سے خدمت لینے کا سارا کام آج وہ لوگ کر رہے ہیں جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں انھوں نے اسباب عالم کو قابو میں لانے اور ان سے معروف کی خدمت لینے کا کام چھوڑ رکھا ہے۔ اسی وجہ سے پورا انسانی تمدن ناپاک ہو گیا ہے اور دنیا کی ہر چیز آلۂ منکر بن کر رہ گئی ہے۔ اب اگر ہم یہ کہہ کر ایک ایک چیز کو اس بنا پر چھوڑتے چلے جائیں کہ فلاں چیز آلۂ منکر ہے اور فلاں چیز کو استعمال کرنے سے فاسقین و ظالمین کے ساتھ تشبہ ہو جائے گا، تو ہمیں تمدن ہی سے الگ ہو جانا پڑے گا، اور یہ مزید غلطی ہوگی۔ اس سے خدا پرستانہ تہذیب اور زیادہ مغلوب اور ظالمانہ تہذیب اور زیادہ غالب ہوتی چلی جائے گی، اس لئے کہ جو تہذیب مشینوں کے زور سے پھیل رہی ہو اس کے مقابلہ میں وہ تہذیب کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جو تمام کارگر ذرائع اور طاقت ور اسباب سے خود ہی دست بردار ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ موٹر پر دوڑنے والے کا مقابلہ چھکڑے پر چلنے والا نہیں کر سکتا۔ جو لوگ ریڈیو کے زور سے ایک سکنڈ کے اندر باطل کی آواز کرۂ زمین کے ایک ایک کونے میں پہنچا دیں، اور کروڑہا کروڑ انسانوں کے خیالات کو ایک جنبش زبان سے مسموم کر کے رکھ دیں ان کے مقابلہ میں وہ لوگ کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں جو ایک جلسہ کے سامعین تک بھی حق کی آواز پہنچانے میں خدا کی پیدا کی ہوئی ایک طاقت سے کام لیتے ہوئے جھجکتے ہوں منکر کی آواز بلند کرنے والے تو ایک شخص کو بھی اپنی بات سنائے بغیر چھوڑنا پسند نہ کریں، اور معروف کی آواز بلند کرنے والوں کا انداز فکر یہ ہو کہ سامعین بعید تک تبلیغ صوت کا پہنچانا ضروری تو ہے نہیں، لہذا کیوں اس کی کوشش کی جائے۔ اس طرز عمل کا انجام جو کچھ ہوگا، بلکہ ہو رہا ہے اس کو ہر شخص بادنیٰ تامل جان سکتا ہے۔ اس کے معنی در اصل یہ ہیں کہ ہم ایک ایک ہتھیار کو یہ کہہ کر پھینکتے جائیں کہ دشمن کے استعمال سے وہ گندہ ہو گیا ہے، اور دشمن ان سب ہتھیاروں کو اٹھا کر ہم پر حملہ

کرتا چلا جائے۔

یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ سامعین بعید تک تبلیغ صوت شرعاً غیر ضروری ہے، مگر یہ درست نہیں ہے کہ تبلیغ صوت اور سماع حاضرین کو درجہ مقصودیت فی الشرع حاصل نہیں۔ نماز میں قرآن اسی لئے پڑھا جاتا ہے کہ مقتدی اس کو سنیں۔ خود قرآن میں اس مقصد کی تصریح موجود ہے کہ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا۔ خطبہ بھی اسی لئے دیا جاتا ہے اور شارع نے اسی غرض سے خطبہ کے وقت بات چیت سے منع کیا ہے۔ استماع کا مقصود ہونا تو نقلاً بھی ثابت ہے، اور عقلاً بھی۔ ظاہر ہے کہ کلام اسی لئے ہوتا ہے کہ لوگ اس کو سنیں۔ منہ سے آواز اسی لئے نکالی جاتی ہے کہ کانوں تک پہنچے۔ اب رہا یہ امر کہ شارع نے اس کو ضروری کیوں نہیں قرار دیا، تو میں عرض کروں گا کہ یہ رخصت کے قبیل سے ہے۔ چونکہ اس زمانہ میں کوئی ایسا ذریعہ موجود نہ تھا جس سے دور تک آواز پہنچائی جا سکے، اور آج بھی ہر وقت ہر جگہ مکبر الصوت مہیا نہیں ہو سکتا اس لئے استماع کو لازم نہیں کیا گیا کہ اس کے بغیر نماز ہی نہ ہو، یا حضور خطبہ کا ثواب ہی حاصل نہ ہو سکے۔ مگر اس نرمی اور رخصت کو جو محض طبعی موانع کا لحاظ کر کے عطا کی گئی ہے، اس امر کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ تبلیغ صوت کا اہتمام غیر ضروری ہے حتیٰ کہ اگر اس کے لئے کوئی ذریعہ مہیا ہو جائے تب بھی اسے قصداً ترک کر دیا جائے۔

آخر میں یہ بات بھی صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ اس مسئلے پر میرے بار بار لکھنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مجھے خاص طور پر لاؤڈ اسپیکر سے کوئی دلچسپی ہے۔ بلکہ در اصل میرا مقصد یہ ہے کہ سائنٹفک ایجادات اور تمدن حدیث کے آلات و وسائل کے متعلق مسلمان اپنا رویہ بدلیں۔ یہ آلات بجائے خود ناپاک نہیں ہیں۔ اصل میں وہ طریق استعمال ناپاک ہے جو مغرب کی باغیانہ تہذیب نے اختیار کر رکھا ہے۔ خداوند عالم نے جن چیزوں کو انسان کے لئے مسخر کیا ہے وہ بالیقین پاک اور مطہر ہیں اور ان کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ ان سے خدائی قانون کے مطابق کام لیا جائے، مگر ان پر دوہرا ظلم ہو رہا ہے کہ جن کے پاس خدائی قانون موجود ہے وہ ان سے کام نہیں لیتے، اور جو ان سے کام لے رہے ہیں وہ شیطانی قانون کے متبع ہیں۔

ضمیمہ ترجمان القرآن

دستور العمل

ادارۂ دار الاسلام

مع

توضیح مقاصد و طریق کار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

توضیح مقاصد و طریق کار

اسلام محض ایک عقیدہ اور چند جسمانی عبادات اور مذہبی رسموں کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ ایک ضابطۂ زندگی ہے جسکا دائرہ انسانی اعمال کے تمام گوشوں کو اپنے حدود میں سمیٹ لیتا ہے، ایک جامع تہذیب ہے، جو ایک مکمل نظام تمدن پیدا کرتی ہے۔ جو لوگ اس تہذیب کے اصولوں پر ایمان رکھتے ہوں صرف وہی "مسلمان" ہیں، اور مسلمان ہونیکے ساتھ ہی ان پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ انسانی تمدن کی بنا اسلام کے اصولوں پر قائم کریں۔ "مسلمان" کسی نسلی یا وطنی قوم کا نام نہیں ہے۔ اسکی نوعیت انگریز یا جرمن کی سی نہیں ہے، جو پیدائشی طور پر انگریز یا جرمن ہوتا ہے، اور انگریزیت یا جرمنیت اسکی ذات سے کسی حال میں منفک نہیں ہو سکتی، خواہ اسکے خیالات اور اطوار کچھ ہی ہوں۔ بلکہ اسکی نوعیت سوشلسٹ کی سی ہے جسکا سوشلسٹ ہونا اسکے عقیدہ و مسلک پر موقوف ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص کا عقیدہ و مسلک "سوشلزم" نہیں ہے، تو وہ سوشلسٹ نہیں ہے، خواہ وہ سوشلسٹ کے گھر پیدا ہوا ہو اور سوشلسٹ سوسائیٹی سے اپنے آپکو منسوب کرتا ہو۔ بعینہ یہی مثال مسلمان کی بھی ہے۔ جسطرح ایک سوشلسٹ، اسوقت تک سوشلسٹ نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ سوشلزم کو سب سے بہتر نظام فکر و عمل تسلیم نہ کرے، اسیطرح کوئی مسلمان بھی اسوقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اسلام کو بہترین نظام فکر و عمل نہ سمجھے۔ پھر جسطرح سوشلسٹ ہونیکے ساتھ ہی فطری طور پر یہ لازم آجاتا ہے کہ آدمی اپنے گرد و پیش کی کارگاہِ حیات کو اشتراکی نظام تمدن میں تبدیل کرنے

کی کوشش کرے، اسیطرح مسلمان ہوتے ہی یہ خود بخود لازم آجاتا ہے کہ آدمی اپنے ماحول کو "دارالاسلام" بنانے کی کوشش کرے۔ یہ محض ایمان و اعتقاد کا طبعی اقتضا ہی نہیں ہے بلکہ عملی دنیا کی ایک ناگزیر ضرورت بھی ہے۔ کوئی شخص اور کوئی گروہ اپنے نصب العین اور اپنے تخیلات کے مطابق زندگی بسر کر ہی نہیں سکتا جب تک وہ اس نظام تمدن کو، جسکے اندر وہ رہتا ہے، اپنے تخیلات کے مطابق نہ ڈھال لے۔ فاسستی یا سرمایہ داری نظام تمدن میں سوشلسٹ بنکر رہنا انسان کیلیے ناممکن ہے۔ ایسے نظام میں جب تک وہ رہیگا، اعتقاداً سوشلسٹ اور عملاً غیر سوشلسٹ بنکر رہیگا۔ بالکل اسیطرح غیر اسلامی نظام تمدن میں بھی انسان کا مسلمان بنکر رہنا غیر ممکن ہے۔ کچھ مدت کیلیے وہ محض اپنے ارادہ کی زبردستی سے اعتقادی اسلام اور عملی کفر جیسے دو نقیضوں کو اپنی زندگی میں جمع کریگا، مگر بالآخر ماحول کی مخالف طاقتیں اعتقاد کے مرکز سے بھی اسلام کو ہٹا دینگی۔ پس یہ بات بادنیٰ تامل سمجھ میں آسکتی ہے کہ مسلمان کیلیے اپنے ماحول کو دارالاسلام میں تبدیل کرنیکی کوشش کرنا محض اقتضائے ایمان ہی نہیں ہے، بلکہ ایک ناگزیر ضرورت ہے مسلمان ہونے اور مسلمان رہنے کیلیے اسکے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اپنے وطن کو دارالاسلام بنانیکی خواہش یا کوشش کرنا کسی طرح بھی حُبِ وطن کے خلاف نہیں ہے، اور نہ حریت طلبی ہی کے منافی ہے۔ اس باب میں بھی مسلمان کی پوزیشن سوشلسٹ کی پوزیشن سے ملتی جلتی ہے۔ آپ اس سوشلسٹ کو غیر محب وطن نہیں کہہ سکتے جو اپنے وطن کو زندگی کا وہ نظام دینا چاہتا ہے جو اسکے نزدیک بہترین ہے۔ اور آپ اسکو آزادی کا دشمن بھی نہیں کہہ سکتے۔ اسکے نزدیک اصلی آزادی محض غیر ملکیوں کی غلامی سے آزاد ہونیکا نام نہیں ہے بلکہ سرمایہ داری کے چنگل سے نجات پا جانیکا نام ہے۔ اگر کسی تحریک آزادی میں غیر ملکی قہر و استبداد کی زنجیریں کٹنے کیساتھ ساتھ ملکی سرمایہ داری کی بندشیں بھی مضبوط ہوتی جا رہی ہوں، تو سوشلسٹ اسکو دور سے سلام کریگا، کیونکہ اسکے عقیدہ و مسلک کی رو سے یہ آزادی کی نہیں بلکہ ایک غلامی کی جگہ دوسری غلامی کے تسلط کی تحریک ہوگی۔ ایسی حالت میں وہ مجبور ہوگا

کہ غیر ملکی اقتدار کے خلاف جنگ کرنیکے ساتھ ہی ملکی سرمایہ داری کے خلاف بھی جنگ شروع کر دے۔ اور ان لوگوں کی رائے کا کوئی لحاظ نہ کرے جو اسکی ایسی جدوجہد کو حصول آزادی میں مانع سمجھتے ہوں، کیونکہ اسکا تصور آزادی ہی اصلاً ان لوگوں کے تصور آزادی سے مختلف ہے جو محض بیرونی اقتدار ہٹ جانیکا نام آزادی رکھتے ہیں۔ ٹھیک ٹھیک ایسی ہی پوزیشن مسلمان کی بھی ہے۔ اسکے نزدیک حُبِّ اسلام اور حُبِّ وطن میں کوئی منافات نہیں۔ اسکے لیے عین حب وطن یہی ہے کہ وہ اپنے وطن کو معاشرت اور معیشت اور سیاست اور اخلاق کا وہ عادلانہ نظام دے جسکا نام اسلام ہے۔ اسکے نزدیک اصلی آزادی انگریز کے پنجہ سے آزاد ہونیکا نام نہیں ہے، بلکہ جاہلیت سے آزاد ہونیکا نام ہے، عام اس سے کہ وہ بدیشی جاہلیت ہو یا سودیشی۔ اگر بیرونی حکمران ہٹ جائیں اور انکی جگہ وطنی حکمران لے لیں، مگر جاہلیت وہی کی وہی رہے، تو اسکے نزدیک حقیقت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ وہ غلامی کی جس زنجیر کو کاٹنا چاہتا ہے وہ دراصل جاہلیت کی زنجیر ہے۔ اسکے نزدیک آزادی کی جنگ اسی زنجیر پر ضرب لگانے کا نام ہے، اور مسلمان کی حیثیت سے وہ جب کبھی آزادی حاصل کرنیکے لیے اٹھیگا تو اسی زنجیر پر ضرب لگائیگا۔ اگر اسکا نتیجہ یہ ہو کہ جاہلیت کی حفاظت کیلیے سودیشی جاہلیت کے علمبردار بدیشی جاہلیت کے علمبرداروں سے مل جائیں تو مسلمان اسکی قطعاً پرواہ نہ کریگا، اور دونوں کو ایک ہی نوع کا دشمن سمجھ کر دونوں سے لڑیگا، بالکل اسیطرح جسطرح کہ سوشلسٹ اسکی پرواہ نہ کریگا کہ اشتراکی تحریک آزادی کے مقابلہ میں ملکی سرمایہ دار غیر ملکی سرمایہ داروں کیساتھ مل جائیں۔ وہ دونوں کو ایک درجہ میں رکھ کر دونوں سے لڑیگا۔ اس کو حریت دشمنی یا وطن دشمنی سے تعبیر کرنیوالے لوگ ناواقف ہیں۔ وہ بیچارے ان لوگوں کے نقطۂ نظر کو سمجھ ہی نہیں سکتے جو انسانی زندگی کے متعلق اپنا ایک عقیدہ اور مسلک رکھتے ہیں، اور جنکا عقیدہ و مسلک ہی عین انکی زندگی ہے۔

لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ غیر مسلموں سے زیادہ خود مسلمان آجکل اپنی پوزیشن کو سمجھنے میں غلطی کر رہے ہیں۔ وہ "دار الاسلام" کا نام زبان پر لاتے ہوئے ڈرتے ہیں، اور اس لفظ کو سنکر ان پر لرزہ چڑھ جاتا ہے، کَاَنَّمَا یُسَاقُوْنَ اِلَی الْمَوْتِ وَھُمْ یَنْظُرُوْنَ۔ ایک سوشلسٹ تو علانیہ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے

اپنے خطبۂ صدارت میں یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ "ہم ہندوستان کو ایک سوشلسٹ اسٹیٹ میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور اسکے لیے ملک کو ابھی سے تیار کرنیکی ضرورت ہے"[1] ایک دوسرا سوشلسٹ علانیہ یہ لکھنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ "ہندوستان کے اور تمام دنیا کے مسائل کا حل اسکے سوا کوئی نہیں کہ ایک اشتراکی نظام قائم کیا جائے، پہلے قومی دائرے میں (یعنی ہندوستان میں) اور پھر ساری دنیا میں"[2] یہی نہیں بلکہ وہ یہ کہنے کی بھی جرأت کرسکتا ہے کہ:

"جس چیز میں ایک پوری قوم بلکہ کل نوع انسانی کی بھلائی ہو وہ محض اسلیے نہیں روکی جاسکتی کہ کچھ لوگ جو موجودہ نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس تغیر کے مخالف ہیں۔ اگر کچھ سیاسی یا تمدنی ادارے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو انہیں مٹادینا چاہیے"[3]

اور وہ یہ کہنے کی جرأت بھی کرسکتا ہے کہ:-

"سوسائٹی کی موجودہ کشمکش یعنی قومی جنگ اور پھر طبقات کی جنگ کا تصفیہ جبر کے سوا کسی اور صورت سے ممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال (یعنی اشتراکی) بنانے کا کام بہت بڑے پیمانے پر کرنا پڑیگا، کیونکہ جب تک بہت بڑی جماعت ہم خیال نہ ہوجائے اسوقت تک نظام تمدن کو بدلنے کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہوسکے گی۔ لیکن اسکے بعد تھوڑے لوگوں پر جبر کرنے کی ضرورت ہوگی"[4]

---

[1] ملاحظہ ہو مسٹر سوبھاش چندر بوس کا خطبۂ صدارت ہری پورہ کانگریس:-

"SOCIALISM IS NOT AN IMMEDIATE PROBLEM FOR US NEVER-THE-LESS SOCIALIST PROPAGANDA IS NECESSARY TO PREPARE THE COUNTRY FOR SOCIALISM WHEN POLITICAL FREEDOM HAS BEEN WON"

[2] ملاحظہ ہو پنڈت جواہرلال کی خود نوشت سوانح عمری۔ ترجمۂ اردو۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۹ام

[3] ایضاً۔

[4] ایضاً۔ صفحہ ۷۰-۴۶۹

مگر ایک مسلمان یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ میرا نصب العین اس ملک کو اور اسکے بعد ساری دنیا کو دارالاسلام بنانا ہے، اور میں اس مقصد کیلیے پہلے ایک کثیر جماعت کو اسلامی نظام کی اصلیت کا قائل بناؤنگا، اور پھر طاقت سے اس نظام کو قائم کرونگا ولوکرہ الکافرون۔ حالانکہ سوشلزم کو ابھی ہندوستان میں آئے چند سال سے زیادہ نہیں ہوئے ہیں، اور اسکے معتقدین کا دائرہ صرف متوسط درجہ کے اور اونچے تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک مٹھی بھر جماعت تک محدود ہے۔ بخلاف اسکے اسلام یہاں آٹھ نو صدیوں کی زبردست تاریخ اپنے پیچھے رکھتا ہے، اور اس ملک کی ایک چوتھائی آبادی پہلے ہی سے اسکی معتقد ہے۔ شائد کسی انقلابی تحریک کو بھی اس سے زیادہ مضبوط بنیاد آج تک نہیں ملی جتنی اسلامی انقلاب کی تحریک کو اس وقت حاصل ہے۔ کسی تحریک کیلیے اس سے بہتر آغاز (START) اور کیا ہوسکتا ہے کہ پہلے ہی سے آٹھ نو کروڑ آدمی ایک ملک اور چالیس پچاس کروڑ آدمی تمام دنیا میں اسکے معتقد موجود ہوں لیکن اسکے باوجود ہم حیرت کیساتھ یہ دیکھتے ہیں کہ مٹھی بھر سوشلسٹ جس چیز کیلیے کھلم کھلا کوشش کرنے کی جرأت کرسکتے ہیں اسکا نام تک زبان پر لانے کی جرأت مسلمان اپنے اندر نہیں پاتے۔

آخر اسکی وجہ کیا ہے؟ اسکی وجہ ضعفِ ایمان کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہماری قوم میں بکثرت لوگ ایسے ہیں جو بند کمروں میں بیٹھ کر بے تکلف اعتراف کرتے ہیں کہ "دارالاسلام" ایک مسلمان کا فطری نصب العین ہے اور اسکے بغیر اسلامی زندگی ممکن نہیں۔ مگر کھلی ہوا میں اس قول کو منہ سے نکالتے ہوئے انہیں ڈر لگتا ہے کہ زمین و آسمان کا ایک ایک ذرہ ان کا دشمن ہو جائیگا، اور ایک ایسی لڑائی میں انکو مبتلا ہو جانا پڑیگا جسکے "تخت" پر ختم ہونے کا امکان تو بہت بعید ہے، البتہ "تختہ" پر ختم ہونے کا امکان بالکل سامنے نظر آتا ہے۔ صرف یہی ایک وجہ ہے جسکی بنا پر "دارالاسلام" کا لفظ سن کر لوگ کانپ اٹھتے ہیں۔ جو شخص اس لفظ کو زبان پر لاتا ہے اسکے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا جاتا ہے کہ کیا غضب کرتے ہو، جو بات منہ سے بھی نہیں نکالی جاسکتی، اسکو تم علی رؤس الاشہاد کہہ رہے ہو۔[1]

[1] یہ ایک مشہور عالم دین کے الفاظ ہیں جو انہوں نے ایک پرائیوٹ خط میں تحریر فرمائے ہیں۔ اور واضح رہے کہ یہ صاحب ایک بڑی اسلامی جمعیت کے ناظم ہیں۔

لیکن اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم کو مسلمان رہنے یا نہ رہنے کا آخری فیصلہ کرنا ہے ۔ اگر ہم مسلمان رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے ماحول کو اور پھر تمام دنیا کو دارالاسلام بنانے کا عزم لے کر اٹھنا چاہیے اور اسکے لیے جان وتن کی پوری بازی لگا دینی چاہیے ۔ اور اگر ہم اتنی ہمت وجرأت نہیں رکھتے تو پھر اسلام سے ہمیشہ کیلیے ہاتھ دھونے پر تیار ہو جانا چاہیے، کیونکہ ہندوستان میں وطنی قومیت کی بنیاد پر جو جمہوری ولادینی اسٹیٹ برطانوی سلطنت کے بطن سے پیدا ہو رہا ہے، اور اشتراکی تخیلات کے دودھ سے نشوونما پا رہا ہے، اسکو خود اپنی کوشش سے قائم کرنا، یا منفعلانہ صبر کے ساتھ اسکے قیام کو برداشت کرنا، اسکے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں دکھا سکتا کہ مسلمان ایک ہمہ گیر تمدنی وفکری انقلاب کی رو میں منتشر تنکوں کی طرح بہ جائیں، اور بالآخر ایک ایسے اجتماعی نظام میں جذب ہو جائیں جو عقیدہ وعمل دونوں کے اعتبار سے قطعاً غیر اسلامی ہو۔

یہ سوال کہ آیا اس انقلابی عمل کو روکنا اور اس کا رخ ایک اسلامی انقلاب کی طرف پھیر دینا ممکن بھی ہے یا نہیں، یہ بعد کا سوال ہے ۔ پہلا سوال یہ ہے کہ تم میں مسلمان بنکر رہنے کا عزم وارادہ بھی موجود ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اسکی کوئی پرواہ نہیں کہ اس ارادہ کو پورا کرنا ممکن ہے یا نہیں ۔ مان لیجیے کہ ناممکن ہے ۔ تسلیم کر لیجیے کہ اس وقت کفر کی طاقتوں کے قاہرانہ اور ہمہ گیر تسلط کو دیکھتے ہوئے جو شخص "دارالاسلام" کا نصب العین لے کر اٹھتا ہے وہ قطعی دیوانہ ہے اور آگ سے کھیلنا چاہتا ہے ۔ یہ بھی یقین کر لیجیے کہ اس وقت بازی قریب قریب بالکل ہر چکی ہے اور میدان ہاتھ سے نکل چکا ہے، اس حالت میں مقابلہ کے لیے اٹھنا فی الواقع دیوانوں ہی کا کام ہے، ایسے دیوانوں کا جو جان بوجھ کر آگ میں کودنے کیلیے تیار ہوں ۔ یہ بھی خوب سمجھ لیجیے کہ اس کا انجام خفیفت میں یہی ہے، جیسا کہ ہماری قوم کے ضعفاء اور معتذرین خیال کرتے ہیں کہ زمین وآسمان کا ذرہ ذرہ آپ کا دشمن ہو جائیگا، اور تمام اقسام کے کفار اور خود آپ کی اپنی قوم کے منافقین متحد ہو کر آپ کو پیس ڈالنے کی کوشش کرینگے، کیونکہ

ان کے آپس میں خواہ کتنے ہی اختلافات ہوں، مگر دار الاسلام کا نقطان سب کے لیے یکساں چیلنج ہے اور اس تخیل کو ان میں سے کوئی بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ پھر یہ بھی پہلے ہی سے جان رکھیے کہ کفرو نفاق کی طاقتیں تو متحدہ ہو کر آپ کے خلاف امنڈ آئینگی، مگر مسلمان متحد ہو کر آپ کا ساتھ دینے کیلیے نہیں اٹھینگے، بلکہ بہت سے مدعیان ایمان و تقویٰ تو آپ پر الٹے دلشکن آوازے کسینگے اور آپ کی دیوانگی کا مذاق اڑائینگے اور دور کھڑے ہوئے کہتے رہینگے کہ لَوْ كَانُوا عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا۔ ان سب باتوں کو خوب جان کر اور سمجھ کر اپنے قلب کا جائزہ لیجیے کہ آیا اس میں مسلمان رہنے کا جذبہ اس دیوانگی کی حد تک پہنچا ہوا ہے یا نہیں کہ جو چیز بظاہر بالکل ناممکن الحصول نظر آتی ہے، اور جس کے حصول کی کوشش میں جان و مال کا کھلا ہوا زیان ہے، اسکی خاطر سر اور دھڑ کی بازی لگا دینے کیلیے تیار ہو جائے؟ جن لوگوں میں یہ دیوانگی موجود ہے، اور جو اپنے مقصد کی راہ میں لڑتے ہوئے ناکام مرجانے کو دنیا کی سامرانیوں پر ترجیح دینے کیلیے تیار ہیں، صرف انہی کی ہم کو ضرورت ہے اور وہی دار الاسلام کی تحریک کو چلا سکتے ہیں۔

کام کا نقشہ

جب یہ معلوم ہو گیا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم ایک انقلابی مشن کے حامل ہیں، اور یہ مشن ہمارے مسلمان ہونے کا غیر منفک لازمہ ہے، تو یہ سوال خارج از بحث ہو جاتا ہے کہ ہمیں اس مشن کو لے کر اٹھنا چاہیے یا نہیں۔ اگر ہم مسلمان ہیں تو ہمیں بہر حال یہ کام کرنا ہی ہے، خواہ اس کو انجام دینا ممکن ہو یا نہ ہو۔ جو شخص اسے ناممکن سمجھ کر چھوڑ دینا چاہتا ہے، بہتر ہے کہ وہ اسلام ہی کو چھوڑ دے اور جو اسے مصلحتہً ملتوی کرنا چاہتا ہے، تو اسکے لیے یہ بھی مصلحت ہی کا تقاضا ہونا چاہیے کہ کلمہ طیبہ پڑھنا بھی سردست ملتوی کر دے، کیونکہ لا الٰہ الا اللہ آج کہنا مگر الوہیت غیر اللہ کی نفی اور الوہیت خدائے واحد کے اثبات کو کسی دوسری فرصت پر اٹھا رکھنا، دو بالکل متضاد باتیں ہیں جنہیں کوئی

ذی عقل یکجا جمع کرنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔

ب نہیں اس امر کی توضیح کرنی ہے کہ یہ کام کس طرح اور کس تدریج سے کرنا چاہیے۔

نظام جماعت | سب سے پہلی چیز جسکی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں جتنے لوگ اس مقصد سے متفق ہیں اور اسکے لیے جد و جہد کرنا چاہتے ہیں ان کو ایک جماعت میں منسلک کیا جائے، اور انکی جماعت کا نظام خالص اسلامی اصول پر قائم ہو۔ اس غرض کیلیے جو دستور العمل بنایا گیا ہے اسکی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

(۱) ہر مسلمان اسکا رکن بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ نصب العین سے متفق ہو اور نظام سمع و طاعت کی پابندی قبول کرے۔ رکنیت کیلیے کوئی فیس نہیں۔ صرف عقیدہ اور عمل ہی اسلامی جماعت کیلیے رکنیت کی فیس ہے۔

(۲) ہر مسلمان کیلیے صدر[1] کے مرتبہ تک پہنچنا ممکن ہے بشرطیکہ وہ اپنی اہلیت سے جماعت کا اعتماد حاصل کرے۔

(۳) صدر کا عہدہ انتخابی ہے، نہ کہ استبدادی (SELF-IMPOSED)

(۴) صدر قابلِ عزل ہے اگر وہ جماعت کا اعتماد کھو دے[2]

(۵) شوریٰ اور انتخاب اور صدر کے اختیارات اور اسکی مسئولیت کے بارے میں جدید زمانے کی نام نہاد جمہوریت کا تجربہ اتارنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے، بلکہ خلافت راشدہ کی سادہ اور حقیقی جمہوریت کو نمونہ بنایا گیا ہے جس میں ایک شخص جماعت کی مرضی سے صاحب امر قرار پاتا اور جب تک جماعت کو اس پر اعتماد رہتا اس وقت تک اسے اپنی بصیرت کے مطابق کام کرنے کا پورا موقع دیا جاتا تھا۔

[1] اگرچہ صحیح اصطلاح "امیر" ہے، لیکن غلط کار لوگوں نے اس لفظ کی معنویت کو بہت خراب کر دیا ہے، اس لیے ہم نے اسکو چھوڑ کر "صدر" کی اصطلاح اختیار کی ہے۔

[2] آجکل یہ ایک غلط خیال پھیل گیا ہے کہ اسلام میں امیر یا خلیفہ ناقابلِ عزل (IRREMOVABLE) ہے اس خیال کا ماخذ زیادہ تر حضرت عثمان رضؓ کے اس فعل کو قرار دیا جاتا ہے کہ انہوں نے باغیوں کے مطالبۂ عزل کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا حالانکہ وہی واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ امیر ناقابلِ عزل نہیں ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کے مطالبہ پر یہ دلیل پیش نہیں فرمائی کہ مسلمانوں کو اپنے امیر سے ایسا مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے بلکہ یہ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ہدایت فرمائی تھی کہ "ایک وقت آئیگا جب لوگ تجھ سے اس قمیص کے اتارنے کا مطالبہ کرینگے جو اللہ تجھے پہنائیگا، سو تو اسے نہ اتاریو"۔ اگر فی الواقع اسلام میں امارت ناقابلِ عزل ہوتی تو حضرت عثمانؓ اس سے استدلال فرماتے۔ درحقیقت ناقابلِ عزل امارت عقلاً و نقلاً دونوں حیثیتوں سے غلط ہے۔

(۴) حالات کی ناسازگاری کو دیکھکر ادارہ سے وابستہ ہونیوالوں کو دو طبقوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ ایک وہ جو تن من اور دھن سے مقاصد ادارہ کیلیے کام کرسکتے ہیں اور اس کام کے خطرات کو بھی آخری حد تک قبول کرنے کیلیے تیار ہیں۔ یہ ادارہ کے اصلی کارکن ہونگے۔ دوسرے وہ جو مقاصد سے ہمدردی رکھتے ہیں اور کسی حد تک اعانت بھی کرسکتے ہیں، مگر اپنے شخصی حالات کی وجہ سے زیادہ نازک ذمہ داریوں کو قبول نہیں کرسکتے۔ چونکہ ہماری قوم اسوقت کمزوری کی حالت میں ہے، اور ہمکو تمام امکانی طاقتوں سے کام لینا ہے، اسلیے ہم ایسے لوگوں کو بھی چھوڑ نہیں سکتے۔ ہم نے انکا شمار "معاونین" میں کیا ہے۔

سیرت اسلامی دوسری اہم چیز یہ ہے کہ جو لوگ "دارالاسلام" بنانے کیلیے اٹھیں وہ خود عملاً مسلمان ہوں اور اسلامی تہذیب و تمدن کا نمونہ بنیں۔ ہم ان لوگوں کے مانند نہیں بننا چاہتے جنکی باتیں سوشلسٹ کی سی ہیں اور زندگی بورژوا کی سی۔ ایسے لوگ کوئی انقلاب برپا نہیں کرسکتے، کیونکہ وہ جن اصولوں کے علمبردار بنکر اٹھتے ہیں، ان پر خود بھی عمل کرکے نہیں دکھاتے پھر دوسروں کو انکا پیرو کیسے بنا سکتے ہیں۔ اسی لیے دستور العمل میں ارکان ادارہ اور معاونین کیلیے یہ لازمی شرط رکھی ہے کہ وہ عملاً اسلامی تعلیمات کی زیادہ سے زیادہ پیروی کریں۔

لیکن اس قاعدہ کے لحاظ سے ارکان ادارہ پر تنقید کرتے ہوئے لوگوں کو یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ جو لوگ اس ادارہ میں شریک ہورہے ہیں وہ اُس بگڑے ہوئے ماحول کے پروردہ ہیں جسمیں ایمان بھی سالم رہنا مشکل تھا، کجا کہ اسلامی سیرت۔ انکو جو چیز اس ادارہ میں کھینچ کر لا رہی ہے، وہ انکی زبردست قوتِ ایمانی ہے جسکی بدولت ایسے دارالکفر میں بھی انہیں دارالاسلام کے نصب العین سے لگاؤ باقی رہا۔ اسی قوت ایمانی سے کام لیکر وہ اسلامی سیرت بھی اپنے اندر پیدا کرینگے مگر یکایک انکے اندر اتنا مکمل انقلاب پیدا ہوجانیکی توقع نہیں کیجا سکتی کہ وہ صحابۂ کرام کی زندگی کا نقشہ پیش کردیں۔ ظاہر ہے کہ پہلا قدم آخری سیڑھی پر نہیں پڑسکتا۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ درجۂ کمال ہی سے ابتدا ہو، وہ دراصل خیالی باتوں کے سوا کچھ نہیں کرنا چاہتے۔ اسی بنا پر دستور العمل میں فرائض کے امتثال اور کبائر سے اجتناب پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور اس سے کم درجہ کے اوامر و نواہی میں نرمی کی گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ بتدریج اصلاح نفوس ہو اور اصلاح نفوس کے ساتھ خود بخود اسلامی سیرت نشوونما پائے۔

مالی وسائل | تیسرا اہم سوال مالی وسائل کا ہے۔ اس باب میں بھی ہم نے ابتدائی اسلامی دور کی تقلید کی ہے کہ جو لوگ اسلامی نصب العین کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں وہ اپنے کام کیلیے ان لوگوں کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں جو اپنے سامنے وہ نصب العین نہیں رکھتے۔ انکو خود اپنی محنت سے کمایا ہوا مال اپنے مقصد کی راہ میں صرف کرنا چاہیے۔ باہر کے لوگ اگر خوشی سے ہمارے کام میں مدد دیں تو ہم ان سے لے لینگے، مگر ہم خود انکے پاس چندہ مانگنے کیلیے نہیں جائینگے۔ اسی لیے ذی استطاعت ارکان و معاونین پر لازم کیا گیا ہے کہ اپنی آمدنی کا ایک مقرر حصہ ادارے کے بیت المال میں داخل کریں۔

دوسرا قاعدہ یہ رکھا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص یا گروہ اس ادارہ کی مالی اعانت کرے یا اسکے مقاصد کیلیے کوئی جائداد وقف کرے تو اسکو ادارہ کی پالیسی یا طریق کار میں دخل دینے کا حق نہ ہوگا۔ جس کسی کو ادارے کے نظام پر کامل اعتماد ہو وہ اسکی مدد کرے، اور جسکو اعتماد نہ ہو وہ نہ کرے۔ البتہ مالی اعانت کرنیوالوں کو حساب دریافت کرنیکا حق ضرور ہوگا، اور اگر وہ چاہیں تو اپنے مال کیلیے مصارف کی تعیین بھی کر سکتے ہیں۔

حصول مقاصد کا راستہ | تشکیل جماعت کے بعد دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ ہم اپنے مقاصد کو حاصل کرنیکے لیے کیا طریق کار اختیار کرینگے۔

اس سلسلہ میں یہ جان لینا چاہیے کہ دار الاسلام قائم کرنیکی راہ میں مشکلات کا ایک عظیم الشان پہاڑ حائل ہے جسے ڈھا کر پھینکدینا کوئی سہل کام نہیں ہے۔ پھر موانع کو دور کرنیکے ساتھ دار الاسلام کیلیے زمین تیار کرنا خود ایک شدید مشقت طلب کام ہے۔ ہمیں ان دونوں کاموں کو غایت درجہ کی حکمت اور سخت جانفشانی کیساتھ بتدریج انجام دینا ہے۔

دفاع | سب سے پہلا کام یہ ہے، کہ مخالف انقلاب کی طاقتیں جو تمام فضا پر چھا گئی ہیں انکی مدافعت کیجائے کیونکہ اگر ہم محض تعمیر میں لگے رہے اور مدافعت کی فکر نہ کی تو چند سال کے اندر تعمیر کیلیے بھی کوئی موقع باقی نہ رہیگا، اسکے لیے اولین ضرورت ہے کہ ہم اپنی تحریک کے مرکز میں فوراً ایک شعبہ نشر و اشاعت قائم کردیں اور اخبار اور رسائل کے ذریعہ سے عامۂ مسلمین کے اندر انقلابی ذہنیت پیدا کرنیکی کوشش کریں۔ ہم کو واضح طور پر یہ بات مسلمانوں کے ذہن میں بٹھانی چاہیے کہ وطنی قومیت اور ڈیماکریسی کے انگریزی نمونہ پر جو کانسٹی ٹیوشن قائم ہوا ہے اسمیں تمہارے حقوق کیا معنی، تمہارے وجود کی حفاظت بھی ممکن نہیں ہے۔ اسلیے

موجودہ کانسٹی ٹیوشن کے اندر اپنے حقوق کے تحفظ کا خیال چھوڑ دو اور اس کانسٹی ٹیوشن کے اصولوں سے جنگ کرو۔ اسکے ساتھ ہمکو یہ بھی صاف طور پر مسلمانوں کو بتانا چاہیے کہ دستوری وسائل اور آئینی جدوجہد سے اصول بدلوانا کسیطرح ممکن نہیں اسکے لیے سخت انقلابی جدوجہد کرنیکی ضرورت ہے تاکہ برطانوی سلطنت کے مدبرین اور ہندوستانی اہل سیاست کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ وہ کوئی نظام حکومت ان اصولوں پر قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس سلسلہ میں مسلمانوں کی رائے عام کو ہم اس حد تک تیار کر دینا چاہتے ہیں کہ انکی قیادت کسی ایسی سیاسی جماعت کے ہاتھ میں آجائے جو کلچرل اٹانومی اور مساویانہ حصہ داری کے اصول پر بین الاقوامی وفاق کو اپنا نصب العین بنائے اور اسکے لیے دستوری ذرائع کے بجائے انقلابی ذرائع استعمال کرنے پر آمادہ ہو۔ مسلمانوں کی سیاسی جماعتوں میں سے جو جماعت بھی اس نقطہ پر آجائیگی اسکے ساتھ ہم اشتراک عمل کرینگے۔

مرکزی ادارہ سے باہر ملک کے طول وعرض میں جو ارکان معاونین پھیلے ہوئے ہونگے انکا کام یہ ہوگا کہ مرکز سے جو آواز اٹھے اسے عامۂ مسلمین اور خصوصاً قوم کے کارفرما اور کارکن طبقوں تک پہنچائیں اور رائے عام کو تیار کرنیکی پوری کوشش کریں۔ اگر اسباب مساعد ہوں تو مرکزی ادارہ سے باہر بھی نشر واشاعت کے مختلف مرکز قائم کیے جائینگے اور انکو مرکزی ادارہ کی ہدایات کے تحت کام کرنا ہوگا۔

اس مدافعانہ پالیسی کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ جب تک اسلامی انقلاب برپا کرنے کیلیے ایک منظم جماعت علمی اور عملی حیثیت سے تیار ہو اس وقت تک ملک میں اس نئے دار الکفر کو مستحکم بنیادوں پر قائم ہونے سے روکا جائے جو انگریزی سنگینوں کی حمایت میں ہم پر مسلط کیا جا رہا ہے اور عامۂ مسلمین کی بیداری اور جدوجہد سے ملک کے نظم ونسق میں کم از کم اتنا تغیر کرا دیا جائے جس پر "شبہ دار الاسلام" کا اطلاق ہوتا ہو۔

تعمیری کام | دار الکفر کی مزاحمت کیساتھ ہمکو "دار الاسلام" کے قیام کی تیاری بھی کرنی ہے۔ عموماً لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ "دار الاسلام" کا قیام محض تلوار کا زور چاہتا ہے۔ اس نام کو سنتے ہی انکی نگاہوں میں فسادات اور بلووں کی تصویر پھر جاتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس کام کو انجام دینے کیلیے مسلمانوں کو موجودہ حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کرنی ہوگی اور اسکے ساتھ بازاروں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے سر پھٹول بھی ناگزیر ہے۔ مگر یہ قصور فہم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ نظام تمدن میں انقلاب اسطرح نہیں ہوا کرتا اور نہیں ہو سکتا۔ تمدنی انقلاب کے لیے سب سے پہلے اس امر کی ضرورت ہوتی ہے کہ انقلاب کی فکری اساس مستحکم کیجائے۔ موجود الوقت نظام

تمدن کے اصول و فروع پر سخت تنقید کیجائے تاآنکہ باشندوں کی ایک کثیر جماعت اس سے غیر مطمئن ہوجائے اور یہ محسوس کرنے لگے کہ یہ نظام حقیقت میں غیر معقول اور مضرت بخش ہے۔ پھر اس نظام کے بجائے جو دوسرا نظام قائم کرنا ہو اسکے بنیادی تصورات سے لیکر اسکی عملی تفصیلات تک ایک ایک چیز کی اسطرح تشریح کیجائے کہ باشندوں کی ایک کثیر جماعت اس پر مطمئن ہوجائے اور یہ جان لے کہ وہ نظام نہ صرف غایت درجہ معقول اور فطری ہے، بلکہ پوری طرح قابل عمل بھی ہے، اور انکی زندگی کے تمام مسائل کا بہترین حل اسمیں موجود ہے۔ اسکو نہ صرف علمی حیثیت سے ثابت کیا جائے، بلکہ ساتھ ساتھ عملی حیثیت سے اسکا مظاہرہ بھی کیا جائے اور راستے کام کرتا ہوا دکھا دیا جائے، چاہے وہ کتنی ہی محدود پیمانہ ہی پر کیوں نہ ہو۔ یہ کام گہری علمی تحقیقات اور مسلسل اور ان تھک محنت کیساتھ ایک مدت تک جاری رہنا چاہئے۔ یہاں تک کہ جمہور کو اپنا ہم خیال بنا لیا جائے اور صرف وہ طبقے اسکے خلاف رہ جائیں جو ضد اور شقاق میں مبتلا ہیں یا بروقت نظام تمدن سے فائدہ اٹھانیکی وجہ سے اسکے حامی ہیں۔ پھر اسکی ضرورت البتہ پیش آئیگی کہ طاقت سے اس نظام تمدن کو الٹ کر جدید انقلابی نظام کو قائم کردیا جائے اور مخالفین کو اسکی اطاعت پر مجبور کیا جائے۔

حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُوْنَ -

اسلامی انقلاب کا یہی طریقہ ہے جسکو قرآن حکیم نے پیش کیا اور رسول کریم نے برت کر دکھایا اور اسی کی پیروی ہمکو بھی کرنی ہے۔ اس غرض کیلئے ہم کام کو دو شعبوں میں تقسیم کرینگے۔ ایک شعبہ علمی۔ دوسرا شعبہ عملی۔

شعبۂ علمی | اس شعبہ کا مختصر خاکہ حسب ذیل ہے:

(۱) اس میں صرف وہ لوگ لیے جائینگے جو عربی مدارس یا انگریزی کالجوں کے فارغ التحصیل ہوں یا جنکی علمی استعداد اعلیٰ درجہ کی ہو بشرطیکہ وہ ادارہ کے ابتدائی رکن ہوں اور خدمت اسلام کیلئے اپنی زندگی وقف کریں، اور صدر ادارہ کو انکی سیرت اور انکی ذہنی صلاحیتوں کے متعلق اطمینان حاصل ہوجائے۔

(۲) ان لوگوں کو مستقل طور پر مرکز ادارہ میں رہنا ہوگا، اور یہاں کے قواعد کی پابندی کرنی ہوگی تاکہ ماحول کی اثرات سے انکے اندر پوری طرح اسلامی ذہنیت پیدا ہوجائے، اور وہ روح تقویٰ ان میں جاری و ساری ہو جو دین اسلام کی صحیح حقیقتوں کا ادراک کرنے کیلئے ضروری ہے۔

(۳) عربی تعلیم یافتہ لوگوں کو انگریزی زبان اور علوم جدیدہ کی اور انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کو عربی زبان اور علوم اسلامی کی تعلیم دیکر ان میں اس امر کی ابتدائی استعداد بہم پہنچائی جائیگی کہ وہ تحقیق و اجتہاد کی راہ میں قدم رکھ سکیں۔ اسی تعلیم کے دوران میں یہ کوشش بھی جائیگی کہ دونوں گروہ ایک سطح پر آ جائیں، دونوں کے ذہن میں غلط نظام تعلیم کی وجہ سے معلومات کا ذخیرہ جو غلط طور پر مرتب ہوا ہے اسکو صحیح ترتیب پر لایا جائے، اور ان کے نقطۂ نظر کو ٹھیک اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق کر دیا جائے۔

(۴) اسلام کا صحیح فہم پیدا کرنے کیلئے قرآن مجید کا درس بالالتزام دیا جائیگا اور یہ درس اس بنیادی تخیل پر مبنی ہوگا کہ قرآن علم کا اصلی ماخذ اور حقیقت کا مرکزی نقطہ ہے۔ کائنات کے تمام مسائل کی کلید اسکے اندر موجود ہے۔ تمام علوم کی تحقیقات کیلئے صحیح نقطۂ آغاز بھی وہی دیتا ہے، اور صحیح منزل مقصود بھی وہی بتاتا ہے۔ اسکی رہنمائی سے بے تعلق ہوکر ہر علم اپنی صراط مستقیم سے ہٹ گیا ہے، اور وہ صراط مستقیم پر نہیں آسکتا جب تک کہ قرآن کو ہادی و رہنما نہ بنایا جائے۔ صرف دنیوی علوم ہی نہیں بلکہ خود اسلامی علوم بھی اپنے اصل مقصد سے اسی لیے ہٹ گئے ہیں کہ قرآن کو آگے رکھنے کے بجائے پیچھے رکھ دیا گیا ہے۔ حدیث، فقہ، اصول تشریع، حکمت اسلامیہ، فلسفہ تاریخ اسلامی، سب کی روح قرآن میں ہے۔ اس روح سے بیگانہ ہوکر سب بے جان ہیں اور اس روح سے لبریز ہوکر سب میں جان اور حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۵) دین میں مجتہدانہ بصیرت پیدا کرنیکے لیے سیرت پاک کی تعلیم بھی لازماً دیجائیگی تاکہ طالب میں مزاج نبوی کی پہچان پیدا ہو جائے جو عین مزاج شرع و ملت ہے۔ اسکے ساتھ صحابۂ کرام اور مجتہدین سلف کی سیرتوں اور انکے کارناموں کا بھی مطالعہ کرایا جائیگا تاکہ طالب اچھی طرح جان لے کہ دین اسلام کی حدود میں حریت فکر اور آزادی تحقیق کی گنجائش کہاں تک ہے اور کس مقام پر پہنچ کر یہ آزادی اس دین کی سرحدوں سے نکل جاتی ہے۔

(۶) اسطرح تحقیق و اجتہاد کی ضروری استعداد اور روح اسلام سے کافی واقفیت پیدا کرنیکے بعد ان لوگوں کو انکی صلاحیتوں اور انکے میلانات کے مطابق مختلف علمی حلقوں (گروپس) میں تقسیم کر دیا جائیگا اور ایک ایک حلقہ کو ایک ایک شعبۂ فنون کے تحقیقی مطالعہ میں لگا دیا جائیگا، مثلاً ایک حلقہ فلسفہ اور نظری سائنس کا، دوسرا حلقہ علوم عمران (سوشیالوجی) کا، تیسرا حلقہ قانون اور اسکے متعلقہ فنون کا، وغیر ذالک۔ ان تمام علوم میں تحقیقات کا اساسی مقصد یہ ہوگا کہ اولاً ہر طرف سے

اس ناخدا شناسی اور مادہ پرستانہ تصور پر حملہ کیا جائے جو علوم کی اساس میں پیوست ہو گیا ہے، اور اس بنیاد کو ڈھا کر قرآنی حقائق کی اساس پر علوم کو از سر نو مرتب کیا جائے۔ ثانیاً مغربی نظام تہذیب و تمدن پر سخت تنقید کیجائے اور اسکے جواب میں پورے اقناعی دلائل کیساتھ اسلامی نظام تہذیب و تمدن کو پیش کیا جائے۔ ثالثاً جدید علوم اور تمدن کے صالح اجزاء کو اسطرح اسلامی تہذیب و تمدن میں جذب کیا جائے کہ مزاج شرع میں فرق نہ آنے پائے ... نظام تمدن کا نقشہ پوری تفصیل کیساتھ مرتب کیا جائے جو ہر معقول آدمی کو مطمئن کر سکے کہ یہ نظام تمدن ایک ترقی پذیر سوسائیٹی کیلیے قابل عمل اور اصلح ہے۔

(۷) تحقیق و تنقید کے ان مختلف شعبوں کی رہنمائی صدر کریگا اور اسکا طریق رہنمائی یہ ہوگا کہ محققین میں حریت فکر کی روح بھی برقرار رہے اور اسکے ساتھ وہ اسلام کی صراط مستقیم سے ہٹنے بھی نہ پائیں، اور تمام مختلف شعبوں میں مقصدی توافق برقرار رہے۔

(۸) بیرونی ارکان و معاونین اس شعبے کی مدد تین صورتوں سے کرینگے۔ ایک یہ کہ بہترین اشخاص کو تلاش کر کے اس شعبے میں کام کرنیکے لیے بھیجیں۔ دوسرے یہ کہ اس شعبے کیطرف سے جو لٹریچر شائع ہو اسکو ملک میں پھیلائیں۔ تیسرے یہ کہ اس شعبے کی مالی ضروریات پوری کرنے میں حصہ لیں۔

شعبۂ عملی | شعبۂ عملی کا مختصر خاکہ حسب ذیل ہے:۔

(۱) اس شعبہ میں ان ارکان کو داخل کیا جائیگا جنکے اندر اعلیٰ درجہ کی عملی صلاحیتیں ہوں۔

(۲) ابتداءً انکو ضروری تربیت دیجائیگی تاکہ وہ اپنے خاص حلقۂ عمل میں صحیح اسلامی طرز پر کام کر سکیں۔

(۳) دوران تربیت میں انکی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کر کے انکے لیے عمل کی مختلف راہیں تجویز کی جائینگی، جن میں سے چند کو مثالاً بیان کیا جاتا ہے:

(الف) ایک جماعت کو مساجد کی امامت کیلیے تیار کیا جائیگا تاکہ وہ مساجد کیواسطہ سے مسلمانوں میں بیداری پھیلائیں، اور انکی اصلاح و تنظیم کریں۔ اور یہ بیرونی ارکان و معاونین کا کام ہوگا کہ اسطرح جو امام تیار

ہو کر نکلیں ان کو مرکزی مقامات پر متعین کریں۔

(ب) ایک جماعت کو دیہات میں کام کرنے کیلیے تیار کیا جائیگا، اور اسکے لیے بھی میدان عمل مہیا کرنا بیرونی ارکان و معاونین کا کام ہوگا۔

(ج) ایک جماعت مختلف معاشی اور صنعتی اسکیموں کو اسلامی اصول پر چلانے کیلیے تیار کی جائیگی تاکہ وہ موجودہ زمانہ کے معاشی و صنعتی مسائل کو حل کرکے عملاً اسلامی تمدن کا مظاہرہ کرے۔

(د) اس شعبہ کیلیے ہر فن کے آدمیوں اور ہر قسم کی صلاحیت رکھنے والے اشخاص کی ضرورت ہو گی جنکو تلاش کرکے مرکز میں بھیجنا اور بعد میں انکے لیے ملک کے مختلف حصوں میں میدانِ عمل فراہم کرنا ادارہ کی بیرونی شاخوں کا کام ہوگا۔

کام کی توسیع ابتداءً یہ دونوں شعبے صرف مرکزی ادارہ میں قائم کیے جائینگے۔ لیکن اگر حالات مساعد ہوئے تو ملک کے دوسرے مقامات پر بھی اس قسم کے مرکز بنائے جائینگے جہاں یہ دونوں شعبے یا ان میں سے کوئی ایک شعبہ قائم کیا جاسکے۔

اس وقت ہم تعمیری کام کے بالکل ابتدائی مرحلے میں قدم رکھ رہے ہیں اور صرف اسی مرحلہ کے متعلق ہم وضاحت کیساتھ کچھ کہہ سکتے ہیں۔ ابھی یہ بتانا مشکل ہے کہ ضروری تیاری کے بعد ہم اپنے اصل مقصد کی طرف کس طرح پیش قدمی کرینگے۔

پہلی منزل کے قریب پہنچ کر دوسری منزل کا راستہ انشاءاللہ خود بخود صاف نظر آنے لگے گا۔

دستورالعمل

نام

——— اس ادارہ کا نام "ادارۂ دارالاسلام" ہوگا۔

مقاصد

——— اس ادارہ کا مقصدِ وحید اعلائے کلمۃ اللہ ہے، یعنی قانونِ اسلام کو غیر اسلامی قوانین پر عملاً غالب کرنا۔

——— مقصد ثانی یہ ہے کہ جو لوگ قانونِ اسلام پر ایمان رکھتے ہوں اور اسکو دنیا کے تمام قوانین پر غالب کرنیکے لیے عمل کرنا چاہتے ہوں انکو ایک نظامِ اجتماعی میں منسلک کیا جائے تاکہ وہ علمی اور عملی حیثیت سے اس مقصد کو حاصل کرنے کی استعداد بہم پہنچائیں، اور اس کیلیے منظم جدوجہد کرسکیں۔

اصول

——— یہ ادارہ حسب ذیل اصولوں پر قائم کیا گیا ہے

(۱) شریعتِ اسلامی کو اسکے تمام پہلوؤں کے ساتھ واحد قانون تسلیم کیا جائے اور غیر اسلامی قانون کو اپنے لیے معدومِ محض سمجھ لیا جائے، اِلّا یہ کہ اسکی اطاعت نہ کرنے پر ہم قادر نہ ہوں، یا جب تک غیر مسلم حکومت ہم پر مسلط ہے، امن عام کی خاطر یا ضروریاتِ تمدن کی وجہ سے اسکے بعض قوانین کی اطاعت ناگزیر ہو۔

(۲) شریعتِ اسلامی کی اطاعت کسی قوت قاہرہ کے بغیر بطوع و رغبت اسطرح کی جائے جیسے کسی

حکومت کے قانون کی اطاعت کی جاتی ہے۔

(۳) ادارہ اپنے حدود میں گویا ایک اسلامی حکومت ہو جسکا قیام کسی جابرانہ طاقت کے بل پر نہیں بلکہ خود ارکان ادارہ کی ایمانی طاقت اور رضا کارانہ تسلیم و اطاعت کے بل پر ہو اور اس میں قوتِ جابرہ کوئی بیرونی چیز نہیں بلکہ مسلمان کی یہ اندرونی اخلاقی صفت ہو کہ وہ جس قانون کی صداقت پر ایمان لائے اسکے آگے خود اپنے نفس کی رضامندی سے سر جھکا دے۔

(۴) ادارہ کا نظام اسلامی جمہوریت کے اصولوں پر ہو یعنی تمام ارکان ادارہ اسلامی مفہوم کے مطابق ایک جماعت بن کر رہیں، انکی رضامندی سے ایک شخص ان کا صاحب امر ہو جو اسلامی اصول شوریٰ کے مطابق حکومت کرے، پوری جماعت اس حکومت کی فرمانبردار ہو اور زندگی کے سارے کام اسی نظام اجتماعی کے تحت رہ کر انجام دے۔

متعلقینِ ادارہ کی اقسام

—— اس ادارہ سے جو لوگ متعلق ہوں گے ان کی دو قسمیں ہوں گی:۔

(۱) مستقل ارکان جو اپنی زندگی کو بالکلیہ اس نظام کا تابع بنا دیں۔

(۲) معاونین جو اطاعت نظام کے بغیر مقاصدِ ادارہ کی تحصیل میں کسی طور پر مدد کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔

(تشریح۔ لفظِ "ارکان" کا اطلاق صرف قسم اول کے لوگوں پر ہوگا۔

ادارہ کی ہیئت ترکیبی

—— ادارہ اُن ارکان پر مشتمل ہوگا جو حلفِ رکنیت پر دستخط کر کے باقاعدہ شریک ادارہ ہوں گے۔

—— مجلسِ شوریٰ حسب قواعد صدر کا انتخاب کرے گی

—— صدر بشمولیت مجلس شوریٰ (یعنی پریزیڈنٹ اِن کونسل) ادارہ کا حاکمِ اعلیٰ ہوگا جس پر خدا اور رسول کے سوا کوئی حاکم بالاتر نہ تسلیم کیا جائے گا۔

ارکان ادارہ

——— ادارہ کی رکنیت کا دروازہ ہر مسلمان کیلیے کھلا ہوگا، اور اسلامی فرقوں میں سے کسی فرقہ کیلیے بند نہ ہوگا۔

(جو لوگ تحریف قرآن کے معتقد ہوں، یا کسی انسان میں باریتعالیٰ کے حلول کا اعتقاد رکھتے ہوں، یا صحابۂ کرام میں سے کسی کے ایمان کے منکر ہوں، یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی جدید نبوت کے قائل ہوں، یا اپنے فرقہ کے سوا تمام مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہوں انکا شمار فرق اسلامیہ میں نہیں کیا جاسکتا۔ انکے علاوہ احتیاطاً ایسے گروہوں سے بھی اجتناب کیا جائیگا جو اگرچہ صریح طور پر اصول سے متصادم نہیں ہیں مگر اپنی بدعت طرازیوں سے نظام شریعت کو درہم برہم کرتے ہیں۔)

——— دائرۂ رکنیت میں داخل ہونیسے پہلے ہر امیدوار کے عقائد اور اسکی اخلاقی حالت کی کافی جانچ پڑتال کرکے اس امر کا اطمینان کرلیا جائیگا کہ وہ اس ادارہ کی رکنیت کے لایق ہے۔

(اس قید سے صرف وہ لوگ مستثنیٰ ہونگے جنکی اعتقادی و اخلاقی حالت کے متعلق صدر یا اسکے نائبین کو امتحان کے بغیر ہی اطمینان حاصل ہوجائے)۔

——— رکنیت کیلیے حلف نامۂ رکنیت (ضمیمہ ب) پر دستخط کرنا، اور اس حلف کے مطابق قواعد رکنیت (ضمیمہ۔ الف) کی پابندی کرنا لازمی شرط ہوگا۔

——— جو ارکان مستقل طور پر یا کسی مدت کے لیے مرکز ادارہ میں رہینگے انکو ضابطۂ قیام دارالاسلام (ضمیمہ ج) کی بھی پابندی کرنی ہوگی۔

——— جو ارکان مرکز سے باہر مقیم ہونگے انکو اپنی پوری زندگی ان قواعد کے تحت بسر کرنی ہوگی جو ارکان ادارہ کیلیے مقرر کیے گیے ہیں، اور ان احکام کو بجا لانا ہوگا جو وقتاً فوقتاً مرکز سے انہیں پہنچیں۔

——— جو رکن اپنی حلف کو توڑدے یا ایسے فعل کا ارتکاب کرے جو صدر یا اس کے نائب کی رائے میں

نقضِ عہد تک پہنچتا ہو اسے رکنیت سے خارج کر دیا جائیگا، الّا یہ کہ وہ تائب ہو کر تجدیدِ عہد کرے۔

——— ارکان کی پبلک اور پرائیوٹ زندگی میں کوئی تفریق نہ کیجائیگی۔ انکو قواعد کی پابندی اور احکام کی اطاعت اپنی پرائیوٹ زندگی میں بھی اسیطرح کرنی ہوگی جسطرح پبلک زندگی میں کرنی لازم ہے۔ کسی رکن کو کسی امر میں یہ کہنے کا حق نہ ہوگا کہ یہ اسکا ذاتی معاملہ ہے۔

——— ادارہ کا ہر رکن دوسرے ارکان کیساتھ مساوی الدرجہ ہوگا۔ اسکے حقوق سب کے برابر ہونگے، اور کسی کو کسی کے مقابلہ میں ترجیحی مرتبے کا دعویٰ کرنے یا امتیازی برتاؤ کا مطالبہ کرنیکا حق نہ ہوگا۔

——— ہر رکن کو صدر یا ادارہ کے عہدہ داروں، یا ارکان شوریٰ کے اعمال پر تنقید کرنے، اور ادارہ کی کاروائیوں کے متعلق سوال کرنیکا پورا حق حاصل ہوگا، اور ایسی تنقید کو کسی طریقہ سے دبانے کی کوشش نہ کیجائیگی۔

——— ادارہ کے ارکان کا اجتماع ہر جمعہ کو دار الاسلام کی مسجد میں ہوا کریگا اور اس موقع پر ہر شخص کو اظہارِ خیال کی پوری آزادی ہوگی۔ اسیطرح ادارہ کی شاخوں میں بھی جمعہ کے اجتماع کا التزام ہوگا۔

——— مرکز سے باہر کے ارکان ادارہ کو حسبِ ضرورت مرکز میں یا کسی اور مقام پر اجتماعِ عام کی دعوت دیجاتی رہیگی اور اس اجتماع میں ادارہ کی پالیسی، اسکے معاملات اور اسکے حسابات سب کے سامنے پیش کیے جائینگے، اور ارکان کو اظہارِ خیال کا عام حق دیا جائیگا، اور ان کی آراء کا مناسب لحاظ کیا جائیگا۔

——— اجتماعِ عام میں اگر یہ معلوم ہو کہ اکثریت کی رائے صدر، یا کسی عہدہ دار، یا کسی رکنِ شوریٰ کے خلاف ہے تو اسے مستعفی ہونا پڑے گا۔

——— اجتماعِ عام میں ادارہ کی شاخوں کے معاملات بھی زیرِ بحث آئیں گے اور ہر شاخ کے کارکنوں کے متعلق مقامی ارکان کے احساسات کا مناسب لحاظ کیا جائیگا۔

مجلسِ شوریٰ

——— مجلسِ شوریٰ کی ترکیب ان قواعد کے تحت ہوگی جو اس دستور العمل کیساتھ منسلک ہیں۔

صدر ادارہ

—— کسی ایسے شخص کو صدارت کا منصب کبھی نہ دیا جائیگا جو خود اسکا امیدوار ہو یا اسکے لیے کسی قسم کی کوشش کرے

—— صدر انتخاب کے بعد ہی مجلس شوریٰ کے سامنے حلف لیگا جسکے الفاظ قواعد مجلس شوریٰ کی ضمیمہ الف میں مذکور ہیں۔

—— صدر ادارہ کے جملہ امور اہل حل و عقد کے شوریٰ سے انجام دیگا جسکی تفصیل قواعد مجلس شوریٰ میں مذکور ہے۔

—— اگر صدر احکام خدا اور رسول کی معصیت فاحشہ کرے اور قضائے شرعی سے ایسا فعل ثابت ہو جائے یا معصیتِ خدا اور رسول کا حکم دے اور وہ قضائے شرعی سے ثابت ہو جائے تو اسے صدارت سے استعفیٰ دینا لازم ہوگا۔

(جس امر کے معصیت فاحشہ ہونے یا نہ ہونے میں صدر اور قاضی کے درمیان اختلاف ہوگا اس میں چند اکابر علماء سے استصواب کیا جائیگا اور انکی اکثریت کی فیصلہ کو قبول کیا جائیگا)

—— اگر مجلس شوریٰ کسی وقت یہ دیکھے کہ تدابیر دنیویہ میں صدر کی روش درست نہیں رہی ہے اور اسکی رہنمائی ادارہ کیلیے یا مفاد اسلامی کیلیے نقصان رساں ہے تو وہ اسکو معزول کر سکے گی جسکا ضابطہ قواعد مجلس شوریٰ کی دفعہ نہم میں مذکور ہے۔

(عزل یا استعفیٰ سے پہلے جب تک وہ صدر رہے، ارکان ادارہ پر اسکی اطاعت لازم ہوگی البتہ اس خاص معاملہ کی تنفیذ ملتوی رہیگی جس پر صدر کو معزول کرنے کی تجویز ہو)

—— ارکان ادارہ کو صدر کی سیرت، اور اسکے کردار پر تنقید کرنیکا عام حق ہوگا خواہ وہ اسکی پبلک زندگی سے متعلق ہو یا پرائیویٹ زندگی سے۔ مگر کسی رکن جماعت کو یہ حق نہ ہوگا کہ صدر جب تک صدر ہے، محض اپنے کسی اعتراض یا شکایت کی بنا پر اسکی اطاعت سے انکار کرے۔ اعتراضات یا شکایات جو کچھ بھی ہوں، مجلس شوریٰ کے سامنے پیش کر دی جائیں گی اور یہ مجلس کا کام ہوگا کہ ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کرے۔

—— صدر کو کلی اختیار ہوگا کہ جس رکن کو جو کام چاہے سپرد کرے اور جسکو جس کام سے چاہے علیحدہ کر دے۔ اس باب میں مجلس شوریٰ سے رائے لینا یا نہ لینا اور اسکی رائے کو قبول کرنا یا نہ کرنا صدر کے اختیار تمیزی پر موقوف ہوگا۔ (البتہ اگر شخص متعلق کو صدر کے فیصلہ پر کوئی عذر ہو تو ایسی صورت میں مجلس شوریٰ سے استصواب کیا جائیگا)

—— روزمرہ کے جزئی معاملات، یا ایسے معاملات جنکے تصفیہ کی فوری ضرورت ہو، شوریٰ کے بغیر صدر خود انجام دیگا

—— ادارہ کے تمام عہدہ دار صدر کو جوابدہ اور اس کے احکام کے تابع ہونگے، اور انہیں ایسے معاملات کے سوا جنکا اختیار صدر نے ان کو دیدیا ہو، کوئی کام صدر سے استصواب کے بغیر انجام دینے کا حق نہ ہوگا۔

—— صدر کو حق ہوگا کہ احکام کی خلاف ورزی یا نظام ادارہ سے انحراف کرنے پر جو تادیبی کارروائی مناسب سمجھے کرے، اور جس شخص کیلیے ایسی کارروائی تجویز کی جائیگی وہ اپنے آپ کو اسکے لیے رضا کارانہ پیش کرے گا۔ کوئی ایسا شخص رکن ادارہ نہ رہ سکیگا جو سزا کو قبول کرنے سے انکار کرے۔

قضائے شرعی

—— ارکان ادارہ کے باہمی نزاعات کا شرعی فیصلہ کرنے کے لیے صدر، ادارہ کے ارکان میں سے کسی مناسب شخص کو قاضی مقرر کرے گا۔

(شاخ ادارہ کے لیے قاضی کا تقرر نائب صدر یعنی صدر شاخ کے اختیار میں ہوگا)

—— قاضی، صدر اور مجلس شوریٰ کے سامنے اس امر کا حلف لے گا کہ وہ مقدمات کا فیصلہ ٹھیک ٹھیک اپنے علم شریعت کے مطابق بلا رورعایت کرے گا۔

—— حلف لینے کے بعد قاضی اپنے فرائض قضا کی حد تک صدر کی اطاعت سے آزاد ہوگا۔

—— قاضی کو صرف اس صورت میں معزول کیا جاسکے گا جبکہ صدر کے نزدیک یہ متحقق ہو جائے کہ وہ اپنے عہد کے خلاف عمل کر رہا ہے، اور مجلس شوریٰ کی کم از کم ⅔ اکثریت صدر کی اس رائے سے اتفاق کرے

—— قاضی کی عدالت میں صدر اور ارکانِ ادارہ کی حیثیت مساوی ہوگی شرعی معاملات میں اسکا فیصلہ صدر پر بھی اسیطرح نافذ ہوگا جسطرح کسی رکنِ ادارہ پر۔ اور صدر کو بھی شاہد یا مدعی یا مدعا علیہ کی حیثیت سے قاضی کے سامنے اسیطرح حاضر ہونا پڑے گا جسطرح ایک عام رکنِ ادارہ کو۔

—— ادارہ کا کوئی رکن اپنے ایسے معاملات میں جو ادارہ کے کسی دوسرے رکن سے متعلق ہوں، یا اسکے اہل و عیال سے متعلق ہوں، قاضی ادارہ کے سوا کسی دوسری عدالت سے رجوع کرنیکا مجاز نہ ہوگا۔ البتہ جو معاملات قاضی ادارہ کے حدودِ عمل سے خارج ہوں یا ایسے اشخاص سے متعلق ہوں جن پر قاضی کا حکم نہ چل سکتا ہو ان کو وہ انگریزی عدالتوں میں لے جا سکتا ہے۔

—— ادارہ کے کسی رکن کو اگر انگریزی عدالت میں اپنا معاملہ لیجانیکی ضرورت پیش آئے تو اسے پہلے صدر سے اجازت لینی ہوگی اور صدر یہ دیکھیگا کہ آیا ضرورت واقعی ایسی شدید ہے کہ اسمیں انگریزی عدالت سے رجوع کرنا اضطرار کی حد میں آتا ہے۔

(صرف ایسے معاملات اس قید سے مستثنیٰ ہونگے جن میں فوری کارروائی کی ضرورت ہو اور صدر سے اجازت لینے کا وقت نہ ہو۔ مگر ایسی کارروائی کرنیکے بعد بلا تاخیر صدر کو صورت معاملہ کی اطلاع دینی ہوگی)

—— ادارہ کے ارکان میں سے جو شخص قاضی کے فیصلہ کو نہ ماننے یا ایسے معاملات میں جو قاضی کے حدودِ عمل سے تعلق رکھتے ہوں، انگریزی عدالتوں کی طرف رجوع کرے وہ فوراً ادارہ سے خارج کردیا جائیگا اور اسکا یہ فعل صریحاً نقضِ عہد کا ہم معنیٰ ہوگا۔

—— ادارہ سے باہر کا کوئی شخص اگر کسی رکن جماعت کے خلاف قاضی کی عدالت میں مقدمہ لائے اور تحریر کی صورت میں بحلف یہ عہد کرے کہ قاضی کے فیصلہ کو قبول کریگا تو قاضی اسکی سماعت کرسکے گا۔

—— ادارہ سے باہر کے لوگ اگر اپنے معاملات میں قاضی ادارہ سے رجوع کریں تو ان کو صرف فتویٰ کی حد تک حکم شرعی بتایا جاسکے گا۔

—— قاضی کے فیصلوں کو نافذ کرنا صدر کے فرائض میں سے ہوگا۔

بیت المال

—— ادارہ کو جس قدر اموال حاصل ہوں گے وہ بیت المال میں رکھے جائیں گے۔

—— بیت المال کی مدات آمدنی حسب ذیل ہوں گی:۔

(۱) عطایا (Grants) جو غیر سرکاری ذرائع سے آئیں۔

(۲) خیرات و میراث۔

(۳) زکوٰۃ و صدقات واجبہ۔

(۴) اوقاف جو ادارہ کی اعانت کے لیے کیے گئے ہوں۔

—— بیت المال پر تین قفل لگائے جائیں گے جن میں سے ایک قفل کی کنجی صدر کے پاس رہے گی اور دو قفلوں کی کنجیاں ایسے دو اشخاص کے پاس رہیں گی جن کو ارکان ادارہ کے اجتماع کی رضامندی سے منتخب کیا جائے گا۔

—— بیت المال کیلیے ایک محاسب مقرر کیا جائیگا جو تمام حسابات باضابطہ رکھے گا۔

—— فوری ضروریات میں، جو غیر معمولی نہ ہوں، صدر کو بیت المال سے روپیہ صرف کرنے کے اختیارات ہونگے جنکی حد بعد میں ادارہ کی مالی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے، مجلس شوریٰ وقتاً فوقتاً مقرر کرتی رہیگی۔

—— عام معاملات میں روپیہ صرف کرنے کے لیے مجلس شوریٰ کی زائد از نصف اکثریت کا اتفاق ضروری ہوگا۔

—— ادارے کے ہر رکن کو صدر سے حساب پوچھنے اور حسابات پر تنقید کرنے کا حق ہوگا۔

—— بیت المال کا حساب معطیوں کو بطور خاص اور عام مسلمانوں کو بالعموم دیکھنے کا اختیار ہوگا اور کسی شخص کو حساب دکھانے سے انکار نہ کیا جا سکے گا۔

—— کسی معطی کو خواہ اس نے کتنی ہی بڑی مالی امداد کی ہو، ادارہ کی پالیسی اور اس کے طریق کار میں محض اس بنیاد پر دخل دینے کا حق نہ ہوگا کہ اس نے ادارہ کی مالی امانت کی ہے۔

—— اگر کوئی شخص اس ادارہ کے لئے کچھ وقف کرے تو اس کو منظور کر کے مناسب انتظام کیا جائے گا۔

—— بیت المال کا روپیہ کبھی کسی ایسے ادارہ میں نہ رکھا جائے گا جو سودی کاروبار کرتا ہو۔ (البتہ جب تک ادارہ اپنے خزانہ کی خود حفاظت کرنے کے قابل ہو اس وقت تک روپیہ کو مجبوراً بنک میں رکھا جائے گا)

معاشی معاملات

—— ارکان ادارہ میں سے جو لوگ حدود دارالاسلام میں تجارت، زراعت یا صنعت و حرفت کا پیشہ کرتے ہوں یا اپنے مستقل ذرائع معاش رکھتے ہوں ان کے لئے مجلس شوریٰ کے مشورت سے صدر ایک معاشی پالیسی (ECONOMIC POLICY) مقرر کرے گا اور ان کو اس کی پابندی کرنی ہوگی۔ ان میں سے کوئی رکن اپنے کسی کاروبار کو اپنا نجی معاملہ قرار دے کر ادارہ کے معاشی قواعد سے مستثنیٰ ہونے کا دعوے نہ کر سکے گا۔

—— ارکان ادارہ کا فرض ہوگا کہ اپنی ذاتی املاک کا حساب کر کے شرعی ضابطہ کے مطابق اپنی زکوٰۃ بیت المال کو دیں۔

——— کوئی رکن اپنی زکوٰۃ کو بطور خود صرف کرنے یا ادارہ بیت المال کے سوا کسی اور جماعت کو دینے کا مجاز نہ ہوگا۔ اگر کوئی رکن اپنے رشتہ دار مستحقین کو زکوٰۃ یا اس کا کوئی حصہ دینا چاہتا ہو تو وہ ان کے لئے بتصریح یا بلا تصریح نام، بیت المال سے امداد حاصل کر سکتا ہے۔

تقسیم کار

——— ارکان کی ایک کافی تعداد فراہم ہو جانے کے بعد صدر ادارہ کے مختلف کاموں کو مختلف شعبوں میں تقسیم کرے گا اور ہر شعبہ کے لئے ایک ناظم اور چند ارکان شوریٰ مقرر کر دیگا۔

——— ہر شعبہ کے لئے پالیسی اور طریق کار اور ضابطۂ عمل مقرر کرنا صدر کا کام ہوگا، مگر اس میں مجلس شوریٰ کا مشورہ بھی شامل رہے گا۔

——— ہر شعبہ کا ناظم صدر کے سامنے جواب دہ ہوگا اور اس کو اپنے شعبہ کی حد تک فیصلہ کن اختیارات حاصل ہوں گے، یعنی وہ شوریٰ کا پابند نہ ہوگا اور اپنے شعبہ کے تحت جو احکام وہ نافذ کرے گا، پوری جماعت کو اس کی اطاعت کرنی ہوگی۔

——— کسی رکن ادارہ کو اگر کسی ناظم شعبہ کے خلاف کوئی شکایت ہوگی تو وہ بطور خود اطاعت سے انحراف کا مجاز نہ ہوگا بلکہ اسے صدر کے پاس مرافعہ کرنا ہوگا اور جب تک صدر کوئی فیصلہ نہ کرے، اس کو ناظم شعبہ کے احکام کی تعمیل کرنی ہوگی۔

ادارہ کی شاخیں

——— جس جگہ ادارہ کے پانچ رکن مقیم ہوں، وہاں لازم ہوگا کہ ادارہ کی باقاعدہ شاخ قائم کر دی جائے۔

——— ادارہ کی شاخ کا نظام بھی وہی ہوگا جو مرکزی ادارہ کا ہے۔ اور بحوالہ ضابطہ قیام دارالاسلام کے، تمام قوانین وہی ہوں گے جو مرکزی ادارہ میں نافذ ہیں، یا آئندہ نافذ ہوں۔

——— جس رکن ادارہ کو شاخ کے ارکان شوریٰ اپنا صدر منتخب کریں گے اس کی حیثیت صدر ادارۂ مرکزی کے نائب کی ہوگی

——— شاخ کا صدر اپنی مجلس شوریٰ کا صدر ہوگا۔ مگر جب صدر ادارہ وہاں جائے تو وہی شاخ کی مجلس شوریٰ کا صدر قرار پائے گا۔

——— شاخ کے صدر کو جتنے اختیارات صدر ادارہ دے گا ان کی حد تک وہ اپنی شاخ میں اسی طرح کام کرے گا جس طرح صدر ادارہ مرکز میں کام کرتا ہے۔ ان اختیارات کے ماسوا دوسرے تمام معاملات میں اسے صدر مرکز کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

——— ہر شاخ کا صدر مرکزی مجلس شوریٰ کا رکن ہوگا اور اس وقت تک رکن رہیگا جب تک وہ شاخ کا صدر رہے۔

(تشریح۔ مجلس شوریٰ کے جلسوں میں بیرونی ارکان شوریٰ کی شرکت ہمیشہ لازم نہ ہوگی۔ اہم معاملات کے سوا باقی تمام مسائل میں ان سے بذریعہ مراسلت مشورہ لیا جاتا رہے گا اور وہ بھی اپنی اور اپنے اپنے حلقوں کے ارکان کی آراء سے وقتاً فوقتاً صدر کو مطلع کرتے رہیں گے)

——— شاخ کے صدر کو معزول یا معطل کرنے کا اختیار صرف صدر مرکز کو ہوگا مگر بالعموم وہ اس وقت تک کسی شاخ کے صدر کو معزول یا معطل نہ کریگا جب تک کہ شاخ کی مجلس شوریٰ حسب قاعدہ اسکے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کر کے صدر مرکز سے اسکے عزل کی سفارش نہ کرے۔

——— ہر شاخ کے صدر پر لازم ہوگا کہ کسی شخص کو اس وقت تک رکن ادارہ نہ بنائے۔

جب تک اس کے اعتقاد اور اس کی سیرت کو جانچ کر یہ اطمینان نہ کر لے کہ وہ اس ادارہ کا رکن بننے کی اہلیت رکھتا ہے۔

—— ہر شاخ کے ارکان کی پوری فہرست مرکزی ادارہ کو بھیجی جائے گی۔ اور جس قدر نئے ارکان بھرتی ہوں ان کی اطلاع وقتاً فوقتاً بھیجی جاتی رہے گی۔

—— ایک شاخ کا حلقہ زیادہ سے زیادہ ایک ضلع تک وسیع ہوگا۔

—— شاخ کے کارکنوں پر لازم ہوگا کہ اپنے قریب کے اضلاع میں شاخیں قائم کرنے کی کوشش کریں۔

—— ہر شاخ کے لیے یہ لازمی ہوگا کہ اپنی کارگزاری اور اپنے حلقہ میں ادارہ کے متعلق تمام قابل ذکر معاملات کی رپورٹ کم از کم ہر مہینہ مرکزی ادارہ کو بھیجتی رہے۔

—— شاخ کے معاملات میں معاونین کا تعاون اور مشورہ حاصل کیا جائے گا اور ان سے ہمیشہ ربط قائم رکھا جائے گا۔

—— شاخ میں مقامی بیت المال قائم کیا جائیگا اور تمام مقامی آمدنیاں اسی میں رکھی جائینگی۔

—— ہر شاخ کے بیت المال کو اپنے واردات وصادرات کا حساب ماہانہ مرکزی بیت المال کو بھیجنا ہوگا۔

—— ہر شاخ کا بیت المال اپنے واردات کا پانچواں حصہ مرکزی بیت المال کو بھیجے گا۔ مگر اہم ضروریات پیش آجانے پر وہ صدر مرکز کی اجازت سے اپنے پورے واردات استعمال کر سکے گا، بلکہ مزید ضرورت پیش آنے پر مرکزی بیت المال سے امداد بھی لے سکے گا۔

—— ہر شاخ کو اپنے بیت المال کا روپیہ صرف کرنے کے متعلق جتنے اختیارات مرکز سے دیے جائیں گے، ان کے سوا باقی مصارف میں اسے صدر مرکز سے اجازت لینی ہوگی۔

—— شاخ کو مرکز سے جو ہدایات بھیجی جائیں گی ان کی تعمیل بے چون وچرا کرنی ہوگی۔

——— اگر شاخ کی مجلس شوریٰ اپنی زائد از نصف اکثریت سے مرکز کی کسی ہدایت کے خلاف اظہار ناراضگی کرے گی تو شاخ کا صدر اسے مرکزی مجلس شوریٰ میں پیش کرے گا، مگر جب تک مرکزی مجلس میں وہ حکم منسوخ نہ ہو، اس وقت تک اس کی تعمیل شاخ پر لازم ہوگی۔

——— مرکزی مجلس میں جب کوئی اہم معاملہ پیش ہوگا تو شاخ کے نمائندوں (یعنی صدروں) کو مجلس میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے گی۔

معاونین ادارہ

——— جو لوگ ادارہ کے مقاصد سے متفق ہوں، اور ان مقاصد کے لئے جدوجہد میں بھی حصہ لینا چاہتے ہوں مگر رکنیت کی شرائط پوری کرنے سے معذور ہوں ان کو رکن کے بجائے معاونین کی فہرست میں رکھا جائے گا۔

——— معاونین کے زمرہ میں داخل ہونے کے لئے کم سے کم شرائط یہ ہیں جن پورا کرنے کا ہر معاون کو عہد کرنا ہوگا:-

(۱) کبائر سے اجتناب کیا جائے خصوصاً سودی لین دین، جوئے اور سٹے، شراب، صنفی جرائم، رشوت، اور جھوٹی شہادت سے۔

(۲) شرعی احکام کے مقابلہ میں کسی رسم و رواج کی پابندی نہ کی جائے۔

(معاون کی اسلامیت کا امتحان اس امر میں ہے کہ اس کے خاندان یا قبیلہ یا علاقہ میں جو رسوم و رواجات قانون اسلامی کے خلاف پھیلے ہوئے ہوں ان کو توڑ دے)

(۳) صوم و صلوٰۃ کی پابندی کا عہد کیا جائے۔ اور حج پر قادر ہونے کی صورت میں بلا تاخیر حج کیا جائے

(۴) جو لوگ صاحب نصاب ہوں وہ ٹھیک شرعی طریق پر اپنی قابل زکوٰۃ املاک کا حساب کریں اور ان کی زکوٰۃ ادارۂ دارالاسلام کے بیت المال میں داخل کریں۔

(تشریح: جن لوگوں کے حلقہ میں ادارہ کی کوئی شاخ موجود ہو وہ اس شاخ کے بیت المال کو زکوٰۃ دیں۔ اور جہاں مقامی بیت المال نہ ہو وہاں کے لوگ مرکزی بیت المال کو لکھیں کہ انکے پاس زکوٰۃ کی کسقدر رقم ہے اور انکے اعوا، یا انکے محلہ یا گاؤں میں کتنے مستحقین ہیں جنہیں وہ اس رقم سے مدد پہنچا سکتے ہیں۔ اسکے جواب میں مرکزی بیت المال انکی رقم زکوٰۃ کے مصارف متعین کرکے بھیجے گا۔ اور ان کیلئے لازم ہوگا کہ اسی کے مطابق زکوٰۃ خرچ کریں اور اس کا صحیح حساب مرکزی بیت المال کو بھیج دیں۔

جہاں ایک سے زیادہ معاونین موجود ہوں انہیں اپنی زکوٰۃ ایک جگہ جمع کرنی ہوگی اور مرکزی بیت المال کی ہدایات کے مطابق اسے خرچ کرنا ہوگا)

(۵) اپنے اہل وعیال کو فرائض دینی بجالانے اور معاصی سے اجتناب کرنے کی سخت تاکید کی جائے خصوصاً نماز کے معاملہ میں اپنی اولاد اور اپنی بیویوں کے ساتھ کوئی نرمی نہ برتی جائے۔

(۶) لڑکوں اور لڑکیوں کو لازمی طور پر مذہبی تعلیم دی جائے اور انکے اندر جذبۂ اسلامیت مشتعل کرنے کی کوشش کی جائے اور حتی الامکان ایسے مدارس میں انہیں بھیجنے سے پرہیز کیا جائے جہاں ان کو غیر مسلم بنانے کی بالواسطہ یا بلاواسطہ کوشش کی جاتی ہو۔

(۷) کم از کم ایسے لباس اور ایسی وضع کا التزام کیا جائے جس سے ایک ناواقف آدمی مسلمان کو دیکھ کر مسلمان سمجھ سکے خصوصاً فرنگیت اور ہندویت سے کلّی اجتناب کیا جائے۔

(۸) اپنی عورتوں کو شرعی پردہ کا پابند رکھا جائے۔

(تشریح: پردے کی کم سے کم حد یہ ہے کہ گھر میں شوہر کے سوا تمام مرد عزیز ونکے سامنے پورا جسم باستثنائے چہرہ وکف دست چھپایا جائے اور باریک لباس جس سے جسم جھلکتا ہو، نہ پہنا جائے۔ گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت ہو تو خوشبو اور آواز دینے والے زیور نہ استعمال کئے جائیں خوشنما اور جاذب نظر لباس کو نہایت سیادہ لباس میں خواہ وہ برقع ہو یا کوئی اور چیز چھپا لیا جائے، اور جبتک چہرہ کھولنا ناگزیر نہ ہو اسے ڈھانکے رکھا جائے)

(۹) سینما بینی سے اجتناب کیا جائے خصوصاً نوجوان لڑکوں لڑکیوں اور عورتوں کو ہرگز سینما نہ دکھایا جائے۔

(۱۰) عریاں تصاویر اور بد اخلاقی کے جذبات پیدا کرنے والے لٹریچر کو اپنے گھر میں ہرگز نہ آنے دیا جائے۔

(۱۱) اسلامی فرقوں کی باہمی آویزش میں کسی قسم کا حصہ نہ لیا جائے اختلافی مسائل پر بحث و مناظرہ کرنے سے پرہیز کیا جائے، بلا امتیاز فرقہ و مسلک ہر مسلمان کے پیچھے نماز پڑھی جائے کسی فرقہ کے مسلمان سے متعصبانہ برتاؤ نہ کیا جائے اور معاون کا عقیدہ و مذہب فقہی خواہ کچھ ہو، بہرحال وہ اس امر کو ہمیشہ پیش نظر رکھے کہ تمام مسلمان ایک امت ہیں اور سب کا دین اسلام ہے۔

(۱۲) اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں اسلامی مفاد کو ملحوظ رکھا جائے تمام مفادوں پر اسکو ترجیح دیجائے کبھی کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جو اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہو، اور کسی معاشی فائدے یا کسی عزت، خطاب یا عہدے کو اسلامی مفاد کی قربانی دے کر حاصل نہ کیا جائے۔

(۱۳) ایسے تمام لوگوں اور انجمنوں سے ترک تعلق کیا جائے جو اسلامی مفاد کو نقصان پہنچانے کی خفیہ یا علانیہ کوشش کریں، یا جو زبان و قلم سے اسلام کی مخالفت کرتے ہوں۔ نیز ایسی صحبتوں سے کبھی اجتناب کیا جائے جہاں اسلام کا مذاق اڑایا جاتا ہو، یا فواحش اور معاصی کا ارتکاب کیا جاتا ہو۔

—— جو شخص معاون دارالاسلام بننا چاہے اس کو سچے دل سے شرائط مذکورہ بالا کو پورا کرنے کا عہد کرنا ہوگا، اور اسی عہد کو بصورت تحریر ادارۂ مرکزی میں داخل کرنا ہوگا۔

—— جو معاون اپنے عہد کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو اسے لازم ہوگا کہ اپنی خلاف ورزی کی اطلاع مرکزی ادارہ کو دے اور جو سزا مرکز سے تجویز کی جائے اسے خود اپنے اوپر نافذ کرے۔

—— جو معاون ادارہ کے مقاصد یا اصول سے منحرف ہو جائے یا اسکی شرائط کی پابندی نہ کرنا چاہے اسکا اخلاقی فرض ہوگا کہ معاونت سے استعفیٰ دیدے اور منافقانہ طرز عمل اختیار نہ کرے۔

—— جس معاون کے متعلق یہ تحقیق ہو جائے گا کہ وہ شرائط معاونت کی خلاف ورزی کر رہا

ہے اور اس کی اطلاع نہیں دیتا۔ یا ادارہ کے مقاصد و اصول کے خلاف کام کر رہا ہے اور استعفیٰ نہیں دیتا اسے معاونین کے زمرہ سے خارج کر دیا جائے گا اور تمام ارکان ادارہ اور معاونین کو مطلع کر دیا جائے گا کہ اس سے احتراز کریں۔

——— معاونین میں یہ جذبہ ہونا چاہئے اور اس کیلئے انکو عملاً بھی کوشاں رہنا چاہئے کہ وہ رکنیت کے مقام تک ترقی کریں اور محض معاونت کے درجہ میں رہنے پر مطمئن نہ ہوں۔

——— معاونین پر لازم ہوگا کہ:-

(۱) جہاں ادارہ کی شاخ موجود ہو وہاں اس کے نظام سے رابطہ رکھیں اور ہر امکانی طریق پر اس کے کاموں میں مدد دیں۔

(۲) جہاں شاخ موجود نہ ہو وہاں ایسے لوگ فراہم کرنے میں ادارہ کی مدد کریں جو رکن ادارہ بن سکتے ہوں

(۳) ادارہ کے لٹریچر اور خیالات کو اپنے حلقہ میں پھیلانے کی پوری کوشش کریں اور زیادہ سے زیادہ معاون بنائیں

(۴) جہاں ایک سے زیادہ معاون فراہم ہو جائیں اور ادارہ کی کوئی شاخ موجود نہ ہو وہاں کے معاونین اپنا حلقہ بنالیں جسے حلقہ معاونین سے تعبیر کیا جائے گا اور مرکزی ادارہ سے ان کا رابطہ قائم کر دیا جائیگا مگر شاخ قائم ہو جانیکے بعد اس حلقہ کو توڑ دینا ضروری ہوگا اور معاونین کیلئے لازم ہوگا کہ اس شاخ سے ربط قائم کریں۔

(۵) ہر معاون اپنے حلقہ اثر میں لوگوں کو تعلیمات اسلام سے باخبر کرنے عقائد فاسدہ سے بچانے اور احکام دینی کا پابند بنانے کی پوری کوشش کرتا رہے۔

(۶) جو معاون دیہی علاقوں میں رہتے ہوں وہ اپنے اثر کو استعمال کر کے اس امر کی کوشش کریں کہ بہت سے دیہات کے مسلمان ایک جگہ نماز جمعہ پڑھا کریں۔ نیز جمعہ پڑھانے کیلئے ایک ایسے مناسب آدمی کو مقرر کرائیں جو اسلامی مفاد کیلئے جمعہ کے اجتماع سے کام لینے کی اہلیت رکھتا ہو۔

(تشریح۔ ایک ہی حلقہ میں کسی مقام کو "مصر جامع" قرار دینے کی صورت یہ ہے کہ اس مقام سے چھ چھ سات سات میل تک کے دیہات میں رہنے والے مسلمانوں کو وہاں جمعہ پڑھنے پر راضی کیا جائے اور جب ان کی اکثریت اس پر اظہار رضامندی کر دے تو اس حلقہ میں اعلان کر دیا جائے کہ فلاں مقام جمعہ کے لئے مرکز قرار پا گیا ہے، لہٰذا سب مسلمانوں کو وہاں آنا چاہئے۔

"مصر جامع" کی تحریک کرنے والے کو مقام کے انتخاب میں محض اپنی سہولت کا لحاظ نہ کرنا چاہئے، بلکہ ایسی بستی کا انتخاب کرنا چاہئے جو اس حلقے میں سب سے بڑی ہو اور جہاں اجتماع جمعہ کے قابل کوئی بڑی مسجد موجود ہو۔

جو صاحب کہیں مصر جامع قائم کرائیں، وہ مرکزی ادارہ کو یا اپنے قریب کی شاخ کو اطلاع دیدیں تاکہ انہیں اجتماع جمعہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے مناسب ہدایات دی جا سکیں۔

جو لوگ اپنے فقہی مسالک کی بنا پر اس شق کی تعمیل نہ کر سکتے ہوں وہ اس سے مستثنیٰ رہیں گے مگر وہ اس کی مخالفت بھی نہ کریں)

(۷) جو معاون سو روپے ماہوار سے زیادہ آمدنی رکھتے ہوں، انہیں اپنی آمدنی کا کم سے کم دو فی صدی حصہ مرکزی ادارہ کو یا ادارہ کی شاخ کو اگر وہ شاخ کے حلقہ میں رہتے ہوں، ادا کرنا ہوگا۔ اس سے زائد دینا یا نہ دینا ان کی خوشی پر موقوف ہے۔ اور جو معاون پچاس اور سو روپے کے درمیان آمدنی رکھنے والے ہوں، وہ ایک فی صدی کے حساب سے دیں۔

(۸) معاونین کو روزانہ کچھ وقت کسی ایسی خدمت کے لئے وقف کرنا ہوگا جو ادارہ ان کے سپرد کرے۔ مثلاً ناخواندہ لوگوں کو قرآن اور ضروریات دینی اور اردو زبان کی تعلیم دینا یا اگر کوئی خاص صنعت جانتے ہوں تو وہ بے کار لوگوں کو سکھانا وغیرہ۔

ضمیمۂ الف

قوانین [illegible] ادارہ

[illegible] کے لئے سب سے اول شرط [illegible]

[illegible] محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء [illegible] اور شریعت محمدی کو

[illegible]

[illegible] FINAL AUTHORITY [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ورثہ طلوبہ کے ساتھ اس کی اجازت دی جا سکتی ہے اور وہ اپنی ملازمت میں مفاد اسلامی کے خلاف کوئی کام نہ کریں اور جب انہیں یہ معلوم ہو کہ مفاد اسلامی کو نقصان پہنچائے بغیر ملازمت نہیں کی جا سکتی تو ملازمت کو مفاد اسلامی پر قربان کر دیں۔ تاہم ارکان اس بات کے لئے تیار رہیں کہ اگر جماعت کی طرف سے کبھی ان کو ترک ملازمت کا حکم دیا جائے تو اس کی تعمیل کریں۔

ہر رکن کو اپنی حیثیت اس نظام اسلامی کا ایک رکن سمجھنا چاہیئے جو جماعت دارالاسلام کی صورت میں قائم کیا جا رہا ہے جس کا وہ وفادار ہو اور اس کے قوانین و احکام کی اسی طرح اطاعت کرے جیسے ایک اسلامی حکومت کے قوانین و احکام کی اطاعت کی جاتی ہے خواہ وہ اس کی خواہش نفس اور اس کے ذاتی مفاد کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

—— کوئی شخص اس وقت تک رکن نہیں بنایا جاتا جب تک وہ شرائط مذکورہ کی پابندی کا حلف نہ کرے۔ بصورت خلاف ورزی امیر یا نائب امیر کو اختیار ہوگا کہ ایسے رکن کو رکنیت سے خارج کرے یا اگر اصلاح کی توقع ہو تو اس کیلئے مناسب تدابیر اختیار کرے۔

—— جماعت کے ارکان پر لازم ہوگا کہ:-

(۱) احکام شرعیہ کی زیادہ سے زیادہ پابندی کریں، فرائض کی بجا آوری اور منہیات سے اجتناب کا پورا اہتمام کریں، اپنے اخلاق اور معاملات میں اسلامی سیرت کا نمونہ پیش کریں اور اپنی زندگی میں ہمیشہ اس خیال کو پیش نظر رکھیں کہ وہ دنیا کے سامنے اسلام کے نمائندے ہیں اور دنیا میں اسلام کی عزت ان کی باتوں سے نہیں بلکہ ان کے عمل ہی سے قائم ہوگی۔

(۲) اپنے اہل و عیال، اپنے قرابت داروں اور اپنے حلقہ تعارف میں لوگوں کو صحیح اسلامی تعلیمات سے باخبر کرنے اور احکام دینی کی اطاعت پر آمادہ کرنے کیلئے ہمیشہ کوشش کرتے رہیں، اور جو لوگ ان کے زیر اثر ہوں (زوجین، بچے، ملازم وغیرہ) ان کو احکام شرعی کی پابندی پر مجبور کریں۔

(۳) اپنے اندر اس قدر دینی غیرت پیدا کریں کہ خدا اور رسولؐ کے احکام کی خلاف ورزی اور منکرات و منہیات و فواحش کے اعلانی اظہار کو برداشت نہ کر سکیں، اور ہر ممکن طریقہ سے انکے خلاف جہاد کریں۔

(۴) آپس میں ایک دوسرے کے نگران ہیں، عیب چینی کی نیت سے نہیں بلکہ اس نیت سے کہ اپنے ساتھی ارکان کے نقائص کو دور کرنا اور ان کی تکمیل میں مددگار رہنا ہر رکن کا اخلاقی فرض ہے۔

(۵) اپنی زندگی کو سادہ اور اپنی ضروریات کو محدود بنانے کی کوشش کریں تاکہ خدمتِ دین کے لئے جان و مال کی قربانی دینا ان کے لئے آسان ہو جائے۔

(۶) مسلمان کے ہاتھ کا بنا ہوا کپڑا پہنیں، مسلمان دکانداروں ہی سے سودا خریدیں خواہ اس میں کچھ نقصان ہی ہوتا ہو، مسلمان کاریگر ہی سے کام لیں خواہ اس سے بہتر کام غیر مسلم کرتا ہو۔

(۷) کسبِ معاش یا اپنی ذاتی ضروریات کیلئے جسقدر وقت صرف کرنا ان کیلئے ناگزیر ہو صرف اتنا ہی وقت ان کاموں میں صرف کریں باقی تمام اوقات نظامِ ادارہ کے تحت دین کی خدمت کیلئے وقف کر دیں۔

(۸) اپنی معاشرت اور اپنے لباس میں فرنگیت اور ہندویت سے سختی کے ساتھ اجتناب کریں۔

(۹) مذہبی مناظروں اور فرقہ بندی کے جھگڑوں سے بالکل الگ رہیں۔ بلکہ حتی الامکان اسلامی فرقوں کی منازعات کو دور کرنے کی کوشش کریں۔

(۱۰) اپنی پبلک اور پرائیوٹ زندگی میں نظامِ ادارہ کی پوری اطاعت کریں اور ادارہ کی ہیئت حاکمہ سے جو احکام ان کو ملیں انہیں پوری وفاداری کے ساتھ بجا لائیں۔

(۱۱) اگر صاحبِ نصاب ہوں تو اپنی زکوٰۃ ادارہ کے بیت المال کو دیں۔

(۱۲) اگر اپنا کوئی ذاتی ذریعۂ آمدنی رکھتے ہوں تو اس کا کم از کم پانچ فی صدی حصہ ادارہ کے بیت المال میں داخل کریں۔

(ضمیمہ ب)

حلف نامہ رکنیت

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ اِنَّ صَلٰوتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۔

میں اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کو اور اس کے بعد جماعت مسلمین کو گواہ کر کے اقرار کرتا ہوں کہ ادارہ دارالاسلام کے مقاصد، اصول اور قوانین اور خصوصاً قواعد رکنیت کو میں نے پڑھ کر اور سمجھ کر قبول کیا۔ اور اپنی زندگی کو ان مقاصد کی تحصیل کے لئے وقف کر دیا۔ اب میرا مرنا اور جینا انہی مقاصد کے لئے ہے، اور زندگی کے تمام معاملات پر یہ مقاصد مقدم ہیں۔ میں عہد کرتا ہوں کہ ان مقاصد کی تحصیل کے لئے ادارۂ دارالاسلام کا جو نظام قائم کیا گیا ہے اس کی پوری اطاعت کروں گا، اس کے قوانین کا ہمیشہ ہر حال میں پابند رہوں گا اور ادارہ کی ہیئت حاکمہ سے جو احکام ملیں گے ان کو لفظاً و معناً سچے دل سے بجا لاؤں گا خواہ وہ میری خواہشات اور میرے ذاتی مفاد کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ اور اگر مجھے نظام ادارہ کے احکام یا حکام سے کسی امر میں اختلاف ہوگا تو دستور العمل میں اصلاح کا جو طریقہ مقرر کیا گیا ہے اسی کے مطابق اصلاح کی کوشش کروں گا۔

ضمیمہ (ش)

ضابطۂ قیام دار الاسلام

حدود دار الاسلام میں آنے اور رہنے کے لئے حسب ذیل ضابطہ بنایا جاتا ہے جس کی سختی کے ساتھ پابندی لازمی ہوگی۔ اور خلاف ورزی کرنے والے کو ان حدود سے خارج کر دیا جائے گا۔ ان قواعد سے صرف غیر مسلم اور وہ غیر مسلمان جو صرف مہمان کی حیثیت رکھتے ہوں مستثنٰے ہوں گے مگر ایسے لوگوں کو ان حدود میں مستقل قیام کی اجازت نہ ہوگی۔

(۱) اذان کی آواز سن کر سب کام چھوڑ دیئے جائیں اور نماز کی تیاری کے سوا کوئی دوسرا کام نہ کیا جائے۔

(۲) ہر مرد بالغ کے لئے پانچوں وقت نماز با جماعت میں شریک ہونا لازمی ہوگا۔

(۳) ہر مقیم دار الاسلام کے لئے لازم ہوگا کہ اپنے سات برس سے زائد عمر کے بچوں، اور اپنی عورتوں اور اپنے متعلقین کو نماز کا پابند بنائے اور اس کے متعلقین میں سے جو کوئی ترک صلوٰۃ پر مصر ہو اس سے قطع تعلق کرے۔

(۴) تمام بالغ افراد جو حدود دار الاسلام میں مقیم ہوں، عذر شرعی کے سوا کسی صورت میں رمضان کے روزوں سے مستثنٰے نہیں ہو سکتے، اور عذر شرعی میں بھی وہ صرف اس وقت مستثنٰے ہو سکیں گے جبکہ قاضی دار الاسلام ان کے عذر کو قبول کرے

(۵) ان حدود کا ہر باشندہ صاحب نصاب ہو اسے محصل زکوٰۃ کے سامنے اپنی املاک کا پورا حساب دینا ہوگا اور جو زکوٰۃ اس پر عائد ہو وہ بلا تامل ادا کرنی ہوگی۔

(۶) ہر مقیم دار الاسلام کو روزانہ قرآن کی تلاوت سمجھ کر غور کے ساتھ کرنی ہوگی، خواہ ایک ہی رکوع کیوں نہ ہو۔

(۷) حدود دار الاسلام میں شریعت محمدی کے خلاف کوئی کام نہیں کیا جا سکتا خواہ کبائر میں سے ہو یا صغائر میں سے۔ جو شخص کسی کو پہلی مرتبہ کوئی گناہ کرتے دیکھے تو گناہ صغیرہ کی صورت میں نرمی کے ساتھ نصیحت اور گناہ کبیرہ کی صورت میں سختی کے ساتھ ملامت کرنا، اور دوسری بار دیکھنے پر محتسب کو یا صدر کو اطلاع دینا اس کا فرض ہوگا۔

(۸) محتسب کبائر کی صورت میں پہلے جرم پر، اور صغائر کی صورت میں دوسرے جرم پر قاضی دار الاسلام کے سامنے مقدمہ پیش کر دے گا۔ اور قاضی کا فیصلہ بلا کسی رو رعایت کے نافذ کیا جائے گا۔

(۹) بعض صغائر جو اس زمانہ میں بلائے عام بن گئے ہیں، ان کے بارے میں نو وارد لوگوں کے ساتھ ابتداءً کچھ مدت تک بطور تالیف قلب رعایت کی جائے گی، مگر دائماً نہیں۔ مدت رعایت کا تعین صدر دار الاسلام کے اختیار تمیزی پر موقوف ہوگا۔

(۱۰) حدود دار الاسلام میں غیر مسلموں سے مشابہ لباس کا استعمال قطعی ممنوع ہوگا۔

(۱۱) حدود دار الاسلام میں منکرات شرعیہ کے اظہار و اعلان کی اجازت نہ ہوگی۔

(۱۲) ان حدود میں فواحش (فحش گانا، فحش لٹریچر، مسکرات کے استعمال) حتیٰ

بداخلاقیوں، اور عریانی لباس، کو پھیلنے کی اجازت کسی حال میں نہ دی جائے گی۔

(اس دفعہ سے غیر مسلم اور موالفۃ القلوب بھی مستثنےٰ نہ ہوں گے)

(۱۲) ان حدود میں اسلامی فرقوں کے اختلافی مسائل پر جدال و مناظرہ کرنے کی اجازت نہ ہوگی، البتہ خالص علمی و تحقیقی حیثیت سے گفتگو کی جا سکتی ہے، مگر ایسی گفتگوؤں پر مدرر کی سخت نگرانی قائم ہوگی تاکہ وہ نزاع کی صورت اختیار نہ کریں۔

(۱۳) تمام لوگ جو حدود دارالاسلام میں مقیم ہوں، بلا امتیاز فرقہ ایک جماعت میں ایک امام کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔

(۱۴) ان حدود کے اندر جو لوگ اپنا مکان یا کارخانہ بنائیں یا کوئی تجارتی و صنعتی کاروبار جاری کریں وہ ان ضوابط اور قوانین کی پابندی اور ان محاصل کی ادائی پر مجبور رہوں گے جو دارالاسلام کی اعانت کہ وہ حدود میں رہنے اور کاروبار کرنے والوں کے لئے وقتاً فوقتاً بنائے جائیں گے۔

قواعدِ مجلس شوریٰ ادارۂ دارالاسلام

صدارت ۱۔ مجلس شوریٰ کا صدر دائماً ادارۂ دارالاسلام کا صدر ہوگا۔

۲۔ صدر کو منصبِ صدارت پر فائز ہوتے ہی سب سے پہلے تمام حاضرین کے سامنے حلف لینا ہوگا جس کے الفاظ ضمیمہ (الف) میں منسلک ہیں۔

۳۔ صدر کی غیر موجودگی میں وہ شخص فرائضِ صدارت انجام دیگا جسے مستقل صدر اُس خاص جلسہ کیلئے نامزد کرے۔ اور اس جلسہ کی صدارت انجام دینے کیلئے اسکو بھی وہی حلف لینا ہوگا جو صدر کے لئے مقرر ہے۔

رکنیت ۴۔ مجلس شوریٰ کا رکن صرف وہ شخص ہو سکے گا جو دستورالعمل کے مطابق "رکن جماعت" ہو، عام اس سے کہ وہ مرکز میں مقیم ہو یا مرکز سے باہر۔

(کسی ایسے شخص کو شوریٰ کی رکنیت نہ دی جائے گی جو خود اسکا امیدوار رہو یا اس کیلئے کسی قسم کی سعی کرے)

۵۔ ہر رکن مجلس کو اپنی رکنیت کے آغاز میں صدر اور مجلس کے سامنے حلف لینا ہوگا جس کے الفاظ ضمیمہ (ب) میں منسلک ہیں۔

۶۔ جب تک ارکانِ شوریٰ کے انتخاب کا قانون نافذ ہو تمام وہ ارکانِ ادارہ جو مرکز میں مقیم ہیں اور ادارہ کی تمام شاخوں کے صدر، مجلسِ شوریٰ کے رکن متصور ہوں گے۔

مجلس کے فرائض و اختیارات ۷۔ مجلسِ شوریٰ بشمولیتِ صدر، اس ادارہ کی ہیئتِ حاکمہ ہوگی اور ادارہ کے تمام معاملات اس کے فیصلوں کے مطابق انجام پائیں گے۔

۸۔ مجلس کے ارکان اکثریت سے صدر کا انتخاب کریں گے۔

۹۔ مجلس کے ارکان اکثریت سے جب صدر پر عدمِ اعتماد کا اظہار کریں گے تو وہ بحیثیت

صدرِ مجلس بحیثیت صدرِ ادارہ معزول ہو جائے گا۔

(الف) صدر کے خلاف عدم اعتماد کی تجویز اگر کوئی ایسا رکن ادارہ پیش کرنا چاہے جو مجلس شوریٰ کا رکن نہ ہو تو وہ اپنی تجویز ناظر مجلس کے پاس بھیجے گا اور ناظر مجلس کا فرض ہوگا کہ اسے مجلس میں پیش کر دے۔

(ب) اگر کوئی رکن مجلس عدم اعتماد کی تجویز پیش کرنا چاہے تو اسے اختیار ہے کہ چاہے خود اسے پیش کرے یا ناظر مجلس کے پاس بھیج دے۔

(ج) جب صدر کے خلاف عدم اعتماد کی تجویز پیش ہو تو وہ صدارت سے الگ ہو کر محض ایک رکن مجلس کی حیثیت اختیار کرے گا اور مجلس اس اجلاس کے لئے وقتی طور پر صدر منتخب کر کے اس تجویز پر بحث کرے گی۔ اس تجویز پر صدرِ ادارہ کو رائے دینے کا حق نہ ہوگا بلکہ وہ صرف اپنی مدافعت میں کوئی بیان دینے کا حقدار ہوگا۔

۱۰۔ مجلس کو اُسی جلسہ میں دوسرے صدرِ ادارہ کا انتخاب کرنا ہوگا جس میں وہ سابق صدر کو معزول کرے۔

۱۱۔ مجلس شوریٰ کا جلسہ حسب ضرورت صدر طلب کرے گا اور اگر کوئی رکن اس کی ضرورت محسوس کرے تو وہ اس کے لئے صدر سے درخواست کرے گا۔

طریق کار ۱۲۔ مجلس کے ہر رکن کو ادارہ کی پالیسی یا جزئی و کلی معاملات کے متعلق تجاویز پیش کرنے سوال کرنے اور صدر یا انتظامی عہدہ داروں کے اعمال پر تنقید کرنے کا حق ہوگا مگر غیر معمولی ضرورت کے سوا عموماً تمام تجاویز یا سوالات بصورت تحریر اجلاس سے دو روز قبل صدر کے پاس بھیجنے ضروری ہوں گے۔

۱۳۔ تمام ارکان کو آدابِ مجلس کے متعلق صدر کے احکام کی سختی کے ساتھ پابندی کرنی

ہو گی بصورت خلاف ورزی صدر اس کو اس جلسہ میں مناسب وقت کے لیے شمولیت مجلس سے معزول کر دے گا۔

۱۴۔ اگر کوئی رکن اپنے حلف رکنیت کی خلاف ورزی کرے تو صدر اسکو رکنیت مجلس سے محروم کر دیگا۔

۱۵۔ صرف وہی امور مجلس کے فیصلے متصور ہونگے جنکو صدر کی منظوری حاصل ہو، عام اس سے کہ وہ صدر اور ارکان کے اتفاق سے منظور ہوں یا مجلس کی اکثریت کو برسرِ حق پا کر اس سے صدر اتفاق کرے یا اسی طور پر مجلس کی اقلیت سے صدر اتفاق کرے یا اس کو خود اپنی رائے کے حق ہونے کا اس درجہ وثوق ہو کر پوری مجلس سے اختلاف کر کے ایک امر کا فیصلہ کر دے مگر بالعموم وہ اکثریت کی رائے کا احترام کرے گا۔

۱۶۔ مجلس کے جس اجلاس میں کسی امر کا فیصلہ ہو اسکے خلاف کوئی ترمیم اسی اجلاس میں پیش نہ کی جا سکے گی البتہ دوسرے اجلاس میں ترمیم پیش کرنے کا ہر رکن کو اور صدر کو حق ہوگا۔

ناظر مجلس

۱۷۔ مجلس کیلئے صدر ایک ناظر مقرر کریگا جو تمام کارروائیوں کو قلمبند کر کے اپنے پاس محفوظ رکھے گا۔

۱۸۔ مجلس میں ادارہ کی کارروائیوں کو پیش کرنا ناظر کا کام ہوگا، علاوہ ان چیزوں کے جنہیں صدر یا کوئی رکن خود پیش کرنا چاہے۔

اعزازی ارکان شوریٰ

۱۹۔ مجلس شوریٰ معاونین میں سے چند ارباب علم و بصیرت کو اعزازی رکنیت کیلئے منتخب کر سکے گی تاکہ ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ایسے اعزازی ارکان کیلئے قواعد رکنیت ادارہ کی پابندی نہ ہوگی الا یہ کہ وہ باقاعدہ رکن ادارہ بننے پر آمادہ ہوں۔

۲۰۔ مجلس کو یہ بھی اختیار ہوگا کہ حسب ضرورت ادارہ سے باہر کے اصحاب علم و فکر سے مشورہ حاصل کرے۔

ترمیم قواعد

۲۱۔ مجلس کے قواعد میں حسب ضرورت ترمیم کی جا سکے گی۔

ضمیمہ الف۔ قواعد مجلس شوریٰ

حلف نامہ برائے صدر

اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ واشھد ان محمداً عبدہ و رسولہ۔ ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین وبذٰلک امرت وانا من المسلمین۔

میں اللہ وحدہ لاشریک لہٗ کو اور اس کے بعد جماعت المسلمین کو گواہ کر کے عہد کرتا ہوں کہ:

۱۔ شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی پوری پابندی کروں گا۔

۲۔ جماعت میں شریعت کے احکام نافذ کروں گا اور ان احکام کی تنفیذ میں اپنی ہوائے نفس کے اتباع اور کسی کی ذاتی مخالفت یا جانبداری، یا کسی کے خوف یا طمع کو ہرگز دخل نہ دوں گا۔

۳۔ احکام شرعیہ کے ماسوا جو امور میری رائے سے متعلق ہوں یعنی جن میں کوئی صریح حکم شرعی نہ ہو اور جن میں بحیثیت صدر مجھے اپنی قوت فیصلہ سے کام لینے کا اختیار ہو، ایسے امور میں اپنے علم کے مطابق کامل نیک نیتی کے ساتھ شخصی جذبات سے پاک ہو کر فیصلہ کروں گا۔

۴۔ جماعت کے نظام اور مجلس شوریٰ کے اجرائے کار کیلئے جو قواعد بنائے جائیں گے ان کی خود پابندی کروں گا اور تمام ارکان سے بلا رو رعایت ان کی پابندی کراؤں گا۔

۵۔ مجلس شوریٰ کے باہر ارکان کو فرداً فرداً اپنا ہم خیال بنانے یا بعض ارکان کو بعض کے خلاف استعمال کرنے سے سختی کے ساتھ اجتناب کروں گا، اور جماعت میں بھی پارٹیوں کی تشکیل اور منافست کی پیدائش اور ترقی کو روکنے کے لئے اپنی پوری قوت استعمال کروں گا۔

۶۔ ارکان مجلس کو اظہار رائے کی آزادی کا پورا حق دوں گا خواہ وہ میری ذات ہی کے خلاف ہو۔

۷۔ اپنی صدارت کو محفوظ رکھنے اور اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے کبھی کوئی کوشش نہ کروں گا، اور اپنی بے لاگ رائے کے خلاف کوئی ایسا طریق کار ہرگز اختیار نہ کروں گا جس کا مقصد محض ارکان کی کثرت کا اعتماد حاصل کرنا ہو۔

۸۔ بالعموم مجلس کی اکثریت کی رائے کا احترام کروں گا اور صرف ایسے معاملات میں اکثریت کی رائے یا مجلس کی متفقہ رائے کے خلاف فیصلہ کروں گا جن میں مجھے پورا وثوق ہو گا کہ اس رائے پر عمل کرنا جماعت کیلئے مضر یا مفاد اسلامی کے خلاف ہے۔

۹۔ جس وقت مجھے اپنے کسی فیصلہ کی غلطی کا احساس ہو گا اسی وقت بلا تامل اس سے رجوع کروں گا اور اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں مجھے کوئی حجاب مانع نہ ہو گا۔

۱۰۔ تمام ارکان مجلس کے ساتھ یکساں برتاؤ کروں گا اور کبھی کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک موافقانہ یا مخالفانہ کروں گا۔

مَیں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس حلف پر قائم رہنے کی توفیق بخشے اور میرے رفقاء کو اس عہد کے پورا کرنے میں میرا مددگار بنائے۔ آمین۔

ضمیمہ (ب) قواعد مجلس شوریٰ

حلف نامہ برائے ارکانِ مجلس شوریٰ

اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ واشھد ان محمداً عبدہ و رسولہ۔ ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین وبذٰلک امرت و انا من المسلمین۔

میں اللہ وحدہ لاشریک لہ اور اسکے بعد جماعت مسلمین کو گواہ کر کے عہد کرتا ہوں کہ :-

۱۔ مجلس شوریٰ میں اپنے علم اور اپنے ضمیر کے مطابق بلا خوف لومۃ لائم اور بلا طمع ذاتی اپنی رائے کا صاف صاف اظہار کروں گا۔

۲۔ اگر میری رائے کے خلاف مجلس میں فیصلہ ہو تو اسے بے چون وچرا قبول کروں گا، اور فیصلہ ہو جانے کے بعد اس پر اس طرح عمل کروں گا کہ گویا وہی میری رائے تھی، اور کبھی یہ کوشش نہ کرونگا کہ وہ فیصلہ ناکام ہو تاکہ میری سابق رائے کی صحت ثابت ہو جائے۔

۳۔ مجلس کے قواعد اور صدر کے احکام کی سختی کے ساتھ پابندی کروں گا، اور بصورت خلاف ورزی اس سزا کو بخوشی قبول کروں گا جو مجھے دی جائے۔

۴۔ مجلس کے باہر ارکان کو اپنا ہم خیال بنانے کے لئے کنویسنگ نہ کروں گا، نہ کسی رکن یا صدر کے خلاف دوسرے ارکان سے کوئی گفتگو کروں گا، نہ کبھی اپنی پارٹی بنانے کی کوشش کروں گا بصورت خلاف ورزی مجھے جو سزا دی جائے اسے بخوشی قبول کروں گا۔

۵۔ صدر یا کسی رکن یا ارکان سے مجھے جو اختلاف ہوگا، یا جو شکایت ہوگی اسے صاف

صاف مجلس میں پیش کروں گا، اور اس معاملہ میں مجلس کا جو فیصلہ ہوگا اُسے بخوشی قبول کرونگا

۶۔ کبھی کوئی عہدہ حاصل کرنے کا طمع نہ کروں گا، نہ اس کے لئے کوئی کوشش کروں گا، نہ اس کے عدم حصول پر یا اس سے معزول کئے جانے پر کسی رنجش کو اپنے دل میں پرورش کروں گا، نہ کسی رفیق سے اس بنا پر حسد کروں گا کہ اسے کوئی عہدہ دیا گیا ہے۔

۷۔ جو خدمت میرے سپرد کی جائے گی اس کو کامل دیانت و امانت اور وفاداری و تندہی کے ساتھ انجام دوں گا۔

۸۔ اختلاف رائے کی پوری آزادی برتنے کے ساتھ، اختلاف رائے کی بنا پر اپنے کسی رفیق سے کوئی رنجش اپنے دل میں نہ رکھوں گا بلکہ تمام رفقاء کے ساتھ اخلاص و محبت رکھوں گا۔

۹۔ اگر میں اپنے عہد کی خلاف ورزی کروں اور اس کی صحیح اطلاع میرا کوئی رفیق صدر تک پہنچا دے تو اس سے رنجیدہ نہ ہوں گا۔

میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس حلف پر قائم رہنے کی توفیق بخشے اور میرے رفقاء کو اس عہد کے پورا کرنے میں میرا مددگار بنائے۔

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے:-

۱- اسلامی جہاد کی حقیقت۔ اسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روحِ جہاد کا کیا مرتبہ ہے

۲- مدافعانہ جنگ۔ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

۳- مصلحانہ جنگ۔ اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں

۴- اشاعت اسلام اور تلوار۔ دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعتِ اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

۵- قوانینِ جنگ۔ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور اُن میں اسلام کی اصلاحات۔

۶- جنگ دوسرے مذاہب میں۔ جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مت، یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ۔

۷- جنگ اور تہذیب جدید۔ بین الاقوامی قانونِ جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ۔ قیمت مجلد ۵؎ غیر مجلد للعہ

رسالہ دینیات یہ رسالہ سرکار آصفیہ کے محکمۂ تعلیمات نے میٹرک کے طلبہ کو پڑھانے کیلئے لکھوایا ہے۔ اور علمائے دکن کی ایک مستند مجلس اسکی تالیف میں شریک مشورہ رہی ہے۔ مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے۔ اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصولِ شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علما بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۰/

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجیے

مسلمان

اور

موجودہ سیاسی کشمکش

اس کتاب میں ایڈیٹر ترجمان القرآن کے وہ سیاسی مضامین یکجا جمع کر کے شائع کیے گئے ہیں جو ترجمان القرآن کی اشاعتہائے سابقہ میں محرم ۱۳۵۶ھ سے رجب ۱۳۵۶ھ تک لکھے گئے تھے۔ یہ کتاب اصل میں اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت، اور مستقبل کے امکانات پر ایک مدبرانہ تبصرہ ہے، جس سے مسلمانان ہند کے دل و دماغ میں ان کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ کوئی لکھا پڑھا مسلمان اس کے مطالعہ سے محروم نہ رہنا چاہئے۔ یہ کتاب اصل لاگت پر فروخت کی جا رہی ہے۔ ذیل کے نرخوں پر آپ اسے طلب فرما سکتے ہیں۔

ایک روپے میں ۵ نسخے علاوہ محصول ڈاک

نو روپے میں ۵۰ نسخے } کرایہ ریل بذمہ خریدار

پندرہ روپے میں ۱۰۰ نسخے }

نوٹ: محصول ڈاک فی نسخہ سات پیسے بذمہ خریدار۔ ریلوے پارسل کے ذریعہ کم از کم ۲۵ نسخے منگوانے میں فائدہ رہتا ہے۔

شعبۂ اشاعت دار الاسلام (پٹھان کوٹ - پنجاب)

صنعت سرور تی پرنٹنگ پریس میں طبع ہوا

Registered No. L. 4186

شعبان، رمضان، شوال ۱۳۵۷ھ

جلد ۱۳ — عدد ۲، ۳، ۴

۷۸۶

رسالہ ترجمان القرآن ماہوار

اشاعت خاص

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ دوم

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

ملتان روڈ، لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے

قیمت فی پرچہ ۸ آنے

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے :-

۱- اسلامی جہاد کی حقیقت اسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے
۲- مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔
۳- مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں
۴- اشاعت اسلام اور تلوار۔ دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔
۵- قوانین جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور ان میں اسلام کی اصلاحات۔
۶- جنگ دوسرے مذاہب میں۔ جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مت، یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ۔
۷- جنگ اور تہذیب جدید۔ بین الاقوامی قانون جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ۔ قیمت مجلد ۵؎ غیر مجلد ۴؎

رسالہ دینیات یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے۔ اس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے۔ مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے۔ اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصول شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کیلیے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں نیز علماء بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۰؍ محصولڈاک ۲؍ خرچ وی پی ۳؍

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجئے

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

(حصہ دوم)

اسلامی نقطۂ نظر سے موجودہ سیاسی حالات کا تفصیلی تجزیہ۔

اسلامی جماعتوں کی سیاسی روش پر تنقید۔
جدید انقلابی نصب العین کی توضیح۔

از
ابوالاعلیٰ مودودی

فہرست مضامین

ماہ شعبان، رمضان، شوال ۵۷ھ مطابق ماہ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۳۸ء

جلد ۱۳ - عدد - ۲، ۳، ۴

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر پبلشر کے اہتمام سے گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپکر دفتر ترجمان القرآن
واقع ملتان روڈ لاہور سے شائع ہوا۔

بار اوّل	دسمبر ۱۹۳۸ء	۱۳۰۰
بار دوم	فروری ۱۹۳۹ء	۱۰۰۰
بار سوم	اپریل ۱۹۳۹ء	۲۰۰۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مقدمہ

"مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے میرے مضامین کا ایک مجموعہ پہلے شائع ہو چکا ہے۔ اب یہ دوسرا مجموعہ اسی سلسلہ کے دوسرے حصہ کی حیثیت سے شائع ہو رہا ہے۔

کسی قوم کیلیے اُس وقت سے زیادہ پریشانی و سراسیمگی کا اور کوئی وقت نہیں ہوتا جب وہ دیکھتی ہے کہ اسکے گردوپیش سارا ماحول اسکے خلاف بدل گیا ہے، زندگی کے کارخانہ کو چلانیوالی تمام طاقتیں اُن اصول اور اُن مناہج کے خلاف چل رہی ہیں جن پر اعتقاداً و عملاً اُس کے وجود قومی کی اساس قائم ہے، اور وہ اُس درخت کی طرح ہو کر رہ گئی ہے جس کیلیے زمین، ہوا، پانی، موسم سب کے سب ناموافق و ناسازگار ہو گئے ہوں۔ بدقسمتی سے آج ہم ہندوستان کے مسلمان اسی صورت حال سے دوچار ہیں۔ ڈیڑھ صدی سے زیادہ مدت ہم پر اسی حالت میں گذر گئی ہے، اور روز بروز یہ حالت شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ ہندوستان کی کسی دوسری قوم کو یہ پریشانی پیش نہیں آئی اسلیے دوسرے لوگ اُس الجھن کو بآسانی نہیں سمجھ سکتے جس میں ہم مبتلا ہیں۔ انکے لیے ہر بدلی ہوئی صورت کے مطابق بدل جانا اور اپنی ہیئت کو ہر سانچے میں ڈھال لینا سہل ہے۔ ان

کے اعتقادات اور اصول حیات انکے وجود سے الگ ایک چیز ہیں جن کے بدل جانے اور سراسر الٹ جانے کے بعد بھی ان کا وجود جوں کا توں رہتا ہے۔ لیکن ہمارے اعتقادات اور اصول حیات عین ہمارا وجود ہیں، اور انکے بدل جانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اہم نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے ہندوستان کے حالات نے پلٹا کھایا ہے، ہم ایک الجھن میں مبتلا ہیں، اور یہ الجھن بڑھتی جارہی ہے، کیونکہ ہمارے گردوپیش ایک ایسا ڈھانچہ بن گیا ہے اور بنتا جارہا ہے جس میں ہم کسی طرح ٹھیک نہیں بیٹھتے۔

انگریزی حکومت جب ہندوستان پر مسلط ہوئی تو اس کے ساتھ ہی ہمارے ماحول میں ایک ہمہ گیر تغیر رونما ہونا شروع ہوگیا۔ ہم صرف مقام عزت و اقتدار ہی سے گرا نہیں دیے گئے بلکہ ایک غیر مسلم قوم کے غلبہ واستیلاء کا یہ نتیجہ روز بروز زیادہ شدت کیساتھ ہمارے سامنے آنے لگا کہ ہمارے گردوپیش افکار، نظریات، اصول اخلاق، طرز تمدن، معیار تہذیب، قوانین معاشرت و معیشت، نظام حکومت و سیاست، غرض ایک دنیا کی دنیا بدلتی چلی جارہی ہے اور اسکی ہر چیز ہمارے اجتماعی مزاج اور ہماری قومی طبیعت کے بالکل خلاف ہے۔

اول اول ہم نے کوشش کی کہ پتھر کی ایک چٹان بن کر تغیر و انقلاب کی اس رو کے مقابلہ میں ڈٹ جائیں۔ اس سے زیادہ اور کچھ کرنے کے ہم اہل بھی نہ تھے۔ صدیوں کے جمود نے ہم میں اتنی صلاحیت ہی باقی نہ رہنے دی تھی کہ ہم اس انقلاب کی حقیقت کو سمجھ سکتے اور نہ اتنی قوت باقی چھوڑی تھی کہ سوچ سمجھ کر اُن تدابیر کو عمل میں لاتے جو کسی انقلاب کے مقابلہ میں اختیار کرنی چاہییں۔ اتنی صلاحیت اور طاقت ہم میں ہوتی تو یہ انقلاب رونما ہی کیوں ہوتا۔

ایک صدی تک خوب پسنے اور مادی و اخلاقی حیثیت سے تباہ ہوجانے کے بعد یہ راز ہم پر کھلا کہ تغیرات زمانہ کے سیلاب کا مقابلہ جامد چٹان بنکر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے بعد ہمارے

دانشمندوں نے ہمیں ایک اور پالیسی کی تلقین کی اور وہ یہ تھی کہ:

زمانہ باتو نسازد تو بازمانہ بساز

ہم نے کہا کہ آؤ اسی کو آزما دیکھیں، شائد اپنے آپ کو کچھ بدل کر ہم اس نئے ڈھانچہ میں ٹھیک بیٹھ سکیں۔ چنانچہ ہم نے پہلے مغربی تعلیم کی طرف توجہ کی اور اپنے آپ کو زمانے کی رو کے ساتھ بہنے کیلئے تیار کیا۔ پھر غیر مسلم حکومت کی بارگاہ میں درخور حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ اپنی کھوئی ہوئی مادّی طاقتوں میں سے کم از کم ایک معتدبہ حصہ باز یافت کرلیں۔ پھر اپنے ملک کے جدید سیاسی تغیرات سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کی کہ زمانہ کا یہ سیلاب جس طرف جا رہا ہے اسی طرف سب کے ساتھ ہم بھی جائیں۔

یہ تغیرات جو ہم نے اپنی پوزیشن میں کیے، ان سب میں ہمارے پیشِ نظر یہ مسلک رہا کہ اپنی خودی کا تحفظ بھی کرو اور زمانے کے ساتھ بھی چلو۔ لیکن ستّر برس کے تجربے پر ایک غائر نگاہ ڈال کر دیکھیے، کیا اس زمانہ سازی کے دور میں ہم اپنی خودی کو محفوظ رکھ سکے ہیں؟ واقعات کی ناقابلِ تردید شہادت ہے کہ ایسا نہیں ہوا، اور عقل اس کو محال کہتی ہے کہ کبھی ایسا ہوسکتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ چوکھونٹے سانچے میں آپ ٹھیک بھی بیٹھیں اور اپنی مثبت کی گولائی کو تبدیل بھی نہ کریں۔ دریا کے رخ پر بہیں بھی اور اپنی جگہ پر قائم بھی رہیں۔ یہ دو باتیں بالکل متضاد ہیں اور ان کو جمع کرنا صریح عقل کے خلاف ہے۔

مغربی تعلیم کے تجربے سے کیا ثابت ہوا؟ یہ کہ جو ماحول ہم پر مسلط ہے اس میں سے محض ایک عنصر، یعنی "تعلیم" کو ہم دوسرے عناصر سے الگ کرکے نہیں لے سکتے۔ دوسرے عناصر جنکے ساتھ اس عنصر کا غیر منفک رابطہ ہے، خود بخود اسکے ساتھ آتے ہیں۔ زندگی کا ایک اور نقطۂ نظر، اخلاق کے کچھ دوسرے اصول، اشیاء کی قدر و قیمت متعین کرنے کا ایک مختلف معیار،

متمدن زندگی کے کچھ نرالے ڈھنگ، جو سب کے سب اسلام سے بالکل بیگانہ ہیں، اس ایک چیز کو قبول کرتے ہی خواندہ و ناخواندہ آنے شروع ہو جاتے ہیں، اور ان سب کے جمع ہو جانے سے مسلمان خود بخود نا مسلمان بنتا چلا جاتا ہے۔

سرکار فرنگ کے دربار میں پہنچ کر ہمیں کیا سبق ملا؟ یہ کہ دین، ایمان، اخلاق، تہذیب، تمدن سب کچھ ایک روٹی کے عوض دیدو اور روٹی بھی پیٹ بھر نہ ملے۔ اپنی خودی کو قربان کیے بغیر وہاں سے تم کچھ نہیں پا سکتے، اور اس قربانی کے بعد بھی تمہاری حیثیت ایک خادم سے بڑھ کر نہیں ہوتی جو ایک متاعِ حقیر کی طرح آقا کے مفاد پر بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔

سیاسیات میں زمانہ سازی کا پھل کیا ملا؟ یہ کہ تمام سیاسی تغیرات جو اب تک ہوئے اور جو آئندہ ہونے والے ہیں، ہمارے نظریات عمرانی کے بالکل خلاف اور خداوندانِ فرنگ کے نظریات عمرانی کے عین مطابق ہیں۔ ان کا نظریۂ قومیت، انکے اصول جمہوریت، ان کے تصورات حکومت و سلطنت، انہی چیزوں پر تمام جدید تغیرات کی بنا رکھی گئی ہے، اور ایسے تغیرات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کے معنی اپنے وجود کو ایک دوسرے وجود میں بالکل تحلیل کر دینے کے ہیں۔

ان تجربات کے بعد اب ضرورت ہے کہ ہم اپنی دوسری پالیسی پر بھی نظرِ ثانی کریں۔ پہلی پالیسی قریب قریب سو برس کے تجربہ سے غلط ثابت ہوئی اور اسے بدلنا پڑا۔ دوسری پالیسی کو ستر برس کے تجربے نے غلط اور غلط ہی نہیں مہلک ثابت کر دیا۔ اس کو بھی بدلنا اور بہت جلدی بدل ڈالنا چاہیے۔ اب ہمارے لیے صرف تیسری پالیسی باقی رہ جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ:

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

جو ڈھانچہ تمہارے گرد و پیش چھا گیا ہے اس سے تم الگ بھی نہیں رہ سکتے، اور اس میں

اپنی خودی کو قربان کیے بغیر ٹھیک بھی نہیں بیٹھ سکتے، لہذا آؤ اب مردوں کی طرح لڑ کر اس ڈھانچے کو توڑ ڈالو اور اسے مجبور کرو کہ تمہاری ہئیت کے مطابق بنے۔ جس سیلاب میں تم گھر گئے ہو اس کے ساتھ بہنے میں تمہارا وجود نمک کی طرح تحلیل ہوا جاتا ہے، اور اسکے مقابلہ میں جامد چٹان بن کر تم اپنی جگہ جم بھی نہیں سکتے، لہذا آؤ، اب پہاڑوں کی طرح اٹھ کر اس سیلاب کا رخ پھیر دو اور اسے اُس رخ پر بہنے کیلیے مجبور کرو جو تمہاری فطرتِ مُسلمہ کے مقتضیات سے مطابقت رکھتا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں اس میں کامیابی نہ ہو۔ بہت ممکن ہے کہ تم خود ہی اس لڑائی میں ہلاک ہو جاؤ۔ مگر بکری کی زندگی کے سو برس سے شیر کی زندگی کا ایک دن بہرحال زیادہ قیمتی ہے۔

یہی انقلابی ذہنیت ہے جسے میں اب مسلمانوں میں، خصوصاً ان کے نوجوانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ انقلابی ذہنیت یکایک پیدا نہیں ہوتی۔ زمانہ کی سخت ٹھوکریں کھا کھا کر آہستہ آہستہ دماغ درستی پر آتا ہے، اور ان ٹھوکروں کے ساتھ آہستہ آہستہ انقلابی ذہنیت اُس کے اندر اترتی ہے۔ اس دوران میں آدمی کو بڑے سخت مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ باہر والوں سے پہلے گھر والوں سے لڑائی، اور لڑائی بھی چو مکھی لڑائی لڑنی پڑتی ہے۔ قدیم پالیسی جن دماغوں میں گہری جمی ہوئی ہوتی ہے وہ انقلاب کی دعوت سن کر اول تو اس کا مفہوم و مدعا ہی نہیں سمجھ سکتے۔ پھر کچھ کچھ سمجھتے بھی ہیں تو اسے اپنے عادی تصورات کے خلاف پا کر مشتعل ہو جاتے ہیں۔ کوئی سمجھتا ہے کہ یہ کوئی نیا دوکاندار آیا ہے جو ہماری پرانی جمی ہوئی دوکانوں کے مقابلے میں اپنی دوکان جمانے کیلیے یہ باتیں کر رہا ہے۔ کوئی خیال کرتا ہے کہ یہ کوئی گہری سازش ہے جسے دشمنوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ تیار کیا ہے۔ کوئی تیوری بدل کر کہتا ہے کہ جن لوگوں نے اپنے بال قومی خدمت میں سفید کیے ہیں ان کے مقابلہ میں نوخیز، طفلِ مکتب ہو کر تمہیں زبان

کھوتے شرم نہیں آتی۔ کوئی آوازہ کستا ہے کہ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ۔ اور کوئی نہنگ سال خوردہ سیلاب کے ساتھ بہتے ہوئے ایک سرپرستانہ نگاہ اس رَو کے خلاف تیرنے والی مچھلی پر ڈالتا ہے اور بس یہ کہکر آگے بہ نکلتا ہے کہ اس نے کوئی نئی بات نہیں کہی، ہم بھی پہلے کہہ چکے ہیں۔

پھر پرانے خیالات کی ایک دنیا ہوتی ہے جسے انقلاب کے داعی کو توڑنا پھوڑنا ہوتا ہے، اور نئے خیالات کی ایک دنیا ہوتی ہے جو اُسے بنانی پڑتی ہے۔ لوگ پرانے خیالات سے ہٹ نہیں سکتے جب تک کہ نہایت مضبوط دلائل کے ساتھ تنقید کرکے ان کی بنیادیں ہلا نہ دی جائیں۔ اور نئے خیالات قبول نہیں کرسکتے جب تک کہ تعمیری افکار کو حکمت عملی کے ساتھ پیش کرکے انہیں قابل قبول نہ بنا دیا جائے، اور معقول دلائل کے ساتھ انہیں مطمئن نہ کردیا جائے کہ اس مضبوط ڈھانچے کو جس کی گرفت میں تم طوعاً یا کرہاً آگئے ہو، یوں توڑا جاسکتا ہے اور اسکی جگہ یہ ڈھانچہ بنانے کی ضرورت ہے جس میں تم ٹھیک بیٹھ سکتے ہو، اور یہ دوسرا ڈھانچہ اس طرح بننا ممکن ہے۔ اس کام میں تخریبی تنقید اور جدید تعمیر دونوں ساتھ ساتھ کرنی پڑتی ہیں۔ جب تک یہ دونوں کام تکمیل کے قریب نہیں پہنچ جاتے، غلط فہمیوں، بدگمانیوں اور پریشان خیالیوں کا ایک گہرا غبار ہر طرف چھایا رہتا ہے جسکی وجہ سے پرانے خیالات کے معتقدین اور جدید و قدیم کے درمیان بھٹکنے والے مذبذبین کے ایک انبوہ کثیر کو انقلابی نصب العین کا نقطہ صاف نظر نہیں آسکتا کہ وہ اُس پر جمع ہوسکیں، اور جب تک یہ نقطہ واضح ہوکر اس قابل نہیں بن جاتا کہ قوم کی عملی قوتیں اس پر مجتمع ہوں، اس وقت تک عملی جدوجہد کی راہ میں کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ پس یوں سمجھیے کہ ابتداءً سب سے بڑا عمل یہی ہے کہ قدیم خیالات کا طلسم پیہم ضربوں سے توڑا جائے اور جدید خیالات کیلیے راہ صاف کی جائے۔

تخریبی تنقید کے مرحلے میں ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ قدیم پالیسی کی غلطیاں اور مضرتیں ثابت کرنے کیلیے اُس پالیسی پر چلنے اور چلانے والوں کو تنقید کا ہدف بنائے بغیر چارہ نہیں ہوتا اور یہ ایسا کام ہے جسے دل پر پتھر رکھ کر انجام دینا پڑتا ہے۔ اس میں آدمی کو بہت سی دوستیوں، بہت سی محبتوں، بہت سے پرانے تعلقات کی قربانی دینی پڑتی ہے، اور بہت سے ان بزرگوں کی ناراضی مول لینی ہوتی ہے جن کا وہ تمام عمر احترام کرتا رہا ہے اور جنکی بزرگی کے احترام سے اس کا دل کبھی خالی نہیں ہوتا۔ اس میں آدمی کو اس امر کا بھی اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں تنقید کی شدت سے وہ جواب میں ضد پیدا نہ کردے، اور کہیں جوابی حملے خود اس کے ذہنی توازن کو نہ بگاڑ دیں۔ غرض اس خارزار سے اس کو بہت ہی سنبھل کر گزرنا پڑتا ہے اور ہر وقت اپنے اعصاب کی بندش چست رکھنی ہوتی ہے۔

انقلابی ذہنیت پیدا کرنے کیلیے تدریج کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ لوگوں کی قوتِ تحمل سے زیادہ خوراک دینا بھی مہلک ہے اور جتنی خوراک کی طلب ان میں پیدا ہو چکی ہو اس سے کم دینا بھی برے نتائج پیدا کرتا ہے۔ یہاں قدم قدم پر آدمی کی قوت فیصلہ کا سخت امتحان ہوتا ہے، اور صرف خدا ہی کی مدد اسکو حالات کا صحیح اندازہ کرنے اور ٹھیک وقت پر ٹھیک قدم اٹھانے کی طاقت بخش سکتی ہے۔

میں اپنی کمزوریوں سے خوب واقف ہوں، اور انہی کمزوریوں کا احساس ہے جو مجھے ہر وقت مجبور کرتا ہے کہ میں خداوند عالم سے علمِ صحیح اور عقلِ سلیم کیلیے دعا کروں۔ محض فرض کی پکار نے مجھے مجبور کرکے اُس کام پر آمادہ کیا ہے جسکے دشوار گذار مرحلوں کو دیکھ کر ایک طرف، اور اپنی کمزوریوں کو دیکھ کر دوسری طرف، میری روح لرز اٹھتی ہے۔ بہرحال محض خدا کے بھروسے پر میں نے اس میدان میں قدم رکھ دیا ہے اور ان تمام حکمتوں کو پیش نظر رکھ کر، جنکی طرف

اوپر اشارہ کرچکا ہوں، اپنے انقلابی مشن کی تبلیغ شروع کردی ہے۔

پچھلا مجموعہ مرتب کرتے وقت میں نے خاص طور پر اس بات کو ملحوظ رکھا تھا کہ ابھی محض لوگوں کو چونکانے اور ان کے دماغوں کو انقلابی تصورات کیلیے تیار کرنے کی ضرورت ہے، اس سے زیادہ کے وہ متحمل نہیں ہوسکتے۔ اس لیے میں نے مسلمانوں کی پچھلی تاریخ، انکے موجودہ حالات، اور انکے گردوپیش کام کرنے والی قوتوں کے رجحانات پر ایک سرسری تبصرہ کرتے ہوئے صرف یہ بتانے پر اکتفا کیا تھا کہ تمہارے اندر کیا کمزوریاں ہیں، اور باہر سے کس قسم کے خطرات تم کو گھیرے ہوئے ہیں، اور تمہاری تہذیب کی فطرت سے تمہارے ماحول کی طاقتیں کس طرح متصادم ہورہی ہیں۔ اس تبصرے کے ساتھ میں نے جدید انقلابی نصب العین کی طرف غرض چند اشارات کیے تھے اور انہیں قصداً زیادہ واضح نہیں کیا تھا تاکہ اچانک ایک نرالی آواز سن کر طبائع آمادۂ بغاوت نہ ہوجائیں۔

اب اس دوسرے مجموعہ میں، میں ایک قدم اور بڑھا رہا ہوں۔ اب میں نے زیادہ وضاحت کے ساتھ ہندوستان کے موجودہ سیاسی نظام اور اسکی بنیادوں کا تجزیہ کیا ہے اور ایک ایک مقام پر انگلی رکھ کر بتایا ہے کہ یہاں مسلمانوں کیلیے ہلاکت ہے، اور یہاں ان کیلیے نقصان ہے، اور یہ چیزیں انکے مزاج قومی کے منافی ہیں ــــ یہ ان لوگوں کا جواب ہے جنہوں نے یہ غلط فہمی پھیلا رکھی ہے کہ مسلمانوں کو محض خیالی خطرات سے ڈرایا جارہا ہے ــــ اسکے بعد میں نے مسلمانوں کے اُن رہنماؤں کی پالیسی پر تنقید کی ہے جو اب تک "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" کے مسلک پر چلے جارہے ہیں۔ جس قدر دلائل و شواہد میں فراہم کرسکتا تھا ان سب سے کام لے کر میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ پورا نظامِ حکومت و سیاست جو ہم پر مسلط ہے، اپنے اصول و فروع سمیت، اُن اصولوں سے متصادم ہورہا ہے جن پر

ہماری قومی زندگی کی بنا قائم ہے، اور اس نظام کو انہی بنیادوں پر قائم رکھ کر اپنے آپ کو جوں کا توں، یا کسی قدر تحفظ کیسا تھ اس میں فٹ کرنیکی کوشش کرنا سراسر ایک غیر دانشمندانہ طریق کار ہے، اور مسلمان اس طریق کار سے ہرگز کسی فلاح کی، اور فلاح کیا معنی، اپنے بقاء کی بھی امید نہیں کر سکتے ــــ اس بحث سے میرا واضح مقصد یہ ہے کہ خیالات، مقاصد اور پالیسیوں میں جو اشتباہ و التباس اور الجھاؤ اس وقت پایا جا رہا ہے اسے ختم کر دیا جائے، جو مختلف اور متضاد راستے اس وقت خلط ملط اور گڈمڈ ہو گئے ہیں ان کو الگ الگ کر کے دینِ قیم کی راہ اور طاغوت کی راہ کو بالکل ایک دوسرے سے ممیّز کر دیا جائے، اور لوگوں کو مجبور کر دیا جائے کہ دونوں میں سے کسی ایک ہی راستے کو اپنے لیے منتخب کریں۔ جو وطن پرست ہیں اور ایک ہندوستانی قومیت میں جذب ہونا چاہتے ہیں وہ علیٰ وجہ البصیرت اور علیٰ رؤس الاشہاد اس راستے پر جائیں اور یہ سمجھ کر جائیں کہ یہ راستہ اسلام کے راستے کے خلاف جا رہا ہے۔ اور جو مسلمان ہیں اور مسلمان رہنا چاہتے ہیں وہ قوم پرستی اور نیشنلزم کا نام لینا چھوڑ دیں اور اُس تحریک سے الگ ہو جائیں جو اسلامی قومیت کو وطنی قومیت میں تحلیل کرنا چاہتی ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ میں ان لوگوں کے موقف کو ناممکن الوقوف بنا دینا چاہتا ہوں جو بیک وقت دو کشتیوں میں پاؤں رکھنا چاہتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ یہ مخالف سمتوں میں جانیوالی کشتیاں ہیں ــــ سب سے آخر میں میں نے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ ہمارے لیے اب صحیح قومی پالیسی کیا ہے اور اس کو کس طرح عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کو پورا جواب مل جائے گا جو اس غلط خیال میں خرص و تخمین کے تیر تکّے چلا رہے ہیں کہ میرے پاس محض سلب ہی سلب ہے، اثبات و ایجاب نہیں ہے۔

جب لوگ موجود الوقت نظام کے پوری طرح خوگر ہو چکے ہوں تو ان کے لیے یہ

سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ اس نظام میں اصولی خرابیاں کیا ہیں، اور یہ کہ اسکے اصولوں سے مختلف بھی کچھ اصول ہوسکتے ہیں جن پر کوئی قابلِ عمل نظام بن سکتا ہے۔ اسی لیے میں جانتا ہوں کہ اُس توضیح و تشریح کے باوجود جو میں نے موجودہ نظام پر تنقید کرنے اور جدید تعمیر کا نقشہ کھینچنے میں اختیار کی ہے، بہت سے نکات ایسے باقی رہ جائینگے جن میں لوگوں کو الجھن پیش آئیگی۔ میں خود بھی اپنا تمام وقت ان کو سمجھنے میں صرف کر رہا ہوں، اور اپنے ناظرین سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ اس مجموعہ کو ملاحظہ فرماتے وقت وہ نوٹ کرتے جائیں کہ کون کون سے مقامات توضیح طلب ہیں۔ اگرچہ میں گالیاں دینے والے حضرات کا بھی شکر گذار ہوں کہ وہ بھی میری اخلاقی تربیت میں مفید حصہ لے رہے ہیں، مگر میں اُن حضرات کا اور زیادہ شکر گذار ہونگا جو میرے ان مضامین پر تحقیقی تنقید فرمائینگے۔

ابوالاعلیٰ

۲۱ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۷ھ

مسلمانوں کی غلط نمائندگی اور اسکے نتائج

یہ سوال کہ ہندوستان کے مسلمان کیوں بے چین اور غیر مطمئن ہیں، اور کیوں اپنے ملک کی اس سیاسی جدوجہد میں، جسکو "جنگ آزادی" کہا جاتا ہے، اپنے شایان شان حصہ نہیں لیتے، ایک ایسا معمّا بن گیا ہے جسے سمجھنا صرف غیر مسلموں ہی کیلیے نہیں، بلکہ خود بہت سے مسلمانوں کیلیے بھی دشوار ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کی حالت اس وقت اس شیر خوار بچے کی سی ہے جو اپنی تکلیف پر روتا اور تڑپتا ہے، مگر ٹھیک ٹھیک یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کو تکلیف کیا ہے جس پر وہ رو اور تڑپ رہا ہے، حتیٰ کہ بسا اوقات غیر تو غیر، خود اسکی اپنی ماں کو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ اسے فی الواقع کوئی شکایت نہیں، محض ضد چڑھ گئی ہے۔ اس وقت ضرورت تھی کہ مسلمان قوم کے ذہن کو ٹھیک ٹھیک پڑھ کر اسکی بے چینی اور بے اطمینانی کے حقیقی اسباب دریافت کیے جاتے، اس اصل مسئلے کو واضح اور منقح صورت میں پیش کیا جاتا جو ہندوستانی مسلم قوم کیلیے زندگی و موت کا مسئلہ بنا ہوا ہے، اور یہ بتایا جاتا کہ ہندوستان کا مسلمان فی الواقع چاہتا کیا ہے۔ نیز مسلمان کے نقطۂ نظر سے ہندوستان کے موجودہ حالات اور مستقبل کے رجحانات کا تجزیہ کر کے صاف صاف بیان کر دیا جاتا کہ کس طرح یہاں ایسا ماحول پیدا ہو رہا ہے اور ہوتا جا رہا ہے جس کو مسلمان اپنی قومی زندگی کے لیے مہلک سمجھتا ہے۔ صرف یہی ایک صورت تھی جس سے مسلمانوں کی اپنی پراگندہ خیالی، اور غیر مسلموں کی حیرانی، بدگمانی اور بدتدبیری کا خاتمہ ہو سکتا تھا۔ بعض غیر مسلموں نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اس معمّے کو سمجھنے اور مسلمان کے ذہن کو پڑھنے کی کوشش بھی

کی، مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ہو سکے۔ یہ کام دراصل ایسے لوگوں کے کرنیکا ہے جنکے احساسات جمہور مسلمین کے احساسات سے متحد الاصل ہیں، اور اسکے ساتھ جن میں یہ قوت بھی ہے کہ اپنے اندر جو کچھ محسوس کریں اُسکی واضح تصویر خارج میں کھینچ کر رکھ دیں۔

مسلمانوں کے صاحب علم و صاحب فکر لوگوں نے اس باب میں جس غفلت سے کام لیا ہے، اس کا نتیجہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ مسئلہ بالکل نا اہل اور نا قابل اعتماد لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا ہے، اور انہوں نے اس کو نہایت غلط طریقوں سے پیش کر کے دوسروں ہی کو نہیں، خود اپنی قوم کو بھی پریشان خیالیوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔

ان میں سے ایک بڑی جماعت تو اسلام کا صحیح علم ہی نہیں رکھتی، اور نہ اس حقیقت کو سمجھ سکتی ہے کہ مغربی علوم کے فروغ، غیر مسلم حکومت کے اقتدار، اور اب جدید نیشنلزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے مسلم قوم کیلئے فی الواقع کونسا بنیادی سوال پیدا ہو گیا ہے۔ یہ لوگ بغیر سمجھے بوجھے، محض چند سطحی اور حقیر سے جزئیات کو مسلمانوں کے قومی مسائل بنا کر پیش کرتے ہیں، اور ان پر مناسب حد سے بہت زیادہ زور دیکر اپنی پوزیشن کو اور زیادہ مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں۔ اس سے ہوشیار لوگوں کو یہ خیال پھیلانے کا اچھا موقع مل جاتا ہے، کہ مسلمانوں کا قومی مسئلہ چند بہت ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے مرکب ہے جن کو محض جہالت تنگ نظری اور نادانی کی وجہ سے اتنی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔

ایک دوسری جماعت جس نے اس مسئلہ کی حمایت میں اپنے آپ کو بہت نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے، انگریزی سلطنت کے وفادار غلاموں پر مشتمل ہے، اور ان کا فائدہ اسی میں ہے کہ اصل مسئلہ کو فروعات میں گم کر دیا جائے، تاکہ مسلمان فضول چیزوں پر لڑ کر اپنی قوت ضائع کرتے رہیں اور ان کی جان و مال کے خرچ پر سرکار برطانیہ کا کام بنتا رہے۔ ان حضرات کی

مداخلت سے اس مسئلہ کی عزت و وقعت اور بھی زیادہ کم ہو گئی ہے اور مخالف گروہ کے چالاک لوگوں کو یہ مشہور کرنے کا بہت اچھا بہانہ ہاتھ آگیا ہے کہ در حقیقت مسلمانوں کے قومی مسئلہ کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، یہ تو محض امپیریلسٹ پالیسی کا ایک شاخسانہ ہے، اور صرف ٹوڈیوں، رجعت پسندوں اور سرکار پرستوں ہی کی اغراض نے اسے پیدا کیا ہے۔

ان دونوں گروہوں کی بدولت جو نقصان ہمارے مقدمہ کو پہنچا ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ غیر تو غیر خود مسلمان بھی اب اس دھوکہ میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں کہ در حقیقت ہمارا کوئی قومی مسئلہ نہیں ہے۔ اور اگر ہے بھی تو وہ ایسا اہم نہیں کہ آزادی وطن کے مسئلے سے بڑھ کر ہم کو اسکی فکر ہو۔ چنانچہ مسلمانوں کے اپنے آدمیوں کی زبانوں پر اب وہی باتیں آنے لگی ہیں جو کل تک غیر مسلم اخباروں اور لیڈروں کی زبان و قلم پر تھیں۔ یعنی مسلم مفاد کا نام لینا رجعت پسندی اور ٹوڈیت اور فرقہ پرستی ہے۔ یہ جادو عوام سے گذر کر علماء پر بھی چڑھ رہا ہے اور وہ لوگ اس سے متاثر ہو رہے ہیں جنکا اصلی فرض یہ تھا کہ جانشینان رسول ہونیکی حیثیت سے اس مسئلہ کو سمجھتے اور سمجھاتے، اور جانشینان رسول ہونیکی حیثیت ہی سے اسکو حل کرنیکی کوشش کرتے۔ اب اگر ہماری قوم کے وہ چند ارباب فکر جو حقیقت کو سمجھنے ہیں اور سمجھانے کی بھی اہلیت رکھتے ہیں اور جنکا ذہن ابھی تک بیرونی اثرات سے آزاد ہے، پھر خاموشی نہ توڑینگے اور صاف صاف حقیقت کو بیان نہ کرینگے، تو یقیناً زمانے کی دو تین گردشیں بھی نہ گزرنے پائیں گی کہ مسلمانوں کی پوری قوم فریب میں مبتلا ہو جائیگی۔ اس میں شک نہیں کہ اب مسلمانوں کے مفاد کا نام لینا اپنے آپکو بڑے خطرے میں ڈالنا ہے کیونکہ اب غیروں ہی سے نہیں، خود اپنے بھائیوں سے بھی ایسے شخص کو گالیاں سننی پڑینگی اور انسان کیلیے غیروں کی گالیوں سے بدرجہا زیادہ دلشکن ان لوگوں کی گالیاں ہوتی ہیں جنکی بھلائی کیلیے وہ کام کرتا ہے۔ لیکن خواہ نتائج کیسے ہی تلخ ہوں، جن لوگوں کو اپنی ذات کے مفاد سے بڑھ کر اپنی قوم کا مفاد عزیز ہے، انھیں ہر برے سے

بُرے نتیجہ کو برداشت کرنے کیلیے تیار ہونا چاہیے، اور کم از کم تذکیر کا فرض بجالانے سے ہرگز منہ نہ موڑنا چاہیے۔

اس کو مسلمانوں کی بدنصیبی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ لوگ جو سب سے بڑھ کر ان کے قومی مزاج کو سمجھنے والے، اور انکے جذبات وداعیات کا صحیح حال جاننے والے، اور ان کے قلب وروح کی سچی نمائندگی کرنے والے ہوسکتے تھے، اور جن سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ اس قوم کی حقیقی مشکلات کو سمجھ کر کوئی کارگر تدبیر علاج تجویز کرینگے، آج وہ بھی زمانہ کے غالب اثرات کی رو میں بہتے جارہے ہیں، اور نادانستہ انکی زبانوں سے وہ باتیں نکل رہی ہیں جو کل تک زیادہ کھلے الزامات کی صورت میں غیروں کی زبان سے نکلا کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر میں اس تقریر کا اقتباس نقل کرتا ہوں جو ابھی حال میں مولنا سید سلیمان ندوی نے مدراس میں ارشاد فرمائی ہے[1]۔ مولنا کے علم وفضل، انکی صداقت، ان کے تفکر و تدبر کا جیسا معترف میں ہمیشہ سے تھا ویسا ہی آج بھی ہوں، اور انکی تقریر کا اقتباس نقل کرنے سے میرا مدعا انکی ذات گرامی پر کوئی حرف لانا نہیں ہے، بلکہ دراصل میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وقت کے غالب خیالات نے ہماری قوم کے اتنے بڑے صاحب فکر و بالغ النظر عالم پر بھی کیا اثر کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"اس وقت تین ہی صورتیں ہیں۔ یا تو مسلمان اپنے گھروں کے دروازے بند کرکے بیٹھ رہیں اور جب آزادی کی جنگ ختم ہوجائے تو وہ اپنے دروازے کھول کر باہر نکلیں اور گلیوں میں آزادی کی بھیک مانگتے پھریں۔ یا یہ کریں کہ اپنا

[1] مولانا نے ترجمان القرآن میں اس اقتباس کے شائع ہونے پر شکایت تو فرمائی تھی لیکن یہ نہیں فرمایا کہ انہوں نے یہ الفاظ نہیں کہے تھے یا کم از کم ان کا مفہوم یہی نہ تھا جو "انصاری" کے رپورٹر نے روایت بالمعنی کے طور پر بیان کیا ہے۔

کیمپ الگ لگائیں اور یہ دیکھتے رہیں کہ آزادی کی فوج اپنی قوت بازو سے کب میدان جیتتی ہے اور مال غنیمت پر قبضہ کرتی ہے اس وقت وہ آگے بڑھیں اور فاتح فوج سے مال غنیمت میں جھگڑا کریں۔ یا یہ کہ وہ آزادی کی فوج میں شامل ہوکر آزادی کیلیے ان کے دوش بدوش کھڑے ہوکر جنگ کریں اور اپنے لیے اپنی عظیم الشان قومیت کی پوزیشن کے مطابق اپنی کوششوں سے اپنی جگہ حاصل کریں (" الصاری" مورخہ ۳ رمضان ۱۳۵۹ھ)۔

غور کیجیے! یہ ارشاد گرامی کن مفروضات کا نتیجہ ہے: "مسلمان جو کئی سال تک آزادی کی جنگ سے الگ رہے اور اب بھی ٹھٹکے کھڑے ہیں، اسکی وجہ کچھ اور نہیں، محض بزدلی ہے۔ اور یہ قوم بزدل ہونے کے ساتھ کمینہ بھی ہے۔ جب آزادی کی فوج کے سورما سپاہی، جو ظاہر ہے کہ اکثر و بیشتر غیر مسلم ہی ہیں، شیروں کی طرح شکار مار لینگے تو یہ جنگل کے ذلیل جانوروں کی طرح آکر حصہ اڑانے کی کوشش کرے گی"۔۔۔ یہ ہے مسلمانوں کی وہ تصویر جو ان الفاظ سے ذہن سامع میں بنتی ہے۔ اور اسکے ساتھ غیر مسلموں کی عظمت و بزرگی کا کیسا مرعوب کن نقشہ ذہن کے سامنے آتا ہے کہ گویا وہ شیران بیشہ حریت ہیں جو تمام ہندوستان کیلیے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ پھر یہ "جنگ آزادی" کس قدر پاک، کیسی بے عیب اور کتنی بے لوث چیز فرض کی گئی ہے کہ اس میں کسی لوٹ کا شبہ کرنا تو گویا ممکن ہی نہیں، ایسی پاک جنگ، ایسے مقدس جہاد میں حصہ لینے سے مسلمانوں کا احتراز کرنا کسی معقول وجہ پر تو مبنی ہو ہی نہیں سکتا، اب بس یہ ایک ہی وجہ رہ جاتی ہے کہ مسلمان بزدل، دوں ہمت اور کمینہ ہیں۔

ایک دوسرے بزرگ جنکے علم، تقوٰی اور دیانت کا احترام میرے دل میں انکے کسی شاگرد اور مرید سے کم نہیں ہے، اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

"جس طرح آزادی کیلیے جدوجہد کرنا ہندوستان کی دوسری قوموں پر واجب ہے اسی طرح مسلمانوں پر بھی واجب ہے، بلکہ ان کیلیے اسباب وجوب بہ نسبت دیگر اقوام ہند کے چند در چند زائد ہیں۔ پس مسلمانوں کا دوسری اقوام سے پیچھے رہنا انتہائی شرمناک اور ذلیل امر ہے" (مولانا حسین احمد صاحب کا مکتوب "آفتاب" لکھنؤ، مورخہ ۱۵ اپریل ۳۸ء)

یہاں بھی وہی نظریہ کام کر رہا ہے۔ حقائق سے آنکھیں بند کر کے یہ تسلیم کر لیا گیا کہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی جدوجہد فی الواقع خالص آزادی وطن کی جدوجہد ہے اور اس مفروضہ پر یہ حکم لگا دیا گیا کہ اس جدوجہد میں شریک ہونا مسلمانوں پر واجب ہے، اور اس سے ان کا علیحدہ رہنا کسی معقول وجہ پر مبنی نہیں بلکہ "انتہائی شرمناک اور ذلیل امر ہے"۔

میرے ایک نہایت محترم بھائی جو علم و فضل کے ساتھ خلوص نیت کی نعمت سے بھی مالامال ہیں، اور عصر حاضر کے مشہور مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی جانشینی کا شرف رکھتے ہیں، اپنے ایک تازہ مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:-

"یہ ساری تنظیم صرف اکثریت کے خطروں اور اندیشوں پر مبنی ہے۔ یہ اندیشے واقعی ہیں یا غیر واقعی؟ ہم تھوڑی دیر کیلیے تسلیم کر لیتے ہیں کہ واقعی ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ امر بھی ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ تنظیم کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ انگریزوں کے ہاتھوں بالکل انہی نعروں اور انہی ہنگاموں کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے بعد سے شروع ہو گئی تھی اور ۱۸۸۵ء کے بعد سے تو ہندوستان میں کوئی انگریز حکمراں ایسا نہیں آیا جس نے اکثریت کی چیرہ دستیوں سے بچاؤ کیلیے مسلمانوں کی تنظیم اپنی حکومت کی مسلّمہ پالیسی نہ قرار دی ہو۔ اور یہ تنظیم اس تھوڑے سے وقفہ کے سوا جو تحریک خلافت

نے پیدا کر دیا تھا پورے استحکام کیساتھ باقی رہی ہے اور ہم سے زیادہ ہمارے مہربان حکام نے اسکی رضاعت اور تربیت کی ذمہ داریاں محسوس کی ہیں، اور جب تک موجودہ سیاسی ضروریات باقی ہیں اور حالات کوئی نئی کروٹ نہیں بدلتے، کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے اس عظیم الشان انسانی و سیاسی فرض سے بحیثیت ہمارے فرمانروا ہونے کے اُن پر عائد ہوتا ہے، بے پروا ہو جائینگے۔ پس جو چیز بنی بنائی موجود، اور پورے استحکام و قوت کے ساتھ موجود ہے اس پر مزید چونے گارے کے اسراف کی کیا ضرورت ہے؟ اگر اکثریت آپکے اس حصن حصین میں سرنگ لگانے کی فکر میں ہے تو نصیب اعداء آپ کیوں اس درجہ مضطرب و سراسیمہ ہوں۔ جو بیدار مغز حکومت ایک لاکھ روپیہ سرحد پر روزانہ خرچ کر کے محض فرضی خطروں کا سدباب کرتی رہتی ہے کیا وہ اتنی بیہوش اور بے خرد ہو گئی ہے کہ وہ اپنے حفظ و بقاء کی ریڑھ کی ہڈی کو یونہی اعداء کے حملوں کا ہدف بننے کیلیے چھوڑ دے گی" (الاصلاح ۔ ۲ راسے میر۔ مورخہ جولائی ۳۸ء)

آگے چلکر مولانا فرماتے ہیں :۔

"اگر آپ سچ مچ مسلمانوں کو منظم کرنا چاہتے ہیں تو ان کو کسی اکثریت و اقلیت کے خطروں سے ڈرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اللہ سے ڈرائیے"

پھر ایک طویل بحث کے بعد آیات قرآنی سے استدلال کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

"تمہارے سامنے بھی ہمت آزمائی اور عمل کا ایک میدان (یعنی یہی آزادی کی جنگ!) ہے جس میں اگر داخل ہو جاؤ تو فتمندی تمہارے ہی لیے ہے۔ لیکن اکثریت کے خوف اور اسکے سامان اور رعب کی کثرت نے تم کو سراسیمہ کر دیا ہے

اس لیے عزم و ہمت سے محروم ہو کر تم پست ہمتی کی خاک مذلت پر لوٹ رہے ہو"

(حوالۂ مذکور)

دیکھیے! یہاں خود ہماری قوم کا ایک اہل قلم ہمارے مقدمہ کی کس قدر غلط ترجمانی کر رہا ہے۔ جس عینک سے پنڈت جواہر لال نہرو مسلمانوں کے معاملہ کو دیکھتے ہیں، ٹھیک وہی عینک خود ہمارے ایک بھائی نے اپنی آنکھوں پر لگالی ہے، اور لطف یہ ہے کہ یہاں اس عینک پر روسی کارخانے کے بجائے قرآنی رصدگاہ کا لیبل لگا ہوا ہے تاکہ مسلمان بے چارا بچاؤ کی کوئی راہ نہ پائے۔ دنیا سے تو گیا ہی تھا، دین کی عدالت سے بھی گمراہی کا فتویٰ سنے!

جس حکومت کی مہربانیوں کو اس قدر لطیف پیرایہ میں اوپر ذکر فرمایا گیا ہے، اس کی سب سے بڑی مہربانی ہمارے حال زار پر یہ ہے کہ اس نے ڈیماکریسی کے انگریزی اصول ہندوستان میں رائج کیے ہیں، جنکی رو سے دو مسلمانوں کے مقابلے میں ۳ غیرمسلموں کی رائے بہرحال صحیح ہے اور حکومت ہمیشہ اُسی رائے کے مطابق چلے گی جو ڈیماکریسی کے اس قاعدہ کی بنا پر صحیح قرار پائے۔ مہربان سرکار کی لائی ہوئی اس نعمت کو آگے بڑھ کر وہ غیرمسلم قبول کر لیتے ہیں جو "ہمت آزمائی اور عمل" کے میدان میں داد مردانگی دے رہے ہیں، کیونکہ اس میں سراسر انہی کی "فتحمندی" ہے مسلمان اس پر ناک بھوں چڑھاتا ہے تو وہی غیرمسلم اپنی "فتحمندانہ" پوزیشن کو محفوظ رکھنے کیلیے مسلمان پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ انگریز کے اشارے سے ہو رہا ہے۔ خود غرضانہ نقطۂ نظر سے غیرمسلموں کا یہ کہنا بالکل حق بجانب۔ کیونکہ ان کو اپنے مفاد کی حفاظت کیلیے ہر ممکن تدبیر کرنی ہی چاہیے، مگر یہ مسلمانوں کی بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے کہ خود انکے اپنے بہت سے ممتاز افراد بھی اس معاملہ میں غیرمسلموں کے ہم نوا بن جاتے ہیں۔ سرکار برطانیہ کی لائی ہوئی یہ ڈیماکریسی کی لعنت تو ان کو نعمت نظر آئی ہے، مگر اس لعنت سے بچنے کیلیے مسلمان اگر کوئی کوشش کرتے ہیں

تو ارشاد ہوتا ہے کہ اکثریت و اقلیت کا سوال چھیڑنے کے معنی انگریزی اقتدار کی حفاظت کے ہیں۔

پھر لطف یہ ہے کہ ایک طرف تو ڈیماکریسی کا یہ قاعدہ تسلیم کرا یا جاتا ہے کہ دو مسلمان، چاہے وہ موسیٰ و ہارون ہی کیوں نہ ہوں، باطل پر ہیں اگر انکے مقابلے میں فرعون یا سامری کی امت کے چھ آدمی مخالفانہ رائے دیں، اور دوسری طرف یہ بھی ارشاد ہوتا ہے کہ "مسلمانوں کو اکثریت اقلیت کے خطروں سے ڈرانے کی ضرورت نہیں، صرف اللہ سے ڈرنا چاہیے۔" اور یہ ہدایت بھی فرمائی جاتی ہے کہ اگر ڈیماکریسی کے اس قاعدے کو قبول کر کے تم "ہمت آزمائی اور عمل کے میدان" میں کود پڑوگے تو "فتحمند" ہوگے، ورنہ یونہی "پست ہمتی کی خاک مذلت" پر لوٹتے رہوگے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ انگریز اور ہندو مل کر جو زہر تم کو کھلا رہے ہیں ہمت کر کے اسے کھا جاؤ، انشاء اللہ تم کو شہادت کا درجہ نصیب ہوگا جو عین "فتح مندی" ہے، ورنہ اس زہر کو کھانے سے اگر تم نے انکار کیا، اور لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ کے قرآنی اصول پر پست ہمتوں کیطرح اصرار کرتے رہے، تو "اولوالالباب" تم کو جواہر لال نہرو کے ساتھ مل کر طنز و تعریض کی لطیف زبان میں "سرکار برطانیہ کے ٹوڈی" کا طعنہ دینگے!

سب سے آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تحریر ملاحظہ ہو جن کا انقلاب حال میرے نزدیک مسلمانوں کیلیے اس صدی کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ پچھلے سال جب کانگریس کے ایوان سے مسلم ماس کانٹیکٹ کا علم اٹھایا گیا تو اس کے ساتھ ہی مولانا کا ایک سپہ سالارانہ خطبہ بھی اخبارات میں شائع ہوا۔ اس میں یہ ارشاد فرمانے کے بعد کہ "مسلمانوں کو اگر کانگریس میں شریک ہونا چاہیے تو صرف اسلیے کہ ادائے فرض کا غیر مشروط تقاضا یہی ہے" مولانا اپنی تمام تقریر اس انداز میں فرماتے ہیں کہ یا تو مسلمان اُس تحریک میں آنکھیں بند کر کے شریک ہو جائیں جسکی اساس وطنی قومیت اور ڈیماکریسی کے انگریزی نمونہ پر رکھی گئی ہے، یا نہیں تو وہ بزدل ہیں، کم ہمت ہیں،

اور ذلت کی موت مرجانے والے ہیں - پوری تحریر نقل کرنے کی یہاں گنجائش نہیں، مگر چند فقرے نقل کیے بغیر چارہ بھی نہیں :

"ایک زمانہ تھا جب مسلمانوں نے کانگریس کی شرکت سے اسلیے انکار کر دیا تھا کہ وہ سرے سے سیاسی اصلاح و تغیر کے مخالف تھے - انہیں یہ بات سمجھائی گئی تھی کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اسلیے یہاں جو تبدیلی بھی جمہوری ونیابتی اداروں کے طریقہ پر کی جائیگی، ہندوؤں کیلیے مفید ہوگی، مسلمانوں کیلیے مضر ہوگی، چنانچہ ۱۸۸۸ء میں لارڈ ڈفرن اور سر آکلینڈ کالون نے سر سید احمد خاں مرحوم کو یہی راہ دکھائی تھی اور اسی بنا پر انہوں نے کانگریس کی مخالفت کا اعلان کیا تھا....

"اب ملک اصلاحات کیلیے بلکہ کامل تبدیلی کیلیے لڑ رہا ہے - ظاہر ہے کہ ان تغیرات کے بعد اب کانگریس کی عدم شرکت کیلیے ۱۸۸۸ء والی بات سود مند نہیں ہو سکتی - ناگزیر ہے کہ کوئی دوسری ہی بات اختیار کی جائے - چنانچہ اب بعض حضرات نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جب کبھی کانگریس کی تحریک میں شرکت کا سوال چھڑ جاتا ہے یا خود کانگریس کا کوئی رکن مسلمانوں کو توجہ دلاتا ہے تو فوراً یہ حضرات فرقہ وارانہ حقوق اور تحفظات کا سوال چھیڑ دیتے ہیں........

"انہیں خطرہ ہے کہ اگر برطانی اقتدار ملک میں باقی نہیں رہے گا یا بالکل کمزور پڑ جائیگا تو ہندو اکثریت ان کے حقوق پامال کر دیگی.......

"خطروں اور تباہ حالیوں کی اس اندیشہ ناکی کا کن لوگوں کو یقین دلایا جارہا ہے؟ ان لوگوں کو جو بلحاظ تعداد کے ہندوستان کی سب سے بڑی دوسری اکثریت اور بلحاظ معنوی قوتوں کے سب سے پہلی طاقتور جماعت ہیں! اور پھر ان تمام خطروں کا

انسداد کیونکر ہو سکتا ہے؟ صرف اس طرح کہ انڈین نیشنل کانگریس ایک ریزولیوشن پاس کردے۔ جونہی اس نے ریزولیوشن پاس کردیا، خطروں اور تباہ حالیوں کا تمام بادل جو آٹھ کروڑ انسانوں کے سروں پر چھایا ہوا ہے معاً چھٹ جائیگا۔۔۔۔۔۔

"انہیں اگر کانگریس میں شریک ہونا چاہیے تو صرف اس لیے کہ انہیں اپنے اوپر بھروسہ ہے۔ اس لیے نہیں کہ دوسروں نے انہیں بھروسہ دلایا ہے، یا دوسرے انہیں بھروسہ دلا سکتے ہیں۔ اگر فی الحقیقت انکی بے بسی اور بے چارگی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں خطروں اور تباہ حالیوں میں گھر گئے اور تحفظ کی راہ اسکے سوا کچھ نہ رہی کہ یا تو انگریزی اقتدار کے سہارے جئیں یا کانگریس کے اطمینان دلا دینے پر، اور خود ان کے اندر خود اعتمادی وہمت کی ایک چنگاری بھی نہیں رہی جو انکی ٹھنڈی رگوں کو گرم کر سکے، تو میں کہونگا ایسی زندہ نعشوں کیلیے یہی بہتر ہے کہ جہاں پڑی ہیں پڑی رہیں۔۔۔۔۔۔"

مسلمانوں کی یہ تصویر وہ شخص کھینچ رہا ہے جو ایک زمانہ میں اسلامی ہند کی نشأۃ ثانیہ کا سب سے بڑا لیڈر تھا۔ اس قوم کی مظلومی کا اس سے زیادہ دردناک منظر اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو کبھی "الہلال" و "البلاغ" کا ایڈیٹر تھا وہ آج ان کی اس قدر غلط ترجمانی کرے ــــ مولانا کے مفروضات جن پر اس پورے خطبہ کی بنا رکھی گئی ہے، مختصر الفاظ میں حسب ذیل ہیں:

(۱) "سیاسی اصلاح وتغیر کے معنی محض اُس تبدیلی کے ہیں جو انگریزوں کے رائج کیے ہوئے جمہوری ونیابتی اداروں کے طریقہ پر کی جائے۔ ایسی تبدیلی کی مخالفت جس مسلمان نے کی اس نے گویا نفس سیاسی اصلاح وتغیر کی مخالفت کی" ــــ یہ بات اُس ہندو کے کہنے کی تھی جو انگریزی اصول جمہوریت ونیابت کو اپنے لیے مفید پاکر قوم پرستانہ جوش کیساتھ قبول کرتا ہے۔ مگر وقت

کی جادوگری کا تماشہ دیکھیے کہ اس نظریہ کو مولانا ابوالکلام بیان فرمارہے ہیں اور محسوس تک نہیں کرتے کہ فی نفسہٖ یہ نظریہ کس قدر پوچ اور بے اصل ہے۔

(۲) "مسلمانوں کا یہ خیال غلط تھا کہ ہندوستان میں جو تبدیلی انگلستان کے جمہوری نیابتی ادارات کے نمونہ پر کی جائیگی وہ بربنائے اکثریت ہندوؤں کیلیے مفید اور بربنائے اقلیت مسلمانوں کیلیے مضر ہوگی" ــــــ سیاسیات کا ایک طفل مکتب بھی بتا سکتا ہے کہ مولانا کا یہ مفروضہ محض بے اصل ہے اور بلا کسی غور و فکر کے انہوں نے اُس بات کو قبول کرلیا ہے جو ہندوؤں کے سیاسی لیڈر رجان بوجھ کر ہمیں بے وقوف بنانے کیلیے کہا کرتے ہیں۔ انگریزوں نے اپنے ملک کے جن جمہوری و نیابتی اداروں کو یہاں ہمارے سر منڈھا ہے انکی بنا ہی اکثریت کی حکومت (Majority Rule) پر ہے، اور ان کو جوں کا توں ایک ایسے ملک میں جہاں دو مختلف قومیں رہتی ہوں، رائج کرنے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اکثریت حکمراں اور اقلیت محکوم ہو کر رہے۔ لہٰذا سید احمد خاں مرحوم کے دور میں جو رائے قائم کی گئی تھی وہ ہرگز غلط نہ تھی۔ البتہ اگر کسی چیز کو غلط کہا جاسکتا ہے تو وہ انکی وہ پالیسی ہے جو اس مصیبت سے بچنے کیلیے انہوں نے اختیار کی، اور اس کو بھی اُس زمانے کے حالات سامنے رکھ کر غلط قرار دیتے ہوئے ایک صاحب فکر آدمی کو تامل کرنا چاہیے۔

(۳) "مسلمانوں نے کانگریس سے علحدگی کا فیصلہ اس بنا پر کیا تھا کہ لارڈ ڈفرن اور سر آکلینڈ کالون نے سر سید احمد خاں مرحوم کو یہ راہ دکھائی تھی" ــــــ مولانا کو شائد خبر نہیں کہ کانگریس کا قیام اور وہ اصول و مقاصد جن پر آج تک کانگریس چل رہی ہے، سب کچھ اسی لارڈ ڈفرن کی رہنمائی کا نتیجہ ہے، اور اس میں لارڈ رپن اور لارڈ ڈلہوزی اور اس عہد کے متعدد دوسرے انگریزی مدبرین کے دماغوں نے بھی کام کیا ہے۔ کم از کم اپنے ورکنگ کمیٹی کے رفیق ڈاکٹر پٹا بھی

سیتا رامیاہی کی "تاریخ کانگریس" مولانا نے پڑھ لی ہوتی تو شائد اپنی قوم کے دامن پر دھبا لگانے کیلیے ہندوؤں کے کارخانۂ روشنائی سے یہ سیاہی مستعار لیتے ہوئے ان کو کچھ نہ کچھ تامل ضرور ہوتا۔

(۴) "اب ملک اصلاحات کیلیے نہیں بلکہ کامل تبدیلی کیلیے لڑ رہا ہے" ــــ یہ تحریر اس وقت لکھی گئی ہے جب اصلاحات جدیدہ کو قبول کرکے الکشن لڑائے جاچکے تھے، امپریلیسٹ گورنمنٹ کے تحت صوبوں کی حکومت کا انتظام کرنے کیلیے کانگریس اپنی خدمات پیش کرچکی تھی، اور اس اقدام میں خود جناب مولانا بھی شریک تھے۔ پھر جب اپنے عمل سے آپ نے ثابت کردیا کہ آپ کامل تبدیلی کے لیے نہیں بلکہ اصلاحات اور ان اصلاحات کیلیے لڑ رہے ہیں جو انگریز اپنے مفاد کیلیے دے رہا ہے اور ہندو اپنے مفاد کیلیے لے رہا ہے، تو "کامل تبدیلی" کے لفظ بے معنی کو محض اسلیے دُہرانا کہ اس کے بغیر مسلمانوں کا منہ کالا نہیں کیا جاسکتا، مہاسبھائی ہندو کو تو ضرور زیب دیتا ہے" مگر مولانا کو زیب نہیں دیتا۔

(۵) "مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن یہ ہے کہ وہ یا تو انگریزی اقتدار کے سہارے جینا چاہتے ہیں اور اس فکر میں ہیں کہ انگریزی سنگینیں انکی حفاظت کیلیے ہندوستان میں موجود رہیں۔ یا پھر یہ چاہتے ہیں کہ کانگریس انکو تحفظ کا زبانی اطمینان دلادے" ــــ یہ بات بھی ایک ہندو امپریلسٹ کے کہنے کی تھی اور کہہ رہے ہیں اسے مولانا ابوالکلام۔ حقیقت میں تو پوزیشن اس وقت یہ ہے کہ دس سال کے بعد کانگریس اور ہندو مہاسبھا پھر اُسی نقطہ پر جمع ہوگئی ہیں جس پر یہ نہرو رپورٹ میں جمع ہوئی تھیں، "انقلاب" کا ڈراما ختم ہوچکا ہے، اور اسکی جگہ وہی دستوری ارتقا کا نصب العین برسرکار آگیا ہے جو ابتدا سے انکے پیش نظر تھا۔ "دستوری ارتقا" کے معنی اسکے سوا کچھ نہیں ہیں کہ انگریز اپنی سنگین سے مسلمان کو اس وقت تک دبائے رکھے جب تک ہندو اسکی جگہ لینے کے لیے کافی طاقتور اور کافی قابو یافتہ نہ ہوجائے۔ اب مسلمان جس فکر میں ہے وہ یہ نہیں ہے کہ

انگریز کی طرف جائے یا ہندو کی طرف - بلکہ وہ پریشان ہوکر یہ دیکھ رہا ہے کہ گھر کا ساتھی باہر کے غاصب کا اسسٹنٹ بن گیا ہے، باہر کا غاصب اس کو سنگین سے دبائے ہوئے ہے، اور گھر کا ساتھی اپنی رسیاں کھول کھول کر اُسکے ہاتھ پاؤں باندھتا جاتا ہے - یہ وقت ایسا تھا کہ مولانا ابوالکلام جیسے لوگ اٹھ کر مسلمانوں کو ان دونوں بلاؤں کے مشترک عمل سے بچانے کی تدبیر کرتے، مگر مولانا ان کو الٹا اس بات پر مطعون فرما رہے ہیں کہ تم اس دامِ فریب میں پھنسنے سے دور کیوں بھاگے جا رہے ہو! ہمت کر کے اپنی گردن اور اپنے ہاتھ پاؤں اسکے پھندوں میں کیوں نہیں دے دیتے!

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پروپیگنڈا کی طاقت کیسی زبردست طاقت ہے، اور جب کوئی قوم نامساعد حالات میں گھر جاتی ہے تو اس پر باہر ہی سے نہیں، اندر سے بھی کیسے مصائب نازل ہوتے ہیں - جو تصویر اپنی اغراض کیلئے غیروں نے کھینچی تھی، وہ اب خود ہماری اپنی قوم کے دماغوں میں بیٹھتی چلی جا رہی ہے اور اسکو وہ لوگ ہماری اصلی تصویر کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں جن سے ہم توقع رکھتے تھے کہ وہ ہمارے سب سے بہتر نمائندے ہوں گے - کون کہہ سکتا ہے کہ مولٰنا ابوالکلام یا مولانا حسین احمد صاحب یا مولانا سید سلیمان نے یہ باتیں جان بوجھ کر فرمائی ہیں؟ ہرگز نہیں - فضا جن خیالات سے بھر دی گئی ہے، وہ غیر محسوس طور سے دماغوں میں نفوذ کر رہے ہیں اور غیر ارادی طور سے زبانوں پر آ رہے ہیں - یہ ایک جادو ہے جو سروں پر چڑھ کے بول رہا ہے، اور کیا بتائیے کہ کیسے کیسے عالی مقام سروں پر چڑھ کر کیا کچھ بول رہا ہے - فرقہ پرستی کا لفظ جو مغربی تصورِ قومیت کو پیش نظر رکھکر وضع کیا گیا تھا، آج مسلمانوں کے علماء اور بڑے بڑے لیڈر اس لفظ کو خود مسلمانوں پر استعمال کر رہے ہیں " نیشنلزم" یا "قوم پرستی" کا لفظ آج بے تکلف افتخار کے انداز میں بولا جا رہا ہے گویا یہ تسلیم کر لیا گیا کہ ہندوستان ایک "قوم" ہے، اور مسلمان، ہندو، عیسائی وغیرہ اس قوم کے

فرقے ہیں :- "رجعت پسندی" اور "ٹوڈیت" کے الزامات اب خود مسلمانوں کی طرف سے مسلمانوں پر عائد کیے جانے لگے ہیں، اور یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ آزادی کے اس جہاد مقدس میں کود پڑنے سے احتراز، بلکہ اس میں ادنیٰ تامل بھی اگر کسی چیز کا نتیجہ ہو سکتا ہے تو وہ بس رجعت پسندی و ٹوڈیت ہے، یا پھر بزدلی۔

اس طوفان کے شور و ہنگامہ سے دماغ اس درجہ متاثر ہو چکے ہیں کہ اب ان کو صبر و سکون کیساتھ یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملتی کہ آخر وہ کیا چیز ہے جو مسلمان جیسی بہادر، عالی حوصلہ، حریت پسند اور جنگ آزما قوم کو برابر دس سال سے اس جنگ میں اپنے شایان شان حصہ لینے سے روک رہی ہے؟ اور وہ کیا چیز ہے جسکی وجہ سے اپنوں اور غیروں کے اتنے طعنے اور ایسے سخت الزامات آئے دن سنتے رہنے کے باوجود اس قوم کے خون میں جوش نہیں آتا؟ اگر اسکی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شائد یہ مسلمانوں کا قصور ہو، تو اسکی ایک دوسری ممکن وجہ یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ شائد اس "جنگ آزادی" میں کوئی کھوٹ ہو، شائد یہ "شیرانِ بیشۂ حریت" اُس جنس کے شیر نہ ہوں جن سے "اسد اللہ" میل کر سکتا ہے اور کرتا رہا ہے۔ شائد اس "آزادی کی فوج" میں وہ خصوصیات ہوں جنہیں دیکھ کر مسلمان کا ضمیر یہ فیصلہ کر رہا ہو کہ انکے ساتھ چلکر میں اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکونگا۔ کم از کم امکان تو دونوں پہلوؤں کا ہے۔ پھر آخر یہ پروپیگنڈا کی طاقت اور نامساعد حالات کی قہرمانی نہیں تو اور کیا ہے جسکی بدولت رفتہ رفتہ دماغوں پر پہلی شق کا امکان جزم و یقین بن کر مسلط ہوتا جا رہا ہے اور دوسری شق کے متعلق اب طوفان میں بہنے والی کشتی کے مسافروں اور کھویوں میں سے کسی کو بھی یاد نہیں آتا کہ اسکا بھی کوئی امکان ہے۔

میں آئندہ صفحات میں ناقابل تردید واقعات و شواہد سے ثابت کرونگا کہ فی الواقع صورت حال یہی دوسری ہے، اور مسلمانوں کو اسی صورت حال نے اپنے اہلِ وطن کیساتھ سیاسی جدوجہد

میں حصہ لینے سے روک رکھا ہے۔ اس بحث سے میرا مقصد ایک طرف تو عام مسلمانوں کے تصورات کو واضح کرنا ہے کیونکہ وہ حالات کو دیکھ دیکھ کر پریشان تو ہو رہے ہیں مگر ابھی تک ان خطرات اور مشکلات کو پوری طرح سمجھے نہیں ہیں جن میں وہ اس وقت گھر گئے ہیں، اور اسی وجہ سے انہیں اپنی نجات کا صحیح راستہ پانے میں مشکل پیش آرہی ہے۔ دوسری طرف میں انصاف پسند غیر مسلموں کو بھی یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے اصلی احساسات کیا ہیں، ان کا ذہن کس طرح کام رہا ہے، اور ہندوستان کی موجودہ سیاسی تحریکات کس طرح مسلمان کے مزاج، اسکے مفاد اور اُن اصولوں کے خلاف چل رہی ہیں جن پر وہ ایمان رکھتا ہے۔ ان باتوں کو اگر وہ سمجھ لیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ مسلمان کا مقدمہ ایسا مہمل نہیں ہے جیسا اسکے غلط نمائندے پیش کر رہے ہیں، بلکہ درحقیقت وہ بالکل صحیح بنیاد پر لڑ رہا ہے اور لڑنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ تیسری طرف .... اس بحث میں میرے پیشِ نظر یہ مقصد ہے کہ اُن حضرات علماء کو انکی غلطی پر متنبہ کروں جو مذہب کے نام سے مسلمانوں کو پشت بمنزل چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں انکو اصل حقائق سے روشناس کرانا چاہتا ہوں۔ جس جنگ آزادی کو وہ اتنا مقدس سمجھ رہے ہیں، میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ درحقیقت کس نوعیت کی جنگ ہے۔ جس آزادی کی فوج کو وہ سمجھ رہے ہیں کہ راہ حق پر گامزن ہے، میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ دراصل کس راہ پر جا رہی ہے اور مسلمان قوم بحیثیت مسلمان ہونیکے چند قدم سے زیادہ اس راہ پر اسکے ساتھ نہیں چل سکتی۔ جس طریق کار کو وہ بالکل صحیح طریق سمجھ کر اختیار کر رہے ہیں میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ خدا اور رسول کے بتائے ہوئے طریق کار کے بالکل خلاف ہے۔ یہ سب کچھ عرض کرنیکے بعد میں ان سے درخواست کرونگا کہ اسکو ٹھنڈے دل سے پڑھیں انصاف کی نظر سے دیکھیں اور اس نور علم و بصیرت سے جو خدا نے ان کو دیا ہے کام لے کر اپنے حال پر غور کریں کہ کیا وہ مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کر رہے ہیں؟ اگر ان کا ضمیر گواہی دے کہ یہ رہنمائی غلط ہے تو نہیں بلحاظ اس کے کہ

غلط راستہ پر کتنی دور جا چکے ہیں، الٹے قدم واپس ہونا چاہیے اور راہ راست معلوم کرنیکے لیے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور عقل سلیم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اور اگر انہیں اس پر اصرار ہو کہ وہی راستہ صحیح ہے جس پر وہ چل رہے ہیں اور مسلمانوں کو چلانا چاہتے ہیں، تو میں ان سے مطالبہ کرونگا کہ پہلے وہ دلائل سے اپنا حق بجانب ہونا ثابت کریں۔ محض شخصیتوں کے درمیان تقابل کرنا، یا سیاسی پارٹیوں کی گذشتہ و موجودہ روش کے درمیان موازنہ کرنا، یا نرے جذبات سے سپہ سالارانہ انداز میں اپیل کرنا کوئی استدلال نہیں ہے اور نہ اس سے احقاق حق یا ابطال باطل ہوا کرتا ہے۔ براہ کرم حقائق اور واقعات کی دنیا میں آئیے۔ جو حقائق میں پیش کر رہا ہوں، یا تو یہ ثابت کر دیجیے کہ وہ حقائق نہیں ہیں، یا پھر ان حقائق کو تسلیم کر کے دلیل و حجت سے ــــ حجت خواہ عقلی ہو یا نقلی، مگر بہر حال ہو حجت ــــ ثابت کیجیے کہ ان کے باوجود وہی راہ صحیح ہے جو آپ نے اختیار کی ہے۔

یہ کوئی چیلنج نہیں ہے، بلکہ دراصل اُس احساس ذمہ داری سے ایک اپیل ہے جو ہر مسلمان کے دل میں ہوتا ہے، جسکی بنا پر وہ اپنے آپکو اپنے ہر عمل کیلیے خدا کے سامنے جوابدہ سمجھتا ہے۔ پھر اسکا مقصد کسی گروہ کو ملزم بنانا اور قابل ملامت ٹھیرانے کی کوشش کرنا بھی نہیں ہے، جیسا کہ ایک پارٹی کے لوگ دوسری پارٹی والوں کے مقابلے میں کیا کرتے ہیں۔ جو شخص یہ الفاظ لکھ رہا ہے وہ کسی پارٹی میں بھی شامل نہیں اور اس نے آج تک خدا کی پارٹی کے سوا کسی پارٹی کیطرف بھی مسلمانوں کو دعوت نہیں دی ہے۔ لہذا اس اپیل میں خواہ مخواہ پارٹی فیلنگ کی بو سونگھنے کی بھی کوشش نہ کی جائے۔ اسکے ساتھ ایک اور بات بھی صاف کہدینا چاہتا ہوں۔ میرا یہ خطاب ائمہ سیاست کے مقتدیوں سے نہیں بلکہ خود اماموں سے ہے۔ اُن جاہل مقتدیوں سے میں کسی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا جو محض جواب دینے کی خاطر جواب دیا کرتے ہیں۔ بات کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور بس اول نظر میں یہ دیکھ کر کہ کہنے والا کچھ انکی خواہشات کے خلاف

کہہ رہا ہے جوابی بحث، اور بحث بھی نہیں بلکہ (۳۱) بازاریوں کی طرح حملے شروع کر دیتے ہیں۔

غلط فہمیاں اور خام خیالیاں

مسلمانوں کے سامنے "آزادی" کا نام لے کر توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس دلفریب نام کو سُن کر بے خود ہو جائینگے اور حقائق سے آنکھیں بند کر کے ہر اُس راستے پر چل کھڑے ہونگے جسے "آزادی کا راستہ" کہہ دیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمان بھی آزادی کے اتنے ہی خواہشمند ہیں جتنے ہندوستان کے دوسرے لوگ، بلکہ مسلمانوں میں اس چیز کی تڑپ دوسروں سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ ان میں ایک قلیل جماعت ایسی ضرور ہو سکتی ہے جو اپنی اغراض کیلیے ہندوستان میں غیر ملکی اقتدار چاہتی ہو۔ ہندوؤں، سکھوں، پارسیوں اور ہندوستان کی دوسری قوموں میں بھی ایسی قلیل التعداد جماعتیں موجود ہیں۔ لیکن جمہور مسلمین میں شائد کوئی ایک شخص بھی آپ کو ایسا نہ ملیگا جو ہندوستان کو انگریزوں کا غلام دیکھنا چاہتا ہو۔ بلکہ اوسطاً ایک مسلمان دوسری تمام قوموں کی بہ نسبت انگریزیت اور اس کے اقتدار کو زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا مذہب ہی اسے یہ سکھاتا ہے کہ مادہ پرستی، شہوات کی بندگی اور ظلم و جور پر جس تہذیب اور جس سیاست کی بنا قائم ہو اس سے نفرت کرے۔ پھر اس کے دل میں آج تک یہ زخم تازہ ہے کہ اس ملک کی حکومت اُسی سے چھینی گئی ہے اور اسی کو سب سے زیادہ پامال کیا گیا ہے، اسلیے نہ صرف فطرۃً، بلکہ تاریخی لحاظ سے بھی مسلمان سب سے بڑھ کر آزادیٔ وطن کا خواہشمند ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آزادیٔ وطن سے مراد کیا ہے؟ کوئی قوم آزادی کیوں چاہتی

ہے؟ یہ چیز فی نفسہٖ مطلوب ہے یا کسی غرض کیلیے ناگزیر وسیلہ ہونے کی حیثیت سے مطلوب ہے؟ اگر وہ غرض حاصل ہونے کے بجائے الٹی فوت ہوئی جاتی ہو تو کیا پھر بھی کسی قوم سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ "آزادی" کے نام پر دیوانہ وار دوڑی چلی آئیگی؟ کیا ایسی "آزادی" کو وہ قوم بھی اپنے لیے آزادی سمجھ سکتی ہے جس کو حقیقت میں آزادی نہ مل رہی ہو؟ اور کیا اس قسم کی آزادی کیلیے جنگ اور قربانی کرنا عقل، فطرت، دین کسی چیز کی رو سے بھی کسی قوم کا فرض ہوسکتا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن پر میدان جنگ میں قدم رکھنے سے پہلے ہر ذی عقل انسان غور کرنے پر مجبور ہے۔ اور مسلمان آخر ذوی العقول سے خارج تو نہیں ہے کہ ان بنیادی سوالات کو نظر انداز کرکے خواہ مخواہ اُس بگل کی آواز پر لفٹ رائٹ شروع کردے جو شبوگاؤں یا سوراج بھون سے پھونکا جائے۔

یہ ظاہر ہے کہ "آزادی وطن" سے مراد ہمالہ اور گنگا وجمنا اور مشرقی و مغربی گھاٹوں کی آزادی نہیں ہے۔ یہ پہاڑ اور یہ دریا دس ہزار برس پہلے جیسے آزاد تھے ویسے ہی آج بھی ہیں اور قیامت تک رہینگے۔ دراصل غلام یہ پہاڑ اور یہ دریا نہیں ہیں، بلکہ ہندوستان کے باشندے ہیں، اور آزادی وطن سے مراد حقیقت میں وطن کے باشندوں ہی کی آزادی ہوسکتی ہے۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ وطن جب ۳۵ کروڑ باشندوں سے آباد ہے تو صحیح معنوں میں "آزادی وطن" صرف اُسی آزادی کو کہا جاسکتا ہے جو ان پورے ۳۵ کروڑ باشندوں کے لیے آزادی ہو۔ اہل وطن میں سے بعض کی آزادی اور بعض کی غلامی کو پورے وطن کی آزادی سے ہرگز تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ عموماً لوگ محض سہولت پسندی کی بنا پر بہت سے ایسے ملکوں کو "آزاد" کہہ دیا کرتے ہیں جنکے باشندوں کا ایک حصہ آزاد اور دوسرا حصہ خود اپنے

اہلِ وطن کا غلام ہوتا ہے۔ مثلاً جس دور کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہندوستان آزاد تھا اس میں درحقیقت "ہندوستان" آزاد نہ تھا بلکہ صرف ہندوستان کا آریہ آزاد تھا۔ شودر کی غلامی اُس ملک کے باشندوں کی غلامی سے ہزار درجہ زیادہ بدتر تھی جسے اصطلاحاً ہم غلام کہتے ہیں۔ آج امریکہ کو آزاد ملک کہا جاتا ہے، حالانکہ امریکہ کی آزادی محض اسکے سفید فام باشندوں کی آزادی ہے، سیاہ فام باشندے کسی آزادی سے متمتع نہیں۔ اسی طرح روس کی آزادی صرف اس کے کمیونسٹ باشندوں تک محدود ہے۔ مسلمان، عیسائی اور تمام غیر اشتراکی بلکہ غیر اسٹالینی باشندوں کے لیے قطعاً کوئی آزادی نہیں، بلکہ ہماری غلامی سے بھی بدتر غلامی ہے۔ جنوبی افریقہ کی آزادی محض اسکے فرنگی باشندوں کے حصہ میں آئی ہے۔ وہاں کی دیسی آبادی اور ہندوستانی آبادی اس درجہ غلام ہے کہ ہم اپنے آپ کو نسبتہً ان کے مقابلہ میں آزاد کہہ سکتے ہیں۔ جرمنی کی آزادی صرف آرین نسل کیلیے ہے، سامیوں کیلیے نہیں۔ چیکوسلوواکیا کی آزادی چند روز پہلے تک صرف چیک اور سلاوک باشندوں کیلیے مخصوص تھی، دوسروں کے لیے نہیں۔ ایسے ممالک کو اگر عرف عام میں آزاد کہا جاتا ہے تو اس سے وہ تلخ حقیقت شیرینی نہیں بن جاتی جو اُن کے غلام باشندوں کو رات دن زہر کے گھونٹوں کی طرح حلق کے نیچے اتارنی پڑتی ہے۔

یہ ایک عام غلط فہمی ہے کہ محض غیر ملکی اقتدار سے آزاد ہو جانے کا نام "آزادی" رکھ دیا گیا ہے، حالانکہ یہ آزادی کی تمام حقیقت نہیں ہے، بلکہ صرف اس کا مقدمہ ہے۔ آزادی کا اصلی جوہر تو حکومت خود اختیاری سے متمتع ہونا اور اپنی اجتماعی خواہشات و ضروریات کو پورا کرنے پر آپ قادر ہونا ہے۔ یہ چیز اگر ملک کے کسی گروہ کو حاصل نہ ہو، اگر اسکی نکیل اپنے ہی وطن کے کسی دوسرے گروہ کے ہاتھ میں رہے کہ جس طرح وہ چاہے اسے اٹھائے اور بٹھائے

اور جس طرف چاہے اسے چلائے جائے اور جو کچھ چاہے اس پر لاد دے، تو وہ حقیقت میں غلام ہی ہوگا۔ اسکے لیے ملک کی آزادی محض بے معنی ہوگی۔ غلامی اپنی حقیقت اور فطرت کے لحاظ سے بہر حال ایک ہی چیز ہے۔ اس میں اس لحاظ سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ وہ غیر ملک والوں کی غلامی ہے یا اہلِ وطن کی۔ اگرچہ تجربہ سے یہی ثابت ہوا ہے کہ کمیت و کیفیت کے اعتبار سے اہلِ وطن کی غلامی بہ نسبت غیر ملکیوں کی غلامی کے زیادہ شدید ہوتی ہے، مثلاً جو سلوک امریکہ کا سفید فام اپنے حبشی اہلِ وطن کے ساتھ کرتا ہے، یا جو برتاؤ روس کا اسٹالینی اپنے غیر اسٹالینی یا غیر اشتراکی اہلِ وطن سے کر رہا ہے، اسکو کوئی نسبت اُس طرزِ عمل سے نہیں جو ہندوستان میں انگریزوں نے ہمارے ساتھ اختیار کیا ہے، تاہم دونوں قسم کی غلامیوں میں سے ایک کو دوسری پر ترجیح دینے کا سوال ہرگز پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ غلامی بہرحال ایسی چیز ہے کہ اسے دفع کرنے کی کوشش ہی کرنی چاہیے۔ پس جو شخص اہلِ وطن کی غلامی کو غیر ملکیوں کی غلامی پر ترجیح دیتا ہو، اور دوسری قسم کی غلامی کو محض پہلی قسم کی غلامی میں بدل لینے کا نام "جنگِ آزادی" رکھے، اور ایسی جنگ آزادی میں شریک ہونے کو فرض قرار دے وہ دراصل جنت الحمقار کا باشندہ ہے۔ کوئی صاحب عقل انسان اسکی پیروی نہیں کرسکتا۔ نہ ایک پوری کی پوری قوم اتنی بے وقوف ہوسکتی ہے کہ وہ صرف غیر ملکی اقتدار سے آزاد ہونے کیلیے میدانِ جنگ میں کود پڑے، اور یہ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھے کہ آزادی کے اصلی جوہر میں بھی اس کا کوئی حصہ ہے یا نہیں۔

ایک وطن کے باشندوں کو مجرد اس واقعہ کی بنا پر کہ وہ ایک وطن کے باشندے ہیں، تمام حیثیات سے ایک سمجھ لینا، اور اس مفروضہ پر ملک کی آزادی کو ان سب کیلیے یکساں آزادی قرار دینا، یا تو جہالت ہے یا پھر خطرناک قسم کی چالاکی۔ بہت سے لوگ اسی

مفروضہ کو سامنے رکھ کر بے تکلف کہہ جاتے ہیں کہ "بھائی! جب ملک آزاد ہوگا تو سب آزاد ہو جائینگے"۔ لیکن یہ مفروضہ ہر حال میں ہر جگہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ جہاں صرف ایک قوم رہتی ہو، مختلف گروہ اور اُن گروہوں کے درمیان گروہی امتیازات نہ ہوں، اور سب باشندے اپنے عقائد، جذبات و احساسات (Sentiments)، رسوم و رواج، قوانینِ معاشرت اور طرزِ زندگی کے اعتبار سے ایک ہوں، یا کم از کم باہم متقارب ہوں، وہاں تو بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ محض ملک کا آزاد ہو جانا ہی تمام باشندگانِ ملک کا آزاد ہو جانا ہے، کیونکہ وہاں اہلِ ملک میں الگ الگ گروہوں کا وجود ہی نہیں ہے جس کی بنا پر اس امر کا امکان پیدا ہوتا ہے کہ آزادی ایک گروہ کے پاس اٹک کر رہ جائے اور دوسرے گروہ تک نہ پہنچ سکے۔ لیکن جس ملک کے باشندوں میں ایک سے زیادہ گروہ موجود ہوں اور ان کے درمیان نسل یا رنگ یا زبان یا عقائد، جذبات اور طرزِ زندگی کے بیّن اختلافات موجود ہوں، وہاں اس امر کا امکان ہے کہ آزادی کی دولت کو ایک گروہ اُچک لے اور دوسرے گروہ یا گروہوں کو اس سے محروم کردے۔ ایسی جگہ وہ مفروضہ نہیں چل سکتا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں ہر گروہ کو یہ پوچھنے کا حق ہے، اور اگر وہ اپنے وجود کو عزیز رکھتا ہے تو اسے پوچھنا چاہئے کہ آزادی حاصل کرنیکا کونسا طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے، اور جس آزادی کیلئے جدوجہد کی جا رہی ہے وہ کس نوع کی آزادی ہے۔ پھر اگر واقعات سے کسی گروہ پر یہ ثابت ہو جائے کہ حصولِ آزادی کا وہ طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے جو اس کے اجتماعی وجود کو نقصان پہنچانے والا ہے، اور ملک کی آئندہ حکومت ایسے اصولوں پر تعمیر ہو رہی ہے جنکی بدولت حکمرانی کے اختیارات سے وہ لازمی طور پر محروم ہو جاتا ہے تو اس سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایسی جنگِ آزادی میں حصہ لیگا۔ ایسی آزادی کو ملک کی آزادی کہنا ہی حقیقت کے خلاف ہے۔ جس گروہ کیلئے یہ آزادی نہیں بلکہ غلامی

ہے، اور جس گروہ کیلئے یہ زندگی نہیں بلکہ موت ہے وہ آخر کیوں اسکے حاصل کرنے میں حصہ لے؟

اس مرحلے پر پہنچ کر ہم سے مختلف باتیں کہی جاتی ہیں، اور ضرورت ہے کہ ہم ان پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔

کہا جاتا ہے کہ ملک کی آزادی کا لازمی نتیجہ ملک کی خوشحالی ہے، اور یہ خوشحالی جب آئیگی تو تمام باشندے اس سے متمتع ہونگے۔ تعلیم عام ہوگی، تمدن ترقی کریگا، صنعت وحرفت اور تجارت کو فروغ ہوگا، معیار زندگی بلند ہوگا، اور اقوام عالم کے درمیان اہل ملک کی عزت بڑھیگی۔ یہ فوائد ظاہر ہے کہ ملک کے تمام باشندوں کو حاصل ہونگے۔ پھر کیوں نہ ملک کے ہر گروہ کو ان فوائد سے یکساں دلچسپی ہو، اور کیوں نہ وہ انکے حصول کیلئے مل کر جدوجہد کریں؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ملک کی خوشحالی اور ترقی کیلئے آزادی ناگزیر ہے، اور آزادی کے حصول میں مختلف گروہوں کا وجود اور انکے امتیازات مانع ہیں، لہذا کوشش کرنی چاہیے کہ ان گروہوں کو اور ان کے امتیازات کو مٹا کر تمام اہل ملک کو ایک کر دیا جائے۔ کیونکہ جب تک یہ باقی رہینگے ملک آزاد نہ ہو سکے گا۔ اور جب تک ملک آزاد نہ ہوگا، تمام اہل ملک، خواہ وہ کسی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں، یکساں بدحالی، افلاس، جہالت، اخلاقی اور ذہنی پستی میں مبتلا رہینگے۔ کیا تم ان حالات کو دائماً برقرار رکھنا چاہتے ہو؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک ملک کے باشندوں میں عقائد، جذبات، طرز زندگی، زبان، ادب اور تہذیب و تمدن کے اختلافات غیر حقیقی اور مصنوعی ہیں۔ ان کو زندگی کے اہم تر مسائل سے کوئی علاقہ نہیں۔ زندگی کے اہم تر مسائل یہ ہیں کہ لوگوں کو کھانے کیلئے مل رہا ہے یا نہیں؟ اُن کیلئے زندگی کی ضروریات پوری کرنے، اور مزید برآں زندگی کی آسائشوں سے متمتع ہونے

کے مواقع موجود ہیں یا نہیں؟ ان کے ملک میں دولت آفرینی کے جو وسائل موجود ہیں ان سے کس قدر فائدہ اٹھایا جا رہا ہے؟ اور جو دولت وہ پیدا کر رہے ہیں وہ کس طرح تقسیم ہو رہی ہے؟ ان اہم تر مسائل کا تعلق تمام باشندگان ملک سے یکساں ہے اور ان میں اُن سطحی اختلافات کا کچھ دخل نہیں جن کا تم ذکر کرتے ہو۔ لہٰذا یہ اختلافات اگر موجود بھی ہیں تو انہیں نظر انداز کر دینا چاہیے اور تمام باشندگان ملک کو ایک قوم فرض کر کے زندگی کے ان مسائل کو حل کرنا چاہیے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تہذیب و تمدن کے بقا و قیام اور عروج و ارتقا کا انحصار بھی معاشی فلاح اور سیاسی آزادی پر ہے۔ یہ چیز اگر حاصل نہ ہو تو کوئی تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی، کجا کہ ترقی کر سکے۔ لہٰذا تہذیب و تمدن کا مفاد بھی اس امر کا مقتضی ہے کہ ملک کے تمام گروہ مل کر پہلے سیاسی آزادی اور معاشی فلاح کے لیے جدوجہد کریں۔

یہ مختلف باتیں کبھی مختلف زبانوں سے اور کبھی ایک ہی زبان سے سُننے میں آتی ہیں۔ لیکن جب ہم ان پر غور کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ ہم کو دھوکا دینے کے لیے نہیں کہی جا رہی ہیں تو ان کے کہنے والے خود دھوکے میں ہیں۔ وہ حقیقت کو طالب علم کی نظر سے نہیں دیکھتے، بلکہ مُنشری کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو اپنی خواہش نفس کے اتباع میں گم ہو جاتا ہے۔

آج انسان اُس دور سے ہزاروں برس آگے نکل چکا ہے جس دور میں وہ محض ایک جانور ہونے کی حیثیت سے بس اپنی جسمانی ضروریات کی تکمیل کا خواہشمند ہوتا تھا، اور یہ امر اس کی نگاہ میں کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا کہ یہ ضروریات کس ڈھنگ پر کس صورت میں پوری ہوتی ہیں۔ اب اسکے لیے اپنی ہزار ہا برس کی طے کی ہوئی مسافت کو الٹے پاؤں دوبارہ طے کرنا اور یکایک اُسی دور وحشت و حیوانیت کی طرف پس پا ہو جانا محال ہے۔ اس طویل مدت

ہیں اس کی عقل، اسکے مذاق، اسکے علم اور اسکی قوتِ اجتہاد و اکتساب کے ارتقار سے انسانیت کے مختلف نمونے (Models) پیدا ہو چکے ہیں۔ ایک ایک قوم ایک ایک نمونے کو پسند کر کے اُس پر اپنی اجتماعی شخصیت تعمیر کر چکی ہے اور اُس خاص نمونۂ انسانیت کو اپنی قومی ہیئت (National type) بنا چکی ہے جو صدیوں کے نشو و نما سے اس کے اندر پختہ ہوا ہے۔ اب ایک قوم کی زندگی دراصل اسکے نیشنل ٹائپ کی زندگی ہے اور اسکے نیشنل ٹائپ کا مرجانا خود اس قوم کا مرجانا ہے۔ اگرچہ ضروریاتِ زندگی کا پورا ہونا، دولت حاصل کرنا اور اسے خرچ کرنا آج بھی ہر قوم کیلیے اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنی اہمیت آج سے دس ہزار برس پہلے رکھتا تھا۔ لیکن ان تمام معاملات کا دامن ہر قوم کے مخصوص نظریۂ زندگی، اسکے ضابطۂ اخلاق، اسکے اصولِ معاشرت و تمدن، اور اس کے معیارِ قدر و قیمت کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ ہر قوم اپنی ضروریات کو اپنے ہی نیشنل ٹائپ کے مطابق پورا کرنا چاہتی ہے۔ آپ محض "ضروریاتِ زندگی" کا نام لے کر کسی قوم سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ انکے حصول کے لالچ میں وہ اپنے نیشنل ٹائپ کو تبدیل کر دے، کیونکہ اسکی تبدیلی دراصل قوم کی موت ہے۔ کوئی قوم جسکی قومی سیرت مستحکم ہو چکی ہو وہ محض آسائشوں کے لالچ سے اپنے نیشنل ٹائپ کو بدلنے پر آمادہ نہیں ہو سکتی۔ اور جو قوم اس پر آمادہ ہو جائے اسکے متعلق بہ یقین کے ساتھ جان لینا چاہیے کہ یا تو اس کا کیرکٹر ابھی بنا نہیں ہے، یا پھر وہ ایک ذلیل اور موقع طلب (Opportunist) قوم ہے جس کی سیرت پر کوئی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

اس بنیادی حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے بعد غور کیجیے کہ کوئی قوم آزادی کیوں چاہتی ہے؟ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ممکن ہے، اور وہ یہ ہے کہ اپنے نیشنل

ٹائپ کی حفاظت اور اسکے نشو و ارتقاء کی خواہش ہی دراصل آزادی کی طلب کا مبدا ہے۔ جو قوم غلام ہوتی ہے تو وہ اپنے نیشنل ٹائپ کو صرف یہی نہیں کہ ترقی نہیں دے سکتی، بلکہ اسکے برعکس اس کا نیشنل ٹائپ مضمحل ہوتا جاتا ہے۔ اگر کسی قوم کو اپنا نیشنل ٹائپ عزیز نہ ہو تو اس میں سرے سے آزادی کی خواہش پیدا ہی نہ ہوگی۔ اور جس قوم میں آزادی کیلیے تڑپ پائی جاتی ہے، اسکی اس تڑپ کا کوئی سبب اسکے سوا نہیں کہ وہ اپنے نیشنل ٹائپ کو عزیز رکھتی ہے، اسے فنا نہیں ہونے دینا چاہتی، اور اس کو ترقی دینے کی خواہشمند ہے۔

جب حقیقت یہ ہے تو وہ صرف ایک جاہل اور بے وقوف آدمی ہوگا جو آزادی حاصل کرنے کی خاطر کسی قوم کو اپنا نیشنل ٹائپ بدل دینے کے لیے کہیگا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا حماقت ہوسکتی ہے کہ جس چیز کی خاطر آزادی کی خواہش ایک قوم میں پیدا ہوا کرتی ہے، اسی چیز کو مٹانے کا خیال ظاہر کیا جائے اور پھر یہ توقع رکھی جائے کہ آزادی کی پکار اس قوم کے دل و دماغ کو اپیل کریگی۔ کیا کوئی شخص مرنے کے لیے غذا کھا سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص نقصان اٹھانے کی نیت سے تجارت کر سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص اس غرض کے لیے پانی کی طرف دوڑ سکتا ہے کہ اسکی پیاس بجھنے کے بجائے اس کا سینہ جل جائے؟ اگر یہ ممکن نہیں تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک قوم اپنے قومی وجود کو ختم کرنے کیلیے آزادی کی خواہش کرے حالانکہ آزادی اسکی مطلوب ہی صرف اسلیے ہوسکتی ہے کہ اپنے قومی وجود کو زندہ رکھے اور ترقی دے۔

بلاشبہ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ کوئی قوم اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت اور ترقی کے لیے کچھ نہیں کرسکتی جب تک کہ وہ آزاد نہ ہو جائے۔ لیکن اسکے ساتھ یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ جس ملک میں متعدد قومیں مختلف قومی ہیئتوں کے ساتھ رہتی ہوں، وہاں مجرد ملک کی آزادی کو ہر ہر قوم کی آزادی نہیں کہا جا سکتا۔ وہاں آپ کو صراحت کے ساتھ یہ بتانا پڑیگا

کہ آزاد حکومت کی نوعیت کیا ہوگی۔ اگر آزاد حکومت کیلیے آپ کے پاس خالص جمہوریت کے اصول ہوں جنکے معنی اکثریت کی حکومت کے ہیں، تولا محالہ یہ آنے والی آزادی صرف اس قوم کیلیے آزادی ہوگی جو کثیر التعداد واقع ہوئی ہو۔ قلیل التعداد قوموں کیلیے اس کے معنی بجز اسکے کچھ نہ ہونگے کہ وہ غیر ملکی اقتدار سے نکل کر خود اپنی ایک ہم وطن قوم کی تابع ہوجائے۔ ایسی آزادی کو نہ تو قلیل التعداد قومیں اپنے لیے آزادی سمجھ سکتی ہیں اور نہ یہ توقع کرسکتی ہیں کہ اکثریت کی حکومت کے تحت رہ کر انہیں اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت اور ترقی کا کوئی موقع مل سکیگا۔ آزادی کی جنگ میں ان کے لیے صرف اسی وقت کشش پیدا ہوسکتی ہے جب کہ آزاد حکومت کا ایسا نقشہ انکے سامنے پیش کیا جائے جس میں انکے لیے بھی حکومت خود اختیاری رکھی گئی ہو، اسلیے کہ صرف حکومت خود اختیاری ہی وہ چیز ہے جس سے کوئی قوم اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت و ترقی کیلیے کچھ کرسکتی ہے، اور نیشنل ٹائپ کی حفاظت و ترقی ہی وہ واحد غرض ہے جسکے لیے کوئی قوم آزادی چاہتی اور آزادی کی خاطر لڑ سکتی ہے۔

رہا یہ قول کہ ملک کی خوشحالی میں تمام باشندگان ملک کا یکساں حصہ ہوگا خواہ ملک کا نظام حکومت اکثریت کے ہاتھ میں ہی کیوں نہ ہو، تو یہ قطعاً غلط ہے۔ جہاں قومی امتیاز موجود ہو وہاں ترجیح ہم جنس لازماً موجود ہوتی ہے، اور جہاں ترجیح ہم جنس پائی جاتی ہو وہاں صرف عقائد، جذبات، طرزِ زندگی، زبان و ادب اور تہذیب و تمدن ہی کے معاملہ میں ایک قوم کا مفاد دوسری قوم سے مختلف نہیں ہوتا، بلکہ معاشی، سیاسی اور انتظامی معاملات میں بھی لازماً مختلف ہوجاتا ہے۔ وہاں جس طرح ایک قوم اپنی تعلیم، اپنی معاشرت اور اپنی تہذیب کے سوال کو بے خوف و خطر دوسری قوم کے ہاتھ میں نہیں دے سکتی، اسی طرح وہ اپنی روٹی کے سوال کو بھی اسکے ہاتھ میں دے کر مطمئن نہیں ہوسکتی، اور نہ انتظامی

وتشریعی ادارات میں اپنی نمائندگی کے سوال کو اس پر چھوڑ سکتی ہے۔ جس جگہ ایک شخص پانی پینے اور کھانا کھانے کیلیے بھی یہ دیکھتا ہو کہ پانی لانے والا اور کھانا بیچنے والا اسکا ہم قوم ہے یا نہیں، جہاں ایک شخص بازار میں خرید و فروخت کرتے وقت بھی دوکاندار کی قومیت پر نظر رکھتا ہو، جہاں ایک مزدور سے خدمت لیتے ہوئے، یا کسی آدمی کو ملازم رکھتے ہوئے بھی یہ دیکھا جاتا ہو کہ اس مزدور یا اس امیدوار کا تعلق کس قوم سے ہے، وہاں یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا جاسکتا کہ ملک کے سارے باشندوں کا معاشی یا سیاسی مفاد یکساں ہے، اور کسی ایک قوم کے ہاتھ میں حکومت کے اختیارات سمٹ جانے سے دوسری قوم کے پیٹ کو کوئی خطرہ نہیں۔

پھر جیسا کہ میں پہلے اشارہ کرچکا ہوں، یہ خیال کرنا بھی بالکل غلط ہے کہ دولت آفرینی اور تقسیم دولت اور معیار زندگی کی ترقی اور ضروریات زندگی کی فراہمی کے مسائل کا کوئی تعلق تہذیب و تمدن سے نہیں ہے۔ اس باب میں ہر جماعت اپنا ایک الگ مسلک اور الگ نقطۂ نظر رکھتی ہے، اور محض آسائش جسمانی کے لالچ سے اس بات پر آمادہ نہیں ہوسکتی کہ اپنے نقطۂ نظر کو دوسرے نقطۂ نظر سے بدل لے۔ آپ اشتراکی جماعت سے یہ توقع نہیں کرسکتے کہ وہ اپنے نظریات معیشت و اجتماع کو کسی لالچ کی بنا پر سرمایہ دارانہ نظریات سے بدل لیگی۔ اسی طرح آپ کو ایک مسلمان سے بھی یہ توقع نہ کرنی چاہیے کہ وہ ان مسائل کو حل کرنے میں اپنے مخصوص نقطۂ نظر کو بدل دیگا، اور اپنے آپ کو دوسروں کے حوالہ کر دیگا کہ جس طرح چاہیں اسکے لیے دولت کی پیدائش اور اس کی تقسیم کے سوال کو حل کردیں، درانحالیکہ یہ سوال اسکی تہذیب و تمدن کے نقشے کو بنانے اور بگاڑنے میں فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔

اس بحث سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو لوگ "آزادی" کا لفظ زبان

سے نکال کر یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان اس نام کو سنتے ہی ان کی طرف دوڑے چلے آئینگے، اور جب انکی یہ توقع پوری نہیں ہوتی تو مسلمانوں کو بزدلی اور رجعت پسندی اور سامراج پرستی کے طعنے دیتے ہیں، وہ کس قدر خام خیالی میں مبتلا ہیں۔ ہر قوم میں تھوڑے یا بہت افراد ایسے ضرور نکل آتے ہیں جو اپنے تخیلات دل و ہام میں گم ہو کر اپنے قومی مفاد کو بھول جاتے ہوں۔ اور ایسے افراد بھی ضرور پائے جاسکتے ہیں جو دن کی روشنی میں بھی نمایاں حقائق کو نہ دیکھ سکتے ہوں۔ مگر ایک پوری کی پوری قوم نہ اندھی ہوسکتی ہے اور نہ بے وقوف۔ وہ کسی آواز پر دوڑنے سے پہلے یہ ضرور دیکھے گی کہ اس کو کس طرف بلایا جا رہا ہے۔ وہ محض آزادی کی پکار پر فریفتہ نہیں ہوسکتی بلکہ عین اسکی عقل اور فطرت کا اقتضا ہے کہ اس پکار کی حقیقت پر غور کرے، اور یہ تحقیق کرے کہ آزادی حاصل کرنے کیلیے کونسا طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے، اور یہ پکارنے والے جس آزادی کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے۔

آئندہ صفحات میں انہی دو سوالات کی تحقیق کی جائے گی۔

قوم پرستوں کے نظریات

خوش قسمتی سے ہمارے پاس ایک کتاب ایسی موجود ہے جس میں ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلے اور اسکے حل، اور ہندوستان کی آزاد حکومت کے نقشے اور اس کے طریق حصول کے متعلق "قوم پرست" جماعت کے نظریہ کی پوری تشریح مل جاتی ہے۔ یہ کتاب پنڈت جواہرلال نہرو کی تصنیف ہے، جو نہ صرف کانگریس کے صدر رہ چکے ہیں بلکہ گاندھی جی کے متوقع جانشین سمجھے جاتے ہیں۔ اگرچہ آگے چل کر ہم اس قوم پرستی کے تمام اساطین سے استفادہ کرنے والے ہیں، مگر بحث کی ابتدا بھارت بھوشن پنڈت جواہرلال کے افادات سے کرنا ہر آئینہ مناسب ہے۔

پنڈت جی کو یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلہ کا ایک نیا حل دریافت کیا ہے جسکی گہرائیوں تک یا تو ان سے پہلے کے ہندوستانی سیاست والوں کی نظر نہ پہنچی تھی یا ان میں ایسا انقلابی حل پیش کرنے کی جرأت نہ تھی۔ اس حل کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے اُن نظریات کا تجزیہ کرنا ضروری ہے جن کو پنڈت جی نے بطور اصول موضوعہ کے تسلیم کرلیا ہے اور پھر انہی پر اُس پالیسی کی بنیاد رکھی ہے جسے وہ اس مسئلہ کا صحیح حل سمجھتے ہیں۔ میں ان نظریات کو ترتیب وار بیان کرونگا، تاکہ اس پالیسی کی پیدائش اور اس کے ارتقاء کا پورا نقشہ آپ کے سامنے آجائے۔

پنڈت جی کے تصور کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے کہ وہ ہندوستان کی آبادی کو ایک قوم فرض

کرتے ہیں۔ تاریخ یورپ اور سیاسیات یورپ کے مطالعہ سے انکے ذہن میں قومیت کا صرف ایک ہی تصور پیدا ہوا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایک جغرافی رقبہ کی تمام آبادی ایک قوم ہے اور اسکو ایک ہی قوم ہونا چاہیے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ فرانس ایک ملک اور ایک قوم ہے۔ جرمنی ایک ملک اور ایک قوم ہے۔ اٹلی، انگلستان، ہسپانیہ وغیرہ ایک ایک ملک اور ایک ایک قوم ہیں۔ اس مشاہدہ کے دوران میں ان کی نظر اس حقیقت کی طرف نہیں جاتی کہ ان میں سے ہر ملک کے باشندے ایک اسپرٹ، ایک قسم کے تمدن اور کم از کم قریبی دور کی حد تک ایک قسم کی تاریخی روایات کے حامل ہیں، اور وہ تمام عناصر ترکیبی جن سے ایک قومیت وجود میں آتی ہے، ان کے درمیان مشترک ہیں یا واقعات کی رفتار نے ان کو مشترک بنا دیا ہے، اور اس اشتراک ہی نے انکے اندر یہ ہم آہنگی اور یگانگت پیدا کی ہے۔ ان سب حقیقتوں کو نظر انداز کر کے وہ ایک نہایت سطح بین آدمی کی طرح یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان سب ممالک میں قومیت کی اساس، رشتۂ وطنیت کا اشتراک ہے، اور اسی طرح سے ہر خاک وطن کی پیداوار کو ایک ہی قوم ہونا چاہیے۔ یہی تصور ہے جس کے تحت ان کے قلم سے یہ الفاظ نکلے ہیں:-

"ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے جو یکجا نہیں ہے، منتشر ہے، مبہم ہے اور غیر متعین ہے۔ اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دور از کار ہے اور بدقت قابلِ توجہ کہا جا سکتا ہے۔ ...... مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں، بس مذہبی اخوت کا رشتہ ہی ایک چیز ہے، اس لیے جدید مفہوم میں کوئی قومیت نشو و نما نہ پا سکے۔" (میری کہانی - جلد دوم - صفحہ ۲۳۱۔ مکتبۂ جامعہ دہلی)

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی کے ذہن میں ہندوستانی قومیت کا تصور کیا ہے

ممکن ہے کہ یہ مطالعہ اور فہم کا قصور ہو، یا ہندوستان کو ایک قوم دیکھنے کی آرزو نے ان کے ذہن کو روشن ترین حقائق کے ادراک سے عاجز کر دیا ہو۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ وہ قوم پرستی اور فرقہ پرستی کے الفاظ کو بالکل حقیقی معنوں میں لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں ایک ہی قوم رہتی ہے، اور یہ مسلمان، ہندو، عیسائی وغیرہ محض اس قوم کے فرقے ہیں۔ اسی بناء پر وہ ہندوستان کی ان جماعتوں کے اختلافات کو "فرقہ وارانہ" مسئلے سے تعبیر کرتے ہیں، اور یہ بنیادی حقیقت ان کے ذہن کی گرفت میں آتی ہی نہیں کہ یہ مسئلہ دراصل فرقہ وارانہ نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے ——— آپ چاہیں تو اسے بدقسمتی کہیے اور بہت ہی ناگوار چیز سمجھیے مگر ہے یہ حقیقت، اور اس حقیقت کو نظر انداز کرنے میں پنڈت جی تنہا نہیں ہیں بلکہ تمام "قوم پرست" ان کے شریک حال ہیں۔

تصور قومیت کے بعد دوسرا تصور جو صاحب موصوف کے دماغ پر حاوی ہے، وہ کارل مارکس کا فلسفۂ تاریخ ہے۔ یہاں اس فلسفہ کی تشریح کا موقع نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ جس طرح کسی بھوکے سے پوچھا گیا تھا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں تو اس نے کہا تھا کہ چار روٹیاں، اسی طرح معاشی مصائب کے مارے ہوئے اس فلسفہ نے بھی دنیا کے تمام مسائل کا مرکز و محور صرف روٹی کے مسئلہ کو قرار دیا ہے۔ تاریخ کے تمام انقلابات میں اس کو معاشی طلب یا بھوک کے سوا کوئی قابل توجہ عامل (Factor) نظر نہیں آتا۔ اُس کے نزدیک، جواہر لال نہرو کے الفاظ میں:

"دنیا کی ساری تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشی مفاد ہی وہ قوت ہے جو جماعتوں اور طبقوں کے سیاسی خیالات کی تشکیل کرتی ہے۔" (ص ۵۴)

اگرچہ پنڈت جی بقول خود کسی اذعانی عقیدے (Dogma) کے قائل نہیں

ہیں، مگر مارکس کی اس تعبیر تاریخ کو انہوں نے وحی آسمانی کی طرح قبول کیا ہے، اور اس کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ "اب میرے نزدیک تاریخ کے معنی ہی بدل گئے۔ مارکس کی تعبیر نے اسے کہیں زیادہ روشن اور واضح کر دیا" (ص ۱۴۱)

اپنے تصور قومیت کے ساتھ اس مارکسی فلسفہ کو ملا کر پنڈت جی یہ نظریہ قائم کرتے ہیں کہ اول تو ہندوستان کی تمام آبادی ایک قوم ہے۔ پھر اس قوم میں اگر کوئی حقیقی امتیاز و اختلاف ہو سکتا ہے تو وہ صرف معاشی بنیاد ہی پر ہو سکتا ہے۔ یہ ہندو اور مسلم اور عیسائی، یعنی مذہب کی بنیاد پر جو اختلافات ہیں، یہ کسی طرح معقول نہیں ہیں۔ اختلاف کی فطری اور معقول بنیاد یہ ہے کہ قوم کے اندر جنکے پاس ایک روٹی ہو وہ سب ایک گروہ ہوں، اور جنکے پاس دو روٹیاں ہوں وہ دوسرا گروہ ہوں، وھلم جراً۔ پھر اگر ان کو لڑنا ہو تو روٹیوں پر لڑیں۔ بلکہ "اگر" کیا معنی، ان کو اسی چیز پر لڑنا چاہیے۔

اسی نظریہ کی بنیاد پر ہندوستان جدید کا یہ لیڈر کہتا ہے:-

"معاشی نقطۂ نظر سے یہ (یعنی مسلم قومیت کا تخیل) بہت دور از کار ہے اور بدقت قابل توجہ کہا جا سکتا ہے" (ص ۳۳۱)

" ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں ہے۔ آج جماعتوں اور ملتوں کی بنیاد اقتصادی فوائد پر رکھی جاتی ہے" (جواہر لال کا خطبۂ صدارت آل انڈیا نیشنل کنونشن منعقدہ مارچ ۱۹۳۷ء)

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب سارے ہندوستان کی آبادی ایک قوم ہے، اور اس قوم کے درمیان فرقے اور گروہ بننے کی وجہ محض معاشی اغراض ہی ہو سکتی ہیں، تو پھر یہ ہندو

مسلم اور دوسرے "فرقے" پیدا کیسے ہو گئے؟ یہ معاملہ کیا ہے کہ غیر معاشی چیزوں نے ہندوؤں کو ایک "فرقہ" اور مسلمانوں کو دوسرا "فرقہ" بنا دیا اور ان کے درمیان غیر معاشی وجوہ سے اختلافات پیدا کر دیے؟ یہاں موقع تھا کہ پنڈت جی خود اس نظریہ ہی پر نظر ثانی کرتے جسے انہوں نے مارکس کی "وحی" سے بے سوچے سمجھے اخذ کیا اور اذعانی عقیدے کے طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ انکے سامنے واقعات کی دنیا میں ایک کھلی ہوئی حقیقت موجود تھی جو شہادت دے رہی تھی کہ انسان کے جسم میں صرف معدہ ہی ایک عضو رئیس نہیں ہے، صرف بھوک ہی وہ چیز نہیں ہے جو اسکی ذہنیت اور اسکے خیالات کی تشکیل کرتی ہو، صرف معاشی عامل (Factor) ہی ایک عامل نہیں ہے جو انسانوں کو قوموں اور گروہوں کی شکل میں مجتمع کرتا اور ان کے درمیان اختلافات پیدا کرتا ہو۔ مگر انہوں نے تمام حقائق سے آنکھیں بند کر کے یہ رائے —— عقلی و استدلالی نہیں بلکہ رجحانی و وجدانی رائے —— قائم کر لی کہ یہ مذہبی تفریق ایک غیر فطری چیز ہے، اور اس مادۂ فاسد یعنی مذہب نے دخل انداز ہو کر "ہندوستانی قوم" کو ایک صحیح بنیاد (یعنی روٹی کی بنیاد) کے بجائے، ایک غلط بنیاد (یعنی طرز خیال اور طریق زندگی کی بنیاد) پر متفرق کر دیا ہے۔

اس تصور کے زیر اثر وہ جگہ جگہ مذہب پر یوں غصہ اتارتے ہیں:۔

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو تک ظاہر کی ہے۔ قریب قریب ہمیشہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانے کا، قائم شدہ حقوق اور مستقل اغراض رکھنے والوں کے بقا کا حامی ہے" (صفحہ ۱۶۱)

مذہب کے خلاف نفرت و غضب کا اظہار "ہندوستانی قوم" کے اس لیڈر نے اتنی کثرت کیساتھ

کیا ہے کہ تمام تحریروں کو نقل کرنا ایک طول عمل ہے۔ وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں ہر اس موقع پر جہاں ہندو مسلم کا نام آتا ہے، چیں بجبیں ہو کر کہتے ہیں کہ "مذہب کو بیچ میں کیوں لاتے ہو"؟ اس ارشاد سے ان کی مراد یہی ہوتی ہے کہ سیاسی، اجتماعی اور معاشی گروہوں میں مذہب کی بنیاد پر تفریق کرنا سرے سے غلط ہے۔ اس غلط بنیاد کو ڈھانا چاہیے، نہ کہ اس کو سامنے لاکر ایک قابل لحاظ چیز قرار دینا۔

ہندوستانی "قوم" میں فرقوں کے وجود اور انکے باہمی اختلاف کی یہی ایک توجیہ ہمارے وطنی لیڈر کے پاس نہیں ہے۔ دوسری توجیہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ وہ اس کو برطانوی امپیریلزم کی پیدا کردہ چیز سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ انگریزوں کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کیلیے ہندوستانی قوم میں اختلاف پیدا کرنے کی ضرورت تھی، اسی لیے اور صرف اسی لیے یہ اختلافات موجود ہیں۔

دیکھیے! یہاں نظر کا کتنا بڑا ہیر پھیر ہو گیا ہے۔ اگر پنڈت جی ذرا سمجھ سے کام لیتے تو یہ بات بآسانی ان پر واضح ہو سکتی تھی کہ ہندوستان میں حقیقی اختلافات موجود تھے، انگریزوں نے ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، اور اس کوشش میں دو قسم کے لوگوں سے ان کو مدد ملی۔ ایک وہ خود غرض لوگ جو اپنے ذاتی فائدے کیلیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نزاعات کو بھڑکاتے اور پیچیدہ تر بناتے ہیں۔ جنہوں نے نہایت چالاکی سے اپنے آپ کو ان دونوں کا سرپرست اور نمائندہ بنا لیا ہے، نہ اس لیے کہ ان کے اختلافی مسائل کو اطمینان بخش طریقہ پر حل کریں، بلکہ محض اس لیے کہ ان اختلافات کو دائماً برقرار رکھکر اپنے ذاتی مفاد اور برطانی سلطنت کے مفاد کی خدمت کرتے رہیں۔ دوسرے وہ بیوقوف لوگ جو ان اختلافات کی حقیقت کو سمجھنے اور انہیں دانشمندی کیساتھ حل کرنے سے انکار کرتے

ہیں، اور اس طرح ان کے برقرار رکھنے میں مددگار بنتے ہیں۔ اگر پنڈت جی اس نظر سے اس مسئلہ کو دیکھتے تو انہیں صحیح راستہ صاف نظر آجاتا۔ لیکن وہ اپنے تخیل کی آنکھ سے اس کو دیکھتے ہیں، اور محض یہ دیکھ کر کہ ملک کے چند خود غرض اور ترقی دشمن لوگ انگریزی حکومت کیساتھ مل کر ہندو مسلمانوں کے اختلافی مسائل سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں، یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ در حقیقت ان اختلافی مسائل کی کوئی اصلیت نہیں ہے، بلکہ یہ صرف برطانوی امپیریلزم اور اس کے ہندوستانی ایجنٹوں کی پیدا کردہ چیز ہے۔ اس بنا پر وہ جگہ جگہ "فرقہ وارانہ" مسئلے کے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار فرماتے ہیں:-

"ان کا (انگریزوں کا) ترپ کا پتہ فرقہ وارانہ مسئلہ تھا اور اُسے انہوں نے خوب کھیلا" (صد ۲)

"فرقہ پروری کے پردہ میں دراصل ترقی دشمنی نہاں ہے" (صد ۲۳)

"اغراض کے اس ہجوم میں .... برطانوی ہند کے نمایندوں کی سرداری عموماً آغا خاں کے حصہ میں آئی تھی" (صد ۲۱)

"اصل وقت فرقہ پروری نہیں ہے۔ اصل میں سیاسی ترقی دشمنی راہ میں حائل تھی اور فرقہ وارانہ مسائل کی آڑ میں کام کر رہی تھی" (صد ۲۴)

"حکومت روز بروز معاشرتی خرابیوں کی پشت پناہ بنتی جاتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اس کا میل جول ہندوستان کی سب سے زیادہ رجعت پسند جماعتوں سے رہتا ہے۔ جوں جوں اسکی سیاسی مخالفت بڑھتی جاتی ہے اسے عجیب عجیب حمایتی ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ آجکل برطانوی حکومت کے سب سے بڑے حامی انتہائی فرقہ پرست، مذہبی رجعت پسند اور اصلاح و ترقی کے دشمن لوگ ہیں۔ مسلمانوں کی فرقہ پرست جماعتیں سیاسی، معاشی اور سماجی اعتبار سے انتہائی رجعت پسند ہیں۔ ہندو مہاسبھا بھی ان سے کچھ کم نہیں" (صد ۱۷۵)

"فرقہ پرست رہنماؤں کا اتحاد ان لوگوں کے ساتھ ہو گیا ہے جو ہندوستان اور انگلستان میں سب سے زیادہ رجعت پسند لوگ کہے جا سکتے ہیں اور یہ لوگ فی الحقیقت سیاسی، اور سیاسی سے بھی زیادہ تمدنی اصلاح و ترقی کے دشمن ہیں۔ ان کے جملہ مطالبات میں سے ایک بھی عوام الناس کے فائدے کے لیے نہیں ہے۔" (ص ۳۱۱)

یہ اور ایسی ہی بہت سی تحریریں پنڈت جی کے انداز فکر پر صاف روشنی ڈالتی ہیں۔ انکا انداز فکر یہ ہے کہ بیمار کا خود غرض طبیبوں اور عطاروں کے پھندے میں پھنس جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دراصل بیمار ہی نہیں۔ ان کی رائے میں یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ آخر کیا چیز ہے جس کی وجہ سے ان مکار طبیبوں اور عطاروں کو اس بیمار پر ہاتھ صاف کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ سبب پر غور کرنے، اور غلط معالجوں کے پھندے سے نکال کر خود صحیح علاج کرنیکی زحمت کون اٹھائے؟ اسکا علاج بس یہی ہے کہ مرض کے وجود سے انکار کر دیا جائے۔

ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلہ کی یہ دو توجیہیں کرنے کے بعد پنڈت جی ان دونوں کے درمیان رشتہ جوڑتے ہیں۔ ان کا نظریہ اب ترقی کر کے یہ صورت اختیار کرتا ہے کہ مذہب نے "ہندوستانی قوم" کو "فرقوں" میں تقسیم کیا ہے، انگریزی امپیریلزم (سامراج) کیلیے یہ تقسیم مفید ہے، اور سرمایہ دار، زمیندار، اور تمام مستقل اغراض (Vested Interests) رکھنے والے طبقے سامراج کیساتھ سازش کر کے اس تقسیم کو اپنی اور سامراج کی مشترک اغراض کیلیے استعمال کر رہے ہیں، لہٰذا مذہب اور سامراج، اور یہ خود غرض طبقے، تینوں باہم قریبی رشتہ دار ہیں، تینوں قابلِ نفرت ہیں، اور تینوں کو مٹا دینا چاہیے۔ اسی نظریہ کے تحت یہ ارشادات جگہ جگہ پنڈت جی کے قلم سے نکلے ہیں:-

"منظم مذہب" (Organised Religion) بلا استثنا مستقل اغراض سے وابستہ ہو جاتا ہے اور یوں لازمی طور پر ایک ترقی دشمن قوت بن کر تغیر اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حق ملکیت اور موجودہ نظام معاشرت کے متعلق اس کا رویہ یہی ہے" (ص ۷۶۵-۷۶۷)

"جیل میں برطانوی افسر صرف دو قسم کی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ مذہبی کتابیں اور ناول۔ یہ عجیب بات ہے کہ حکومت برطانیہ مذہب کی بڑی قدردان ہے اور بڑی بے تعصبی کیساتھ ہر قسم کے مذہب کی ہمت افزائی کرتی ہے" (ص ۱۱)

"مذہب امن کا وعظ کہتا ہے لیکن اسکے باوجود ایسے نظام کی تائید کرتا ہے جس کا دارومدار ظلم پر ہے" (ص ۳۹۴)

ان تینوں دشمنوں کی سازش سے ہندوستان کو نجات دلانے اور اس ملک کو پھر جنت نشان بنا دینے کی جو صورت پنڈت جی کے پیش نظر ہے وہ حسب ذیل ہے:-

"ہر پھر کر ہم اسی چیز پر پہنچ جاتے ہیں جسکے سوا اس مسئلہ کا اور کوئی حل نہیں۔ یعنی ایک اشتراکی نظام کا قیام، پہلے قومی دائرے میں اور پھر ساری دنیا میں۔ ایسا نظام جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم ریاست کی نگرانی میں مفاد عامہ کے لحاظ سے کی جائے۔ یہ انقلاب کس طریقہ سے ہونا چاہیے؟ یہ ایک جداگانہ سوال ہے۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس چیز میں پوری قوم بلکہ کل نوع انسانی کی بھلائی ہو وہ محض اس وجہ سے نہیں روکی جا سکتی کہ کچھ لوگ جو موجودہ نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس تغیر کے مخالف ہیں۔ اگر سیاسی یا تمدنی ادارے[1] اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو ان کو مٹا دینا چاہیے" (ص ۴۱۹-۲)

"جب تک ہمیں تھوڑی بہت سیاسی آزادی حاصل نہ ہوگی، ہمارے لیے قوم پرستی کا

[1] مذہبی اداروں کا نام نہیں لیا گیا، مگر پچھلی تصریحات سے واضح ہے کہ فی الذہن وہ بھی مراد ہیں۔

تخیل ہی سب سے بڑا محرک عمل رہیگا ...... یہاں تک کہ لوگوں کے دل میں قوم پرستی کے جذبہ کی جگہ تمدنی و اجتماعی انقلاب (Social Revolution) کا جذبہ پیدا ہو جائے[۱]" (ص ۱۴۵)

"بعض لوگ جو عدم تشدد کا عقیدہ رکھنے کے مدعی ہیں، کہتے ہیں کہ شخصی ملکیت کو اس کے مالکوں کی مرضی کے خلاف قومی ملکیت بنانے کی کوشش کرنا جبر ہے؛ اس لیے یہ عدم تشدد کے خلاف ہے ...... یہ کافی نہیں سمجھا جاتا کہ اکثریت موجودہ نظام میں تبدیلی چاہتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ جن لوگوں کو اس تبدیلی سے نقصان پہنچنے والا ہے انھیں بھی راضی کر لینا چاہیے ..... یہ امید رکھنا کہ ایک پورے طبقے یا پوری قوم کے عقائد بدلے جا سکیں گے یا اپنے حریفوں کو عقلی دلائل سے قائل کرنے یا ان کے جذبۂ انصاف کو ابھارنے سے باہمی مخالفت دور ہو جائیگی اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔ یہ محض ایک فریب خیال ہے کہ موثر دباؤ ڈالے بغیر، یعنے جبر و تشدد سے کام لیے بغیر کوئی حاکم قوم محکوم ملک سے قبضہ اٹھالے گی، یا کوئی طبقہ اپنے اقتدار یا امتیازی حقوق سے دست بردار ہو جائیگا[۲]" (ص ۵۵-۴۵۶)

[۱] یہ مقام ذرا سی تشریح کا محتاج ہے۔ اشتراکی نقطۂ نظر سے قوم پرستی (نیشنلزم) ایک غلط چیز ہے۔ اشتراکیوں کا مقصد تمام دنیا میں اشتراکی انقلاب برپا کرنا ہے، جسکی تشریح بابو سوبھاش چندر بوس نے ہری پورہ کانگریس کے خطبۂ صدارت میں کی ہے۔ جب تک ساری دنیا کی قوموں میں اشتراکی نظام قائم نہ ہو جائے، کسی ایک ملک میں اسکا قائم رہنا مشکل ہے۔ مگر پنڈت جی اور انکے ہم خیال حضرات کی رائے یہ ہے کہ سر دست بین الاقوامی اشتراکیت کو رہنے دو۔ سب سے پہلے اپنے ملک میں ہم کو سیاسی آزادی حاصل کرنی چاہیے کیونکہ اس کے بغیر ہم بین الاقوامی اشتراکیت کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ اور اپنے ملک میں سیاسی آزادی حاصل کرنے کیلیے ناگزیر ہے کہ ہم "قوم پرستی" کا مسلک اختیار کریں۔

[۲] مطلب یہ ہے کہ پہلے ملک کی اکثریت کو اشتراکی خیال کا بنا لیا جائے۔ پھر جو لوگ اشتراکیت کے عقیدہ و مسلک کو قبول نہ کریں انکو زبردستی اشتراکی نظام کی اطاعت پر مجبور کیا جائے۔

"دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے[1]" (ص ۴۵۵)

"سوسائٹی کی موجودہ کشمکش یعنی قومی جنگ اور پھر طبقات کی جنگ کا تصفیہ جبر کے سوا کسی اور صورت سے ممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کام بہت بڑے پیمانہ پر کرنا پڑیگا۔ کیونکہ جب تک بہت بڑی جماعت ہم خیال نہ ہو جائے اس وقت تک نظام تمدن کو بدلنے کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہو سکے گی۔ لیکن اس کے بعد تھوڑے لوگوں پر جبر کرنے کی ضرورت ہوگی" (ص ۴۶۹)

یہ ہے وہ نقشہ جو ہندوستان کی نجات کیلیے اس کے سب سے بڑے لیڈر کے ذہن میں ہے۔ قومی حکومت (یعنی وہ حکومت جو مذہبی قومیتوں کو مٹا کر "قومی" بنائی جائے) آخری منزل مقصود نہیں ہے، بلکہ پہلا مرحلہ ہے۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ مذہبی عقائد کے بجائے معاشی عقائد کی تبلیغ کر کے ایک عظیم اکثریت کو ہم خیال بنایا جائے۔ اس کے بعد تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جو اقلیت اس معاشی مذہب کی پیروی قبول نہ کرے اس کو ڈرا کر، دھمکا کر، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کر کے، وسیع پیمانہ پر اجتماعی ڈاکہ زنی کر کے نظام تمدن میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ پھر آخری مرحلہ یہ ہے کہ تھرڈ انٹرنیشنل کے اصول پر تمام دنیا میں کمیونزم کی اشاعت اور اس کے قیام کا بیڑا اٹھایا جائے جس طرح تھوڑی مدت قبل روس نے اٹھا رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان سے جس بین الاقوامی اشتراکیت کا علم بلند کیا جائیگا اس کی ٹکر سب سے پہلے اس بین الاقوامی نظام اجتماعی سے ہوگی جو ہندوستان کے ہمسایہ ممالک میں پھیلا ہوا ہے، یعنی اسلام۔

پنڈت جواہر لال سمجھتے ہیں کہ مسلمان بہادر ہیں، بھوکے ہیں، اور اس کے ساتھ

[1] ڈیماکریسی (جمہوریت) کے اس تصور کو خوب (...)

ان کے اندر اشتراکیت کے عناصر پہلے سے موجود ہیں، لہذا ہندوؤں کی نسبت وہ اس اشتراکی انقلاب کیلیے زیادہ اچھے سپاہی بن سکتے ہیں۔ مزید برآں وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وہی لوگ زیادہ کامیابی کے ساتھ لڑ سکینگے جن کے نام اور لباس مسلمانوں کے سے ہوں۔ لہذا وہ اشتراکیت کی لاگ سے مسلمانوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ اسی بنا پر ارشاد ہوتا ہے :۔

"میرے خیال میں عام مسلمان، عام ہندوؤں سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسلیے کہ انکے نظام اجتماعی میں ایک حد تک آزادی پائی جاتی ہے اور اگر ان میں ایک مرتبہ بیداری پیدا ہو جائے تو غالباً وہ اشتراکیت کی راہ پر تیزی سے قدم بڑھائینگے۔ (صفحہ ۵۰۶)

ان الفاظ میں پنڈت جی نے اپنے اصل مقصد کو پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ لیکن انہیں خوب معلوم ہے کہ مسلمانوں کو قوم پرستی اور پھر بین الاقوامی اشتراکیت کے نظام میں جذب کرنا آسان کام نہیں ہے۔ سب سے پہلے تو اسلامی قومیت کا تخیل اس راہ میں حائل ہے جسکی وجہ سے مسلمان، غیر مسلموں کے ساتھ ایک قومیت بنانے اور اس میں جذب ہو جانے کیلیے تیار نہیں ہو سکتے۔ پھر اسلامی تہذیب کیساتھ مسلمانوں کی شیفتگی ایک دوسری رکاوٹ ہے، کیونکہ مسلمان اپنی تہذیب کو تمام تہذیبوں سے بہتر سمجھتے ہیں اور اسکو کسی دوسری تہذیب سے بدل لینے پر آسانی کے ساتھ راضی نہیں ہو سکتے۔ اسکے بعد آخری اور اہم ترین روک یہ ہے کہ اسلام کا اجتماعی نظام (سوشل سسٹم) زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہے جسکی وجہ سے مسلمان کسی دوسرے اجتماعی نظام کو اپنی زندگی کے کسی شعبے میں بھی اس وقت تک جگہ نہیں دے سکتے جب تک کہ وہ خود اسلام سے منحرف نہ ہو جائیں۔ ان مشکلات کو اچھی طرح سمجھ کر پنڈت جی نے اپنا نقشۂ جنگ بنایا ہے۔

اُن کا پہلا حملہ اسلامی قومیت پر ہے۔ وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم سرے سے کوئی قوم ہی نہیں ہو۔ یہ محض برطانوی سامراج کا ایک داؤں، اور چند سامراجی ایجنٹوں کا پروپیگنڈا ہے جس نے تمہارے دماغ میں یہ ہوا بھر دی ہے کہ تم ایک قوم ہو۔ حالانکہ سیاسی اور معاشی نقطۂ نظر سے ہندوستان میں صرف "ہندوستانی قوم" ہی پائی جاتی ہے، اور اس قوم کے اندر ایک دوسری قوم کا موجود ہونا سراسر ایک لغو تخیل ہے:۔

"ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے جو یکجا نہیں ہے، منتشر ہے، مبہم ہے اور غیر متعین ہے۔ اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے، اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دور از کار ہے اور بدقت قابلِ توجہ کہا جا سکتا ہے۔[1]" (ص ۳۳۱)

"مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پروازِ خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد ہوتا بھی تو حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا۔" (ص ۳۳۲)

---

[1] جب ہم دیکھتے ہیں کہ پنڈت جی اشتراکیت کے قائل ہیں اور مارکس کی تعلیم پر اعتقاد رکھتے ہیں، اور اس کے باوجود اسلامی قومیت کے خلاف یہ طرزِ استدلال اختیار کر رہے ہیں، تو ہمیں مجبوراً یہ رائے قائم کرنی پڑتی ہے کہ پنڈت جی نے خود اپنے شخصی اعتقاد کے خلاف محض سیاسی چال کے طور پر یہ طرزِ استدلال اختیار فرمایا ہے۔ مارکس کا نعرہ یہ تھا کہ "تمام دنیا کے مزدورو! ایک ہو جاؤ!" اس کی تعلیم یہ تھی کہ اشتراکی خیال کا آدمی جہاں بھی ہے ایک اشتراکی جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ جرمنی کا اشتراکی اٹلی کے اشتراکی کا کامریڈ (رفیق) ہے اور خود اپنے وطن بلکہ شہر، بلکہ محلہ میں رہنے والے بورژوا سے اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ اسی تخیل پر بین الاقوامی اشتراکیت کی بنا رکھی گئی ہے۔ اشتراکی ہونے کی حیثیت سے پنڈت جواہر لال بھی اس تخیل پر اعتقاد رکھتے ہیں، مگر اس کے باوجود وہ اسلامی قومیت پر اعتراض کر رہے ہیں، حالانکہ یہ قومیت بھی اسی اصول پر

اس کے بعد وہ اسلامی تہذیب کی طرف بڑھتے ہیں، اور مسلمانوں کو یہ سمجھاتے ہیں کہ حقیقت میں تمہاری کوئی خاص تہذیب ہی نہیں ہے:-

"لیکن یہ اسلامی تہذیب ہے کیا چیز؟ کیا یہ عربوں، ایرانیوں اور ترکوں وغیرہ کے بڑے بڑے کارناموں کی ایک یاد ہے جو نسلی تعلق کی وجہ سے اب تک باقی ہے؟ یا اس کا مطلب زبان، آرٹ، موسیقی اور رسم و روایات ہیں؟ مجھے تو یاد نہیں آتا کہ کوئی شخص آج کل اسلامی موسیقی یا اسلامی آرٹ کا کبھی ذکر کرتا ہو۔" (صفحہ ۳۳۳)

"میں نے یہ سمجھنے کی بہت کوشش کی کہ یہ اسلامی تہذیب ہے کیا چیز۔ مگر میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔ میں دیکھتا ہوں کہ شمالی ہند میں متوسط طبقہ کے مٹھی بھر مسلمان،

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۶۔ قائم ہوئی ہے کہ ایک عقیدے اور ایک مقصد زندگی اور ایک اصول اجتماعی کے قائل جہاں کہیں بھی ہوں، ایک جماعت ہیں چاہے ان میں بعد المشرقین ہی کیوں نہ ہو اور اسکے خلاف مسلک رکھنے والا اگر ہم محلہ کیا معنی، ایک دیوار بیچ بھی رہتا ہو تو وہ بہرحال دوسری ہی جماعت کا آدمی ہے۔ ہمارے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ جو شخص اشتراکی جمعیت کو سمجھ سکتا ہے وہ اسلامی جمعیت کو نہیں سمجھ سکتا۔ لامحالہ ہم یہی سمجھنے پر مجبور ہیں کہ اسلامی قومیت کا وجود چونکہ پنڈت جی کے مقاصد میں حارج ہے اسلیے وہ قصداً ٹھیک اُسی چیز پر اعتراض کر رہے ہیں جس کے اصول کی صداقت پر وہ اعتقاد رکھتے ہیں، اور اعتراض کیلیے ان دلائل سے کام لے رہے ہیں جنکی صداقت پر وہ دل سے اعتقاد نہیں رکھتے!

۱؎ تہذیب کے متعلق اسی قسم کے خیالات آنریبل مسٹر سمپورنانند وزیر تعلیمات صوبۂ متحدہ نے بھی اپنی حال کی ایک تقریر میں ظاہر فرمائے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے:

"مسلمانوں کی تہذیب کیا ہے؟ تہذیب مذہب میں شامل نہیں ہے۔ اسکا جلوہ شاعری، فن تعمیر، سنگتراشی، مصوری اور موسیقی میں نظر آتا ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جنکا مجسمہ تہذیب

اور انہی کی طرح ہندو بھی فارسی زبان اور روایات سے متاثر ہوئے ہیں۔ جب عوام الناس پر نظر ڈالتا ہوں تو اسلامی تہذیب کی نمایاں ترین علامتیں یہ نظر آتی ہیں: ایک خاص قسم کا پاجامہ نہ زیادہ لمبا نہ زیادہ چھوٹا۔ ایک خاص طریقہ سے مونچھوں کو مونڈنا یا ترشوانا مگر ڈاڑھی کو بڑھنے کیلیے چھوڑ دینا۔ اور ایک خاص قسم کا ٹونٹی دار لوٹا۔ بالکل اسی کے جواب میں ہندوؤں کے بھی چند رسمی طریقے ہیں، یعنی دھوتی باندھنا، سر پر چوٹی رکھنا اور تسلا نُما لوٹے سے مختلف طرز کی لٹیا رکھنا۔ یہ امتیازات بھی دراصل زیادہ تر شہروں میں پائے جاتے ہیں اور مفقود ہوتے جا رہے ہیں۔ ہندو اور مسلم کاشتکاروں اور مزدوروں میں مشکل ہی سے فرق کیا جاسکتا ہے تعلیم یافتہ مسلمان شاذ ہی ڈاڑھی رکھتے ہیں۔ علیگڈھ والے البتہ سرخ ترکی ٹوپی کے گرویدہ ہیں (اس کا نام ترکی ہے حالانکہ خود ترکی میں اب اسے کوئی نہیں پوچھتا)۔ مسلمان عورتیں ساڑی پہننے لگی ہیں اور آہستہ آہستہ پردہ سے باہر نکل رہی ہیں۔" (صفحہ ۳۳۵)

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۔ ہے۔ کیا ہندو اور مسلمانوں کی تہذیب کے درمیان ان چیزوں میں کوئی بیّن فرق ہے؟ زمانہ ماضی کے چند بہترین لوگوں کو لے لیجیے۔ وہ سب مسلمان ہیں لیکن راگوں کے نام کیا ہیں؟ یہ راگ اور راگنیاں سب سنسکرت نام ہیں۔ کیا کوئی ہندو آج ایسا ہے جو یہ کہنے کا حق رکھتا ہو کہ ہندوستانی گانے ہندو گانے ہیں یا کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ ہندوستانی گانے مسلمان گانے ہیں؟ ہندوستانی مصوری اور فن تعمیر کے شباب کا زمانہ عہد مغلیہ میں تھا۔ پھر اب کیوں ہم ہندو تہذیب اور مسلمان تہذیب کا ذکر کرتے ہیں؟" ("مدینہ" مورخہ ۱۲ اپریل ۳۸ء)

"ہم ایران کی مثال لیتے ہیں۔ ایران کا مذہب اسلام ہے اور عرب کا مذہب بھی اسلام ہے۔ لیکن کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایران میں عربی تہذیب ہے؟" (حوالہ مذکور)

ان خیالات کو جب ہم پڑھتے ہیں تو ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ اگر یہ سیاسی فریب کاری نہیں ہے تو سخت جہالت ہے۔ یہ لوگ اسلامی تہذیب ہی کو نہیں بلکہ نفس تہذیب کے مفہوم کو بھی نہیں جانتے (۵۸) اور پھر اس موضوع پر زبان کھولنے کی جرأت کرتے ہیں۔ میں اس سے پہلے اسلامی تہذیب کی کافی تشریح کر چکا ہوں (ملاحظہ ہو "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش۔ حصہ اول صفحہ ۴ تا

یہاں تک تو صرف یہ وعظ تھا کہ "اسلامی تہذیب" حقیقت میں کسی چیز کا نام ہی نہیں ہے۔ اسکے بعد دوسرا پہلو اختیار کیا جاتا ہے اور یوں ارشاد ہوتا ہے کہ مسلمان جس چیز کو اپنی تہذیب کہہ رہے ہیں وہ اب زندہ نہیں رہ سکتی۔ زمانے کے انقلابات اس کو مٹا رہے ہیں، مٹا دینگے، اور خود مسلمان قومیں آج اس کو چھوڑ رہی ہیں:-

"اب تو قومی تہذیبوں کا زمانہ بہت تیزی کے ساتھ ختم ہو رہا ہے اور پوری دنیا ایک تہذیبی وحدت بنتی جا رہی ہے...... اس ناگزیر رجحان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا" (صہ ۳۳۲)۔

"اس زمانہ میں ہندی مسلمانوں کو سہیم صدمہ پہنچے ہیں۔ اور انکے بہت سے خیالات جنکی پرورش بڑی تمناؤں سے کی گئی تھی پاش پاش ہو گئے۔ اسلام کے مرد غازی ترکوں نے نہ صرف یہ کہ اس خلافت ہی کو ختم کر دیا جسکے لیے ہندوستان ۱۹۲۰ء میں اتنا لڑا تھا، بلکہ یکے بعد دیگرے ایسے قدم اٹھائے ہیں جو مذہب سے اس کو دور ہی لیے جا رہے ہیں... مصر بھی اسی راستہ پر جا رہا ہے... یہی حال عربی ممالک کا ہے سوائے ملک عرب کے جو بہت پیچھے ہے۔ ایران کی نظریں اپنے تمدنی احیاء کیلئے تاریخ قبل از اسلام پر پڑتی ہیں۔ غرض ہر جگہ مذہب بالکل پس پشت ڈالا جا رہا ہے اور وطنیت جنگ آزما لباس میں ظاہر ہو رہی ہے" (صہ ۳۳۶)

حاشیہ صفحہ ۵۸ ؎ یہاں مسلمانوں کے دوران قوم پرستوں کے مقاصد کا تضاد بالکل نمایاں ہے۔ ہم ان حالات کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ غلامی کی وجہ سے ہمارا نیشنل ٹائپ مضمحل ہو رہا ہے، اور ہمیں آزادی کی ضرورت اسی لیے ہے کہ حکومت خود اختیاری کے وسائل سے کام لیکر اپنے نیشنل ٹائپ کو مستحکم کریں۔ مگر یہ حضرات اس امر واقعہ کو کہ ہمارا نیشنل ٹائپ اس قدر مضمحل ہو چکا ہے، اس بات کی دلیل قرار دیتے ہیں کہ سرے سے ہمارا کوئی نیشنل ٹائپ ہے ہی نہیں اور ہمیں اب اُس نمونے کے مطابق ڈھلنے پر راضی ہو جانا چاہیے جو ان کے پیش نظر ہے۔

؎ اسلام کو ہر سر انحطاط، بلکہ بزعم خود فناپذیر دیکھ کر اس قوم پرست لیڈر کے قلب میں جو انشراح و انبساط کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے، اس کو غور سے ملاحظہ کیجیے۔ یہ پنڈت جی اپنی بے تعصبی کا سکہ جمانے کی بہت کوشش کرتے ہیں، مگر دل میں اسلام کیلیے جو عناد اور دشمنی کا جذبہ بھرا ہوا ہے وہ کسی طرح چھپائے نہیں چھپ سکتا۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمانو! یہ تم کس چیز کو لیے بیٹھے ہو؟ جو چیز فنا ہو رہی ہے، جس کا فنا ہونا یقینی ہے، جس کو سب مسلمان قومیں چھوڑ رہی ہیں اسے تم کیوں پکڑے ہوئے ہو؟ چھوڑو اسے اور آؤ اس راستہ کی طرف جدہر ہم بلا رہے ہیں۔

یہ سب کچھ کہنے کے بعد پھر بھی دل میں تردد باقی رہتا ہے کہ یہ کمبخت مذہب پرست مسلمان، اپنی تہذیب اور قومیت پر جان دینے والے متعصب لوگ، اتنا سمجھانے پر بھی نہ مانینگے۔ لہذا ایک آخری حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مسلمان کے دل میں انگریز اور اسکی غلامی سے جو نفرت ہے اسے مدد پر بلایا جاتا ہے، اور اس سے یوں کام لیا جاتا ہے:۔

"ہندوستان میں مسلم قوم اور اسلامی تہذیب پر اور ہندو و مسلم تہذیبوں کے انتہائی اختلاف پر بڑا زور دیا جاتا ہے، پھر اس سے یہ لازمی نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ برطانیہ کا ہندوستان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ضروری ہے تاکہ دونوں میں توازن قائم رکھے اور بیچ بچاؤ کر سکے (صفحہ ۳۳)

"مسلم قومیت کا ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مطلق العنان حکومت یہاں رہنی چاہیے یا بدیسی حکومت"۔ (صفحہ ۳۳)

"ہاں اب مسلم قوم اور اسلامی تہذیب کا کیا ہوگا؟ کیا یہ دونوں آئندہ صرف شمالی ہند میں برطانیہ کی شفیق حکومت کے تحت پھلتی پھولتی رہیں گی؟" (صفحہ ۳۳)

یہاں پہنچ کر ہندوستان کے "قومی لیڈر" نے اپنی سیاست دانی کے جوہر پوری طرح نمایاں کیے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اسلامی تہذیب اور اسلامی قومیت صرف سرکار برطانیہ ہی کے سہارے جی سکتی ہے، لہذا جو لوگ ان دونوں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں وہ سب ٹوڈی اور سرکار پرست ہیں اور اُن کا مقصد یہ ہے کہ بدیسی حکومت یہاں ہمیشہ قائم رہے۔ اب اگر اس ملعون سامراج سے نجات چاہتے ہو، اگر آزادی کی خواہش ہے تو اس قومیت اور تہذیب کے

تحفظ کا نام لینا چھوڑ دو، ورنہ جو کوئی یہ نام لے گا، ٹوڈی قرار دیا جائیگا ــــ یہ آخری ضرب بڑی کاری ضرب ہے۔ ہماری قوم کے بہت سے حریت پسندوں کو یہی ضرب "آزادی کی فوج" میں کھینچ لے گئی ہے اور بہت سے اُن لوگوں کی زبانوں پر اس نے مہر لگادی ہے جو حریت پسند کہلانا چاہتے ہیں اور ٹوڈیت کے گھناؤنے خطاب سے بچنا چاہتے ہیں۔

قومیت اور تہذیب کی خبر لینے کے بعد پنڈت جی اسلام کے نظام اجتماعی کی طرف بڑھتے ہیں تاکہ اس کو درہم برہم کرکے جمہور مسلمین کو جدید ہندوستانی قومیت میں جذب کرلیا جائے۔

پنڈت جی کو خوب معلوم ہے کہ مسلمانوں کے ہوشمند لوگ جو اسلام سے واقف ہیں، جن میں اپنی قومیت کا شعور پوری طرح موجود ہے، جو اپنی قومی تہذیب کو ہر چیز سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں، وہ تو قیامت تک اس پوزیشن کو قبول کرنے پر راضی نہ ہوں گے۔ ان کیلیے قطعی ناممکن ہے کہ اسلامی قومیت کو چھوڑ کر ہندوستانی قومیت میں اپنے آپ کو ضم کردیں، اور ان کو ایک لمحہ کیلیے بھی یہ گوارا نہیں ہو سکتا کہ اُس تہذیب کو خیرباد کہدیں جسے وہ اس گئی گذری حالت میں بھی اپنی عزیز ترین متاع سمجھتے ہیں۔ قومیت کو چھوڑنا، تہذیب سے دست بردار ہونا، جدید ہندی قومیت اور اشتراکی تہذیب و تمدن میں جذب ہو جانا، یہ تو بہت دور کی چیزیں ہیں۔ مسلمانوں کے اس گروہ سے تو الٹا یہ خطرہ ہے کہ ہندوستان کے آزاد نظام حکومت میں وہ اپنی قومیت اور اپنی تہذیب کو زیادہ مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کریگا، اور اس غرض کیلیے حکومت کے اقتدار میں برابر کی شرکت حاصل کرنا چاہیگا۔

اس خطرے کو اچھی طرح محسوس کرکے پنڈت جی نے یہ تدبیر نکالی ہے کہ مسلمانوں کی قومی جمعیتوں سے اب خطاب ہی نہ کیا جائے بلکہ ان کے افراد تک براہِ راست پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ یہ افراد چونکہ منتشر ہیں، مفلس ہیں، اسلام اور اس کی تہذیب کے اصولوں سے

اچھی طرح واقف نہیں ہیں، اسلامی نظام اجتماعی کا شیرازہ درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے ان پر اسلام کی گرفت قائم نہیں رہی ہے، اور جہالت یا مغربی تعلیم کی وجہ سے ان کا شعور اسلامیت بڑی حد تک مضمحل ہو چکا ہے، اس لیے ان کو بآسانی توڑ لیا جا سکتا ہے۔ قبل اسکے کہ مسلمانوں کا "بورژوا" طبقہ ــــ اشتراکی زبان میں قوم کے اہل دماغ اور متوسط طبقوں کا یہی نام ہے ــــ بیدار ہو کر اپنی قوم کو سنبھال لینے کی فکر کرے، قوم کو اس کے قابو سے نکال لیا جائے یا زیادہ صحیح الفاظ میں اس کی "شدھی" کر لی جائے۔

یہی حقیقت ہے اُس پالیسی کی جس کو مسلم عوام کے ساتھ ربط قائم کرنے" (Muslim Mass Contact) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ پنڈت جی نے آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبۂ صدارت میں اس پالیسی کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی تھی:۔

"ہم نے عام لوگوں سے نگاہ ہٹا کر مدتوں فرقہ دارانہ لیڈروں کی باہمی مصالحت اور گفت و شنید میں وقت گنوایا ہے۔ یہ طریقہ نکما ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہم دوبارہ ادھر نگاہ بھی نہ ڈالیں۔ ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی کوئی گنجائش نہیں۔ آج جماعتوں اور ملتوں کی بنیاد معاشی مفاد پر رکھی جا رہی ہے اور اس لحاظ سے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، سب ملتوں کا بھلا اسی میں ہے کہ اپنی بیکاری اور غریبی کو سامنے رکھ کر سب مل کر قومی آزادی کیلیے آگے بڑھیں۔ جب کبھی ہم اوپر کے لوگوں سے منہ موڑ کر عام لوگوں کی طرف نگاہ ڈالیں گے تو ہمیں ان معاشی مصیبتوں کا حل تلاش کرنا پڑیگا۔ جو سوال ایک زمانہ سے فرقہ دارانہ مسئلہ بن گیا ہے اسکا صحیح حل یہی ہے۔"

کیسے معصوم، کیسے بے ضرر ہیں یہ الفاظ! مگر کتنے زہریلے ہیں! اس سے پہلے جو

تصریحات خود پنڈت جی کی زبان سے میں نقل کر چکا ہوں۔ ان کو سامنے رکھکر جب آپ اس نئی پالیسی کو دیکھیں گے۔ تو صاف نظر آجائیگا کہ یہ دراصل شدھی کی تحریک ہے ایک دوسری شکل میں۔ یہ مذہبی شُدھی نہیں، سیاسی اور معاشی شُدھی ہے اور اس کا نتیجہ عملاً وہی ہے جو مذہبی شُدھی کا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ کھلی ہوئی تحریک ارتداد تھی جس پر مسلمانوں کے جاہل اور عالم سب چوکنے ہو گئے تھے۔ اور یہ ایسی خفی تحریک ارتداد ہے کہ جہلا تو درکنار علماء تک اس کی کنہ کو پہنچنے میں دقت محسوس کر رہے ہیں۔ اُس تحریک کے بانیوں نے پھوہڑ پن سے کام لیا تھا۔ اُنھوں نے مسلمانوں سے کہا کہ تم اپنی قومیت اور اپنے مذہب کو چھوڑ کر ہندو قومیت اور مذہب میں آجاؤ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں کوئی کودن سے کودن آدمی بھی ایسا نہ تھا جو اس پر بھڑک نہ اٹھا ہو۔ بخلاف اس کے اس تحریک کا بانی ایک ہوشیار شخص ہے۔ یہ کہتا ہے کہ تم کوئی قوم ہی نہیں ہو، تمہاری کوئی تہذیب ہی نہیں ہے، لہذا کسی چیز کے چھوڑنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ دراصل تم ایک قوم یعنی "ہندوستانی قوم" کے فرد ہو مگر سامراج کے ایجنٹوں نے تم کو اس قوم سے جدا کر رکھا ہے۔ آؤ اپنی قوم میں مل جاؤ، آزادی حاصل کرو، اور اس اشتراکی تہذیب کے قائم کرنے میں حصہ لو جس میں تم کو خوب روٹیاں ملیں گی ـــــ ہے یہ بھی زہر ہی کا گھونٹ، مگر دیکھیے، کیسے کیسے ہوش گوش کے لوگ اسے شیرِ مادر سمجھ کر نوش فرما رہے ہیں۔

آزادی کی فوج کے مسلمان سپاہی

پنڈت جواہرلال کے جو خیالات گزشتہ صفحات میں پیش کیے گئے ہیں ان کو محض ایک شخص کے ذاتی خیالات سمجھ کر سرسری طور پر نظر انداز کر دینا صحیح نہیں ہے۔ اول تو یہ اس شخص کے خیالات ہیں جو گاندھی جی کے بعد کانگریس میں سب سے زیادہ با اثر ہے اور دو مرتبہ کانگریس کا صدر رہ چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ جواہرلال کے بعد انہی کے ہم خیال بلکہ ان سے زیادہ سخت خیالات رکھنے والے شخص، سوباش چندر بوس کا صدر منتخب ہونا اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ کانگریس پر ان خیالات کا پورا غلبہ ہے۔ ان سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اب یہ خیالات لیڈروں کے ذاتی خیالات نہیں رہے ہیں بلکہ درحقیقت کانگریس کی سرکاری پالیسی کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ کانگریس نے مارچ ۳۷ء کے بعد جمہور مسلمین کے ساتھ ربط قائم کرنے کی جو تحریک (Muslim Mass Contact) کے نام سے شروع کی ہے وہ ٹھیک ٹھیک انہی راستوں پر چل رہی ہے جو پنڈت جی نے تجویز کیے ہیں۔ پورا غیر مسلم پریس جو کانگریس کے زیر اثر ہے مسلمانوں میں قومیت اور اسلامی تہذیب کے خلاف بغاوت پھیلانے میں لگا ہوا ہے۔ جس گوشے سے اس بغاوت کا کوئی اثر ظاہر ہوتا ہے، اس کا بڑے جوش کے ساتھ خیر مقدم کیا جاتا ہے، اور ہر اس آواز کو جو اسلامی شعور کے تحت کسی مسلمان کی زبان سے بلند ہوتی ہے "فرقہ پرستی" اور "رجعت پسندی" کے آوازے کس کر دبا دیا جاتا ہے۔

اس طرزِ عمل کی توضیح کیلیے میں صرف دو مثالیں پیش کرونگا جن سے اس تحریک کے رجحانات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

پچھلے سال لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک مسلمان نژاد طالب علم نے برملا اعلان کیا تھا کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔ مسلمانوں نے اس پر اعتراض کیا کہ جو شخص خود اسلام سے منکر ہے وہ کسی انتخاب میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے امیدوار بننے کا حق دار کیسے ہو سکتا ہے۔ اس واقعہ پر اظہار رائے کرتے ہوئے ایک کانگریسی اخبار (ہندوستان ٹائمز) لکھتا ہے۔

> "اگر ووٹروں کی فہرست میں نام درج ہونے اور انتخابات کیلیے بحیثیت امیدوار کھڑے ہونے سے پہلے لوگوں کے عقائد کی تحقیقات شروع ہو گئی تو ہمارا موجودہ انتشار و اختلال اور زیادہ پریشان کن ہو جائیگا۔ اس سے تو یہ بات بالکل عیاں ہو گئی کہ ہمارا یہ سارا انتخابی نظام جسکو ہمارے آقاؤں نے اسقدر کامل غور و فکر کے بعد مرتب کیا ہے اس وقت بیکار ہو کر رہ جائیگا جب کہ لوگ صرف ہندو یا مسلمان نہ رہیں گے بلکہ فرداً فرداً اپنے مخصوص عقائد اور شبہات پیدا کر لینگے۔ لہذا مسٹر نقوی کو مستقبل کیلیے ایک فال نیک سمجھنا چاہیے اور کیا خبر کہ وہ آنے والی صبح صادق کے ایک پیغمبر ہوں"

آگے چل کر اس مضمون میں انگلستان کے اُن ملاحدہ کو مثالاً پیش کیا گیا ہے جنہوں نے حریت فکر کا علم بلند کیا تھا اور اپنی مذہب پرست قوم کے ہاتھوں تکلیفیں اٹھائی تھیں مثلاً چارلس بریڈلا، مارلے اور رابرٹ انگرسول۔ پھر اسلام سے بغاوت کرنے والے اس نوجوان کو ان "بہادروں" کی صف میں جگہ دے کر اسکی ہمت و جرأت پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے گئے ہیں۔

ایک دوسرا کانگریسی اخبار (تیج) اپنی ۱۴ راگست ۳۸ء کی اشاعت میں ایک مسلمان عورت

کا خط شائع کرتا ہے جسکے الفاظ حسب ذیل ہیں :-

"جب میرٹھ میں پوجیہ پنڈت جواہرلال نہرو تشریف لائے تو میں اپنے خاوند سے چھپ کر جلسہ دیکھنے گئی اس وقت سے میرا دل بے چین رہنے لگا۔ میں نے اپنے مکان پر قومی جھنڈا لگا دیا۔ لیکن جب میرے خاوند نے اسے پھاڑ ڈالا تو میں نے سارا دن نہ تو کھانا کھایا نہ رات کو سوئی بلکہ تمام رات اور دن برابر روتی رہی۔ جب میرے خاوند نے میرے پیارے پنڈت جواہرلال کو گالیاں دینی شروع کیں تو میں نے کہا اگر ان کی شان میں کچھ کہا تو جان کھو دونگی۔ چنانچہ میں اسی دن لڑکر اپنے باپ کے گھر چلی آئی ہوں۔ اب جب تک میرا خاوند معافی نہ مانگے گا، اپنے مکان پر کانگریس کا جھنڈا نہ لگائے گا، اور کانگریس کا ممبر نہ بنے گا، میں اس کی شکل بھی نہ دیکھوں گی۔"

ایڈیٹر صاحب! میں نے پچاس مسلمان عورتیں تیار کر رکھیں ہیں جو پردے کو چھوڑ کر ہر وقت کانگریس کا کام کرنے کو تیار ہیں۔ مگر ہمارے گھر والے ہمکو بہت تنگ کرتے ہیں۔

اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں ؟ اور آپ ہمارے پوجیہ پنڈت جواہرلال سے کہیے کہ ہم مسلمان عورتیں کیا کریں ؟"

بہت ممکن ہے کہ یہ خط فی الواقع کسی مسلمان عورت کا لکھا ہوا نہ ہو، اور محض ایک جعل ہو۔ لیکن اگر یہ جعل ہے تو یہ اور بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ "لشکر آزادی" کے ان نقیبوں کے مافی الضمیر پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "قوم پرستی" کے یہ علمبردار مسلمان مردوں اور عورتوں کو کیا دیکھنا چاہتے ہیں، "آزادی کی فوج" کے لیے کس قسم سپاہی ان کو مسلمانوں میں درکار ہیں، اور کم از کم کس حد تک اصولِ اسلام سے منحرف ہونا ضروری ہے جس کے بعد وہ کسی مسلمان کو "قوم پرست" تسلیم کر سکتے ہیں۔

یہ بغاوت صرف غیر مسلموں ہی کی زبان و قلم کے ذریعہ سے نہیں پھیلائی جا رہی ہے، بلکہ

خود مسلمان بھی اس کی اشاعت کیلیے آلۂ کار بنائے جا رہے ہیں۔ مسلمان لیڈر، مسلمان اہلِ قلم اور مسلمان رسائل وجرائد اُنہی تمام خیالات کو مسلمانوں میں پھیلانے کا وسیلہ بن گئے ہیں اور بنتے جا رہے ہیں جو پنڈت جواہرلال نہرو کی زبان سے آپ سُن چکے ہیں، اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو بہکانے کیلیے غیر مسلموں کی بہ نسبت خود مسلمان زیادہ کارگر ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اس کیلیے آپ کو جتنی مثالوں کی ضرورت ہو، میں پیش کر سکتا ہوں۔ مگر یہاں صرف ان حضرات کی تحریروں سے استناد کرونگا جو کانگریس میں کوئی نہ کوئی "سرکاری" یا ذمہ دارانہ حیثیت رکھتے ہیں۔

بہار کے مشہور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر سید محمود صاحب، جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سکرٹری رہ چکے ہیں، اور اس وقت صوبۂ بہار کی وزارت میں واحد مسلمان وزیر ہیں، اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:-

"مختصر یہ کہ اخلاقی سیاسی اور دوسرے تمام حکیمانہ تصورات کو قطعیت اور عملیت کا جامہ پہنا کر مسلمانوں نے ہندوستان کے تخیل کو عمل کا آئینہ بنا دیا۔ بعض نے اپنے دلور دجوش سے مجبور ہو کر ہندوستان میں متحدہ قومیت کی آفرینش کے پیشِ نظر ایک ایسے جدید نظام مذہبی کی نشوونما کرنی چاہی جو ہندوستان میں سب کے مناسب حال ہو۔ یہ ان لوگوں کی معمولی خدمات نہیں کہی جا سکتیں۔ اجنبی تھے، لیکن انہوں نے جلد ہی اپنی قسمتوں کو اہلِ ملک کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وابستہ کر لیا" (جامعہ۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء)۔

آپ سمجھے کہ یہ "جدید نظام مذہبی" کا اشارہ کس چیز کی طرف ہے؟ یہ اشارہ اکبر کے دینِ الٰہی کی طرف ہے۔ کتنا مختصر اشارہ ہے، مگر "قوم پرست مسلمان" ـــــ مجموعۂ ضدّین ـــــ کی معراجِ تخیل کو کتنی صاف روشنی میں پیش کرتا ہے۔ اکبر کا دور اسلامی ہند کی تاریخ میں پہلا دور ہے

غیر مسلموں کے ساتھ گھل مل جائیں اور ان کے درمیان پیشوں کے ساتھ "رسوم میں بھی یکسانیت" پیدا ہو جائے۔ ہندوستان کی مختلف قوموں کے لیے لفظ "اقوام" کا استعمال ہی فاضل ڈاکٹر کے نزدیک قابل اعتراض ہے۔ وہ ہندوستان کو ایک جغرافی نام نہیں بلکہ ایک قومی وحدت بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک مسئلہ ہند کا یہ حل بالکل غلط ہے کہ ہر "قوم علٰحدہ علٰحدہ اپنے مسائل کو حل کرے اور مشترکہ دولت ہند میں صرف انسانی اور مادّی امداد کرے"۔ برعکس اس کے صحیح حل یہ ہے کہ "مسلمان اسی راستہ پر گامزن ہوں جو اکبر اور ازمنۂ وسطیٰ کے حکمرانوں نے بنا دی تھی"، یعنی ہندوستان کی کان نمک میں نمک بننے کیلیے تیار ہو جائیں۔ اور یہ سب کچھ مسلمانوں کو کیوں کرنا چاہیے؟ خدا اور رسول کی خاطر نہیں، بلکہ ملک کی خاطر اور اپنی خاطر۔ غالباً یہاں "اپنے پیٹ کی خاطر" لکھتے ہیں ڈاکٹر صاحب کو شرم محسوس ہوئی ہوگی۔ ایں ہم غنیمت است!

کیا جواہرلال نہرو کا تصور قومیت اس سے کچھ بھی مختلف ہے؟

مسلمانوں کو اپنے نام "مسلم" پر بڑا فخر ہے۔ خدا کا رکھا ہوا نام، اور وہ نام جس سے بڑھ کر عزت و افتخار کا نام آج تک دنیا کی کسی قوم کو نصیب نہیں ہوا۔ مگر ڈاکٹر سید محمود صاحب کے نزدیک اس علٰحدہ نام سے مسلمانوں کا موسوم ہونا قابل اعتراض ہے۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی اور اس قسم کے دوسرے تمام اسماء ان کے نزدیک محو ہو جانے چاہئیں اور صرف ایک نام "ہندی" تمام باشندگان ہند کیلیے استعمال ہونا چاہیے تاکہ جداگانہ قومیتوں کا احساس ہی باقی نہ رہے۔ فرماتے ہیں:۔

"ہندی" کو زبان کیلیے نہیں بلکہ "اہل ہند" کیلیے اختیار کرنا چاہیے۔ دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں لوگ مختلف مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں۔ صرف

اس کا اظہار ہی ہماری دماغی کیفیت کا آئینہ بن جاتا ہے اور ہمارے متعلق یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ہم اس برّاعظم کی علیحدہ علیحدہ "مذہبی اقوام" ہیں۔ اسی لیے اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب ایک مشترک نام اختیار کریں"۔

"ہم علیحدہ علیحدہ مذہبی اقوام ہیں" یہ گویا ہمارے دامن پر ایک شرمناک دھبہ ہے جسے مٹا دینے کی ضرورت ہے! وہ دماغی کیفیت ہی لائق صد شرم وندامت ہے جس کے تحت دنیا کے اس اکیلے ملک، ہندوستان دوزخ نشان کے باشندے مختلف مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں!! یہ ثابت ہو جانا کہ ہم اس برّاعظم کی علیحدہ علیحدہ مذہبی اقوام ہیں، گویا اس بات کا ثابت ہو جانا ہے کہ ہم دورِ وحشت کی یادگار ہیں، اور اس تلخ حقیقت کو شیرینی یا کم از کم فریب شیرینی سے بدل دینے کیلیے اب ناگزیر ہو گیا ہے کہ ہم ان ناموں کو بدل ڈالیں جو "علیحدہ مذہبی اقوام" ہونے کے احساس کو زندہ رکھتے ہیں ـــــ یہ ہیں اُس زعیم قوم کے خیالات جس کو مولانا ابوالکلام آزاد نے صوبۂ بہار کی وزارت میں ۴۰ لاکھ مسلمانوں کی نمائندگی کیلیے منتخب فرمایا ہے[1]۔

یہ تو صرف ایک نظیر تھی۔ کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ بس یہ ایک ہی نظیر ہے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے حال ہی میں ایک مستقل شعبۂ اسلامیات قائم کیا ہے جسکے کارکن مسلمان ہیں، اور نشر واشاعت کے آلۂ کار سب کے سب مسلمان اخبارات ہیں۔ مسلمانوں کیلیے کانگریس نے جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں ان کی فہرست میں اس شعبۂ اسلامیات

[1] اس موقع پر مولانا ابوالکلام کے "تذکرہ" میں ان علماء ومشائخ کے حالات پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے جنہوں نے دورِ اکبری میں سیاسی اغراض پر دین کی قربانی چڑھانے والوں کے ساتھ مداہنت برتی تھی۔ ان لوگوں کے متعلق مولانا نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ انشاء اللہ ازدیادِ بصیرت کے موجب ہوں گے۔

تہذیب پر بحث کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ اس تمدن اور تہذیب نے ایک خاص ماحول میں تربیت پائی تھی اور بہر صورت مسلمانوں کی حکمران حیثیت سے وابستہ تھی۔ جو لوگ بے ہنری کے ساتھ اسلامی تہذیب کی خصوصیات گناتے وقت یہ حدیث سناتے ہیں کہ کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔ وہ اکثر یہ واقعہ بھول جاتے ہیں کہ یہ حدیث یا اس قسم کے دوسرے اقوال اس زمانہ کے سماجی حالات کا عکس ہیں جب انسانوں کی تقسیم حاکم اور محکوم، راعی اور رعیت میں ہوتی تھی اور مسلمان من حیث القوم حکمران تھے...

البتہ اسلامی تمدن اور تہذیب کا مفہوم اس درجہ محدود نہ تھا جیسا کہ آج کل ہو گیا ہے۔ آج اسلامی تہذیب کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے اگر مسلمان بجائے کلاہ اور عمامہ کے گاندھی ٹوپی پہننے لگتے ہیں یا ہندی رسم الخط کے پرچار کیلئے دو چار ہندو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک خاص قسم کا لباس اگر نہ پہنیے یا اگر فصیح و بلیغ اردو نہ بولیے تو آپ کا تمدنی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ مذہبی حیثیت سے بھی مسلمان رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ معیاری اور ٹکسالی مسلمان صرف وہ خوش نصیب لوگ ہیں جو دہلی اور لکھنؤ کی فضا میں پلے اور بڑھے ہیں (چاہے وہ کایستھ یا کشمیری برہمن ہی کیوں نہ ہوں) یا پھر دیوبند اور فرنگی محل کا لباس پہننے والے اور علماء کی وضع کے پابند لوگ"۔

دیکھیے! "ترقی پسندوں" کے علم و فضل اور انکی دانش و بینش کا معیار کس قدر بلند ہے! انکے ارشادات جب ہم پڑھتے ہیں تو بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی

؎ جہالت ملاحظہ ہو۔ جو حدیث اس کی انفرادی ذمہ داری و مسئولیت کا عظیم الشان اخلاقی تصور پیش کر رہی ہے اس کی معنویت کو کس بری طرح خاک میں ملایا گیا ہے۔ پھر اس علم اور اس فہم پر جسارت کا یہ حال ہے کہ اسلامی تہذیب و تمدن کے متعلق ماہرانہ گفتگو فرمائی جاتی ہے۔

آواز کو ایک ریکارڈ میں بھروا دیا ہے، اور وہی ریکارڈ جگہ جگہ بجتا پھر رہا ہے۔ اپنے شیخ طریقت، پنڈت جواہر لال کی طرح یہ لوگ بھی اسلامی تہذیب و تمدن کے مسئلے پر اظہار خیال کر کے درحقیقت اپنی بے علمی کا راز فاش کرتے ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف اسلامی تہذیب و تمدن ہی سے نابلد نہیں ہیں، بلکہ نفس تہذیب و تمدن کے مفہوم سے بھی ناآشنا ہیں ــــ یا اگر ناآشنا نہیں ہیں تو عمداً غلط مبحث کر کے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ تہذیب نام رکھتے ہیں تمدنی مظاہر کا، حکمران طبقے کے آداب و اطوار کا، لباس کی وضعوں اور کھانوں اور مٹھائیوں کا، موسیقی اور سنگتراشی اور مصوری کا، اور اظہار مافی الضمیر کے وسائل کا۔ پھر ان تمدنی مظاہر میں گردش ایام کے ساتھ جو تغیرات رونما ہوتے ہیں ان میں یہ اس حیثیت سے کوئی امتیاز نہیں کرتے کہ کونسے تغیرات ایک تہذیب کے زیر اثر ہوئے اور کونسے دوسری تہذیب کے زیر اثر۔ بس سطح پر چند تغیرات دیکھ کر یہ اپنی تقریر شروع کر دیتے ہیں کہ دیکھو، تاریخ کے دوران میں تمہارا تمدن بارہا بدل چکا ہے، اور جب تمدن بدلا ہے تو گویا تہذیب بدل گئی ہے، لہٰذا اسلامی تہذیب و تمدن کسی متعین حقیقت کا نام نہیں ہے۔ جس طرح پہلے تم بہت سے تغیرات قبول کر چکے ہو اسی طرح اب بھی اُن تغیرات کو قبول کرنے کیلئے تیار رہو جا ؤ جن کا تقاضا، فضا کے انقلاب انگیز حالات یا بالفاظ دیگر جواہر لال اور انکی امت کے رجحانات کر رہے ہیں ــــ حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ علانیہ ایسی صریح جاہلانہ باتیں لکھنے اور شائع کرنے کی جرأت کیسے کرتے ہیں۔ کیا انہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ سارا ہندوستان بس جہلا ہی سے آباد ہے اور یہاں کوئی پڑھا لکھا آدمی نہیں رہتا؟

اگرچہ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے مگر میں عام ناظرین کی واقفیت کیلئے بطور جملہ معترضہ صرف اتنا عرض کیے دیتا ہوں کہ دراصل تہذیب اُس طریق فکر، اُس نظریۂ حیات، اور اُس معیار امتیاز و

انتخاب کا نام ہے جو انسانوں کی کسی معتدبہ جماعت کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے، اور جس کے زیر اثر وہ جماعت دنیا میں زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقوں میں سے کسی خاص طریقے کو اختیار کرتی ہے۔ اور تمدن اُس خاص طرز زندگی کا نام ہے جو اسی تہذیب کے زیر اثر اختیار کیا جائے۔ ہم جس چیز کو اسلامی تہذیب کہتے ہیں وہ لکھنؤ اور دلّی کی فصیح و بلیغ اردو اور دیوبند و فرنگی محل کے علماء کا لباس نہیں ہے، بلکہ وہ اس ذہنیت، اس طرز خیال اور ان اصول حیات پر مشتمل ہے جو قرآن اور سیرت رسول سے ماخوذ ہیں۔ جب تک کوئی تمدن اس تہذیب کے حدود کے اندر ہے، وہ اسلامی تمدن ہے، خواہ اسکی زبان، اسکے لٹریچر، اس کے آداب و اطوار، اسکے کھانوں اور مٹھائیوں، اس کے لباس و طرز معاشرت، اور اسکے فنون لطیفہ میں کتنے ہی تغیرات واقع ہو جائیں۔ مظاہر کا تغیر بجائے خود کسی تمدن کو اسلامی تہذیب کے دائرے سے خارج نہیں کر دیتا، البتہ جب وہ اس نوعیت کا تغیر ہو کہ اسلامی تہذیب کے اصول و قواعد میں اس کے لیے کوئی سند جواز نہ ہو، تو یقیناً وہ تمدن کو غیر اسلامی تمدن بنانے کا موجب ہوگا۔ مثال کے طور پر مسلمان مشرق سے لے کر مغرب تک بیسیوں طرح کے لباس پہنتے ہیں، مگر ان سب میں ستر عورت کے انہی حدود کا لحاظ رکھا جاتا ہے جو اسلامی تہذیب نے مقرر کر دیئے ہیں۔ لہٰذا یہ سب لباس اپنے تنوعات کے باوجود اسلامی تمدن ہی کے لباس کہے جائیں گے مگر جب کوئی لباس ان حدود سے قاصر ہوگا تو ہم اسے غیر اسلامی لباس کہینگے۔ اسی طرح غذا کے متعلق حلال و حرام کے جو حدود اسلامی تہذیب نے مقرر کیے ہیں ان کے تحت خواہ کتنی ہی انواع و اقسام کے کھانے مسلمانوں کے گھروں میں پکتے ہوں اور تاریخ کے دوران میں ان کی نوعیتیں کتنی ہی بدل جائیں، اور کھانے کے طریقوں میں کتنا ہی تغیر رونما ہو جائے ان سب کو اسلامی تمدن ہی کے دائرے میں جگہ ملے گی، البتہ جب مسلمانوں کی غذا حدود حلت سے متجاوز

ہو گی تو ہم کہیں گے کہ وہ اسلامی تہذیب و تمدن سے بغاوت کر رہے ہیں۔ اسی پر زندگی کے تمام معاملات کو قیاس کر لیجیے۔ عرب، ہندوستان، ایران، ترکستان اور شمالی افریقہ کے تمدنوں میں بظاہر خواہ کتنا ہی فرق ہو، بہر حال جب تک ان کے اندر اسلامی ذہنیت کی روح موجود ہو گی، اور جب تک یہ شریعت اسلامی کے ضابطہ میں رہیں گے، ان پر یکساں "اسلامی تمدن" کا اطلاق ہو گا۔ مگر جب یہ کسی دوسری تہذیب کا اثر قبول کریں گے اور ایسی چیزیں اپنے اندر داخل کر لیں گے جو اسلامی تہذیب کی روح یا شریعت اسلام کے خلاف ہوں تو بلاشبہ یہ کہا جائیگا کہ ان ممالک میں اسلامی تمدن مسخ ہو رہا ہے۔

اب آپ غور فرمائیں کہ پنڈت جواہر لال اور ان کے یہ مسلمان متبعین اسلامی تہذیب و تمدن کے مسئلے کو کیسی غلط روشنی میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ دنیا کو اور خود ناواقف مسلمانوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ

"اسلامی تہذیب و تمدن فی نفسہٖ کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ صدیوں پہلے مغلوں اور پٹھانوں کے دورِ حکومت میں جو طور طریقے مسلمانوں میں رائج ہو گئے تھے انہی کا نام اسلامی تہذیب و تمدن رکھ دیا گیا ہے۔ آج جو مسلمان اسلامی تہذیب و تمدن کے تحفظ کا شور مچا رہے ہیں، ان کا مقصد محض اس گزرے ہوئے تاریخی دور کی میراث کو اس بدلے ہوئے زمانہ میں جوں کا توں برقرار رکھنا ہے، اس لیے یہ رجعت پسند اور ترقی دشمن ہیں"

ایک پوری قوم کے نقطۂ نظر کی اس قدر غلط ترجمانی اور اتنی جسارت کے ساتھ شائد یورپ کے سیاسی بازیگروں سے بھی بن نہ آتی۔ یہ ہمارے ہم وطن اور ہم قوم اس معاملہ میں ان سے بھی بازی لے گئے۔

ان کو اگر معلوم نہیں ہے تو ہم انہیں بتانا چاہتے ہیں کہ ہم اُس تمدن کی حفاظت کیلیے

نہیں اٹھے ہیں جو کسی زمانہ میں حکمراں طبقہ کے رجحانات سے پیدا ہوا تھا، بلکہ اس لیے اٹھے ہیں کہ ہماری قوم کا تمدنی ارتقار قرآنی تہذیب کے راستہ سے منحرف نہ ہونے پائے۔ ہمیں دلّی اور لکھنؤ کی ٹکسالی اردو کو بچانے کی فکر نہیں ہے، بلکہ اُس ذہن کو اسلامی ذہن رکھنے کی فکر ہے جس نے اپنی شخصیت ظاہر کرنے کیلیے اس زبان کو وسیلہ بنایا ہے۔ ہم دیوبند اور فرنگی محل کے لباس کو محفوظ رکھنے کیلیے نہیں لڑ رہے ہیں بلکہ اس لیے لڑنا چاہتے ہیں کہ ہمارے مرد اور ہماری عورتیں اُس لباس حیا سے خارج نہ ہو جائیں جو اسلامی تہذیب نے انہیں پہنایا ہے۔ اور اس لڑائی کی ضرورت ہمیں اسلیے پیش آئی ہے کہ ہم ہندوستان کی سیاست پر تم جیسے لوگوں کو غالب آتے دیکھ رہے ہیں جن میں ہماری تہذیب کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں، جن میں اتنی راستبازی و انصاف پسندی نہیں کہ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور جن میں ان کمزوریوں کے ساتھ ہٹلر اور مسولینی کی فاشستی روح گھل گئی ہے کہ اپنی مرضی کو دوسروں پر مسلط کرنے کیلیے کسی طاقت کے استعمال سے دریغ نہیں کرتے خواہ اسکے استعمال میں صداقت، انسانیت اور راستبازی کو قربان ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

خیر یہ ایک ضمنی بحث تھی۔ یہاں میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ کانگریس کا یہ شعبہ اسلامیات جو ہماری "دلدہی" اور "سہولت کار" کیلیے قائم کیا گیا ہے، دراصل کیا خدمات انجام دے رہا ہے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو کے جو نظریات آپ پہلے پڑھ چکے ہیں ان کو مسلمان مضمون نگاروں اور مسلمان اخباروں کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دلوں میں اتارنا اس کا مقصد ہے، اور آپ نے دیکھ لیا کہ یہ شعبہ جو ہماری "دلدہی" کیلیے قائم کیا گیا ہے اس مقصد کو کس خوبی کے ساتھ پورا کر رہا ہے۔ وہ ہمیں یہ سمجھا رہا ہے کہ یہ تہذیب جس کی حفاظت کا تم دعویٰ کر رہے ہو، کوئی چیز بھی تو نہیں ہے۔ مسلمان حکمران طبقہ کے رجحانات تھے سو وہ طبقہ ہی ختم ہو گیا۔ ایک خاص ماحول میں اس تہذیب نے تربیت پائی تھی، سو وہ ماحول ہی اب

باقی نہیں - اب سے دے کے تمہاری تہذیب یہ رہ گئی ہے کہ ایک خاص وضع کا لباس پہن لیتے ہو اور ٹکسالی اردو بول لیتے ہو، تو وہ بھی دلی اور لکھنؤ تک محدود رہے اور دلی و لکھنؤ میں بھی وہ کوئی خاص تمہاری چیز نہیں ہے بلکہ کالیستھ اور کشمیری برہمن بھی تمہارے ساتھ شریک ہیں - کیا اسی مہمل چیز کو تم فضا کے انقلاب انگیز تقاضوں اور سیاسی و اقتصادی حالات کی ترقی کے مقابلے میں بچانا چاہتے ہو؟ یہ تو عین رجعت پسندی ہے کیونکہ وہ دور گذر چکا جس میں یہ تہذیب پیدا ہوئی تھی - اور یہ سامراج پرستی بھی ہے کیونکہ فضا کے انقلاب انگیز تقاضوں کے مقابلہ میں اس بوسیدہ چیز کی حفاظت صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ تم سامراج کی حمایت کرو اور سامراج تمہاری حمایت کرے! ـــ مسلمانوں کو شکایت تھی کہ کانگریس عام مسلمانوں سے ربط نہیں رکھتی - اس شکایت کی معقولیت تسلیم کر کے کانگریس نے کیسے معقول طریقے سے اسے دور کیا ہے!

ڈاکٹر اشرف صاحب کا وعظ ابھی ختم نہیں ہوا - آگے سنیئے :-

"جاگیرداری اور عہد بادشاہت کے زمانہ میں باعتبار زبان، لباس، تمدن بلکہ مذہبی عقائد کے لحاظ سے بھی مسلمانوں میں کوئی یکسانیت نہ تھی - عربی، فارسی، ترکی، تاتاری، چینی سب مسلمانوں کی زبانیں تھیں - مغربی، مشرقی، ایرانی، رومی، ہندی، ہر طرح کے لباس مسلمانوں کے ہر طبقہ میں رائج ہو چکے تھے - چنانچہ جب ہمایوں ہندوستان سے جلا وطن ہو کر ایران پہونچا تو شاہ ایران نے بجائے ایرانی کھانوں کے اپنے مہمان کیلیے خاص طور پر ہندوستانی مٹھائیاں اور کھانے تیار کرائے - عقائد کی یکسانیت کا تو مسلمانوں میں سرے سے کوئی سوال ہی نہیں۔ بہتر فرقے ضرب المثل ہیں"

کچھ غور بھی کیا آپ نے کہ یہ تنوع کی تمام مثالیں کس مقصد کیلیے پیش کی جا رہی ہیں؟ اس کا

مقصد یہ ہے کہ جب اتنی زبانیں بول کر، اتنے مختلف لباس پہنکر، ایران میں ہندوستانی مٹھائی کھا کر، بہتر فرقوں میں بٹ کر، اور عقائد میں یکسانیت سے یکسر محروم ہو کر بھی تم مسلمان رہے تو اب اگر تم گاندھی کیپ اور دھوتی پہن لو، تمہاری عورتیں سماجی خدمت (Social service) کیلیے گھروں سے باہر نکل آئیں، تم نئی "ہندوستانی" زبان بولنی اور لکھنی شروع کردو، مخلوط تعلیم گاہوں میں تمہارے لڑکے اور تمہاری لڑکیاں "جدید طرز کی تعلیم" حاصل کرنے لگیں، سیاسی معاشرتی اور معاشی انقلاب کی جدید تحریکات تم میں پھیلنے لگیں تو اس میں کونسا مضائقہ ہو جائیگا؟

— اسی مقصد کو چھپا کر ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے :-

> "اس اعتبار سے آج ہم ایک نئے اور زندہ تمدن کی تعمیر میں مصروف ہیں - ہماری سیاسی اور سماجی جدوجہد اس نئے تمدن کا پیش خیمہ ہے - ضرورت اس کی ہے کہ ہم اس نئی تاریخی منزل اور اس کے تقاضے سے باخبر ہوں"

اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ یہ ساری دماغ سوزی اُس سماجی انقلاب (Social Revolution) کیلیے مسلمانوں کو تیار کرنے کی خاطر کی گئی ہے جس کا نقشہ پنڈت جواہرلال نہرو کے خیالات میں آپ دیکھ چکے ہیں - اور یہ دعوت پھیلائی کس اخبار کے ذریعہ سے جارہی ہے؟ اس اخبار کے ذریعہ سے جو جمعیت علمار ہند کا واحد ترجمان ہے - کیسے صحیح راستہ پر جارہی ہے "یہ آزادی کی فوج" اشرد ہانند کی شدھی پر شور قیامت برپا تھا - جواہرلال کی شدھی شربت کے گھونٹوں کی طرح اتاری جارہی ہے -

"آزادی کی فوج" اپنے مسلمان سپاہیوں سے جو خدمت لے رہی ہے ان میں سے دو صاحبوں کے کارنامے آپنے ملاحظہ فرما لیے - ایک صاحب نے اسلامی قومیت پر تیشہ چلایا دوسرے صاحب نے اسلامی تہذیب و تمدن پر ضرب لگائی - اب تیسرے سپاہی کا کارنامہ ملاحظہ ہو -

اسی "شعبۂ اسلامیات" کے ایک ذمہ دار کارکن جناب منظر رضوی[1] صاحب کا ایک طویل مضمون "مسٹر جناح کی کھوکھلی قیادت" کے عنوان سے اخبار "مدینہ" بجنور نے نومبر ۳۸ء کی کئی اشاعتوں میں درج کیا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:-

"ہمارا دوسرا حربہ حکومت اور اسکے حاشیہ بردار زمینداروں، تعلقداروں، جاگیرداروں کی مالگذاری اور لگان بند کرنا ہے ..... لیکن یہ یاد رہے کہ ان پایوں کو گراتے وقت ایک بہت بڑی کرانتی (انقلاب) مچیگی - بلوے اور فساد ہوں گے - اس میں خونریزیاں بھی ہونگی - خون کی ندیاں بہینگی اور سب کچھ ہوگا - اور اس وقت یہ جتنے زمیندار، سرمایہ دار، پونجی اور کانوں کے مالک، تعلقوں اور جاگیروں کے آقا، یہی راجہ محمود آباد، نواب چھتاری، سر سکندر حیات، راجہ نریندر ناتھ، گھنشام داس برلا، بھائی پرمانند، اور سیٹھ ڈالمیا جو مسلم ملت اور ہندو جاتی کے نعرے لگائے جاتے ہیں اپنی اپنی غریب اور دکھی جنتا اور غریب اور فاقہ مست عوام کو چھوڑ کر برٹش سامراج کے ساتھ ہوں گے اور ان پر گولے اور بم برسائیں گے - دوسری طرف غریبوں کی طاقت ہوگی اور ان کی جیون ساتھی کانگریس"۔

"ہماری آنیوالی لڑائی دراصل امیری اور غریبی کی لڑائی ہوگی - اس میں ہندوستان بھر کے

امیر چاہے وہ کسی مذہب اور فرقے کے کیوں نہ ہوں بدیسی سامراج کے ساتھ ہوں گے اور وہ ہم غریبوں اور مفلسوں کو توڑنے اور تباہ کرنے کیلیے ہر ہتھیار کو استعمال کریں گے"....

.... پھر کسانوں اور مزدوروں کی جاگ سے امیروں کو، راجہ محمود آباد، نواب چھتاری اور سر سکندر جیسے لوگوں کو بہت بڑا خطرہ محسوس ہو رہا ہے - وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ زمانہ پلٹا کھانے کو ہے - دولت اور امیری ہاتھ سے نکلنے کو ہے امیروں کو نیچے آنا ہے - غریبوں کو

اوپر جانا ہے - ان سب باتوں کے ڈر سے ہندو جاتی اور مسلم ملت کے یہ ہندو مسلم نام لیوا

[1] ابھی معلوم ہوا کہ یہ صاحب کانگریس سکریٹریٹ سے الگ کر دیئے گئے (۱۸) لیکن انکی علحدگی کا سبب یہ مضامین اور یہ پالیسی نہیں بلکہ کچھ اور ہے - لہٰذا ان مضامین کی ذمہ داری سے کانگریس سکریٹریٹ [illegible]

اپنے اپنے مذہب کے لوگوں کو سامراج مخالف تحریک سے ہٹا کر رکھنا چاہتے ہیں تاکہ یہ لوگ مل کر آخری لڑائی نہ لڑنے پائیں۔ اس لیے قرآن اور حدیث کی آیتیں اور وید اور شاستر کے اشلوک پڑھے جا رہے ہیں!"

جنگ آزادی کی نوعیت کو اس طرح واضح کرنے کے بعد فاضل مضمون نگار فرماتے ہیں:۔

"مسٹر جناح نے پکار کر کہا ہے "ہندوستان بھر کے مسلمانو ملجاؤ" سوال یہ ہے کہ ہندوستان بھر کا مسلمان آپس میں کیوں ملے؟ اس اتحاد کی ضرورت کیا؟ اس کا مقصد کیا؟ جہاں تک توحید، رسالت، مذہبی معتقدات، اور مذہبی حرکت و عمل کا تعلق ہے وہ آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ بالکل متحد ہیں۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں اور ہم مسٹر جناح کو یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ بھی کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ لیکن سیاسی اور اقتصادی اغراض و مفاد کے لیے مسلمانوں کا آپس میں ملنا ناممکن ہے۔ وہ ہرگز متحد نہیں ہو سکتے اور نہ ان کو متحد ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کے اغراض اور فائدے بالکل ایک سے نہیں ہیں"

"ہندوستان میں امیر اور غریب کے دو طبقے ہیں۔ امیروں کی غرض یہ ہے کہ امیری کے جتنے بھی وسائل ہیں ان پر ان لوگوں کا قبضہ رہے اور غریبوں کی محنت سے وہ فائدہ اٹھاتے رہیں۔ غریبوں کا فائدہ اس میں ہے کہ امیری کے یہ وسیلے ان کے ہاتھ سے چھن جائیں اور ان کا انتظام اس طرح ہو کہ ملک سے غربت دور ہو۔ غربت کو دور کرنے کا سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ دولت کے ان محدود بیلوں کو ان کے چنگل سے نکال لیا جائے، شخصی ملکیت کو ختم کیا جائے . . . . . یہ عام اور اصولی بات ہے۔ اب ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کا فائدہ کیا ہے؟ مسلمانوں میں بھی کچھ امیر ہیں اور کچھ غریب، سب کی ایک ہی حالت نہیں ہے۔ مسلمانوں کے تھوڑے سے لوگ امیر ہیں۔ جو شاید زیادہ سے زیادہ

ایک کروڑ ہوں گے۔ سات کروڑ مسلمان محنت سے روٹی حاصل کرتے ہیں۔۔۔۔۔ جب تک پونجی شاہی دولت کی پیداوار اور تقسیم کے طریقوں کو ہم متذکرہ بالا انقلابات سے غارت نہیں کرتے ان کے روزگار کا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔۔ اس کے خلاف وہ ایک کروڑ مسلمان بھی ہیں جنکے پاس زمین، جائداد، کارخانے اور دکان ہیں۔ ان کی جیبوں میں بڑی بڑی سرکاری ملازمتیں ہیں۔ وہ سکھ اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور مزے اڑاتے ہیں۔ اب ان سات کروڑ غریب مسلمانوں کو ایک کروڑ امیر مسلمانوں سے ملنے کیلئے کہا جاتا ہے"

"خیر تو عام مسلمانوں کے حقوق اور مفاد عام ہندوؤں سے جدا نہیں ہیں۔ خود مسلم ملت کے حقوق و مفاد باہم دگر متضاد اور مختلف ہیں ان میں کوئی یگانگت نہیں۔۔۔ ۔۔۔ مختصر یہ کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھی ہمارے مفاد آپس ہی میں بالکل مختلف ہیں"

یہی منظر صاحب اپنے ایک دوسرے مضمون میں (مدنیہ مورخہ ۱۳ دسمبر ۳۸ء) فرماتے ہیں:۔

"غریبوں مفلسوں اور غلاموں کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں۔ اس کا سب سے بڑا مذہب روٹی کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس کا سب سے بڑا تمدن ایک پھٹا پرانا کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ایمان موجودہ افلاس اور نکبت سے چھٹکارا پا لینا ہے۔ وہی روٹی اور کپڑا جس کے لئے وہ چوری تک کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آج افلاس اور غلامی کی دنیا میں اس کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں۔۔۔۔۔ اس پیٹ کیلئے اسے انقلاب اور کرانتی کرنی پڑیگی"

چند اور فقرے اسی مضمون کے ملاحظہ ہوں:۔

"اس وقت ہندوستان میں دو ہی سوال اس اعتبار سے ہیں۔ سرمایہ داری استحصال اور غلامی یا ترقی، اشتراکیت اور آزادی۔ بیچ کی کوئی راہ نہیں۔ ہمارا کوئی درمیانی مسلک نہیں ہو سکتا"

"اسی ردعمل کا نتیجہ روس کی نئی حکومت ہے جو زمین پر ایک جنت ہے۔ وہاں بے روزگاری

بھوک، جہالت اور تنگ دستی کا نام نہیں۔"

"مذہب اور عقائد کو ان باتوں سے کیا خطرہ؟ کیا تعلق؟ مذہب تو ہمیشہ اگر اس میں اخلاقی اور روحانی طاقت رہی ہے، زندہ، تابندہ اور پائندہ ہی رہا ہے۔ مذہب کی سب سے بڑی قبر ہمارے فقیہوں اور محدثوں کو ہو سکتی ہے، نہ کہ عیاش رئیسوں کو۔ سو ہمارے فقیہہ اور محدث اور علماء آج ہی نہیں بلکہ اسی وقت سے، جب سے قومی تحریک کی شروعات ہوئی ہے، ہمارے ساتھ رہے ہیں۔ لیکن آج ہمارا نصب العین مذہبی نہیں ہے، بلکہ محض اقتصادی اور سیاسی ہے۔ ہمیں تو آج کے حالات میں رہ کر، آج کے حالات سے اپنی قیادت قائم کرنی ہے۔ علماء کا ایک طبقہ ایک ہی چیز کو حرام قرار دیتا ہے اور دوسرا حلال۔ آج انہی کا ایک طبقہ تحریک کو شجر ممنوعہ سمجھتا ہے اور دوسرا خیر و برکت کا مجموعہ۔ اور پھر اس کا کیا یقین ہے کہ جب ہم ایک نئی سماج اور نئے نظام معاش کی تاسیس کرنے لگیں گے، جب ہم شخصی ملکیت کو خارج اور ختم کر کے ملک کی دولت اور اس کی پیداوار کو نئے طریقوں پر تقسیم کرنے لگیں گے تو اس وقت بھی یہ طبقہ ہمارے ساتھ ہوگا۔"[۱]

۱۳ دسمبر ۳۷ء ہی کے "مدینہ" میں پنجاب پراونشل مسلم ماس کانٹیکٹ کمیٹی کے سکریٹری منشی احمد دین صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

"ہم تو دیانتداری کے ساتھ یہ سمجھ چکے ہیں کہ ہندوستان کے آنے والے انقلاب میں جو جنگ آزادی لڑی جائیگی وہ محنت (اور سرمایہ، غریب اور امیر، بالفاظ دیگر ظالم اور مظلوم کی جنگ ہوگی، جس میں ہندو اور مسلمان مظلوم ایک طرف ہونگے۔ گویا اس لڑائی میں ہندو اور مسلمان عوام دونوں برابر ہونگے...... لہذا فرقہ وارانہ جنگ

[۱] خط کشیدہ فقرے علمائے کرام کیلیے خاص طور پر غور کے لائق ہیں۔

طبقہ وارانہ جنگ میں تبدیل ہوگئی"۔

ان طویل اقتباسات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آزادی کی فوج کے مسلمان سپاہی کس وفاداری کے ساتھ اُس مشن کو مسلمانوں میں پھیلا رہے ہیں جو انکے غیر مسلم لیڈروں نے ان کے سپرد کیا ہے۔

حصول آزادی کا طریقہ

پچھلے دونوں ابواب پر تبصرہ کرنے سے پہلے میں ناظرین کو ان تنقیحات کی طرف دوبارہ توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں جو میں نے اس سلسلہ کے تمہیدی مباحث میں قائم کی تھیں۔ ان تنقیحات میں سے اولین تنقیح یہ تھی کہ:

"ہمیں کسی جنگ آزادی میں شریک ہونے سے پہلے یہ دریافت کرنا چاہیے کہ آزادی حاصل کرنے کیلیے طریقہ کونسا اختیار کیا جارہا ہے۔ اگر تحقیق سے معلوم ہو کہ حصول آزادی کا وہ طریقہ اختیار کیا جارہا ہے جو ہماری تہذیب اور ہمارے نظام اجتماعی کے اصولوں سے متصادم ہوتا ہو، تو ہم اس کے ساتھ تعاون نہیں کرسکتے۔"

اس تنقیح کو پیش نظر رکھ کر دیکھیے کہ کانگریس کے مسلم اور غیر مسلم لیڈروں اور کارکنوں کی جو تحریریں پچھلے دو ابواب میں نقل کی گئی ہیں ان سے حصول آزادی کے کس راستے کا نشان ملتا ہے۔

ان کے نزدیک ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے ضروری ہے کہ اس ملک کی تمام قومیتوں اور قومی امتیازات کو مٹا کر پوری آبادی کو ایک قوم بنا دیا جائے۔

اس غرض کے لیے وہ سب سے پہلے اسلامی قومیت پر حملہ کرتے ہیں کیونکہ جب تک مسلمانوں کے ذہن میں یہ خیال موجود ہے کہ پیروان اسلام ایک قوم ہیں اور منکرین اسلام دوسری قوم، اس وقت تک آٹھ کروڑ کی اس عظیم الشان آبادی کا ہندوستانی قومیت میں تحلیل ہوجانا محال ہے۔ اسی لیے تمام قوم پرست یک زبان ہوکر کہتے ہیں کہ "مسلمان" کسی قوم کا نام نہیں ہے، اور اسی لیے انکی

تعلیم یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے آپ کو "مسلم" کہنے کے بجائے "ہندی" کہیں۔

ان کا دوسرا حملہ اسلامی تہذیب و تمدن پر ہے۔ ہندوستان کی آبادی ایک قوم نہیں بن سکتی جب تک کہ سب ایک تہذیب اور ایک تمدن نہ اختیار کرلیں۔ عقائد، جذبات و احساسات، لباس، طرز زندگی، زبان، ادب، اور قوانین معاشرت و تمدن کے لحاظ سے جب تک مسلمانوں میں یکجہتی باقی ہے اس وقت تک بہرحال وہ اپنے آپ کو ایک قوم ہی سمجھتے رہینگے، اور جب تک ان امور میں وہ ہندوستان کے دوسرے باشندوں سے مختلف ہیں، اس وقت تک بہرحال ان کا قومی تشخص دوسروں سے الگ ہی رہیگا۔ اس علیحدگی کو مٹانے کیلئے مسلمانوں میں پورے زور شور کے ساتھ یہ تبلیغ کی جارہی ہے کہ ان کی نہ کوئی خاص تہذیب ہے اور نہ کوئی مخصوص تمدن "زمانے کے شدید انقلاب انگیز تقاضوں" سے جو تہذیب پیدا ہورہی ہے، اور ہندوستان کے دوسرے باشندوں میں جو تمدن نشو ونما پارہا ہے، اسے انکو بے تکلف قبول کرنا چاہیے تاکہ وہ سب کے ساتھ ہم رنگ ہوجائیں۔

ان کا تیسرا حملہ اسلام کے نظام اجتماعی پر ہے۔ مسلمانوں میں اشتراکیت کی تبلیغ جو کی جارہی ہے اس کا مقصد دراصل یہی ہے کہ صرف اسی ذریعہ سے اسلامی سوسائٹی کے نظام کو پارہ پارہ کیا جاسکتا ہے، اور مسلمانوں کی جماعت کے افراد کو ایک دوسرے سے الگ کرکے فرداً فرداً غیر مسلم آبادی میں جذب کرنے کے لیے اسکے سوا کوئی دوسری تدبیر نہیں ہے۔ کانگریس کے متعلق یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوچکی ہے کہ اس کا نصب العین اشتراکی نہیں ہے۔ نہ وہ سرمایہ داروں سے بگاڑنا چاہتی ہے، نہ سرمایہ داری نظام کو ختم کرنا چاہتی ہے، نہ اس سماجی و تمدنی انقلاب کی حامی ہے جس کا ذکر جواہر لال اور سوباش چندر بوس بار بار کیا کرتے ہیں۔ ہری پورہ کانگریس میں جواہر لال کے سامنے اور سوباش چندر بوس کی صدارت

میں سردار ولبھ بھائی پٹیل نے سوشلسٹ جماعت کو بری طرح ڈانٹا تھا اور یہ الفاظ کہے تھے کہ:

"تم کانگریس میں دست راست اور دستِ چپ کی جماعتیں پیدا کرنے کے ذمہ دار ہو حالانکہ کانگریس ہمیشہ سے ایک وحدت رہی ہے ..... ہم برابر دو سال سے تمہارے وجود کو برداشت کر رہے ہیں، مگر وہ وقت آرہا ہے جب ہم تمہیں برداشت نہ کر سکینگے۔"

(ٹائمز آف انڈیا۔ مورخہ ۲۲ر فروری ۳۸ء)

اس زجر و توبیخ پر ہندوستانی اشتراکیت کے ان دونوں اقنوموں میں سے ایک نے بھی دم نہ مارا۔ کانپور، احمد آباد اور دوسرے مقامات پر مزدوروں کا سرخود کانگریسی وزارتیں ہی کچلتی رہی ہیں۔ مدراس اور صوبۂ سرحد اور دوسرے صوبوں میں جہاں کہیں اشتراکیوں نے چادر سے پاؤں نکالا، وہاں کانگریسی حکومتوں ہی نے ان کی سرکوبی کی ہے۔ ابھی چند ہی روز ہوئے ہیں کہ حکومت مدراس نے اشتراکیت کی تبلیغ کے خلاف ایک کمیونک شائع کیا ہے جس میں وہ لکھتی ہے کہ:

"چند پمفلٹ جو ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے شائع کیے جارہے ہیں، حال میں حکومت کے ہاتھ آئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پارٹی حد سے گذرتی جارہی ہے اور اس ملک میں ابتری پھیلانا چاہتی ہے، اسلیے حکومت اپنا فرض سمجھتی ہے کہ پبلک کو ان سے متنبہ کردے تاکہ عام باشندگان ملک نادانستگی میں ایسی تحریک سے متأثر نہ ہوجائیں جس کا فلسفہ اور طریق کار بالکلیہ اس ملک کی تہذیب اور روایات کے خلاف ہے"

اس کے بعد اس کمیونک میں اشتراکی پمفلٹوں کا خلاصہ دیا گیا ہے جس کے یہ الفاظ خاص طور پر غور طلب ہیں:۔

"محنت کش طبقوں کی انقلابی فوج، یعنی ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی اس ملک میں طبقہ

وارانہ جنگ برپا کریگی اور قومی انقلابی ہڑتال کا اعلان کریگی - کاریگر اپنے اوزار رکھ دینگے - دماغی کام کرنے والے دفتروں سے نکل آئینگے - طلبہ مدرسوں سے سڑکوں پر آجائینگے - کسان مالگذاری اور لگان دینے سے انکار کر دینگے - ریلیں کھڑی ہو جائینگی - کارخانے اور مل اور بجلی گھر بند ہو جائینگے . . . . . . " (ملاحظہ ہو اخبار رہبر دکن - مورخہ ۲۰ راگست ۳۸ء)

یہ ٹھیک وہی خیالات ہیں جو کانگریس سکرٹریٹ کے دفتر سے منظر رضوی صاحب شائع کر چکے ہیں - مگر یہ عجیب بات ہے کہ جب یہ خیالات مسلمانوں میں پھیلائے جاتے ہیں تو ان کو جائز رکھا جاتا ہے ، اور جب حقیقت میں ملک کے اندر اشتراکی انقلاب برپا کرنے کیلیے ان کی اشاعت کی جاتی ہے تو کانگریسی حکومت ان کو ہندوستان کی تہذیب اور روایات کے منافی قرار دیتی ہے اور ان کے خلاف تنبیہی کیونکہ نشر کرنا ضروری سمجھتی ہے - اس سے صاف ظاہر ہے کہ اشتراکیت فی الواقع کانگریس کی سرکاری پالیسی نہیں ہے ، بلکہ خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں میں اس مسلک کو صرف اس غرض سے پھیلایا جا رہا ہے کہ اسلامی سوسائٹی کو درہم برہم کرنے کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں - حال میں بنگال کے کانگریسی مسلمانوں کا ایک اجتماع بابو سوباش چندر بوس کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا - زیر بحث یہ سوال تھا کہ عامۂ مسلمین میں کانگریس کے خیالات اور اصول کامیابی کے ساتھ کس طرح پھیلائے جا سکتے ہیں ، اور جو مشکلات اس راہ میں حائل ہیں ، ان کا حل کیا ہے - طویل بحث و تحیص کے بعد جو بات بالاتفاق طے ہوئی وہ یہ تھی کہ :

" مسلمانوں میں کانگریس کو مقبول بنانے کیلیے ایک معاشی پروگرام کو پیش کرنا ، ناگزیر ہے اور پروگرام ایسا ہونا چاہیے جو محنت پیشہ عوام کو اپیل کر سکے " (نیشنل کال - مورخہ ۱۳ راگست ۳۸ء)

" معاشی پروگرام " کے لفظ کو خاص طور پر نوٹ کیجیے - اس چھوٹے سے مرکب لفظ میں وہ تمام معانی بھرے ہوئے ہیں جنکی تشریح آپ پنڈت جواہر لال نہرو اور منظر رضوی اور کامریڈ احمد دین صاحبان کی زبانوں سے

سُن چکے ہیں - یہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ عام مسلمان خواہ کتنے ہی جاہل ہوں، مگر پھر بھی انہیں اسلام سے گہری محبت و عقیدت ہے، اور کوئی شخص اپنی جان کو خطرے میں ڈالے بغیر ان سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم اسلام چھوڑ دو۔ اسلیے ان میں علانیہ الحاد و بے دینی کی تبلیغ کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ البتہ اگر اُن کے سامنے "روٹی" پیش کی جائے، اور اس میں بے دینی کو لپیٹ کر رکھ دیا جائے تو یہ بھوک کے مارے ہوئے غریب لوگ لپک کر اسے لے لینگے اور بے تکلف حلق کے نیچے اتار جائینگے۔ ادہر سے مطمئن ہو جانے کے بعد پھر وہ ہر زہر کو خوشی سے ہضم کر سکتے ہیں۔

یہی کچھ سمجھ کر یہ لوگ خستہ حال مسلمانوں کے دلوں پر قبضہ کرنے کیلیے پیٹ کی طرف سے راستہ پیدا کر رہے ہیں جو بھوکے آدمی کے جسم کا سب سے زیادہ نازک حصہ ہوتا ہے۔ یہ ان سے کہتے ہیں کہ آؤ ہم وہ طریقہ بتائیں، جس سے امیری اور غریبی مرتی ہے اور آسودہ حالی آتی ہے۔" پھر جب بیچارا بھوکا مسلمان دو روٹیوں کی امید پر انکی طرف دوڑتا ہے تو یہ اسے خدا پرستی کے بجائے شکم پرستی کے مذہب کی تلقین کرتے ہیں، اور اس سے کہتے ہیں کہ "غریب اور مفلس کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں۔ اس کا سب سے بڑا مذہب روٹی کا ایک ٹکڑا ہے۔ اسکا سب سے بڑا تمدن ایک پھٹا پرانا کرتہ ہے۔ اسکا سب سے بڑا ایمان اس موجودہ افلاس اور نکبت سے چھٹکارا پا لینا ہے"۔ مذہب اشتراکیت کا یہ ابتدائی سبق جب آن اس بے چارے جاہل مسلمان کو دیا جاتا ہے، اسی آن اسے یہ پٹی بھی پڑھائی جاتی ہے کہ "مذہب اور عقائد کو ان باتوں سے کیا خطرہ؟ کیا تعلق؟ مذہب تو ہمیشہ، اگر اس میں اخلاقی اور روحانی طاقت رہی ہے، زندہ تابندہ اور پائندہ ہی رہا ہے"۔ اور پھر مزید ضمانت کے طور پر اس سے یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ بھائی "مذہب کی سب سے بڑی فکر تو فقیہوں اور محدثوں ہی کو ہو سکتی ہے سو دیکھ لو کہ یہ فقیہ اور محدث اور علماء ہمارے ساتھ ہیں"

روٹی کو دین اور روٹی ہی کو ایمان قرار دینے کے بعد یہ آگے بڑھتے ہیں اور ان پڑھ مفلس

مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ دیکھو میاں! تمہارے اصلی بھائی وہ غیر مسلم عوام ہیں جو تمہاری ہی طرح بھوک اور افلاس میں مبتلا ہیں۔ تمہیں جو کچھ ملیگا انہی کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے سے ملیگا۔ اور تمہارے اصلی دشمن وہ مسلمان ہیں جو کسی زمین یا مکان یا کارخانے کے مالک ہیں یا جن کے پاس تم سے زیادہ وسائل معیشت موجود ہیں۔ تمہیں جو کچھ مل سکتا ہے، انہی سے لڑ کر مل سکتا ہے۔ پس آؤ اپنے غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے ان مسلمان دشمنوں سے لڑو۔

اس تبلیغ کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اسکا پہلا نتیجہ یہ ہوگا کہ جوں جوں یہ خیالات عام مسلمانوں کے دلوں میں گھر کرینگے، اسلامی سوسائٹی پارہ پارہ ہوتی چلی جائیگی۔ اسلام میں سوسائٹی کا نظام دین کی وحدت پر قائم ہے۔ تمام وہ لوگ جو توحید اور رسالت محمدی کے قائل ہیں، ایک ہی ہیئت اجتماعی میں شامل ہو جاتے ہیں خواہ ان میں سے ایک عثمان غنیؓ کی طرح سرمایہ دار ہو اور دوسرا ابوذر غفاریؓ کی طرح قلاش۔ (رضی اللہ عنہما)۔ اسی دینی وحدت کی بنا پر ان میں نماز کی جماعت سے لیکر شادی بیاہ تک ہر قسم کے معاشرتی اور تمدنی تعلقات قائم ہوتے ہیں، اور انہی تعلقات سے یہ سب مل کر ایک سوسائٹی بناتے ہیں۔ اس کے برعکس اشتراکی تبلیغ ان کو معاشی حیثیت سے الگ الگ طبقوں میں تقسیم کرتی ہے، اور ان کو یہ سکھاتی ہے کہ ایک معاشی طبقہ کا مسلمان دوسرے معاشی طبقہ کے مسلمان سے لڑے اور اس کو اپنا دشمن سمجھے۔ ظاہر ہے کہ اسکے بعد یہ ایک سوسائٹی کے ممبر نہیں رہ سکتے۔ طبقہ وارانہ جنگ ان کے درمیان صرف معاشرتی تعلقات ہی کو منقطع نہ کردیگی بلکہ خالص دینی حرکت و عمل میں بھی ان کا آپس میں ملنا غیر ممکن ہو جائیگا۔ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ جنکے درمیان روٹی کی جنگ چھڑ گئی ہو وہ ایک دوسرے کیساتھ مسجدوں میں جمع ہوں، یا وہ مالدار مسلمان اپنے اس غریب مسلمان بھائی کو زکوٰۃ دے جسکے متعلق اسے یقین ہے کہ وہ اسکا گھر لوٹنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ اسیطرح یہ بھی ناممکن ہے کہ جو لوگ معاشی اغراض کیلیے ایک دوسرے کے دشمن بن چکے ہوں اور جنکے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف بغض و حسد کی آگ بھڑک چکی ہو وہ ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھیں، اور اسکے

درمیان انما المومنون اخوۃ کا رشتہ قائم رہ جائے۔

اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کے عوام مذہب سے قطعی بیگانہ ہوتے چلے جائینگے۔ معاشی طبقات کی جنگ عامہ مسلمین کو صرف بڑے تعلقہ داروں اور جاگیرداروں اور لکھ پتیوں ہی سے الگ کریگی، بلکہ متوسط طبقہ کے ان تمام مسلمانوں سے کاٹ دیگی جو نسبتہً خوشحال ہیں۔ منظر رضوی صاحب کے اپنے اندازے کے مطابق متوسط طبقہ کے مسلمان تقریباً ایک کروڑ ہیں اور عام مفلس مسلمان سات کروڑ۔ طبقہ واری جنگ کے معنی ان ایک کروڑ مسلمانوں سے سات کروڑ مسلمانوں کے برسرپیکار ہوجانے کے ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اپنے دین کا علم، اپنی تہذیب کا شعور، احکام شرعیہ کی واقفیت، جو کچھ بھی ہے، اسی تعلیم یافتہ متوسط طبقہ ہی میں پائی جاتی ہے۔ یہی طبقہ اس ملک میں اسلامی تہذیب کو کسی نہ کسی حد تک سنبھالے ہوئے ہے۔ عوام انہی سے دین سیکھتے ہیں، انہی سے احکام معلوم کرتے ہیں، اور انہی کے اثر سے تھوڑے یا بہت اسلامی نظام تہذیب و تمدن کی گرفت میں رہتے ہیں۔ جب طبقہ واری جنگ کی بدولت سات کروڑ عام مسلمان ان ایک کروڑ متوسط طبقہ کے مسلمانوں سے کٹ کر الگ ہوجائینگے تو وہ اسلام سے بالکل بیگانہ ہوکر رہ جائینگے۔ خود ان کے پاس کوئی علم نہ ہوگا۔ اور جب متوسط طبقہ کے لوگ ان کو دین کے احکام سنائینگے تو اشتراکیت کا مبلغ فوراً پکار کر ان سے کہیگا کہ ہوشیار! پھر وہی مذہب کی افیون تمہیں کھلائی جارہی ہے، اور پھر اسی "منظم مذہب" کے پھندے میں تم کو پھانسا جارہا ہے جو اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانیکا قائم شدہ حقوق اور مستقل اغراض رکھنے والوں کا حمایتی ہے۔"

اس کا آخری اور فیصلہ کن نتیجہ یہ ہوگا کہ عامہ مسلمین جب اسلامی قومیت کے تخیل سے خالی الذہن ہوکر فرد فرد بن جائینگے، اور جب وہ اسلامی تہذیب و تمدن کو ایک لفظِ بے معنی سمجھ کر

اس غیر اسلامی تہذیب و تمدن کو قبول کرتے چلے جائینگے جو "زمانے کے شدید انقلاب انگیز تقاضوں" سے پیدا ہو رہا ہے، اور جب تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کے مسلمانوں سے کٹ کر وہ اپنے معاشی طبقہ کے غیر مسلموں میں جا ملینگے، تو خود بخود ان کی شدھی ہو جائیگی اور وہ آہستہ آہستہ غیر اسلامی قومیت میں اس طرح جذب ہو جائینگے جیسے نمک کی ڈلی پانی میں گھل گھل کر آخر کار غائب ہو جاتی ہے۔ رہے متوسط طبقہ کے مٹھی بھر مسلمان جو اسلام کے خلاف کسی سماجی اور معاشی نظام کو قبول کرنے سے انکار کرینگے تو ان کے حق میں پنڈت جواہر لال نے پہلے ہی فیصلہ کر دیا ہے کہ "جو سیاسی یا تمدنی ادارے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہوں انہیں مٹا دینا چاہیے" اور یہ کہ "اگر اکثریت نظام تمدن کو بدلنے کی خواہشمند ہو تو ضروری نہیں کہ اقلیت کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کی جائے بلکہ اس پر موثر دباؤ ڈالنا چاہیے اور جبر و تشدد سے کام لینا چاہیے" اور یہ کہ "جمہوری حکومت کے معنی ہی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھے"۔

یہ ہے وہ راستہ جو آزادی حاصل کرنے کیلیے قوم پرستوں نے تجویز کیا ہے اور جس پر وہ عملاً چل رہے ہیں۔ ان کے نزدیک آزادی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ملک کی پوری آبادی کو ایک قوم نہ بنا دیا جائے، اور ملک کی پوری آبادی کو ایک قوم نہیں بنایا جا سکتا جب تک کہ مسلمان قوم کا وجود کلیتہً ہندوستانی قومیت میں تحلیل نہ ہو جائے۔ لامحالہ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ حصول آزادی کے اس طریقہ کو اختیار کرنے سے مسلمان قوم پہلے ختم ہو گی اور آزادی اسکے بعد حاصل ہو گی۔ اب میں علمائے دین اور مفتیان امت سے اور ہر اس مسلمان سے جو اسلام اور قوم پرستی کا بیک وقت دم بھرتا ہے، دریافت کرتا ہوں کہ کیا اسلام اور یہ قوم پرستی صریحاً ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں؟ اور کیا اس طریقہ سے آزادی حاصل کرنا قرآن، حدیث،

عقل غرض کسی چیز کی رو سے بھی مسلمانوں کا فرض ہے بلکہ فرض کیا معنی، میں پوچھتا ہوں کہ آزادی کیلیے قومی خودکشی کا یہ طریقہ اختیار کرنا کسی مسلمان کے لیے جائز بھی ہے؟ اور کیا اس طریقے سے آزادی کی جنگ لڑنے والوں کیساتھ موالات کرنا صریح تعلیمات قرآنی کے خلاف نہیں ہے؟

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ یہ تحریک قطعی طور پر "شدھی" کی تحریک ہے۔ اس میں اور شردھانند والی شدھی میں حقیقت اور نتیجہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ مسلمان جب اسلام سے منحرف اور جماعت اسلامی سے خارج ہو گیا تو خواہ وہ ہندو مت میں جائے یا بے مت ہو جائے، دونوں صورتیں یکساں ہیں۔ البتہ دونوں شدھیوں میں فرق صرف یہ ہے کہ ایک کھلی ہوئی شدھی تھی، اور دوسری دام ہمرنگ زمین کا حکم رکھتی ہے۔ اُس کے ساتھ کوئی مسلمان تعاون کا نام بھی نہ لے سکتا تھا، اور اِسکی فوج میں فقیہ اور محدث اور مفسر تک گرم عمل نظر آرہے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ تحریک اپنی پیشرو تحریک سے ہزار درجہ زیادہ خطرناک ہے۔

پھر جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اس طریقہ سے جو آزادی حاصل ہو گی وہ ان آٹھ کروڑ یا سات کروڑ جسموں کیلیے تو آزادی ہو سکتی ہے جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں، مگر اُس قوم کیلیے آزادی نہیں ہو سکتی جو "مسلمان" ہے۔ مسلمانوں کیلیے مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ آزادی نہ ہو گی بلکہ انکی قومیت، انکی تہذیب اور ان کے نظام اجتماعی کی کامل بربادی اور اس کام کی تکمیل ہو گی جسکو انگریزی امپیریلزم نے ڈیڑھ سو برس پہلے شروع کیا تھا۔ حقیقت میں یہ ایک ایسا حربہ ہے جو انگریزی سلطنت سے پہلے اسلام پر حملہ کرتا ہے اور اُس سے پہلے اس کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ میں تصور نہیں کر سکتا کہ کوئی صاحب عقل مسلمان جو مسلمان رہنا چاہتا ہو اس حربے کو خود اپنے دین اور اپنی قوم پر چلانے میں کس طرح حصہ لے سکتا ہے۔

طرفہ ماجرا یہ ہے کہ وہی جواہر لال اور وہی ان کے قوم پرست ساتھی جنہوں نے حصول

آزادی کے اس طریقہ کو کھلم کھلا اختیار کیا ہے، ہم مسلمانوں کو آزادی کی مخالفت اور سامراج پرستی کا طعنہ بھی دے رہے ہیں کیونکہ ہم اپنی قبر کھودنے میں ان کا ہاتھ بٹانے سے انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت آزادی کے دشمن اور سامراج پرستی کے مجرم وہ خود ہیں۔ انہوں نے خود ہی آزادی حاصل کرنے اور سامراج سے لڑنے کا وہ طریقہ اختیار کیا ہے جسکو ہندوستان کی ۱/۴ آبادی کسی طرح قبول کر ہی نہیں سکتی۔ اس غلط اور احمقانہ طریقہ سے وہ خود ملک کی آزادی کو دور پھینک رہے ہیں، اور سامراج کی مدد کر رہے ہیں، اور پھر طعنہ ہم کو دیتے ہیں کہ تم آزادی کی جنگ سے الگ رہ کر برطانوی سامراج کو مدد دے رہے ہو! اگر ان کے پاس عقل ہے تو انہیں سمجھنا چاہیے کہ کوئی جماعت اپنے جماعتی وجود کو فنا کرنے کیلیے آزادی نہیں چاہا کرتی اور نہیں چاہ سکتی۔ آزادی کی ضرورت قومی زندگی کیلیے ہوتی ہے نہ کہ قومی موت کیلیے، لہذا آزادی کی خاطر ہر چیز قربان کی جاسکتی ہے مگر قومی زندگی قربان نہیں کی جاسکتی۔ تم جب کسی قوم کے سامنے آزادی کا وہ راستہ پیش کرتے ہو جس میں اسکی قومیت کی موت ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم خود ہی اسکو مجبور کر رہے ہو کہ وہ تمہاری تحریک آزادی سے لڑے۔ اس کا یہ لڑنا عین مقتضائے فطرت ہے۔ خواہ دنیا کی کوئی قوم بھی ہو، ایسی حالت میں بہرحال لڑیگی، اور اگر اس لڑنے کا یہ نتیجہ ہو کہ بیرونی اقتدار کو اس سے فائدہ پہنچے تو اسکی کچھ پروا نہ کریگی، اسلیے کہ بیرونی اقتدار کا نقصان بھی زیادہ سے زیادہ وہی ہو سکتا ہے جو اس نام نہاد تحریک آزادی کا ہے، یعنی اسکی قومیت کی موت۔ پھر ایک موت اور دوسری موت میں آخر وجہ ترجیح کیا ہے؟

جنگ آزادی کا مطمح نظر

اب ہمیں اپنی دوسری تنقیح کی طرف توجہ کرنی چاہیے، اور وہ یہ ہے کہ جس آزادی کیلیے یہ قوم پرست حضرات لڑ رہے ہیں اسکی نوعیت کیا ہے، اور کیا مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس نوعیت کی آزادی کسی درجہ میں بھی ہمارے لیے مطلوب یا مفید ہو سکتی ہے؟ اس تنقیح کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرینگے۔ ایک یہ کہ اس جنگ آزادی کا مطمح نظر کیا ہے؟ یعنی موجودہ حکومت کو ہٹا کر یہ کس قسم کی حکومت کن اصولوں پر قائم کرنا چاہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ خود اس جنگ آزادی کی نوعیت کیا ہے؟ یعنی یہ انقلابی ذرائع سے کامل انقلاب چاہتی ہے یا نیم انقلابی نیم دستوری ذرائع سے بتدریج ایک نظام حکومت کو گرانا اور دوسرا نظام حکومت تعمیر کرنا چاہتی ہے؟ پہلے حصہ کو ہم مقدم رکھینگے اور دوسرے حصہ سے اخیر میں بحث کرینگے۔

جو لوگ اس وقت آزادی وطن کے علمبردار بنے ہوئے ہیں ان کے مطمح نظر کو سمجھنے کیلیے تمہید کے طور پر ایک مختصر تاریخی بیان ضروری ہے تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ ان کے تخیلات کا اصلی ماخذ اور ان کے جذبات حریت طلبی کا اصلی محرک کیا ہے۔

یہ ہر شخص جانتا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ وطنی تحریک براہ راست انگریزی تعلیم سے پیدا ہوئی ہے۔ مخالف اور موافق دونوں اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ انگریزی حکومت کی قائم کی ہوئی یونیورسٹیوں میں ہندوستانیوں نے تعلیم حاصل کی۔ وہاں یہ تاریخ، سیاسیات، اور معاشیات سے روشناس ہوئے۔ انگریزی زبان کے توسط سے مغربی افکار ان تک پہنچے، اور ان میں آہستہ آہستہ

وہ سیاسی شعور پیدا ہوا جو حکومت خود اختیاری کی خواہش کا مورث ہوا کرتا ہے۔ تقریباً ۵۰ سال تک ان جدید اثرات کے تحت پرورش پانے کے بعد جب ان کے اندر سیاسی اختیارات حاصل کرنے کا جذبہ ابھرنے لگا تو خود ان کے انگریز مربیوں ہی نے اس جذبہ کیلیے خروج کا راستہ پیدا کیا۔ پہلا شخص جسکے دماغ میں "انڈین نیشنل کانگریس" قائم کرنے کا خیال آیا وہ ایک انگریز، مسٹر ہیوم (Hume) تھا۔ ابتداءً اس کے پیش نظر محض ایک ایسی انجمن بنانے کا تصور تھا جس میں ہندوستان کے سیاسی دماغ مجتمع ہو کر تبادلۂ خیالات کیا کریں اور اس طرح حکمرانوں کو اپنے محکوموں کے داعیات سے واقف ہونے کا موقع ملتا رہے۔ اسی غرض کیلیے اسکی تجویز تھی کہ جس صوبہ میں اس انجمن کا اجتماع ہو وہیں کا گورنر اسکی صدارت کرے۔ مگر لارڈ ڈفرن نے، جو اس وقت ہندوستان کا وائسرائے تھا، اسکے خیالات کو بدل کر ایک دوسری راہ پر ڈال دیا۔ اس نے یہ رائے دی کہ:-

"ہندوستان میں ایسی ایک جماعت ہونی چاہیے جسکی حیثیت یہاں وہی ہو جو انگلستان میں حزب الاختلاف (Opposition) کی ہے تاکہ وہ حکومت پر نکتہ چینی کر کے اس کے نقائص کو دور کرتی رہے۔ نیز اس جماعت کو مستقل بالذات ہونا چاہیے۔ گورنر کی صدارت اسکی آزادیٔ رائے میں خلل انداز ہوگی"

انگلستان میں لارڈ رپن، لارڈ ڈلہوزی، سر جیمز کیرڈ (Caird)، جان برائٹ، مسٹر ریڈ، مسٹر سلنگ (Slagg.) اور دوسرے سیاسی مبصرین نے بھی لارڈ ڈفرن کی اس رائے کو پسند کیا، اور اسطرح ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی تاسیس ہوئی۔[1]

سیاسی عمل کی یہ ابتدا جس طرح انگریزی افکار اور انگریزی تدبر کی رہنمائی میں ہوئی اسی طرح مقاصد اور انکے حصول کی صورت کا تعین بھی آپ سے آپ انگریزی اثرات کے تحت، اور انگریزی دستورِ حکومت کے نمونے پر ہوتا رہا۔ کانگریس کو اول یوم پیدائش ہی میں "انڈین نیشنل کانگریس" کے نام

[1] ڈاکٹر پٹابھی سیتارامیا کی تاریخ کانگریس (انگریزی) (۷ ، ۹) صفحہ ۲۳-۲۴

سے موسوم کیا گیا، گویا کہ "انڈین نیشن" کے نام سے کوئی قوم موجود تھی اور یہ اسکی ایک اجتماعی ہیئت (کانگریس) بنائی جا رہی تھی۔ انگریزی تعلیم کے جو اثرات ان لوگوں کے دماغ پر پڑے تھے، ان کا اثر اتنا گہرا تھا کہ انہوں نے ایک ملک کی آبادی کا ایک قوم ہونا بطور ایک بدیہی کلیہ کے تسلیم کر لیا تھا، اور اسکے لیے وہ واقعات کی شہادت کو بھی غیر ضروری سمجھتے تھے۔ کانگریس کے پہلے اجلاس میں جو مقاصد اس جمعیت کیلیے تجویز ہوئے تھے ان میں سے دوسرا مقصد یہ تھا:

"قومی وحدت کے اُن داعیات کا نشوو ارتقاء اور استحکام جو ہمارے محبوب لارڈ رپن کے ہمیشہ یادگار رہنے والے عہد حکومت میں پیدا ہوئے ہیں"[1]

دوسرے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں ہم کو یہ الفاظ ملتے ہیں:

"ایک قومی کانگریس کو ان امور تک اپنے تئیں محدود رکھنا چاہیئے جن میں پوری قوم براہ راست حصہ دار ہو۔ اور اصلاح معاشرت اور دوسرے طبقہ وار مسائل کو طبقات کی کانگریسوں کے لیے چھوڑ دینا چاہیئے"[2]

یہ وطنی قومیت اور واحد قومیت کا تخیل اس تحریک کے مایۂ خمیر کا پہلا عنصر ہے۔ جس طرح ۱۸۸۵ء میں بینرجی اور نوروجی "ہندوستانی قوم" کا ذکر کرتے تھے، اسی طرح آج گاندھی جی اور نہرو جی بھی کرتے ہیں۔ بلکہ وہ محض ذکر کرتے تھے اور یہ اسکو زبردستی مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ گاندھی جی استفہام انکاری کے لہجے میں پوچھتے ہیں کہ "ہندوستان ایک ملک اور ایک قوم ہی یا بہت سے ملک اور بہت سی قومیں؟" اور خود ہی اسکا جواب دیتے ہیں کہ جو لوگ اسکو ایک ملک اور ایک قوم سمجھتے ہیں انہیں اس پر اعتراض نہ ہونا چاہیے اگر مدراس کا وزیر اعظم ایک قوم کیلیے ایک زبان بنانے میں کرمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ کی جابرانہ طاقت استعمال کرے[3]۔ نہرو جی استفہام کی بھی ضرورت

[1] ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیا کی تاریخ کانگریس (انگریزی) صفحہ ۲۷۔

[2] *How India Wrought for Freedom*, by Annie Besant. p 18

[3] "Congressman Beware," by Gandhi, in *The Harijan*, 10—9—38.

نہیں سمجھتے اور قطعی طور پر اعلان کرتے ہیں کہ ہندوستان میں صرف ایک قوم بستی ہے جس کا نام ہندوستانی ہے۔ جدا جدا مستقل قوموں کا یہاں وجود ہی نہیں ہے۔

دوسرا بنیادی تصور جو انگریزی تعلیم اور انگریز مربیوں کی سیاسی تربیت سے اخذ کیا گیا وہ جمہوریت (Democracy) کا تصور تھا۔ جمہوری ادارات کی مختلف صورتیں جو دنیا میں رائج ہیں اور رائج رہی ہیں، ان میں شاید سب سے زیادہ ناقص اور قدامت پرستانہ صورت وہ ہے جو انگلستان میں قائم ہے۔ لیکن ہمارا ہندوستانی وطن پرست چونکہ انگریز کا شاگرد ہے، اسی سے جمہوریت کا نام اس نے سنا ہے، اور اسی کے جمہوری نظام کا نقشہ اس نے دیکھا ہے، اس لیے یہ جب "جمہوریت" کا لفظ بولتا ہے تو اس کے سامنے جمہوری دستور کے وہی اصول اور وہی طریقے ہوتے ہیں جو انگلستان میں رائج ہیں۔ نمایندگی، انتخاب، ذمہ دار حکومت اور دستور سلطنت کی ساری کی ساری تفصیلات کو یہ جوں کا توں انگلستان سے ہندوستان اٹھا لانا چاہتا ہے۔ یہ اس حقیقت کو نہیں جانتا کہ قوموں اور ملکوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ جس قسم کے ادارات ایک ملک کے مناسب حال ہوں، لازم نہیں کہ وہ دوسرے ملک کے قامت پر راست آسکیں۔ قوت تمیز اور اجتہاد فکر کے بغیر محض دوسروں کی نقالی کرنا اصولاً بھی غلط ہے اور عملاً بھی مشکل بلکہ مضرت رساں۔ مگر مختلف اسباب ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو اس حقیقت کے بار بار سامنے لائے جانے پر بھی ہمارے وطن پرستوں کو اسکے ادراک سے روکتے ہیں۔ ایک گروہ غلامانہ ذہنیت اور محدود واقفیت کی بنا پر یہ سمجھتا ہے کہ وہ جمہوری ادارات کا اطلاق صرف انگریزی طرز کے ادارات پر ہی ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے، لہذا اس طرز کی مخالفت کرنا نفس جمہوری ادارات کی مخالفت کرنا ہے۔ دوسرا گروہ انگریزی نمونہ کی جمہوریت کو غلط سمجھتا ہے مگر اس پر شکست خوردہ ذہنیت کا غلبہ ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہی جمہوری نظام جو ہمارے برطانوی آقا اپنے ملک سے لائے ہیں، اور جسکی پشت پر مشین گن کی طاقت ہے، ہندوستان میں رائج

ہونا ہے اور ہو کر رہیگا، لہذا عافیت اسی میں ہے کہ اسکے آگے سپر رکھ دو۔ تیسرا گروہ جو کانگریس کا اصلی کارفرما اور کارکن گروہ ہے، غلامانہ ذہنیت کے ساتھ خود غرضانہ ذہنیت سے بھی ماؤف ہے۔ انگریزی طرز..... جمہوریت کو قبول کرنے میں سراسر اسی کا فائدہ ہے، کیونکہ یہ طرز جمہوریت، اکثریت کو مالک الملک لاشریک لہا بنا دیتا ہے، اور اتفاق سے یہی گروہ یہاں اکثریت میں ہے، لہذا یہ کہتا ہے کہ ہندوستان میں واحد قومیت کی بنیاد پر ایک "ڈیماکریٹک اسٹیٹ" قائم ہونا چاہیے۔ ۱۸۸۵ء سے ۱۹۳۸ء تک ۵۳ سال کی مدت میں کانگریس کے مطالبات کی صورتیں بہت کچھ بدلی ہیں۔ پہلے سرکار سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ ہمارے لیے ایک ایسا دستور حکومت بنا دو جس میں گورنمنٹ اہل ملک کے سامنے جواب دہ ہو۔ اب یہ مطالبہ ہے کہ ہم خود اپنا دستور بنائینگے۔ بظاہر پہلے موقف سے یہ دوسرا موقف بہت آگے بڑھا ہوا ہے، مگر اصولی حیثیت سے "ڈیماکریسی" کا جو تصور ۱۸۸۵ء میں تھا، بعینہ آج بھی وہی ہے، خواہ دستور حکومت سرکار بنائے یا یہ خود بنائیں۔

وطن پرستی کی اس تحریک میں انگریزی آقاؤں کا اثر محض علمی و نظری حیثیت ہی سے نہیں ہے بلکہ تقریباً ۸۰ سال سے جو سیاسی تربیت ہندوستانیوں کو ان کے یہ آقا دے رہے ہیں وہ عملاً بھی انہی اصولوں پر مبنی ہے۔ ۱۸۶۱ء سے ۱۹۳۵ء تک جتنے دستوری تغیرات اس ملک میں ہوئے ہیں، اور نظم و نسق حکومت میں ہندوستانیوں کو شریک کرنے کی جتنی صورتیں اختیار کی گئی ہیں ان سب میں انگریز کی اس فطری کمزوری کا اثر نمایاں نظر آتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے جمہوری ادارات کو آئیڈیل سمجھتا ہے اور اس میں اتنی اجتہادی صلاحیت نہیں ہے کہ مختلف حالات کیلیے مختلف اصول وضع کر سکے۔ اگرچہ ابتدا سے اب تک ہر زمانہ میں انگریز مدبرین نے اس بات کو اصولاً تسلیم کیا ہے کہ ہندوستان انگلستان نہیں ہے، اور یہاں آنکھیں بند کر کے انگریزی طرز کے جمہوری ادارات قائم کرنا درست نہیں، مگر وہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود اپنی فطرت سے مجبور رہیں کہ انکے ذہن میں ہر پھر کر جمہوریت

کے وہی تصورات اور وہی رنگ ڈھنگ آجاتے ہیں جنکے ماحول میں خود انہوں نے پرورش پائی ہے - وہ غیر شعوری طور پر اہل ہند کو ایک قوم فرض کر لیتے ہیں جس طرح اہل انگلستان ایک قوم ہیں - وہ جائز سمجھتے ہیں کہ یہاں ڈیموکریسی کے وہی اصول اختیار کیے جائیں جو واحد قومیت ہی کیلیے موزوں ہو سکتے ہیں - حالات کی رعایت زیادہ سے زیادہ ان کو جس چیز کے لیے آمادہ کر سکتی ہے وہ بس جداگانہ انتخاب ہے ، یعنی یہ کہ ہندوستان کی مختلف قوموں کو ـــــ جنہیں وہ ایک قوم کے مختلف فرقے سمجھتے ہیں ـــــ اپنے ہی منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعہ سے اپنی خواہشات کے اظہار کا موقع مل جائے - مگر کوئی شخص کسی دلیل سے بھی یہ بات انکے دماغ میں نہیں بٹھا سکتا کہ جداگانہ انتخاب اسوقت بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے جب ان مختلف قوموں کے مجموعہ کو ایک قرار دیکر اکثریت کی حکومت کا جمہوری قاعدہ نافذ کر دیا جائے - انہوں نے میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں سے لیکر صوبوں اور مرکز کی قانون ساز مجالس تک جتنے جمہوری ادارے اس ملک میں قائم کیے ان سب میں کثرت رائے کے غلبہ کا اصول یکساں طور پر رائج کر دیا ، اور اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا کہ ہندوستان میں جو قوم کثیر التعداد واقع ہوئی ہے وہ زیادہ اور زیادہ سیاسی طاقت کی مالک ہوتی چلی گئی ، بلکہ اس سے بھی بڑھکر اس کا بدترین نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ کثیر التعداد قوم اس سیاسی غلبہ کو اپنا فطری اور اخلاقی حق سمجھنے لگی اور قلیل التعداد قومیں اس فریب میں مبتلا ہو گئیں کہ جمہوریت کا مفہوم غلبۂ اکثریت کے سوا اور کچھ نہیں لہذا ان کو خود بھی اپنی مغلوبیت پر راضی ہو جانا چاہیے ، کیونکہ انگلستان سے جو چیز آئے اسکے عین حق ہونے میں تو کلام ہی نہیں کیا جا سکتا -

جس ملک میں ذہنی غلامی اس حد تک پہنچ چکی ہو کہ کسی چیز کے بجا و درست ہونے کے لیے محض صاحب بہادر کے قول و فعل کی سند کافی سمجھی جائے ، حتیٰ کہ اگر کسی ریلوے اسٹیشن پر صاحب چائے میں برف ڈال کر پیتے ہوئے دیکھے جائیں تو غلام ہندوستانی گھر پہنچ کر برف زدہ چائے پینے لگے

وہاں یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ صاحب نے جمہوریت کا جو مفہوم بتایا ہے اسکے درست ہونے میں شک کیا جائیگا۔ یہاں آزادی کے مدعی ایک سے ایک بڑھ کر موجود ہیں، مگر دماغوں کی غلامی ان سب کا مشترک سرمایہ ہے۔ جو لوگ یہاں آزاد خیالوں کے سرتاج سمجھے جاتے ہیں انکی غلام فطرتی بھی یہاں تک بڑھی ہوئی ہے کہ جب تک ایک وزیر ہند (لارڈ آلیوبیرم) نے جداگانہ انتخاب کو جمہوریت و قومیت کے منافی نہ قرار دیا تھا اس وقت تک یہ غریب اس حقیقت سے بالکل ناواقف تھے کہ واقعی یہ چیز اس درجہ منافی قومیت و جمہوریت ہے۔ اور جب یہ بات صاحب کی زبان سے سن لی گئی تو ڈاکٹر مونجے سے لیکر پنڈت جواہر لال تک ہر ایک اس زعم کیساتھ اسکا اعلان کرنے لگا کہ جس قول کو سرکار دولتمدار کی سند حاصل ہے اسکے برحق ہونے میں کس کو کلام کی جرأت ہوسکتی ہے! پھر جو صاحب یہاں آزاد خیالوں کے امام ہیں ان کا حال بھی یہ ہے کہ سرکار کے قائم کیے ہوئے جمہوری ادارات کو وہ جمہوریت کی ایک ہی فطری و برحق صورت سمجھتے ہیں، اور ان ادارات کے اصول سے اختلاف کرنا انکے نزدیک سیاسی اصلاح و ترقی کی مخالفت کرنا ہے، کیونکہ سیاسی اصلاح و ترقی کی صراط مستقیم ایک ہی ہے جسکی طرف غلاموں کے ہادی برحق ——— صاحب بہادر ——— نے انکی رہنمائی کی ہے اور وہ بس یہ ہے کہ مختلف قوموں کو ایک مجموعہ قرار دیکر اس میں غلبۂ اکثریت کا جمہوری اصول نافذ کردیا جائے۔ صاحب کے دیے ہوئے اس علم پر غلام دماغوں کا یقین و اذعان اور انشراح و اطمینان اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ ریاضی کے اصول موضوعہ کی طرح اسے بیان کرتے ہیں اور اپنی ذہنی غلامی کے راز کو چھپانے کی بھی کوشش نہیں کرتے اسلیے کہ انہیں اپنی ذہنی غلامی کا احساس تک نہیں رہا ہے۔

قومیت اور جمہوریت کے ساتھ ایک تیسرا اساسی تخیل بھی ہے جو انہوں نے صاحب کی تعلیم و تربیت سے حاصل کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسٹیٹ کو دنیوی (Secular) یعنی غیر دینی ہونا چاہیے۔

غیر دینی کا ایک سادہ مفہوم یہ ہے کہ اسٹیٹ کا اپنا کوئی مذہب نہ ہو، وہ بجائے خود دنیوی ہو، اسکی اساس کسی مخصوص شریعت پر نہ ہو، وہ کسی خاص مذہب کی نصرت و حمایت نہ کرے، مگر اسکے ساتھ ہی وہ مخالفِ دین (Anti-religious) بھی نہ ہو بلکہ اپنے دائرے میں مذہبی نظامات کو تسلیم (Recognise) کرے، اور ان کو حکومت کے اختیارات میں سے کم از کم اتنے اختیارات تفویض کردے جو اندرونی تنظیم کیلیے ضروری ہیں، مثلاً اپنے پیروؤں پر ٹیکس عائد کرنا، مذہبی قوانین کو ان پر نافذ کرنا اور انکی دینی تعلیم کا انتظام کرنا عام اس سے کہ وہ علیحدہ مدارس کی شکل میں ہو یا مشترک تعلیمی نظام میں نازی دور سے پہلے تک جرمنی میں غیر دینی اسٹیٹ کا یہی مفہوم تھا اور اب بھی یوگوسلیویا، پولینڈ، لتھوانیا، فنلینڈ، اور ایستھونیا میں یہی مفہوم ہے۔ غیر دینی اسٹیٹ کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ دین کی نفی پر (Negation) قائم ہو، مخالفِ دین ہو، اس میں کسی دینی نظام کو تسلیم نہ کیا جائے، باشندوں کی اس حیثیت کو کہ وہ کسی خاص دین کے پیرو ہیں بالکل نظر انداز کر دیا جائے اور عمومی حاکمیت (Popular Sovereignty) کی تعبیر یہ کی جائے کہ باشندگانِ ملک ہونے کی حیثیت سے تو سب باشندے حاکمیت میں حصہ دار ہیں مگر ایک مذہب کے پیرو ہونے کی حیثیت سے اس حاکمیت میں ان کا کوئی حصہ نہیں، لہذا وہ خود اپنی حکومت سے بھی اپنے دینی نظام کی ترقی و استحکام کیلیے کوئی طاقت حاصل نہیں کر سکتے۔ لادینی کے اس مفہوم نے یورپ میں دو مختلف صورتیں اختیار کی ہیں۔ ایک ظالمانہ (Aggressive) جس میں حکومت کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ مذہبی لوگوں کو لامذہب بنایا جائے۔ اس کی مثال روس ہے۔ دوسری صورت معتدل ہے جس میں حکومت کی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ مذہبی نظامات کو زندگی کی طاقت پیدا کرنے والے تمام وسائل سے محروم کر دیا جائے تاکہ وہ خود سوکھ سوکھ کر مر جائیں۔ اسکی مثال چیکوسلوواکیا ہے جہاں تعلیم کا نظام کلیتہً حکومت کے ہاتھ میں ہے اور اس سے دینی عنصر کو قطعاً خارج کر دیا گیا ہے اور حکومت

سرکاری طور پر کسی قوم کے دینی نظام کو تسلیم نہیں کرتی۔

ہندوستان میں ہمارے آقاؤں نے جو طریق کار اختیار کیا ہے وہ ایک عجیب قسم کی معجون مرکب ہے۔ بادشاہ سلامت حامی دین (Defender of the Faith) بھی ہیں، اسٹیٹ کی طرف سے ایک مذہبی محکمہ (Ecclesiastical Department) بھی قائم ہے، اسکے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سلطنت کا کوئی مذہب نہیں ہے اور اس کا مذہب نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ مذہبی رواداری کے اصول پر قائم ہے (یعنی لادینی کا پہلا مفہوم)، مگر عملاً باشندگان ملک کے مذہب سے وہ برتاؤ کیا جاتا ہے جو میکیاولی کی روش سے ملتا جلتا ہے۔ اس عجیب کلچر کی تحلیل اگر سائنٹفک طریقہ سے کی جائے تو اسکے تین اجزاء برآمد ہونگے:-

۱- مذہبی رواداری کا اعلان واظہار۔

۲- ایک خاص عقیدہ ومسلک کی طرف نظر عنایت۔

۳- دوسرے تمام عقائد ومسالک کیساتھ سنگدلانہ سرد مہری

ہندوستان میں "دنیوی اسٹیٹ" کا یہ مرکب تصور فکر وعمل دونوں حیثیتوں میں ڈیڑھ سو برس سے پرورش پا رہا ہے اور ہمارے وطن پرستوں نے بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی تصور کو اپنے اندر جذب کرلیا ہے۔ ان کا ادعا یہ ہے کہ ہماری تحریک غیر دینی ہے اور ہم ایسا دنیوی اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں جسکی بنا کسی مذہب پر نہ ہوگی مگر اس میں مذہبی رواداری ہوگی۔ یہ آقایان نامدار کے بنائے ہوئے کلچر کا پہلا جزء ہے۔ اور دوسرا جزء یہ ہے کہ ان کا لیڈر[1] ایک "مہاتما" ہے جو صداقت (Truth) اور اہمسا (Non-violence) کے خالص ہندوانہ تصورات کا علمبردار اور مبلغ بن کر اٹھا ہے، جسکے تصورات جنگ آزادی کی فکری بنیاد ہیں، جو صاف کہتا ہے کہ عدم تشدد

[1] پنڈت جواہرلال کے بقول "کانگریس سے عظیم تر" (Bigger than Congress itself)

پالیسی نہیں بلکہ دین و ایمان ہے - اسکی رہنمائی میں تمام باشندگان ہند کیلیے سرکاری طور پر عمومی تعلیم کے خاکے بنائے جاتے ہیں اور ان سب میں اس کے دین و ایمان کو اساسی حیثیت دی جاتی ہے۔ اب رہ گیا تیسرا جز، تو اسکی بھی پوری مقدار اس معجون میں شریک کی گئی ہے - صاف صاف کہا جا چکا ہے کہ باشندوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا اسٹیٹ کے فرائض سے خارج ہے، اور اس کے برعکس یہ چیز اسٹیٹ کے فرائض میں داخل ہے کہ باشندوں کو جبراً ایسی تعلیم دے جو ان کے ذہن سے اپنے مذہب کی برتری کا خیال نکال دے - خود مہاتما گاندھی جنہوں نے اپنے مذہب کو واردھا اسکیم کا جزو لاینفک بنوایا ہے، اپنے مذہب کے سوا دوسرے تمام مذاہب کو نظام تعلیم سے خارج کر دینے کیلیے یہ دلیل ارشاد فرماتے ہیں :-

"تمام مذاہب کا یکساں لحاظ رکھنے کی تعلیم دینا ایک ایسی ضرورت ہے جسکے حق میں میرے خیالات بہت سخت ہیں - جب تک ہم اس خوشگوار حالت (یعنی سب مذاہب کو ایک نظر سے دیکھنے اور سب کو مساوی طور پر برحق سمجھنے کی حالت) کو نہ پہنچ جائینگے، اس وقت تک مختلف فرقوں میں حقیقی وحدت پیدا ہونے کی مجھے کوئی توقع نظر نہیں آتی - میرے نزدیک یہ بات مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے بچوں کے درمیان دوستانہ اسپرٹ کے نشو و نما کو غارت کرنے والی ہوگی اگر ان کو یہ سکھایا جائے کہ ان کا مذہب دوسرے مذاہب سے بہتر ہے یا یہ کہ وہی ایک سچا مذہب ہے - اگر قوم (یہ ہندوستانی قوم) پر یہی اختصاصی جذبہ مستولی رہے تو اس سے لازم آئیگا کہ یا تو ہر مذہب والوں کے الگ الگ مدرسے ہوں جن میں ہر ایک کو دوسرے پر طعن کرنے کی آزادی حاصل رہے، یا پھر مذہب کا نام لینے ہی کو کلیتہً ممنوع قرار دے دیا جائے - اس قسم کا طرز عمل اختیار کرنے کے نتائج اتنے خوفناک ہیں کہ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاق

لے واردھا اسکیم، ودیا مندر اسکیم، اور اصلاح دیہات کی اسکیم (جسے ڈاکٹر سید محمود نے بہار میں جاری کیا ہے) تینوں میں اہمسا کی تعلیم کو اساس کی حیثیت دی گئی ہے۔

کے بنیادی اصول تمام مذاہب میں مشترک ہیں۔ وہ ضرور بچوں کو سکھائے جانے چاہئیں، اور جہاں تک وردھا اسکیم کے ماتحت مدارس کا تعلق ہے ان میں بس اتنی ہی مذہبی تعلیم کو کافی سمجھنا چاہیے[1]۔"

اسی خیال کی ترجمانی ایک دوسرے ذمہ دار شخص مسٹر سمپورنا نند (یوپی کے وزیر تعلیم) نے اپنی ایک تقریر میں کی ہے جو انہوں نے ۱۴ راپریل ۳۸ء کو یوپی کی لیجسلیٹو اسمبلی میں ارشاد فرمائی تھی :-

"ہر وہ شخص جو ہندو یا مسلم تہذیب کے قائم رکھنے اور اس کو مدارس میں جاری کرنے پر زور دیتا ہے وہ یقینی طور پر ملک کو نقصان پہنچاتا ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ موجودہ ہندوستان میں یہ چیز مفقود ہونی چاہیے۔ ہم ایک ہندوستانی تہذیب چاہتے ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں اور دوسروں کیلیے جو اس ملک میں آئے ہیں اور جنہوں نے اس کو اپنا گھر بنا لیا ہے بالکل ایک ہے۔ اگر کوئی شخص واقعی ملک کی ترقی میں کوشاں ہے تو اسکو ایسی بات پر زور دینا چاہیے جس سے ہم میں تفرقے پیدا نہ ہوں جو سب کے لیے ضرر رساں ہیں۔ بلکہ ایسے امور ہوں جن سے ہندوستانی تہذیب کی تعمیر و ترکیب ہوتی ہو۔ تمام وہ باتیں جن سے ہم میں تفرقہ اور کشیدگی پیدا ہوتی ہے یقیناً ملک کے ساتھ دشمنی کرتی ہیں۔ اسلیے ملک کا عام مفاد مدنظر رکھتے ہوئے مجھے امید ہے کہ وہ لوگ جو لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس میں ہندو اور مسلم تہذیب قائم رکھنا چاہتے ہیں، اس بات پر زور نہ دینگے[2]۔"

اسی تقریر کا ایک فقرہ یہ بھی ہے :-

---

[1] "ہریجن" مورخہ ۱۶ رجولائی ۳۸ء
[2] "مدینہ" مورخہ ۲۱ راپریل ۳۸ء

"جب ہندو مسلم تہذیبیں مٹ جائینگی تب ہی ہندوستانی تہذیب زندہ رہ سکیگی"[1]

ان تقریروں اور تحریروں سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ ہندوستانی وطن پرست جو اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں وہ ایک معنی میں دینی اسٹیٹ ہے اگر دین سے مراد مہاتما گاندھی کا دین لیا جائے۔ اور ایک معنیٰ میں لادینی بلکہ مخالف دین (Anti-religious) اسٹیٹ ہے اگر دین سے مراد ہندوستان کے ان باشندوں کا دین لیا جائے جو دین گاندھی کے پیرو نہیں ہیں۔ اُن سے ان میں اس اسٹیٹ کا رویہ غیر جانبدارانہ رواداری نہ ہوگا بلکہ چیکوسلوواکیا کی طرح غیر ہمدردانہ اور ایک حد تک مخالفانہ ہوگا۔ اسکا مطمح نظر صریحاً یہ بتایا جا رہا ہے کہ مختلف قوموں کی تہذیبیں کسی نہ کسی طرح فنا ہو جائیں، ان کا مذہبی زاویۂ نظر بدل جائے اور وہ تمام مذاہب کو برابر سمجھنے لگیں، یعنی کسی مذہب کے پیرو نہ رہیں، کیونکہ ایک مذہب کی پیروی کیلیے اس کو سب سے بہتر اور صحیح جاننا فطری طور پر ناگزیر ہے۔ اس کے بعد یہ خیال کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں رہتا کہ ایسا اسٹیٹ کسی مذہبی نظام کو قانوناً تسلیم کریگا اور اسکو تعلیم اور اندرونی تنظیم کیلیے وہ حقوق اور اختیارات دیگا جنکی مثالیں ہم نے اوپر یورپ کے متعدد ممالک سے پیش کی ہیں۔

ان تشریحات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے وطن پرست ہندوستان کیلیے جس قسم کی آزاد حکومت حاصل کرنا چاہتے ہیں اس کی بنیادی خصوصیات تین ہیں:

(۱) "نیشنل اسٹیٹ" اس معنی میں کہ ہندوستان کی پوری آبادی کو ایک قوم قرار دیا جائے اور جداگانہ قومیتوں کی نفی کر دی جائے۔

(۲) "جمہوری اسٹیٹ" اس معنی میں کہ باشندگان ہند کو ایک مجموعہ قرار دیکر اس میں غلبۂ اکثریت کا اصول نافذ کیا جائے۔

(۳) "دنیوی اسٹیٹ" اس معنی میں کہ جہاں تک ہندوستان کی مختلف قوموں کے مذاہب کا تعلق

[1] ٹریبیون مورخہ ۵ راپریل ۳۸ء

ہے ان کے لحاظ سے وہ ایک لادینی اسٹیٹ ہو[1]

اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اس نوعیت کا اسٹیٹ دراصل کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم اس کو اپنا مطمح نظر بنا سکتے ہیں؟ کیا ایسے اسٹیٹ میں ہمارے مسلمان ہونے کی حیثیت برقرار بھی رہ سکتی ہے؟ کیا ہمارے لیے یہ جائز ہے کہ ہم اس کو قائم کرنے کی جدوجہد میں حصہ لیں یا صبر و سکون کیساتھ اسکے قیام کو گوارا کریں؟ آئندہ باب میں ہم ان سوالات پر بحث کرینگے۔

---

[1] ۲۹ راگست ۱۹۳۸ء کو مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی (سنٹرل اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے لیڈر) نے شملہ میں ایک تقریر فرمائی تھی جس میں اسٹیٹ کی انہی تین بنیادوں کو پوری تشریح کے ساتھ بیان کیا تھا۔ یہ تقریر یکم ستمبر ۱۹۳۸ء کے ٹریبیون میں شائع ہوئی ہے اور اس کا مطالعہ ہندوستانی وطن پرستوں کے طریق فکر اور نصب العین کو سمجھنے میں بہت کچھ مدد دیتا ہے۔

قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ

کیا مسلمان اس کو قبول کر سکتے ہیں؟

اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ عام ناظرین کی سہولت کیلیے چند اصطلاحات کی تشریح کر دی جائے۔

لفظ اسٹیٹ، جس کا مترادف ہماری زبان میں "ریاست" کا لفظ ہے، علم السیاست کی اصطلاح میں اس نظام کو کہتے ہیں جو ایک متعین رقبۂ زمین میں رہنے والی آبادی کو قاہرانہ طاقت (Coercive Power) سے ضبط میں رکھتا ہو۔ قوت قاہرہ کا وجود ایک طرف، اور اطاعت کا پایا جانا دوسری طرف، ان دو چیزوں کے بہم ہو جانے سے وہ نظمی ہیئت بن جاتی ہے جسے اسٹیٹ یا ریاست کہا جاتا ہے۔

اسٹیٹ کی اس تعریف کو سمجھنے کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ وہ قوت قاہرہ جسکی اطاعت ایک آبادی کر رہی ہے خود اُس آبادی کے اندر اسکے مجموعہ میں سے ابھرتی ہے یا کہیں باہر سے آتی ہے؟۔ اگر اسکے اجتماعی وجود سے الگ کوئی طاقت ایسی ہے جو اس پر حاکمانہ اختیار استعمال کرتی ہے تو وہ غلام ہے۔ اور اگر وہ آبادی خود حاکمیت (Sovereignty) کی مالک ہے اور اپنی رضامندی سے ایک نظمی ہیئت کو قوتِ قاہرہ فراہم کر کے دیتی ہے تاکہ وہ اسکے معاملات کی تنظیم کرے تو وہ خود مختار جماعت ہے۔ کسی آبادی کا اس طور پر اپنے اوپر آپ حکمراں ہونا، یا بالفاظ دیگر حاکمیت سے

متمتع ہونا جمہوریت کا اصل الاصول ہے۔ جب ہم کسی اسٹیٹ کو "جمہوری اسٹیٹ" کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ اسٹیٹ جن باشندوں سے مرکب ہے وہی اسکی حاکمیت کے مالک ہیں۔ گورنمنٹ جو انکے اسٹیٹ کا انتظام کرتی ہے انکی اجتماعی رضامندی کی تابع ہے، اور اس کا منصب اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ انکی خواہشات کو وضع قوانین اور تنفیذ قوانین میں روبعمل لائے۔

جمہوری نظام کا عمل اسکے نظریہ سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ نظری حیثیت سے تو اسٹیٹ کے ہر فرد کو حاکمیت حاصل ہے اور وہ اسکے استعمال کا حق رکھتا ہے۔ لیکن عملاً یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر ہر شخص کی خواہش کے مطابق قوانین بنیں اور حکومت کی جائے۔ لہذا عملی اغراض کیلیے جمہوریت کا قاعدہ یہ قرار دیا گیا کہ حکومت ہمیشہ اکثریت کی خواہشات کے مطابق ہوگی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے مشکلات کا آغاز ہوتا ہے۔ جمہوری حکومت جن خوشنما نظریات سے شروع ہوتی ہے، عمل کی سرحد میں آکر وہ رخصت ہوجاتے ہیں، اور ان سب کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ مملکت کے باشندوں کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو حاکمیت سے عملاً محروم کرکے ان پر اپنی خواہشات مسلط کردے۔ ہر ملک میں مختلف گروہ مختلف قسم کے مفاد، مذاق، خواہشات اور اغراض رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ان سب کے اشتراک عمل ہی سے تمدن کی مشین چلتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک مملکت کی اجتماعی خوشحالی اور فلاح و بہبود میں کسی نہ کسی حیثیت سے اپنا حصہ ادا کرتا ہے۔ ہر ایک کیلیے اسکی اغراض اور خواہشات اتنی ہی اہمیت رکھتی ہیں جتنی دوسرے کیلیے اسکی اغراض و خواہشات۔ لیکن جمہوری نظام میں جب اکثریت کی حکومت کا اصول اختیار کیا جاتا ہے تو اسکے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو گروہ کثیر تعداد میں ہے وہ حاکم بن جائے اور حکومت کے زور سے اپنی اغراض اور خواہشات حاصل کرے، اور جو گروہ قلیل تعداد میں ہے وہ غلام بنالیا جائے اور اکثریت کی اغراض و خواہشات پر سے اسکی اغراض و خواہشات اسی طرح قربان کی جائیں جس طرح کسی زار یا کسی قیصر کی انتہائی ظالمانہ حکومت میں کی جاسکتی ہیں۔ یہی

چیز ہے جس کو اکثریت کا استبداد (Tyranny of the Majority) کہتے ہیں اور جو اس زمانہ کی جمہوریتوں کے چہرے پر سب سے زیادہ بدنما داغ ہے۔

اکثریت کی حکومت کا اصول صرف اُس جگہ صحیح ہو سکتا ہے جہاں کے باشندے اساسی امور (Fundamentals) میں متفق ہوں، اور ان کے درمیان اختلاف محض آراء کا ہو، نہ کہ اغراض کا۔ ایسی جگہ تو یہ ممکن ہے کہ آج کی اقلیت کل اکثریت بن جائے، اور آج کی اکثریت کل اقلیت بن جائے۔ رائے عام اگر محض رائے عام ہے تو وہ بدل سکتی ہے اور بدلی جا سکتی ہے۔ کل رائے عام لبرل پارٹی کی مؤید تھی تو آج وہ لیبر پارٹی کے حق میں ہموار ہو سکتی ہے۔ ایسی حالت میں کوئی اکثریت نہ مستقل اور دائمی اکثریت ہوگی، نہ کبھی ظلم و جور کا طریقہ اختیار کر سکے گی، اور نہ اقلیت کو اس سے یہ اندیشہ ہوگا کہ وہ اساسی امور پر ضرب لگائے گی۔ لیکن اغراض —— یا خود غرضی —— کا اختلاف، اور مذہبی اصولوں کا، یا قومی جذبات کا، یا طرز زندگی کا اختلاف وہ چیز نہیں ہے جو دلائل سے دور کیا جا سکے۔ اس اعتبار سے جو گروہ اکثریت میں ہے وہ مستقل طور پر اکثریت بن رہیگا اور جو اقلیت میں ہے وہ مستقل طور پر اقلیت میں رہیگا۔ ایسی اکثریت کو حکومت کا حق دینے کے معنی اسکے سوا کچھ نہیں کہ ایک زار کی جگہ لاکھوں زار اور ایک قیصر کی جگہ کروڑوں قیصر پیدا ہو جائیں، اور محض اس بنا پر کہ انکے سروں کی تعداد زیادہ ہے، ان کے لیے یہ جائز ہو جائے کہ اپنے ہی ہموطن لوگوں کی ایک معتدبہ جماعت پر جس طرح چاہیں ظلم و ستم کریں۔ یہ جمہوریت کے بنیادی اصولوں کی صریح اور کلّی نفی ہے۔ اس چیز پر لفظ جمہوریت کا اطلاق ہی غلط ہے۔ اسے بڑے پیمانے پر چنگیزیت کہنا چاہیے۔

جن ممالک میں باشندوں کے درمیان قومی تفریق موجود ہے، یعنی مذہب، نسل، زبان، رنگ وغیرہ امور میں اختلاف پایا جاتا ہے، اور اسی طرح جہاں نظریات اور اصول زندگی کا اسای

اختلاف ہے، یا باشندوں کے مختلف گروہوں کی اغراض باہم متصادم ہیں، وہاں مختلف عناصر کو ملا کر ایک اسٹیٹ بنانے اور اس میں جمہوریت کا اصول نافذ کر دینے کا نتیجہ ظلم کے سوا کچھ نہیں نکلا اور ہمیں دنیا کی پوری تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملی جس کو مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہو۔

روس میں مزدوروں کی حکومت قائم ہونے کے بعد متوسط طبقہ کے لوگ، چھوٹے زمیندار، تجارت پیشہ اور دوکاندار، اور ان سب سے زیادہ مذہبی گروہ جس بری طرح پیسے گئے اور آج بھی جس طرح وہ غلام بنا کر رکھے گئے ہیں، اس حالت کا تقابل اگر زار کی حکومت کے مظالم سے کیا جائے تو شاید زاریت ہی کو اشتراکیت کے آگے سرِ نیاز جھکا دینا پڑے۔ یہ اس امر کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ جہاں خود غرضی بنائے اختلاف ہو، وہاں ایک قسم کی اغراض رکھنے والوں کا حکمراں بن جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ دوسرے تمام گروہوں کا خون چوس لیں اور ان کو اپنی خود غرضی کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیں۔

چیکوسلواکیا میں اب سے ۲۰ سال قبل مختلف چھوٹی اور بڑی قوموں کو ملا کر ایک جمہوری اسٹیٹ بنایا گیا تھا۔ اس سیاسی حماقت کا جو انجام ہوا آج اسے ساری دنیا دیکھ رہی ہے ــــ سب سے بڑھ کر جن دو قوموں سے توقع تھی کہ ایک قوم بن جائینگی انہی نے مصنوعی قوم سازی کے نظریہ کی دھجیاں بکھیر دیں۔ اس نئی ریاست کے اصل اجزائے ترکیبی دو ہیں۔ ایک چیک (Czechs) دوسرے سلاوک (Slovaks)۔ نسل اور قومی روایات کے لحاظ سے دونوں بالکل مختلف ہیں۔ گذشتہ ہزار برس کی تاریخ میں کہیں ان کے درمیان کسی ارتباط کا نشان نہیں ملتا۔ صرف ایک چیز ان کے درمیان مشترک تھی، اور وہ یہ تھی کہ دونوں آسٹریا ہنگری کے غلام تھے اور دونوں کو ظالم سلطنت کی نفرت اور آزادی کی خواہش نے ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا تھا۔ سیاسی مدبرین یہ سمجھے کہ مشترک دشمن کی عداوت اور اس کے پنجہ سے آزادی حاصل کرنے کا مشترک جذبہ دونوں

کو ایک قوم بنا دینے کیلیے کافی بنیاد ہے۔ چنانچہ انہوں نے ان دونوں کو ملا کر ایک نئی قوم "چیکو سلاوک" وضع کردی اور اس کو بالفعل موجود فرض کرکے ان کی ایک قومی جمہوری ریاست بھی بنادی۔ لیکن اس جدید ریاست کی تشکیل پر کچھ زیادہ زمانہ نہ گذرا تھا کہ تجربے نے ثابت کردیا کہ دو قوموں کو ساتھ ملا کر باندھ دینے سے ایک قوم نہیں بن جایا کرتی۔ مصنوعی قومیت محک امتحان کی پہلی ہی رگڑ پر کھوٹی ثابت ہوئی۔ چیک کثیر التعداد تھے، زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ سرمایہ دار تھے، اور آسٹریا ہنگری کے مظالم نے ان کو سلطنت کے ساتھ مذہب سے بھی متنفر کردیا تھا۔ ان کے برعکس سلاوک لوگ سخت پابند مذہب، تعلیم میں بہت پیچھے، زیادہ تر زراعت پیشہ اور خستہ حال، اور تعداد میں بھی چیکوں کی بہ نسبت ½۔ اس تفاوت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر چیک اکثریت نے دستور حکومت میں یہ طے کرلیا کہ قومی اسٹیٹ بالکل ایک دنیوی اسٹیٹ (Secular State) ہوگا، اس میں تمام مذاہب کے ساتھ رواداری تو ضرور برتی جائیگی مگر کسی مذہب یا مذہبی نظام کو سرکاری طور پر تسلیم نہ کیا جائیگا۔ تعلیم کا پورا نظام اسٹیٹ کے ہاتھ میں ہوگا، اور "ایسی تعلیم دی جائیگی جو سائنٹفک تحقیقات کے نتائج سے متصادم نہ ہوتی ہو"۔ دستور العمل کی ان دفعات سے فائدہ اٹھا کر چیک اکثریت کی حکومت نے سلاوک علاقے کے مدارس میں لامذہب اسکول ماسٹر بھیجنے شروع کردیئے اور نظام تعلیم سے مذہبی تعلیم کو قطعی خارج کردیا۔ سلاوک لوگوں نے اپنی مذہبی تعلیم کیلیے بطور خود کوئی انتظام کرنا چاہا تو اسے سرکاری امداد دینے سے انکار کردیا گیا۔ حکومت کے نظم و نسق اور خصوصاً بڑے ذمہ داری کے مناصب کو چیکوں کے لیے مخصوص کرلیا گیا اور خود سلاوک علاقوں میں بھی چیک افسر حکمراں بنکر آنے لگے۔ انہی باتوں نے آخر کار سلاوک لوگوں کو اس بات کا قائل کردیا کہ ایک چھوٹی اور ایک بڑی قوم کو ملا کر ایک قومی جمہوری اسٹیٹ بنانا درا[1]

[1] ملاحظہ ہو ۱۹۲۰ء کا چیکو سلاوک کانسٹی ٹیوشن دفعات ۱۱۹ - ۱۲۱ - ۱۲۲ - ۱۲۴

چھوٹی قوم کو بڑی قوم کی غلامی میں دینا ہے - چنانچہ اب وہ کئی سال سے اپنے علاقہ کیلئے حکومت خود اختیاری (Autonomous Self-government) کا مطالبہ کر رہے ہیں۔[1]

اسی "قومی جمہوری ریاست" میں تقریباً ۳۰ لاکھ جرمن بھی شامل کر دیے گئے تھے، (یعنی کل آبادی کا ⅓ حصہ) جنکی قومیت، نسل، زبان، تاریخی روایات چیک اور سلاوک دونوں قوموں سے بالکل مختلف تھیں، بلکہ صدیوں سے چیک اور جرمن نسل میں کھلی عداوت چلی آتی تھی۔ سرائوں میں، کارخانوں میں، کلیساؤں میں جہاں کہیں چیک اور جرمن جمع ہوتے وہاں اکثر ہنگامے ہو جایا کرتے تھے۔ ایک، دوکان میں دونوں سے یکجا کام لینا مشکل تھا حتیٰ کہ ایک اسٹیشن سے انکا ریل پر سوار ہونا بھی دشوار تھا جسکی وجہ سے اکثر چھوٹے چھوٹے مقامات پر بھی دو اسٹیشن بنائے جاتے تھے تاکہ ایک سے چیک سوار ہوں اور دوسرے سے جرمن[2]۔ اسقدر شدید اختلافات کے باوجود ان دونوں کو ایک قومیت میں شامل کر کے ایک قومی جمہوری اسٹیٹ بنا دیا گیا جسمیں چیک اپنی اکثریت کی بنا پر حاکم اور جرمن اپنی اقلیت کی بنا پر محکوم تھے، حالانکہ صدیوں تک اسی سرزمین میں یہی جرمن حاکم اور چیک محکوم رہ چکے تھے۔ اسکا نتیجہ جو کچھ ہوا اسے ابھی حال ہی میں ساری دنیا دیکھ چکی ہے۔ ثابت ہو گیا کہ محض ایک قومی اسٹیٹ بنا دینے سے دو مختلف قومیں ایک قوم نہیں بن سکتیں اور نہ ایک جمہوری اسٹیٹ بنا دینے سے جمہوریت کی حقیقی روح پیدا ہو سکتی ہے۔ البتہ مصنوعی طور پر دو قوموں کی ایک قومیت اور ایک جمہوریت بنا دینے کا یہ اور صرف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کثیر التعداد قوم عملاً قلیل التعداد قوم کو غلام بنالے اور جمہوری نظام میں اسکو حاکمیت کے فطری حقوق سے محروم کر کے رکھ دے۔ چیک اکثریت نے جرمن اقلیت کے ساتھ یہی کیا۔ تعلیم کے ذریعہ سے جرمنوں کو چیک قومیت میں جذب کرنے کی کوشش کی گئی۔ جرمن زبان و ادب کو مٹانے اور دبانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔

---

[1] R. W. Seton-Watson, The New Slovakia

[2] C. D. Hazen, Europe Since 1815

سرکاری ملازمتوں میں جرمن اور چیک کا قومی امتیاز کبھی نہ بھولا گیا اور ہمیشہ چیکوں کو جرمنوں پر ترجیح دی گئی۔ تجارتی کاروبار اور سرکاری کام کے ٹھیکوں تک میں جرمنوں کو دبانے اور چیکوں کو بڑھانے کا ہر ممکن طریقہ اختیار کیا گیا۔ حتیٰ کہ خاص ان علاقوں میں بھی جہاں ۸۰ اور ۹۰ فیصدی جرمن آبادی تھی، سرکاری ضروریات کیلیے چیکوں کو ٹھیکے دیے جانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سُڈیٹن جرمنوں کی معاشی حالت روز بروز گرتی شروع ہو گئی اور انکے کاروبار بیٹھنے لگے۔ یہ سب کچھ اُس قومی جمہوری اسٹیٹ میں ہوا جسکی "متحدہ وطنی قومیت" کا ایک جزء یہ جرمن بھی تھے، جنکے جمہوری نظام میں ان کو دستور کی رو سے پورے شہری حقوق عطا کیے گئے تھے، اور جسکی دولت مشترکہ (Commonwealth) کی ملکیت میں وہ بھی از روئے دستور یکساں حصہ دار تھے۔ لیکن ۲۰ سال کے تجربہ نے بتا دیا کہ "قومی" اور "جمہوری" کے معنی لغت میں کچھ اور رہتے ہیں، اور حقیقت میں کچھ اور۔ آخر کار جرمنوں میں وہ عظیم الشان ہیجان رونما ہوا جو قریب تھا کہ تمام دنیا کے امن و امان کو پھونک دیتا اگر عین وقت پر عقلمندی سے کام لیکر جرمنوں کو جرمنی کے حوالہ نہ کر دیا جاتا۔

اسی قسم کے حالات ان دوسرے ممالک کے بھی ہیں جہاں مختلف قوموں کو ایک قومیت فرض کر کے ایک جمہوری اسٹیٹ میں ضم کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یوگوسلافیا کو لیجیے۔ انیسویں صدی کے آخری دور میں آسٹریا ہنگری کے ظالمانہ تسلط سے نجات حاصل کرنے کیلیے کروٹ (Croats) اور سلافینی (Slovenes) قوموں میں آزادی کا زبردست جذبہ پیدا ہوا اور انہوں نے اپنے ہمسایہ سربیوں (Serbs) سے اتحاد کر لیا۔ ان مختلف عناصر کے درمیان آسٹریا کی عداوت اور آزادی کی مشترک خواہش کے سوا اور کوئی وجہ اتحاد نہ تھی۔ نسل میں اختلاف، مذہب میں اختلاف، زبان میں اختلاف، اور طرز زندگی میں اختلاف۔ مگر طلب آزادی کے نشے میں ان سب اختلافات کو نظر انداز کر کے یہ سب گھل مل گئے، اپنی متحدہ قومیت کا نام انہوں نے "یوگوسلافیا"

رکھ لیا، اور اپنی الگ زبانوں کے نام ملا کر ایک متحدہ قومی زبان کا عجیب و غریب نام (Serbo-Croatian Slovene) رکھا جس کا مسمّیٰ کہیں دنیا میں موجود نہ تھا بلکہ تین الگ الگ زبانیں مختلف رسم الخطوں اور مختلف لسانی خصوصیات کے ساتھ موجود تھیں اور "ہندوستانی" کی طرح بس ان کا ایک متحدہ نام رکھ دیا گیا تھا۔ جنگ عظیم کے دوران میں جب یہ تینوں قومیں آسٹریا ہنگری کے خلاف برسر پیکار ہوئیں تو جولائی ۱۹۱۷ء میں سربیا کے وزیر اعظم اور یوگوسلا کمیٹی کے صدر کا ایک مشترک بیان اس مضمون کا شائع ہوا کہ:

"سرب، کروٹ اور سلافینی ایک قوم ہیں۔ آیندہ کیلیے یہ اپنا ایک قومی اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں جو جمہوری اسٹیٹ ہوگا۔ اس متحدہ اسٹیٹ کا جھنڈا الگ ہوگا اور تینوں شرکاء کے جھنڈے الگ الگ ہونگے جنکی حیثیت مساویانہ ہوگی۔ اسی طرح (Cyrillic) اور لیٹن دونوں رسم الخط سرکاری طور پر مساوی ہونگے، اور تینوں مذاہب یعنی آرتھوڈوکس، کیتھولک اور اسلام کا درجہ بھی مساویانہ تسلیم کیا جائیگا۔"

مگر جنگ ختم ہونے کے بعد جب آزادی ملی اور نومبر ۱۹۲۰ء میں نئی ریاست کی بنا رکھی گئی تو صورت حال کچھ اور ہی تھی۔ ریاست کی ایک کروڑ بیس لاکھ آبادی میں پچاس لاکھ .... کے قریب سرب تھے، تیس لاکھ کیتھولک، کروٹس اور ۱۰ لاکھ سلافینی اسکے علاوہ جرمن، مگیار، رومانی بلغاری اور البانوی بھی کئی کئی لاکھ کی تعداد میں شامل ہو گئے تھے۔ اگرچہ ان سب کو ملا کر سربی گروہ اقلیت میں تھا، لیکن الگ الگ ہر گروہ کے مقابلہ میں اسکی بڑی اکثریت تھی، اور ان اقلیتوں کے درمیان کامل اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے اسکی پوزیشن اور زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ اس پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر سربیوں نے عملاً حاکم قوم کی حیثیت اختیار کر لی، تمام اقلیتوں کو محکوم بنا لیا، متحدہ قومیت کا تخیل ہوا میں اڑ گیا، اور حکومت کے زور سے سربی قومیت تمام قلیل التعداد جماعتوں پر مسلط

کی جانے لگی۔ تاسیس ریاست کے بعد پہلی مرتبہ جب کانسٹی ٹیوشن بنانے کیلئے نیشنل کونسل منعقد ہوئی تو سربی قوم پرستوں نے یوگوسلافی قومیت کا لبادہ اتار کر پھینک دیا اور خود مختار صوبوں کا ایک وفاق بنانے کے بجائے ایک مضبوط مرکزی طاقت رکھنے والی بادشاہی کی بنا رکھ دی جس کا فرمانروا سربیا کا بادشاہ تھا اور جس کا پایۂ تخت سربیا کا پایۂ تخت تھا۔ آج اس "قومی جمہوری حکومت" کا کھلا ہوا مسلک یہ ہے کہ اقلیتوں کی قومیت کے ایک ایک نشان کو مٹائے، اور تمام اقلیتیں تقریباً ۱۸ سال سے پیہم کوشش کر رہی ہیں کہ اس پھندے سے، جسکو خود انہوں نے خوشی خوشی پہنا تھا کسی طرح نکل نکلیں۔[1]

ان چھوٹی ریاستوں کو چھوڑ کر ان بڑے ممالک کو لیجیے جو آج جمہوریت اور دستوریت کے ابوالآباء سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں بھی جہاں کہیں مختلف مذاہب یا مختلف نسلی قومیتوں کو ملاکر ایک قومیت بنی ہے، جبر اور ظلم ہی سے بنی ہے اور قومی جمہوری اسٹیٹ وہاں اسی طرح بنا ہے کہ آبادی کے ایک کثیر التعداد اور منظم گروہ نے چھوٹے گروہوں پر زبردستی اپنی خواہشات اور اپنے اصولوں کو مسلط کیا اور ان کے امتیازی وجود کو مٹا کر رکھ دیا۔

سوئس قوم اور اسکی جمہوری وفاقی ریاست کس طرح بنی؟ ابتداءً یہ ۲۲ آزاد جمہوری ریاستوں کا محض ایک تحالف (Confederation) تھا۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں مذہبی آزاد خیالی کے اثرات سوئٹزرلینڈ پہنچے اور مذہب کو تعلیم اور سیاست دونوں سے خارج کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ سات کیتھولک ریاستوں نے اسکی مخالفت کی۔ ۱۵ آزاد خیال ریاستوں نے ان پر زبردستی

[1] تفصیلات کیلئے حسب ذیل کتابیں ملاحظہ ہوں:-

C. D. Hazen, Europe since 1815

A. H. Morley, The New Democratic Consti tution of Europe

Encyclopædia Britannica, Article: Yugoslavia

اپنے خیالات کو مسلط کرنا چاہا جس کا انہیں ازروئے آئین کوئی حق نہ تھا۔ آخر ۱۸۴۷ء میں ساتوں کیتھولک ریاستیں تحالف سے الگ ہوگئیں اور تحالف کے اصول کی رو سے وہ پوری طرح اس کی مجاز تھیں۔ مگر آزاد خیال ریاستوں نے اپنی غالب اکثریت سے ان کے اس فعل کو ناجائز ٹھیرایا اور ان کے علاقوں پر حملہ کر کے انہیں زبردستی ایک وفاقی اسٹیٹ میں شامل ہونے پر مجبور کر دیا۔ پھر ۱۸۴۸ء میں جو بنیادی دستور بنایا گیا اس میں وفاقی ریاستوں کے اختیارات محدود کر کے مرکز کے اختیارات نہایت وسیع کر دیے گئے تاکہ اکثریت پوری طرح اقلیت پر اپنی مرضی اور اپنے اصولوں کو نافذ کر سکے اور اقلیت مجبور ہو کر اس واحد قومیت میں اپنے آپ کو گم کر دے جسے آزاد خیال لوگ (Radicals) وجود میں لانا چاہتے تھے۔[1]

برطانیہ میں کیا ہوا؟ انیسویں صدی کے ثلث اول تک برطانیہ عظمیٰ میں انتخاب کا قانون اس قسم کا تھا کہ انگلینڈ کو اسکاٹ لینڈ، ویلز اور آئرلینڈ، تینوں کی مجموعی طاقت سے قریب قریب تین گنی زیادہ اکثریت پارلیمنٹ میں حاصل ہوتی تھی۔ انگلستان کی صرف ایک کاؤنٹی (کارنوال) کے نمائندے پورے اسکاٹ لینڈ کے نمایندوں کے برابر تھے حالانکہ اسکاٹ لینڈ کی آبادی کارنوال سے آٹھ گنی تھی۔ کوئی کیتھولک، کوئی یہودی اور کوئی ایسا شخص جو اینگلیکن چرچ کو نہ مانتا ہو، ازروئے قانون نہ تو پارلیمنٹ کا ممبر بن سکتا تھا، نہ کسی سرکاری عہدے پر مامور ہو سکتا تھا اور نہ کسی میونسپلٹی میں داخل ہو سکتا تھا۔ ان سب فرقوں کو چرچ آف انگلینڈ کیلیے عُشر دینا پڑتا تھا۔ نکاح کیلیے چرچ آف انگلینڈ کے پادری کے پاس جانا ہوتا تھا۔ اپنی عبادت گاہ کو چرچ آف انگلینڈ میں رجسٹر کرانا پڑتا تھا۔ آکسفورڈ اور کیمبرج میں داخلہ کیلیے ایسی مذہبی شرائط رکھی گئی تھیں جنہیں اینگلیکن چرچ کے پیروؤں کے سوا کوئی پورا نہ کر سکتا تھا۔ اسلیے ان دونوں

[1] Cambridge Modern History, vol. XI.

یونیورسٹیوں کے دروازے گویا دوسرے فرقوں کیلیے بند تھے۔ چرچ آف انگلینڈ کو نہ ماننے والے لوگ ووٹ دینے کے حق دار تو تھے مگروہ اپنے ہم مذہب لوگوں کو ووٹ نہ دے سکتے تھے کیونکہ انہیں پارلیمنٹ میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ ۱۸۲۸ء میں ان قیود کو اُٹھانے اور نرم کرنے کا میلان پیدا ہوا اور قریب قریب ۶۰ برس کی مسلسل اور تدریجی اصلاح نے بالآخران کو بالکلیہ منسوخ کیا۔ اس قسم کی تھی وہ جابرانہ طاقت، اور اس قسم کا تھا وہ مادّی و اخلاقی غلبہ جس سے انگلینڈ کے لوگوں نے برطانیۂ عظمیٰ کی مختلف قوموں اور مختلف مذہبی جماعتوں کو مغلوب کرکے اپنی تہذیب اور اپنی قومیت میں جذب کیا، اور وہ واحد قومیت بنائی جسے آج "ایک ملک اور ایک قوم" کا نعرہ بلند کرنے والے سب سے پہلے مثال میں پیش کیا کرتے ہیں۔ شائد کہ ان کے پیش نظر بھی ایک قوم بنانے کے ایسے ہی طریقے ہونگے۔

یہاں مثالوں کا استقصار مقصود نہیں ہے۔ اگرچہ عہد حاضر کی تاریخ اور خود ہمارے موجودہ دور کے واقعات سے ایسی ہی بکثرت مثالیں اور بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔ مگر جو بات میں ثابت کرنا چاہتا ہوں اسکے لیے یہی مثالیں بہت کافی ہیں۔ ان سے بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مختلف قوموں کو ایک قوم قرار دیکر ایک جمہوری اسٹیٹ بنانے کے معنی کیا ہیں، اور یہ بات جو بظاہر نہایت معصوم الفاظ میں بیان کی جاتی ہے اس میں کسقدر غیر معصوم مقصد پوشیدہ ہوتا ہے۔

اب ذرا ہندوستان کے حالات پر ایک نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ یہاں ایک قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ بنانے کے معنی کیا ہو سکتے ہیں۔

جمہوری اسٹیٹ کے معنی یہ ہیں کہ تمام باشندگان ہند کو اسٹیٹ میں حاکمیت حاصل ہو۔ مگر عملاً اس حاکمیت کو وہ جماعت استعمال کرے جو اکثریت میں ہو۔

جمہوری کیساتھ "قومی" کی قید لگانے سے یہ نتیجہ نکلا کہ یہاں مختلف قومیتوں کے وجود کی نفی

کردی جائے اور تمام باشندوں کو ایک قوم قرار دیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں اسکے معنی یہ ہوئے کہ ہندوستان کی حکومت میں کسی شخص کا حصہ اس حیثیت سے نہ ہوگا کہ وہ ہندو یا مسلمان ہے بلکہ صرف اس حیثیت سے ہوگا کہ وہ ہندوستانی ہے۔ اس کا ایسے اسٹیٹ کی رکنیت میں شامل ہونا خود بخود اس امر کو مستلزم ہوگا کہ وہ اپنے ہندو یا مسلمان ہونے کی حیثیت کی خود نفی کردے۔ اس کی جداگانہ قومی حیثیت خواہ بالفعل برقرار رہے، مگر وہ اس حیثیت میں اسٹیٹ سے کسی چیز کا مطالبہ نہ کر سکے گا، بلکہ اسے ان فیصلوں کو قبول کرنا ہوگا جو مجموعی طور پر ملک کے باشندوں کی اکثریت ملک کی مجالس قانون ساز میں طے کردے۔

لادینی کی قید اس میں ایک اور چیز کا اضافہ کرتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اور کوئی گروہ کسی مذہب کا پیرو ہونے کی حیثیت سے اسٹیٹ میں حصہ دار نہیں ہے۔ وہ اسٹیٹ کے دائرے میں اپنی اس حیثیت کو لے کر بھی نہیں آسکتا۔ اس دائرے میں اسکو خود اپنی اس حیثیت کی نفی کرنی ہوگی۔ اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت، تعلیم، اور زندگی کے دوسرے مسائل کے متعلق اسکے اپنے نظریات خواہ کچھ ہوں، وہ ان سب کو اس وقت بھلا دینے پر مجبور ہوگا جب باشندوں کی اکثریت ان مسائل میں کوئی دوسرا نظریہ اختیار کریگی۔ وہ اس وقت یہ نہ کہہ سکیگا کہ میرے مذہب اور میری تہذیب کا نظریہ دوسرا ہے، اور میں اکثریت کے نظریہ کو قبول نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ایسا کہے گا تو اسکو جواب دیا جائیگا کہ اسٹیٹ میں جناب کا حصہ اس حیثیت سے ہے ہی کہاں کہ آپ فلاں مذہب اور فلاں تہذیب کے پیرو ہیں۔ مجلس قانون ساز میں آپ ایک مذہبی آدمی کی حیثیت سے آئے کب ہیں کہ آپ کو اس قسم کے عذرات پیش کرنے کا حق حاصل ہو۔ یہاں تو آپکی حیثیت محض ہندوستانی ہونے کی ہے، اور جمہوریت کا اصول آپ تسلیم کر چکے ہیں، لہذا ہندوستانیوں کی اکثریت جو نظریہ رکھتی ہے اسے طوعاً و کرہاً آپکو قبول ہی کرنا ہوگا۔ اس پر مزید یہ کہ اگر وہ اپنے گروہ کی حد تک اپنی مذہبی تنظیم کرنے کیلئے حکومت کے وسائل و ذرائع میں سے کوئی حصہ مانگیگا تو اس سے کہدیا جائیگا کہ جناب یہ کوئی مذہبی اسٹیٹ نہیں ہے، ایک دنیوی لادینی اسٹیٹ ہے۔ اسکی حاکمیت میں جب آپ کا کوئی حصہ مذہبی آدمی ہونے کی حیثیت سے

ہے ہی نہیں تو آپ کو مذہبی تنظیم کیلیے حکومت کے اختیارات اور وسائل و ذرائع میں سے کوئی حصہ کیسے مل سکتا ہے۔ آپ کو یہ کام کرنا ہے تو جایئے، خود اپنے مذہبی گروہ کے وسائل سے کیجیے۔

یہ نتائج تو محض ان تین اصطلاحوں کے معانی پر غور کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اب عملی حیثیت سے دیکھیے تو یہ تصویر اور زیادہ خوفناک ہو جاتی ہے۔ اوپر میں بیان کر چکا ہوں کہ جمہوری نظام کے صحیح یا غلط ہونے کا تمام تر انحصار اس سوال پر ہے کہ اس میں اکثریت اور اقلیت کسطرح بنتی ہے۔ اگر باشندوں کے درمیان زندگی کے بنیادی مسائل (Fundamentals) میں اتفاق ہے، اور صرف وسائل و طریقہ ہائے کار (Means and Methods) میں اختلاف آراء پایا جاتا ہے، تب تو اکثریت اقلیت میں اور اقلیت اکثریت میں تبدیل ہوتی رہے گی نہ کوئی اکثریت مستقل اور دائمی ہوگی نہ اقلیت۔ ایسی حالت میں اس امر کا کوئی خطرہ نہیں کہ اکثریت ظلم و استبداد کا طریقہ اختیار کرے اور اقلیت کو حاکمیت سے محروم کر کے ایک غلام اور محکوم قوم بنائے لیکن اگر صورت حال برعکس ہو۔ اگر باشندوں کے درمیان زندگی کے اساسی امور میں اختلاف ہو، اور اس اختلاف نے ان کو الگ الگ ممتاز گروہوں میں تقسیم کر دیا ہو، اور ان گروہوں میں ترجیح ہم جنس کی اسپرٹ پائی جاتی ہو، اور اس گروہ بندی نے ان کی دنیوی اغراض کو بھی بڑی حد تک ایک دوسرے سے متصادم کر دیا ہو، تو ایسی جگہ اکثریت دائمی اکثریت ہوگی اور اقلیت دائمی اقلیت ہوگی۔ وہاں رائے عام کو ہموار کر کے اقلیت کا اکثریت بن جانا غیر ممکن ہے۔ وہاں سب باشندوں کو ایک قوم قرار دینے اور اس بنیاد پر جمہوری لادینی اسٹیٹ بنانے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ اکثریت کو اقلیت پر ظلم کرنے اور اس کو غلام بنا کر رکھنے اور اسکو تباہ و برباد کرنے کا لائسنس دیا جائے۔ وہاں قومی اسٹیٹ دراصل اکثریت کی قوم کا اسٹیٹ ہوگا، اور لادینی اسٹیٹ صرف اقلیت کیلیے لادینی ہوگا۔ اس میں اکثریت کو نہیں بلکہ صرف اقلیت کو اپنی جداگانہ

قومی حیثیت اور اپنی مذہبیت کی نفی کرنی ہوگی۔ اکثریت اپنی ان سب حیثیتوں کو برقرار رکھ کر سب کچھ کر سکے گی، مگر اقلیت اپنے مذہب کا یا اپنی تہذیب یا زبان و ادب یا فلسفۂ حیات کا نام نہ لے سکیگی۔ ایسی جگہ تمام باشندوں کو ایک قوم قرار دینے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ فی الواقع ایک قوم ہیں، بلکہ اسکے معنی دراصل یہ ہیں کہ جو قوم کثیر التعداد ہے وہ جمہوری اسٹیٹ کی تمام طاقتوں پر قابض ہو کر قلیل التعداد جماعتوں کی قومیتوں کو مٹانا اور اپنی قومیت میں جذب کر کے ایک قوم بنانا چاہتی ہے۔

آنکھیں کھول کر انصاف کی نظر سے دیکھیے۔ کیا ہندوستان میں فی الواقع یہی صورت حال موجود نہیں ہے؟

(۱) ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان قومیت کا اختلاف اس اختلاف سے بھی زیادہ نمایاں پایا جاتا ہے جو یورپ میں جرمن اور فرنچ اور انگریز اور اطالوی قوموں کے درمیان ہے۔ وہاں کم از کم اخلاقی شعور ایک سا ہے، تہذیب کے بنیادی اصول ایک ہیں، اور آداب و اطوار اور طرز زندگی میں بھی اساسی اختلافات موجود نہیں ہیں، یا اگر ہیں بھی تو بہت خفیف۔ مگر یہاں آٹھ نو سو برس تک ایک آب و ہوا اور ایک خطۂ زمین میں پہلو بہ پہلو رہنے کے باوجود دونوں قوموں کی زندگی کے دھارے الگ الگ بہ رہے ہیں۔ پنڈت جواہر لال دیہاتی ہندوؤں اور مسلمانوں کو کچھ ایک جیسے لباس پہنتے دیکھ کر اور معیشت کے میدان میں ایک ساتھ محنت مزدوری کرتے دیکھ کر حکم لگا سکتے ہیں کہ یہ ایک قوم ہیں۔ وہ ہندوستان میں پیدا تو بے شک ہوئے ہیں مگر ان کا دماغ انگلستان میں بنا ہے اور اس پر روسی وارنش تازہ تازہ چڑھا ہے، اسلیے وہ رات دن ہندوستانیوں میں رہ کر بھی ان کو صرف اوپر اوپر سے اور باہر سے ہی دیکھ سکتے ہیں جس طرح کوئی امریکن سیاح دیکھ لیتا ہے۔ وہ انکے دل میں اتر کر اور انکی زندگی میں گھس کر نہیں دیکھ سکتے کہ ان

کے درمیان کتنا بڑا اور گہرا تفاوت ہے۔ دونوں قوموں کے جذبات و احساسات ایک دوسرے سے اسقدر مختلف بلکہ باہم متصادم ہیں کہ ہندو جس چیز کو الٰہی تقدیس و احترام کی نظر سے دیکھتا ہے، مسلمان اسکو شوق سے کھاتا ہے، اور یہ فرق مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے گاؤں کے جُلاہے اور پاسی تک کے درمیان یکساں ہے، بلکہ مہاتما اور مولانا تو اس باب میں مدارات سے بھی کام لے سکتے ہیں لیکن گاؤں والے اس پر لٹھ چلا بیٹھتے ہیں شہری ہندو اور مسلمان تو کبھی کبھار ایک میز پر کھا بھی لیتے ہیں، مگر دیہاتی ہندو تو مسلمان کا ہاتھ لگا ہوا پانی تک نہیں پیتا۔ وہ ریل میں بھی اُس تختہ پر جہاں مسلمان کھانا کھا رہا ہو، با دلِ ناخواستہ ہی بیٹھتا ہے اور دل میں چھی چھی کرتا رہتا ہے۔ ان دونوں کی زندگی کے اندر داخل ہونے والے دروازے ایک دوسرے کیلیے بالکل بند ہیں۔ پیدائش سے لیکر موت تک ہر رسم، ہر تہوار، ہر خوشی اور غمی میں ہندو ہندو کے ساتھ ہوتا ہے اور مسلمان مسلمان کے ساتھ۔ ان میں اختلافات کے ہوتے کون انہیں ایک کہہ سکتا ہے۔

(۲) منڈی اور دفتر اور کارخانے میں یہ دونوں یکجا تو ضرور ہوتے ہیں، مگر کیا ان کے قومی اختلاف کا اثر انکے معاشی مفاد اور کاروباری اغراض میں ظاہر نہیں ہوتا؟ تخیل کی بلندیوں پر پہنچ کر کہنے والا جو چاہے کہدے اور لکھنے والا جو چاہے لکھ دے۔ مگر روزمرہ کے کاروبار میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے کاروباری زندگی کے اندر اتر کر دیکھیے اور جو لوگ یہاں کام کر رہے ہیں ان سے پوچھیے۔ کیا آدمی کو ملازم رکھنے میں اور مزدور سے خدمت لینے میں اور دوسرے چھوٹے اور بڑے معاملات میں ہندو اور مسلمان کی تمیز نہیں کی جاتی؟ کیا دیہاتی آبادیوں تک میں مسلمانوں کا تمدنی اور اقتصادی بائیکاٹ نہیں ہو رہا ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جو پیشے مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے انکے لیے ہندو تیار کیے جاتے ہیں تاکہ مسلمانوں سے کام نہ لینا پڑے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آڑھت کے کاروبار میں مسلمان کا گھسنا قریب قریب ناممکن کر دیا گیا ہے، اور اگر کوئی مسلمان آڑھت یہ منڈی میں آتا ہے

اٹھا کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ زیادہ تر اسی تناسب آبادی کا لحاظ کیا گیا ہے جسکے متعلق کہا جاتا ہے کہ صرف فرقہ پرست ہی اس کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ بلکہ بعض جگہ تو تناسب آبادی سے بھی کم مسلمان لیے گئے ہیں۔

کیا یہ کھلی ہوئی علامات اس امر کی نہیں ہیں کہ سیاسیات کے دائرے میں بھی خود متحدہ قومیت کے علمبرداروں کے ہاں قومی امتیاز اور ترجیح ہم جنس کی اسپرٹ پوری طرح موجود ہے؟ ایسی حالت میں واحد قومیت کے اصول پر جمہوری اسٹیٹ بنانے کے معنی اس کے سوا کیا ہو سکتے ہیں کہ جہاں مسلمان کثیر التعداد ہوں وہاں وہ ہندوؤں کو، اور جہاں ہندو کثیر التعداد ہوں وہاں وہ مسلمانوں کو اسٹیٹ کے کاروبار سے بے دخل کر دیں، اور چونکہ مجموعی طور پر ہندوؤں کی اکثریت ہے اسلیے وہ قومی اسٹیٹ کو ہندو قوم کا اسٹیٹ بنانے میں کامیاب ہو جائیں۔

(۴) متحدہ قومیت کے اس سراسر جھوٹے دعوے پر جو قومی، جمہوری لادینی اسٹیٹ بنایا جائیگا وہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں مسلمانوں کیلیے تو بلاشبہ غیر مسلم اسٹیٹ ہوگا، مگر ہندوؤں کے لیے لازم نہیں کہ وہ غیر ہندو اسٹیٹ ہو، بلکہ اپنی اکثریت کے بل پر وہ اسکو ایک ہندو اسٹیٹ بنا سکتے ہیں، اور واقعات سے روز بروز عیاں ہوتا جارہا ہے کہ وہ ایسا ہی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اسکے لیے بھی میں صرف ایک صوبہ کے چند واقعات بطور نمونہ پیش کرونگا:۔

۱۔ سی پی کی کانگریسی حکومت کے تحت تعلقہ بورڈ چاندور کا ہندو چیرمین ۲۴ ستمبر ۱۹۳۸ء کو تمام مدارس کے نام سرکلر (نمبر ۶۴۴) جاری کرتا ہے جس میں حکم دیا جاتا ہے کہ ۲ اکتوبر کو مہاتما گاندھی کی سالگرہ کے دن بچے اور استاد سب مل کر ان کی تصویر کی پوجا کریں۔ یہ سرکلر بلا امتیاز ہندو و مسلم سب مدارس کو سرکاری طور پر بھیجا جاتا ہے اور اس پر کوئی باز پرس نہیں ہوتی۔

۲۔ اسی صوبہ کی کانگریسی حکومت محکمۂ پولیس کے حکام کو (جن میں ہندو اور مسلمان سب شامل ہیں) ہدایت نامہ بھیجتی ہے کہ جس جلسہ یا تقریب میں "بندے ماترم" کا گیت گایا جائے اور وہ وہاں موجود ہوں

تو انہیں بھی عام حاضرین کے ساتھ قیام تعظیمی کرنا چاہیے۔ اس واقعہ کو خود وزیر اعظم نے اپنے ایک پریس نوٹ میں تسلیم کیا ہے۔ (ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۰ جون ۳۸ء)

۳۔ ساگر (صوبہ متوسط) کی میونسپل کمیٹی کا صدر، مسلمان طلبہ کو تنبیہ کرتا ہے کہ اگر وہ بندے ماترم گانے میں شریک ہونگے تو انہیں مدرسے سے نکال دیا جائیگا۔ اس واقعہ کو بھی خود سی پی کے وزیر اعظم نے مذکورۂ بالا پریس نوٹ میں تسلیم کیا ہے۔

۴۔ اسی صوبہ کے ایک سرکاری مدرسے میں انجمن ترقی اردو کے نمائندے نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مسلمان بچے ہندو بچوں کے ساتھ مل کر سرسوتی کی پوجا کر رہے تھے، اور ان کو سلام کرنے کے بجائے ہاتھ جوڑ کر "جے رام جی کی" کہنا سکھا دیا گیا تھا (ملاحظہ ہو مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو کا خط گاندھی جی کے نام۔ اخبار "پیام" مورخہ یکم ستمبر ۳۸ء)

۵۔ خود کانگریس کانسٹی ٹیوشن میں برار کو اس کا مشہور و معروف نام چھوڑ کر "ودربھا" اور صوبۂ متوسط کو "مہا کوشل" سے موسوم کیا گیا ہے۔ گویا کہ اب رامائن کا عہد ہندوستان میں واپس آرہا ہے۔

۶۔ مسٹر شریف، وزیر صوبۂ متوسط کا واقعہ ابھی سب کے حافظہ میں موجود ہے۔ انہوں نے ایک ایسے مسلمان کو رہا کر دیا تھا جسے ایک ہندو لڑکی کے ساتھ زنا کرنے کے الزام میں عدالت سے سزا ہوئی تھی۔ اس جرم کی پاداش میں کانگریس ہائی کمانڈ نے انکو وزارت سے معزول کر دیا۔ مگر فسادات جبل پور کے سلسلہ میں جو ہندو ملزمین ۲ مسلمانوں کے قتل کے الزام میں ماخوذ تھے ان کو سی پی کی ہندو وزارت نے علانیہ رہا کر دیا اور اس پر ڈسپلن کے ان دیوتاؤں کو جن سے ہائی کمانڈ مرکب ہے، کسی باز پرس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ حال ہی میں ہوشنگ آباد کے ایک ہندو (بابو سنگھ) کو جسے ایک جوان لڑکی کو زہر دے کر مار ڈالنے کی پاداش میں ہائی کورٹ سے سزائے موت کا حکم ہوا تھا

سی پی کے ہندو وزیر مسٹر ڈی کے مہتا نے رہا کر دیا اور اس پر بھی ہائی کمانڈ کو کسی تحقیقات اور کسی تادیبی کارروائی کا خیال نہ آیا۔

۷۔ اسی صوبہ میں محض اکثریت کے زور پر ودیا مندر اسکیم نافذ کی جا رہی ہے اور مسلمانوں کی متفقہ مخالفت کا استخفاف کرنے میں گاندھی اور شکلا اور ہائی کمانڈ سب متفق ہیں۔

ان واقعات کے علاوہ بہار، یوپی مدراس اور سی پی میں قربانی گاؤ کو عملاً بند کرنے، اور ہندی کو "ہندوستانی" کے پُر فریب نام کی آڑ میں بزور رائج کرنے، اور زبان سے عربی و فارسی کے زبان زد عام الفاظ کو نکال کر نئے غیر مانوس الفاظ گھڑنے، اور سرکاری ملازمتوں میں کھلم کھلا متیا زبرتنے کے واقعات اس قدر کثیر ہیں کہ ان سب کو یہاں نقل کرنا موجب تطویل ہوگا۔ جو کچھ ہمیں ثابت کرنا تھا اسکے لیے مذکورۂ بالا شواہد کافی ہیں۔

اب ہر شخص خود دیکھکر فیصلہ کر سکتا ہے کہ جس "جنگ آزادی" کی منزل مقصود مسلمانوں کے قومی مفاد بلکہ انکی قومی ہستی ہی سے منافات کی نسبت رکھتی ہو اس میں کوئی مسلمان کس طرح حصہ لے سکتا ہے۔ مسلمانوں کو آخر اتنا بے وقوف کیوں فرض کیا گیا ہے کہ وہ اس نوعیت کے اسٹیٹ کو خود اپنے سر پر مسلط کرنے کے لیے جنگ کرینگے؟ کہیں وہ لوگ خود ہی تو عقل باختہ و ہوش ربودہ نہیں ہو گئے ہیں جو ایک قوم سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ جانتے بوجھتے اپنی قبر آپ کھودنے میں جانفشانی دکھائیگی؟

بنیادی حقوق

کہا جاتا تھا کہ اس قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ میں مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کیلیے وہ بنیادی حقوق (Fundamental rights) بالکل کافی ہونگے جنکا اعلان کراچی کانگریس میں کیا گیا تھا۔ مگر کیا یہ حقیقت ہے؟

بنیادی حقوق کا ماخذ ۱۶۸۹ء کا اعلان اہل انگلستان ہے جسے ایک طویل نزاع اور کشمکش کے بعد رعایا کے نمائندوں کی ایک مجلس (Convention) نے وضع کیا تھا تاکہ حکومت کے مستبدانہ افعال کی روک تھام کی جائے، اور حکومت و رعیت کے درمیان کچھ حدود معین کر دیے جائیں جنہیں توڑا نہ جاسکے۔ اسکے بعد امریکہ کے "اعلان آزادی" اور "اعلان حقوق انسانی" میں انہی حقوق کو بطور اصول عامہ کے درج کیا گیا۔ پھر ۱۸۳۱ء کے دستور نامۂ بلجیم میں ان کو شامل کیا گیا، اور اس کے بعد سے یہ گویا ایک قاعدہ سا بنگیا ہے کہ ہر دستور میں باشندوں کے ان حقوق کی تصریح کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ جدید زمانہ کا کوئی دستور ان سے خالی نہیں ہوتا بلکہ ہر بعد کے دستور میں چند حقوق کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ خلاصہ ان سب کا یہ ہے کہ: قانون کی نگاہ میں سب باشندے مساوی ہیں۔ کسی شخص کو کسی قسم کی سزا نہیں دی جاسکتی جب تک کہ وہ قانون کی خلاف ورزی نہ کرے، اور سزا قانون ہی کے مطابق دی جاسکتی ہے۔ حکومت رعایا کی شخصی آزادی اور جائداد میں صرف قانون ہی کے ذریعہ سے مداخلت کر سکتی ہے۔ تقریر اور نشر و اشاعت کی عام آزادی ہوگی بشرطیکہ وہ قانون قذف (Law of Libel) کے خلاف نہ ہو۔ ڈاک اور تار کے پیغامات میں رازداری قائم رکھی جائیگی۔ باشندوں کو اجتماع کا حق حاصل ہوگا

بشرطیکہ غیر مسلح ہوں اور امن عام کو نقصان نہ پہنچا ئیں۔ انتخابات آزاد ہونگے۔ پارلیمنٹ کے ارکان باز پرس سے محفوظ رہینگے۔ ان کو گرفتار نہیں کیا جا سکتا الّایہ کہ کوئی ممبر قانون کی خلاف ورزی کرتا ہوا پکڑا جائے۔ ان علاوہ جدید زمانہ کے دستوروں میں جن باتوں کا اضافہ کیا گیا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عورت اور مرد مساوی ہیں۔ یہ حقوق دراصل اس لیے وضع کیے گئے تھے کہ جب کبھی حکومت اپنی حدود سے تجاوز کرنے لگے تو رعایا کے پاس اپنی شخصی آزادی اور اپنے ذاتی حدود کی حفاظت کیلیے کوئی قانونی بنیاد موجود رہے، جسکی بنا پر وہ حکومت سے اپنے حق کا مطالبہ کر سکے، یا اگر حکومت نہ مانے اور رعایا کو لڑنا پڑے تو حکومت کا اخلاقی پہلو کمزور رہو۔ لیکن اوّل تو زمانۂ حال میں سیاسی تصورات کے انقلاب نے حکومت اور رعایا کے درمیان ہر اُس حدبندی کو توڑ دیا ہے جس کا خیال کیا جا سکتا ہے، حتیٰ کہ اب یہ بتانا قریب قریب محال ہو گیا ہے کہ حکومت کے حدود کہاں جا کر ختم ہوتے ہیں اور افراد رعیت کے حدود کہاں سے شروع ہوتے ہیں۔ ثانیاً یہ اعلان حقوق صرف اس صورت میں کام آسکتا ہے جب کہ جمہور قوم کی مرضی کے خلاف حکومت کی طرف سے کوئی ناروا مداخلت ہو اور باشندوں کی ایک کثیر تعداد اپنے حقوق کی حفاظت کیلیے کھڑی ہو جائے۔ مگر جہاں اکثریت کی حکومت ہو اور وہ اقلیت کے حقوق میں مداخلت کرے وہاں یہ اعلانِ حقوق قطعی بے کار ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً کراچی کے ریزولیوشن میں جن بنیادی حقوق کا ذکر کیا گیا ہے ان کا تجزیہ کر کے دیکھیے تو معلوم ہو جائیگا کہ وہ بجائے خود بھی ہمارے کسی مرض کی دوا نہیں۔

ان تینوں نکات کی مختصر تشریح ضروری ہے تاکہ عام ناظرین اس اہم بحث کو بآسانی سمجھ سکیں۔

(۱)

حکومت کے حدودِ عمل کیا ہیں؟ اس باب میں دنیا کے نظریات اور عملیات اٹھارویں اور

انیسویں صدی میں جو کچھ تھے، آج ان سے بالکل مختلف ہیں - اٹھارویں صدی میں شخصی حکومتوں کا دور دورہ تھا اور لوگ انکے استبداد سے نجات حاصل کرنے کیلیے جدوجہد کر رہے تھے اسلیے لوگوں کے ذہن پر حکومت اور رعیت کے تعلق کا مشینی نظریہ (Mechanical Theory) مستولی تھا، یعنی ان کا تصور یہ تھا کہ افراد کا مجموعہ ایک الگ چیز ہے اور اسٹیٹ ایک دوسری چیز، اور ان دونوں میں باہم کچھ اس طور پر معاملہ ہوتا ہے جیسے بائع اور مشتری یا اجیر اور مستاجر کے درمیان ہوا کرتا ہے - اسی خیال نے اسٹیٹ کے حدود عمل کا انفرادی نظریہ (Individualism) پیدا کیا جس کا منشا یہ ہے کہ اصل چیز فرد کی آزادی ہے - اسی کی حفاظت کیلیے فرد اس معاہدۂ عمرانی (Social Contract) میں شریک ہوتا ہے جسکی بدولت اسٹیٹ وجود میں آیا ہے - لہذا اسٹیٹ کا کام اسکے سوا کچھ نہیں کہ افراد کی شخصی آزادی کی حفاظت کرے اور ایک فرد کی آزادی میں دوسرے کی مداخلت کو روکے - جان و مال کی حفاظت، امن قائم کرنا، انصاف کرنا، اور حدود مملکت کو بیرونی حملوں سے بچانا، بس یہ اسکے فرائض ہیں - ان حدود سے آگے بڑھ کر اشخاص کے ذاتی معاملات میں مداخلت کرنا، خواہ وہ اشخاص کی بھلائی ہی کیلیے ہو، اور کیسی ہی نیک نیتی کے ساتھ ہو، بہرحال ناجائز ہے - اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں یہ عام خیال تھا اور اسی بنا پر بعض علمائے سیاست نے ان کاموں کی ایک فہرست بھی بنا دی تھی جو حکومت کے دائرۂ عمل میں آسکتے ہیں -

یہ تخیلات اُس زمانے میں بھی قائم رہے اور کافی مدت تک چلتے رہے جب شخصی حکومتوں کی جگہ جمہوری حکومتیں لے رہی تھیں - مدتوں تک لوگوں کو محسوس نہ ہوسکا کہ جمہوریت اور دائرۂ حکومت کی حد بندی دونوں باہم متضاد ہیں - جب سوسائٹی خود اسٹیٹ بناتی ہے تو وہ اپنے اوپر خود کس طرح پابندی عائد کرسکتی ہے، اور اسکو اپنے اوپر ایسی پابندی عائد کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ وہ اسٹیٹ

کو اسی لیے تو وجود میں لاتی ہے کہ جبر۔۔ اور تنظیم کی طاقت سے اپنی ان اجتماعی ضروریات کو پورا کرے جن کے لیے تنظیمی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر آخر کونسی معقول وجہ ہے کہ وہ اس تنظیمی طاقت کے استعمال کو اپنی بعض ضروریات کیلیے جائز اور بعض کیلیے ناجائز ٹھہرائے؟ اس حد بندی کی ضرورت تو اُس وقت تھی جب حکومت سوسائیٹی سے الگ۔۔۔۔ ایک چیز ہوتی تھی اور کہیں اوپر سے آکر مسلط ہو جایا کرتی تھی۔ مگر جب خود سوسائیٹی ہی سے حکومت پیدا ہو تو ایسی صورت میں اس حد بندی کی کیا حاجت؟

فرد، سوسائیٹی اور اسٹیٹ کو ایک زندہ نظام جسمانی کی طرح سمجھنے کا یہ تخیل (Organic Theory of State and Society) جمہوری افکار کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ برابر ترقی کرتا چلا گیا اور سوشلزم نے آکر اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ اب دنیا میں ہر جگہ حکومت کے دائرۂ عمل کی حدیں ٹوٹ کر پوری اجتماعی زندگی پر پھیل رہی ہیں۔ تمدن، معاشرت اور معیشت کی جڑوں تک میں اتر تی جا رہی ہیں، اور جزئی سے جزئی معاملات تک کو اپنی لپیٹ میں لیتی چلی جاتی ہیں۔ باشندوں کی روٹی کا بندوبست کرنا، انکے لیے کام مہیا کرنا، انکے معیار زندگی کو بلند کرنا، اور انکے لیے زیادہ سے زیادہ آسائش بہم پہنچانا مانا یہ ہیں اب حکومت کے فرائض۔ ان فرائض کو انجام دینے کیلیے وہ ملک کے معاشی ذرائع کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کرنے پر مجبور ہے، اور اس طرح گویا پوری معاشی زندگی اپنے صنعتی اور تجارتی اور مالی شعبوں سمیت حکومت کے دائرے میں آجاتی ہے۔ پھر وہ اپنے اُن فرائض کی انجام دہی کیلیے تعلیم کا بھی پورا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے پر مجبور ہے تاکہ باشندوں کو ان اغراض کیلیے کارآمد بنا سکے۔ مزید براں ان فرائض کی بجا آوری میں یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ افراد یا افراد کے مختلف مجموعوں کی شخصی آزادی یا انکی انفرادی خواہشات، یا انکے مخصوص حقوق کا ہر حال میں لحاظ کیا جا سکے۔ ان سب چیزوں کا صرف اسی حد تک خیال رکھا جا سکتا ہے اور اسی شرط کے ساتھ رکھا

جاسکتا ہے کہ وہ حکومت کے فرائض کی ادائگی میں حارج نہ ہوں۔ جہاں وہ حائل ہونگے وہاں انکی انفرادیت کو پامال کر دیا جائیگا۔ اب یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص یا کوئی گروہ اس فیصلہ میں خود مختار ہو کہ اپنے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دلائے۔ یہ حکومت کا کام ہے کہ اجتماعی فلاح کے نقطۂ نظر سے جس طرح مناسب سمجھے ان کو تیار کرے۔ تمدنی اور معاشرتی معاملات میں بھی اب انفرادی آزادی یا گروہی آزادی کا حق مسلّم نہیں ہے۔ حکومت اجتماعی فلاح کیلیے تمدن و معاشرت میں جس قسم کا تغیر ضروری سمجھے، کر سکتی ہے، حتیٰ کہ وہ یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ فلاں طرز کا لباس پہنو اور فلاں طرز کا نہ پہنو، فلاں رسم الخط استعمال کرو اور فلاں کو چھوڑ دو، اس عمر میں شادی کرو اور اس عمر میں نہ کرو، وعلیٰ ہذا۔ اسی طرح جب کہ وہ باشندوں کی معاشی فلاح و ترقی کی ذمہ دار ہے تو وہ تجارت، صنعت و حرفت، زراعت اور اموال و املاک کے باب میں بھی لوگوں کے شخصی حقوق کی رعایت ہمیشہ ملحوظ نہیں رکھ سکتی۔ وہ مجبور ہے کہ معیشت کی پوری مشین کو ایک اجتماعی مقصد کے مطابق چلائے اور جو شخصی حقوق اس راہ میں حائل ہوں انہیں پامال کر دے۔ چنانچہ جنگِ عظیم کے بعد جتنے جمہوری دساتیر بنائے گئے ہیں قریب قریب ان سب میں اس قسم کی دفعات رکھی گئی ہیں جنکی بنا پر حکومت کو شخصی املاک اور شخصی کاروبار میں دخل دینے کے نہایت وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً تاجر کے مال کو جبراً فروخت کرا دینا، شخصی املاک پر بمعاوضہ یا بلا معاوضہ قبضہ کر لینا[1]۔ باشندوں کی سکونت یا نو آبادکاری یا ترقی زراعت کے لیے اگر ضرورت ہو تو زمینوں کو بلا معاوضہ ضبط کر لینا[2]۔ موروثی جائداد اگر ایک حد خاص سے زیادہ ہو تو اسے چھین کر تقسیم کر دینا[3]۔ وراثت میں اسٹیٹ کا حصہ مقرر کرنا[4]۔ حتیٰ کہ پرائیویٹ کاروبار کی

---

[1] دستور جرمنی دفعہ ۱۵۳ پارۂ دوم۔ دستور پولینڈ دفعہ ۹۹۔ دستور چیکوسلوواکیا دفعہ ۱۰۹

[2] ایضاً دفعہ ۱۵۵۔

[3] دستور یوگوسلیویا دفعہ ۴۲۔ ایستھونیا، لیٹویا اور لتھوانیا میں بھی اس مضمون کے قوانین پاس کیے گئے ہیں۔

[4] دستور جرمنی دفعہ ۱۵۴۔ دستور یوگوسلیویا دفعہ ۳۹۔

تنظیم اور مراسلت و مخابرت میں بھی مداخلت کرنا اگر اجتماعی مفاد کیلئے اسکی حاجت ہو۔[1]

حکومت کے دائرے کی اس وسعت اور لامحدودیت نے اول تو بنیادی حقوق کو محض بے معنی بنا دیا ہے، کیونکہ جن حقوق کو انسان کے بنیادی اور پیدائشی حقوق کہا جاتا ہے ان سب کو آج کی حکومت اجتماعی فلاح کے نام سے سلب کرسکتی ہے۔ دوسری اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جمہوری نظام میں حکومت کے قوانین بنانے اور نافذ کرنے والی چیز اکثریت ہوتی ہے، اور یہ فیصلہ کرنا بھی اکثریت ہی کا کام ہوتا ہے کہ اجتماعی فلاح کیا ہے اور اسکا اقتضاء کیا ہے۔ لہذا اب اکثریت کے ظلم و جور اور استبداد کی کوئی حد نہیں رہ جاتی۔ اقلیت کی پوری زندگی کے دروازے اسکی قاہرانہ مداخلت کیلئے کھل جاتے ہیں۔ وہ اسکے تمدن اسکی معیشت و معاشرت اور اسکے مذہبی قوانین میں اجتماعی مفاد کے نام سے جس طرح اور جتنی چاہے مداخلت کرسکتی ہے، اور تعلیم کے نظام کو اپنے ہاتھ میں لیکر اسکی قومیت کو بالکل مٹا دینے کی بھی کوشش کرسکتی ہے۔

(۲)

بنیادی حقوق اگر کسی حد تک کام آسکتے ہیں تو صرف اس صورت میں جبکہ باشندگان ملک کی بڑی اکثریت ان کی حفاظت کا ارادہ رکھتی ہو اور اتفاقاً کوئی ایسی گورنمنٹ ملک پر مسلط ہو گئی ہو جو ان حقوق کو سلب کرنا چاہتی ہو۔ رہی یہ صورت کہ خود وہ اکثریت ہی ظلم پر اتر آئے جو حکومت جمہوریہ کو چلا رہی ہو، تو ایسی صورت میں بنیادی حقوق کی کوئی لمبی سے لمبی فہرست بھی اقلیت کے کام نہیں آسکتی۔

خود برطانیہ عظمیٰ کی مثال لے لیجیے جہاں سے ان بنیادی حقوق کی ابتدا ہوئی ہے۔ ۱۸۲۸ء تک وہاں پارلیمنٹ اور مجالس بلدیہ اور سرکاری ملازمتوں میں داخل ہونے کیلئے چرچ آف انگلینڈ

[1] دستور یوگوسلیویا دفعہ ۲۵۔

کے طریقہ پر عشائے ربانی لینا لازم تھا۔ ۱۸۲۹ء تک کیتھولکس ہر قسم کی نمایندگی سے محروم تھے ۱۸۶۷ء تک یہودی پارلیمنٹ میں نہ جا سکتے تھے ۱۸۵۴ء تک آکسفورڈ اور کیمبرج کے دروازے ان لوگوں کیلیے بند تھے جو پراٹسٹنٹ مذہب کے ۳۹ اصولوں پر ایمان نہ لاتے ہوں، اور ۱۸۷۱ء تک ان دونوں یونیورسٹیوں میں ایسے کسی شخص کو کسی قسم کا عہدہ یا امتیاز یا وظیفہ تعلیمی نہ مل سکتا تھا۔ ۱۸۸۱ء تک چرچ آف انگلینڈ کی پیروی نہ کرنے والوں کیلیے دفن اموات کے بارے میں طرح طرح کی قیود موجود تھیں ۱۸۸۸ء تک عدالت میں شہادت دینے والوں کیلیے حلف کی ناروا قیود پائی جاتی تھیں۔ اور آئرلینڈ کی اقلیت کیساتھ تو ۱۹۲۰ء تک جو کچھ ہوتا رہا وہ ساری دنیا پر عیاں ہے۔

ممالک متحدہ امریکہ کی مثال اس سے بھی زیادہ سبق آموز ہے۔ وہاں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ حبشی آباد ہیں جنکا تناسب کل آبادی میں ۹ فیصدی سے کچھ زیادہ ہے۔ دستور کی رو سے ان کو سفید فام امریکیوں کے برابر پورے شہری حقوق حاصل ہیں۔ جمہوری دولت مشترکہ میں وہ بھی برابر کے حصہ دار ہیں۔ اور قانون میں کوئی چیز ایسی نہیں جسکی بنا پر سفید فام اور سیاہ فام میں امتیاز کیا جا سکتا ہو۔ مگر عملاً کیا ہو رہا ہے؟ سفید فاموں کی اکثریت انکے ساتھ کھلم کھلا امتیازی برتاؤ کر رہی ہے شہری حقوق تو درکنار ان کے معمولی انسانی حقوق تک علانیہ سلب کیے جا رہے ہیں اور دستور کے عطا کردہ بنیادی حقوق ان کے کسی کام نہیں آتے۔ سفید فاموں کے کلیساؤں میں وہ گھس نہیں سکتے۔ انکے ہوٹلوں، ریسٹوران اور تھیٹروں میں وہ قدم نہیں رکھ سکتے۔ انکی تفریح گاہوں میں کوئی حبشی اگر چلا جاتا ہے تو سخت ذلت کے ساتھ نکالا جاتا ہے۔ موٹر بسوں اور ریل کے ڈبوں میں بھی سفید فام کیساتھ حبشی کا بیٹھنا جائز نہیں رکھا جاتا۔ سفید فاموں کے محلوں میں کوئی حبشی مکان نہیں لے سکتا۔ انکے بچوں کے ساتھ حبشی کا بچہ ایک مدرسہ میں بیٹھ نہیں سکتا۔ ان کی جان، مال، عزت، آبرو کسی چیز کی کوئی قیمت نہیں۔ حتیٰ کہ انکے ساتھ انتہائی وحشیانہ برتاؤ کرنے سے بھی مہذب گوروں کا ضمیر ابار نہیں کرتا، اور بہت ہی کم کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی

حبشی کی خاطر کسی گورے کے خلاف قانون کی مشین حرکت میں آتی ہو۔

یہاں اس برتاؤ کی تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں جو امریکہ کی اکثریت حبشی اقلیت کیساتھ کر رہی ہے۔ مگر میں اختصار کیساتھ یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں اکثریت اور اقلیت کو نسل یا رنگ یا مذہب یا کسی اور چیز نے حقیقتاً ایک دوسرے سے جدا کر رکھا ہو وہاں اکثریت کی حکومت کیا رنگ ڈھنگ اختیار کرتی ہے اور دستور اور اسکے بنیادی حقوق اور قانون اور اسکی کاغذی دفعات کا کیا حشر ہوا کرتا ہے۔

امریکہ میں حبشیوں کے متعلق بغیر کسی سائنٹفک بنیاد کے یہ نظریہ قائم کیا گیا تھا کہ حیاتی نقطہ نظر سے (Biologically) وہ تعلیم کیلیے نا اہل ہیں اور عمرانی نقطہ نظر سے (Socially) ان کو تعلیم دینا انہیں ناکارہ بنا دینا ہے، یعنی پھر وہ خدمتگار بننے کے بجائے برابر والے بننے لگیں گے اس بنا پر بعض ریاستوں میں انہیں تعلیم دینا حکماً ممنوع تھا اور بعض ریاستوں میں اسے بُرا سمجھا جاتا تھا۔ کئی سال تک حبشی خود اپنی کوششوں سے اور اپنے روپے سے مدارس قائم کرتے اور اپنے بچوں کو تعلیم دلواتے رہے۔ یہاں تک کہ جب انہوں نے اپنی دماغی قابلیت دنیا پر ثابت کر دی تب ۱۹۰۵ء سے انکے مدارس کو سرکاری امداد ملنے کا سلسلہ شروع ہوا۔

قانون کی نگاہ میں حبشی اور سفید امریکن عملاً برابر نہیں ہیں اگرچہ لفظاً برابر ہیں۔ حبشی کیلیے قید کی مدت ہمیشہ زیادہ رکھی جاتی ہے۔ ۱۹۱۰ء کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ حبشیوں کو اوسطاً ۱۷ مہینہ اور سفید فاموں کو اوسطاً ۹ مہینہ کی سزائیں دی گئیں۔ آبادی میں تو حبشیوں کا تناسب ۹ فی صدی ہے مگر جیل خانوں کی آبادی میں ان کا تناسب ۳۱ فیصدی۔

۱۸۸۰ء میں حبشی قیدی فی لاکھ آبادی میں	۲۴۴	تھے اور سفید فام		۹۷
۱۸۹۰ء	// //	۲۷۴	// //	۸۴

۱۹۰۴ء میں حبشی قیدی فی لاکھ آبادی ہیں	۲۷۸	تھے	اور سفید فام			۷۷
۱۹۱۰ء	//	//	//	۳۸۴	//	۸۹
۱۹۲۳ء	//	//	//	۳۲۷	//	۷۷

اس طرح سفید فاموں کی تعداد تو جیل خانوں کی آبادی میں برابر کم ہوتی جارہی ہے مگر حبشیوں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے[1]۔ اسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ حبشی زیادہ جرائم کرتے ہیں۔ شکاگو میں ایک کمیشن نسلی تعلقات کی تحقیق کیلیے مقرر کیا گیا تھا جو Chicago Commission of Racial Relations کے نام سے مشہور ہے[2]۔ اس کمیشن کے سامنے ایک جج نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ "جس شہادت کو جیوری ایک حبشی کو مجرم قرار دینے کیلیے کافی سمجھتی ہے وہی شہادت ایک سفید فام کو سزا دینے کیلیے ناکافی سمجھی جاتی ہے"۔ ایک دوسرے جج نے کہا کہ "ایک ہی طرح کے حالات اور واقعات میں سیاہ فام کو سزا دینا آسان ہے اور سفید فام کو سزا دینا مشکل۔ حبشیوں اور سفید فاموں کے فسادات میں پولیس تمام تر حبشیوں کو پکڑتی ہے اور سفید فام پر شاذو نادر ہی ہاتھ ڈالا جاتا ہے"۔ شکاگو کمیشن اپنی تحقیقات کے نتائج بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"تمام شہادتیں قریب قریب متفق ہیں کہ حبشی بہ نسبت سفید فاموں کے زیادہ پکڑے جاتے ہیں، کیونکہ پولیس کا عام مفروضہ یہ ہے کہ حبشی زیادہ جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ اور پولیس یہ بھی جانتی ہے کہ حبشی کو گرفتار کر لینے میں کوئی خطرہ نہیں۔ رہا سفید فام تو اس پر ذرا احتیاط ہی سے ہاتھ ڈالنا چاہیے...... ایک ایک جرم میں بہت سے حبشی پکڑ لیے جاتے ہیں لہٰذا محض قید خانوں میں حبشیوں کی آبادی زیادہ دیکھ کر یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ زیادہ جرم کرتے ہیں.... سفید فاموں کی بہ نسبت حبشی کم ہی گرفتاری سے بچ سکتا ہے"۔

---

[1] Encyclopædia Britannica. Article: Negros in America

[2] اس کمیشن کی رپورٹ (Negros in Chicago) کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

یہ تو قانون کا حال ہوا - اور وہ اکثریت جو جمہوری نظام کو چلا رہی ہے اس کا کیا حال ہے ؟ حق رائے دہی پر عملاً ایسی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں کہ حبشیوں کی ایک بڑی تعداد "شہری" (Citizen) ہونے کے باوجود خود بخود ووٹ دینے کے حق سے محروم ہو جاتی ہے - سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان کیلیے گویا بند ہیں - آج تک کوئی حبشی کسی ذمہ داری کے منصب پر فائز نہ ہو سکا - البتہ جنگ میں توپوں کا ایندھن بننے کیلیے وہ ضرور بھیجے گئے تھے اور اب بھی اس کام کیلیے تیار کیے جا رہے ہیں -

عامۃ الناس ان کو صرف ملیچھ ہی نہیں سمجھتے بلکہ بات بات پر فساد ہوتے ہیں اور ان کو نہایت بے دردی سے قتل کیا جاتا ہے - سنہ ۱۹۱۹ کا واقعہ ہے کہ شکاگو میں یکایک افواہ اڑی کہ کسی حبشی نے ایک اٹالین لڑکی کو مار ڈالا ہے - اس پر سفید فام لوگوں کا ایک مجمع اکٹھا ہو گیا اور اس نے ایک راہ چلتے حبشی پر حملہ کر دیا - کارونر کی عدالت میں جب اسکی لاش پیش ہوئی تو ۱۳ گولیاں اسکے جسم سے نکلیں، کھوپڑی چور چور پائی گئی اور پسلیوں کے ٹکڑے ہو چکے تھے - بعد میں معلوم ہوا کہ اٹالین لڑکی کے واقعہ کی کوئی اصلیت نہ تھی - پریزیڈنٹ ولسن جب پیرس میں بیٹھے ہوئے جرمنوں کے مظالم پر گریہ فرما رہے تھے اس وقت شکاگو میں ایک حبشی زندہ آگ پر بھونا جا رہا تھا - امریکہ میں انصاف کا ایک نرالا طریقہ رائج ہے جسے لنش کرنا (Lynching) کہتے ہیں - اس کے معنی یہ ہیں کہ عوام جب عدالت کے فیصلہ سے مطمئن نہ ہوں یا قانون کی سست رفتار مشین کو آہستہ چلتے دیکھ کر صبر نہ کر سکیں تو قانون کو خود اپنے ہاتھ میں لے لیں اور جس شخص کو وہ مجرم سمجھتے ہوں اسے اپنے نزدیک جو منصفانہ سزا چاہیں دیدیں - اس طریق انصاف کا وار عموماً حبشیوں پر ہی ہوتا ہے، چنانچہ "نیویارک ورلڈ" نے سنہ ۱۸۸۵ سے سنہ ۱۹۲۶ تک کے جو اعداد و شمار شائع کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۱ سال کی مدت میں ۳۲۰۵ حبشی برسر عام لنش کیے گئے - لنشنگ عموماً اس قصور میں ہوتا ہے کہ کسی گوری عورت سے کسی حبشی کا تعلق پایا جائے یا ایسے تعلق کا شبہ کیا جائے - لیکن سفید فام امریکن کا ضمیر صرف اسی

قت آمادۂ شورش ہوتا ہے جب کالا مرد گوری عورت کے پاس پایا جائے۔ رہی کالی عورت تو اس پر گوروں
کے پیدائشی حقوق ہیں۔ حبشی کے متعلق عام رائے گورے صاحبان کی یہ ہے کہ وہ وحشی جانور (Brute)
وتا ہے، اس کا معیار اخلاق بہت پست ہوتا ہے، بلکہ اس میں اخلاقی احساس ہوتا ہی نہیں۔ عورتوں
ور بچوں پر حملہ آور ہونا اور بدمعاشی کرنا اسکی سرشت میں داخل ہے۔ گویا ہمارے ملک کے ہندو اخبارات
کی زبان میں وہ ایک پیدائشی "غنڈا" ہوتا ہے۔ لیکن شکاگو کمیشن نے باقاعدہ تحقیقات کر کے ثابت
کیا ہے کہ حبشی کا معیار اخلاق صاحب لوگوں سے بہت بلند ہوتا ہے، اور صاحب لوگ خود اپنی قوم
کی عورتوں پر اور کالی عورتوں پر حملہ کرنے میں جس قدر بے باک ہیں حبشی غریب اس کا عشر عشیر
بھی نہیں۔ البتہ حبشی سے جب یہ قصور ہو جاتا ہے (اور وہ بھی زیادہ تر میم صاحبات ہی کی دعوت
اور اشتعالک کا نتیجہ ہوتا ہے) تو صاحب لوگوں میں اس پر شور مچ جایا کرتا ہے اور یہی حبشی کے
بدنام ہونے کی اصلی وجہ ہے۔ کمیشن کے سامنے ایک جج نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ نابالغ لڑکیوں
کے ساتھ زنا بالجبر کرنے والا حبشی تو میری عدالت میں کبھی آیا ہی نہیں، البتہ سفید فام بہت سے آئے۔
ایک دوسرے جج نے بیان کیا کہ میری کل مدت ملازمت میں صرف ایک حبشی اس جرم میں ماخوذ ہو کر
آیا ہے حالانکہ سفید فام اکثر پکڑے ہوئے آتے ہیں۔

۱۸۶۵ء سے امریکہ میں ایک خفیہ جماعت کام کر رہی ہے جس کا نام کو کلکس کلان (Ku Klux Klan)
ہے۔ اس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ سیاہ فاموں پر سفید فاموں کے تفوق کی حفاظت کی جائے اور امریکہ
میں کالی نسل کے مسئلہ (Negro Problem) کو اس طرح حل کیا جائے کہ ریڈ انڈین قوم کی
طرح یہ قوم بھی رفتہ رفتہ فنا ہو جائے[1]۔ یہ امریکہ کی سب سے زیادہ طاقتور سنگھٹن ہے جس کے ارکان کی

[1] ۱۸۶۵ء سے اب تک امریکہ کی گوری نسل میں ۱۳ سو فیصدی اضافہ ہوا ہے اور ریڈ انڈین نسل کی آبادی میں ۵۰ فیصدی کمی ہوئی ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ اس صدی کے خاتمہ تک ایک بھی ریڈ انڈین باقی نہ رہیگا۔ یہ وہ قوم ہے جو سفید فاموں سے پہلے اس ملک میں آباد تھی۔

تعداد ۱۹۲۳ء میں پندرہ لاکھ تھی۔ ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ، اونچی سوسائیٹی والے اور حکومت کے حلقوں سے قریبی تعلق رکھنے والے لوگ اس میں شریک ہیں۔ صوبوں کے گورنر، پولیس اور جیل اور عدالت کے حکام تک ان سے ساز باز رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ بڑے بڑے ہولناک جرائم کرجاتے ہیں اور کبھی نہیں پکڑے جاتے۔ جیل کی کوٹھریوں تک سے قیدیوں کو نکال لے جاتے ہیں اور قانون کی مشین ساکت و صامت کھڑی رہتی ہے۔ (America Comes of Age) کا مصنف لکھتا ہے کہ "وہی مہذب شائستہ جنٹلمین جس سے آپ بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں، ہو سکتا ہے کہ رات کو وہ جنگل میں کسی آدمی کو قتل کرکے آیا ہو اور اسکے ساتھ اس جرم میں بہت سے وہ لوگ شریک ہوں جنہیں آپ دن کے وقت نہایت عزت وافتخار سے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔" چند ہولناک جرائم کے سلسلہ میں ریاست ٹیکساس Texas کے گورنر نے تحقیقات کرائی تو پتہ چلا کہ مجرموں میں ایک تو پادری صاحب تھے اور متعدد ایسے لوگ تھے جو خود گورنر صاحب کے احباب سے تعلق رکھتے تھے۔

یہ مہذب لوگ حبشیوں کے مسئلہ کو کس طرح حل کر رہے ہیں؟ چند مثالیں ملاحظہ ہوں: ایک حبشن کو مارتے مارتے بیہوش کردیا اور ننگا کرکے جنگل میں چھوڑ آئے تاکہ سردی سے مرجائے۔ ایک حبشی کی ہنٹروں سے کھال ادھیڑ دی یہاں تک کہ مجبور ہو کر اس نے اپنی زمین کم قیمت پر ایک سفید فام شخص کے ہاتھ بیچ دی۔ ایک حبشی کو پکڑ کر جنگل لے گئے، رسیوں اور خاردار تاروں سے اسے باندھا، ہنٹر مار مار کر اسکی کھال ادھیڑی، پھر اسکے زخموں پر کریا زوٹ چھڑک کر چل دیے اور وہ گھنٹوں تڑپ تڑپ کر مرا۔ ایک حبشن اور اسکے لڑکے کو پکڑے گئے اور دونوں کو ایک ریل کے پل سے باندھ دیا۔ ایک غریب کو ہسپتال سے اٹھا لے گئے اور اسکو زندہ آگ پر بھون ڈالا۔ ایک بے چارے کو ٹیلیفون کے کھمبے سے باندھا اور مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگادی۔ حبشی کا سب سے بڑا قصور جسے معاف نہیں کیا جاسکتا"

ل؎ یہ واقعات رسالہ "نیو ایج" میں شائع ہوئے ہیں۔

یہ ہے کہ وہ سفید فام آبادی میں یا اسکے قریب جائداد رکھتا ہو، یا سکونت اختیار کرے ۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان صرف شہر شکاگو میں ۵۸ مرتبہ ایسے مکانات کو بم سے اڑایا گیا جو حبشیوں نے خریدے تھے یا جو کسی سفید فام نے حبشی کو کرایہ پر دیئے تھے۔ایک حبشی بنیکر (Binga) کے مکان اور دفتر پر ایک سال کے اندر ۷ مرتبہ بم پھینکا گیا، صرف اس قصور میں کہ وہ حبشیوں کے لیے مالی تقویت کا موجب بن گیا ہے، اسکے بنیک سے حبشیوں کو اچھی شرائط پر روپیہ مل جاتا ہے، اور اسکی بدولت حبشی لوگ جائداد خریدنے لگے ہیں۔۔۔ یہ واقعات ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ جو حبشی ۱۷۹۰ء میں ممالک متحدہ امریکہ کی آبادی کا ۱۹ فی صدی حصہ تھے وہ آج ۹ فی صدی رہ گئے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ امریکہ کے کانسٹی ٹیوشن میں حبشی اقلیت کے بنیادی حقوق بالکل محفوظ ہیں۔

جرمنی کی ایک اور مثال آپ کے سامنے ہے۔جرمن کانسٹی ٹیوشن کی رو سے تمام باشندگان ملک کے بنیادی حقوق مسلّم ہیں۔مگر آج وہاں کی غیر آریہ نسل کیساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ کس سے پوشیدہ ہے۔ ان کیلیے جرمنی کے حدود میں عزت کی روٹی کمانا قریب قریب محال ہو گیا ہے اور وہاں سے نکل جانا بھی اتنا ہی محال ہے۔ سرکاری اور خانگی دونوں قسم کی ملازمتوں کے دروازے ان کیلیے بند ہیں۔ تجارت بھی وہ آزادی سے نہیں کر سکتے۔ دوسرے آزاد پیشوں سے بھی ان کو نکالا جا رہا ہے۔ عدالتوں میں انکے ساتھ کھلم کھلا نسلی امتیاز برتا جاتا ہے۔ ان کیلیے انصاف کا نظریہ، یہ قائم کیا گیا ہے کہ ہر غیر آریہ پیدائشی مجرم ہے تاوقتیکہ وہ اپنے آپ کو غیر مجرم ثابت نہ کر دے۔ عام باشندے اگر ان سے لین دین یا کسی قسم کا معاملہ کرتے ہیں تو ان پر حکومت کا عتاب ہوتا ہے۔ ملک کے مدارس میں ان کے بچوں پر ناقابل برداشت پابندیاں ہیں اور اگر وہ ملک سے باہر تعلیم حاصل کرنے کیلیے بھیجے جاتے ہیں تو ان کو صرف ہجرت کا پاسپورٹ دیا جاتا ہے تاکہ واپس نہ آسکیں۔ انکے والدین اگر ان سے ملنے کیلیے باہر جانا چاہتے ہیں تو انہیں بھی مہاجر کی حیثیت سے جانے کی اجازت دیجاتی ہے اور مہاجر کیلیے یہ قانون بنا دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مال و دولت کا صرف دس

لہ تفصیلات کیلیے کتب ذیل ملاحظہ ہوں:۔
J. E. Cutter, Lynch Law. C. G. Woodson, The Negros in Our

فیصدی حصہ جرمنی سے باہر لے جاسکتا ہے، باقی سب ضبط۔

یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی کونسا ملک ایسا ہے جس کے دستور اساسی میں بنیادی حقوق موجود نہیں ہیں؟ اور کونسا ملک ایسا ہے جہاں دستور کے بنیادی حقوق نے اقلیت کو اکثریت کے ظلم سے بچایا ہو؟ ہر جگہ ملک کی پوری آبادی کو ایک قوم فرض کر کے ایک جمہوری اسٹیٹ بنا دیا گیا اور دستور اساسی میں بنیادی حقوق مقرر کر دیئے گئے، مگر جہاں بھی اکثریت اور اقلیت کے درمیان مذہب یا نسل یا زبان کی بنیاد پر قومی امتیاز موجود ہے وہاں اکثریت کی یہی کوشش ہے کہ یا تو اقلیت اپنے قومی وجود کو اکثریت کی قومیت میں گم کر دے یا پھر اسے شودر بنا کر رکھا جائے اور مختلف طریقوں سے اس کو فنا کر دیا جائے۔ یوگوسلیویا میں جب کروٹس نے مطالبہ کیا کہ ان کی قوم کا ایک الگ صوبہ بنایا جائے اور اسے آٹانومی دیدی جائے۔ تو آپ کو معلوم ہے کہ سربیوں نے ان کو کیا جواب دیا؟ اس جواب کو لفظ بلفظ سن لیجیے:-

"سرب، کروٹ اور سلافینی درحقیقت ایک قوم ہیں۔ غیر ملکی سامراج نے ان کو زبردستی الگ کر رکھا تھا۔ اب جبکہ بیرونی جوا ہمارے کندھوں پر سے اتر گیا ہے تو قومی وحدت کا احساس فتح یاب ہو کر ابھر آیا ہے اور اس نے ان تمام حدبندیوں کو توڑ دیا ہے جو سیاسی ادارات اور زبان اور مذہب نے پیدا کر دی تھیں۔ وحدت کے اس احساس کو برقرار رکھنے اور بڑھانے کیلیے ضروری ہے کہ قدیم جغرافی تقسیم جس کے ذریعہ سے غیر ملکی حکمرانوں نے قوم کو تقسیم کر دیا تھا، منسوخ کر دی جائے۔ مقامی نظم و نسق کیلیے صوبوں کی بالکل نئی تقسیم ہونی چاہیے تاکہ ہر صوبوں کی حدبندیاں نسلی حلقے (Racial Groups) نہ بنا سکیں"[1]

بالکل یہ معلوم ہوتا ہے یا نہیں کہ آزاد ہندوستان میں جواہر لال نہرو تقریر فرما رہے ہیں؟ یہ گویا ایک قاعدہ کلیہ سا بن گیا ہے کہ واحد قومیت کا جو شبیلا وعظ وہی قوم کیا کرتی ہے جس کا سو فی صدی فائدہ اسی وعظ میں ہوتا ہے۔ اور وہ بے وقوف لوگ بعد میں پچھتاتے ہیں جو آزادی کے جوش میں تو "ایک قوم ایک

[1] A. H. Morley, The New Democratic Constitutions of Europe

ملک" کی صدائیں بلند کیا کرتے ہیں، مگر جب آزادی کے بعد واحد قومیت اژدہے کی طرح ان کو نگلنا شروع کرتی ہے تو غیظ کے مارے بل کھاتے ہیں اور قدرت کا بے لاگ قانون ان احمقوں سے پکار کر کہتا ہے کہ موتوا بغیظکم ـــــ جس وقت یوگوسلیویا کی نیشنل اسمبلی میں کروٹس کے اعتراضات کا مذکورۂ بالا جواب دیا گیا تو سنا ہے کہ کروٹ نمایندے احتجاجاً اسمبلی سے اٹھ گئے اور انکے جانے کے بعد سربی اکثریت نے اور زیادہ آسانی کے ساتھ وہ سب کچھ پاس کر لیا جو وہ پاس کرنا چاہتی تھی۔ اس وقت بنیادی حقوق دور کھڑے ہنستے رہے اور کہتے رہے کہ "کہو! کیسا بے وقوف بنایا"!

(۳)

اب ذرا ان بنیادی حقوق کا بھی تجزیہ کر دیکھیے جو کراچی ریزولیوشن میں تجویز کیے گئے ہیں اور جنکی بنا پر ہمارے بہت سے سادہ لوح بھائی ملک بھر میں مسلمانوں کو سمجھاتے پھرتے ہیں کہ بھائیو! کانگریس تو پہلے ہی تمہارے حقوق کی حفاظت کا ذمہ لے چکی ہے، اب تم کیوں متحدہ قومیت کی بنیاد پر ایک آزاد جمہوری اسٹیٹ کی تعمیر میں حصہ نہیں لیتے؟

پہلی دفعہ میں ہندوستان کے ہر باشندے کو اظہار رائے اور اجتماع کی آزادی دی گئی ہے، بشرطیکہ وہ ایسے مقاصد کیلیے ہو جو قانون اور اخلاق کے خلاف نہ ہوں ـــــ قانون اور اخلاق کی شرط اس آزادی کو ہر وقت باطل کر سکتی ہے۔ اصول جمہوریت کی بنا پر، قانون بنانا اور اخلاق کا معیار مقرر کرنا مطلقاً اکثریت کے اختیار میں ہوگا، اور اکثریت ہی کی حکومت اسکو نافذ کریگی۔ لہذا اقلیت کی آزادی کے حدود گھٹانا یا بڑھانا محض انکے اختیار تمیزی پر موقوف ہوگا۔

دوسری دفعہ میں ہر باشندۂ ہند کو ضمیر کی آزادی، اور اپنے مذہب پر اعتقاد رکھنے اور اس پر عمل کرنے کی آزادی عطا کی گئی ہے، بشرطیکہ وہ امن عام اور اخلاق کے خلاف نہ ہو ـــــ یہاں پھر وہی شرط ہے اور یہ شرط اس آزادی کو ہر وقت سلب کر سکتی ہے۔ تاہم اگر اکثریت نے بڑی فیاضی سے کام لیا

اور یہ آزادی ہم کو پوری طرح بخش بھی دی، تو اس سے ہمارا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ ایسی آزادی تو انگریزی حکومت نے بھی ہمکو دے رکھی ہے، مگر اسکے باوجود ڈیڑھ سو برس کے اندر ہماری مذہبیت مضمحل اور ہماری تہذیب نیم مردہ ہوکر رہ گئی۔ جبکہ حکومت کے اختیارات ہمارے ہاتھ میں نہ ہوں، اور ایک ایسی جماعت ان اختیارات کو استعمال کرے جو ہمارے اصول تہذیب سے قطعاً ناآشنا، اور بالکل مختلف قسم کے نظریاتِ تہذیب و اخلاق و تمدن کی گرویدہ ہو، تو اس حکومت کے ماتحت ہمیں مذہبی آزادی حاصل ہونیکا فائدہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ہمیں بزور نماز پڑھنے سے نہیں روکا جائیگا بلکہ ہمارے اندر وہ ارتداد آہستہ آہستہ اتارا جائیگا جس سے ہم خود نماز پڑھنا چھوڑ دیں۔ ہماری مسجدیں توڑی نہیں جائینگی بلکہ ہمارے دل و دماغ کو اندر سے بدلا جائیگا تاکہ یہ مسجدیں ویران ہوکر خود بخود آثار قدیمہ میں تبدیل ہو جائیں۔ ہماری عورتوں کے چہروں سے پولیس کے سپاہی زبردستی نقاب نوچینگے بلکہ مدرسے کے معلم نہایت شفقت و رحمت کیساتھ انکے ذہن میں وہ معیار اخلاق پیوست کرینگے جسکی بنا پر وہ گھر کی ملکہ بننے کے بجائے اسٹیج کی رقاصہ بننا زیادہ پسند کرینگی۔ یہ آزادی محض ایک افیون ہے تاکہ اسکی پینک میں ہم پڑے سوتے رہیں، اور ہمارے گردوپیش زمین و آسمان بدلتے چلے جائیں۔ اس آزادی کے پروانے کو لیکر جو حضرات یہ سمجھ رہے ہیں کہ آئندہ کے قومی جمہوری لادینی اسٹیٹ میں انکے مذہب اور ان کی تہذیب کا پورا تحفظ ہوگا انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ تحفظ اسی نوعیت کا تحفظ ہے جیسا کہ پرانی تاریخی عمارتوں کا ہوا کرتا ہے۔ یہ محض اس امر کی ضمانت ہے کہ موجودہ نسل کے جو لوگ اپنی مذہبیت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں انکی گردن پر چھری رکھکر زبردستی کلمۂ کفر نہیں کہلوایا جائیگا۔ مگر یہ اس امر کی ضمانت نہیں ہے کہ انکی آئندہ نسل کو غیر مسلم بنانے والی تعلیم و تربیت نہ دیجائیگی۔ اس تحفظ کے معنی صرف یہ ہیں کہ آپ اگر چاہیں تو قال اللہ و قال الرسول میں مشغول رہیں۔ آپکی ڈاڑھی یقیناً زبردستی نہیں مونڈی جائیگی، نہ آپکی عبا ضبط کی جائیگی، نہ آپکی تسبیح چھینی جائیگی، نہ آپکی زبان درس حدیث و قرآن سے روکی جائیگی۔ مگر اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ آئندہ نسل کو بھی اس "غلط فہمی" میں مبتلا

رہنے دیا جائیگا کہ اسلام ہی سچا دین ہے، اور تمام مذاہب سے برتر اور اصلح ہے - مذہبی آزادی کا یہ پروانہ لیکر جو صاحب خوش ہونا چاہتے ہیں، وہ خوش ہولیں - ہمیں تو اس پروانہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہمارے مذہب اور ہماری تہذیب کی فطرت تو مفعولانہ نہیں بلکہ فاعلانہ آزادی مانگتی ہے - ہم تو استقلال وطن اسیلیے اور صرف اسی لیے چاہتے ہیں کہ ہماری حکومت ہمارے اپنے ہاتھ میں ہو، اپنا نظام تعلیم ہم خود بنائیں، اپنی تہذیب و تمدن کے مسخ شدہ نظام کو ہم خود اپنی طاقت سے درست کرسکیں - اگر یہ نہیں تو ہمارے لیے یکساں ہے، چاہے حکومت باہر کے کفار کی ہو یا گھر کے کفار کی -

تیسری دفعہ اس امر کا اطمینان دلاتی ہے کہ قلیل التعداد جماعتوں اور مختلف لسانی علاقوں کی کلچر، زبان اور رسم الخط کی حفاظت کی جائیگی ـــ حکومت کے روپے اور اسکی طاقت سے ہندی کو ہندوستان کی "قومی" زبان بنانا اس دفعہ کے خلاف نہیں ہے - اگر نظام تعلیم ایسا بنایا جائے کہ اقلیتوں کی تہذیب کا رنگ اس سے بالکلیہ خارج کردیا گیا ہو، بلکہ اگر نظام تعلیم کو اس قصد کے ساتھ ایسے نقشہ پر مرتب کیا جائے کہ اقلیتوں کی تہذیب اپنی موت آپ مرجائے، تو ایسا کرنا بھی اس دفعہ کے خلاف نہیں - درحقیقت اس دفعہ کا مطلب یہ ہے ہی نہیں کہ اقلیتوں کی زبان اور انکی کلچر کو حکومت کے رسد خانے سے زندگی کی غذا دی جائیگی، بلکہ اسکا مطلب صرف یہ ہے کہ انکو زبردستی قتل نہ کیا جائیگا - باقی رہی یہ بات کہ کمی غذا سے وہ خود سوکھ سوکھ کر مرجائیں، تو حکومت پر اسکی کوئی ذمہ داری نہیں، بلکہ یو - پی کے وزیر تعلیم کی زبان سے ہم کو بتایا جاچکا کہ انکا سوکھ سوکھ کر مرجانا ہی مطلوب ہے تاکہ انکی راکھ سے "ہندوستانی تہذیب" کا ققنس پیدا ہوسکے - ظاہر ہے کہ اس نوعیت کا بنیادی حق تو ہمکو انگریزی حکومت میں حاصل ہے - اس نے بھی ہمکو اردو بولنے اور لکھنے سے نہیں روکا (بلکہ ورنیکلر اسکول قائم کیے) اور کوئی ایسا آرڈیننس پاس نہیں کیا کہ ہم اپنی کلچر کے مطابق زندگی بسر نہ کریں - لیکن اس بنیادی حق نے ہماری زبان اور ہماری کلچر کو زندگی کی طاقت نہیں بخشی - اگر یہی حالت اُس حکومت میں بھی ہو جسکو "قومی حکومت" کے نام سے موسوم کیا

جاتا ہے، تو ہمارے لیے ایسی "قومی حکومت" بعینہٖ غیر قومی حکومت ہوگی۔ ہمیں قومی حکومت کی ضرورت تو اسلیے ہے کہ ہم حکومت کے وسیع ذرائع سے اپنی زبان اور اپنی کلچر کو اس طرح غذا دے سکیں جسطرح آزاد قومیں دیا کرتی ہیں۔ ورنہ بطور خود اپنی قومی ضروریات کا انتظام کر لینے کی آزادی تو ہمیں اب بھی حاصل ہے۔ اسکے لیے ہمیں کسی جنگ آزادی کی کیا ضرورت ہے؟

چوتھی دفعہ کہتی ہے کہ قانون کی نظر میں تمام شہری مساوی ہیں۔ جات پات، مذہب اور صنف کا کوئی امتیاز انکے درمیان نہ ہوگا ——— یہ نہایت عمدہ دفعہ ہے۔ لیکن مساوات کا تصور ہر تہذیب میں مختلف ہوتا ہے۔ اگر جمہوری اصول پر کل کوئی اکثریت میراث میں عورت اور مرد کا حصہ برابر کرنیکا قانون پاس کردے اور اسکی مخالفت کرنیوالی اقلیت کا اسیطرح مذاق اُڑائے جسطرح ابھی چند روز ہوئے مسٹر داس کے بل کی مخالفت کرنیوالوں کا مذاق سنٹرل اسمبلی میں اڑایا جاچکا ہے، تو یہ دفعہ ہمارے کسی کام نہ آئیگی۔

پانچویں دفعہ اس امر کی ضمانت دیتی ہے کہ کسی باشندۂ ملک پر اسکے مذہب یا جات پات، یا عقیدہ ومسلک، یا صنف کی وجہ سے ایسی پابندی عائد نہ کی جائیگی کہ وہ کسی سرکاری ملازمت یا عزت و اقتدار کے کسی منصب یا کسی پیشہ اور کاروبار میں داخل نہ ہوسکے ——— اس دفعہ کے بھی اچھے اور برے دونوں پہلو ہیں۔ اگر نظام حکومت کسی ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہو جو ہماری تہذیب سے کوئی ہمدردی نہ رکھتی ہو تو اس دفعہ کے عطا کردہ حقوق شریف مسلمان بہو بیٹیوں کو فلم ایکٹرس کے مرتبۂ عالی تک بھی پہنچا سکتے ہیں۔

چھٹی دفعہ تمام باشندوں کو سڑکوں اور تالابوں اور کنوؤں اور مدرسوں وغیرہ سے استفادہ کا مساوی حق دیتی ہے ——— یہاں "بشرطیکہ امن عام اور اخلاق کے خلاف نہ ہو" کی قید نہیں لگائی گئی، جس طرح پہلی اور دوسری دفعہ میں لگائی گئی ہے۔ دوسری دفعہ کی رو سے گائے کی قربانی بند کی جاسکتی ہے، مگر چھٹی دفعہ سڑکوں کے استعمال پر کوئی ایسی پابندی عائد نہیں کرتی کہ نماز کے وقت باجا بجا کر مسلمانوں کو پریشان نہ کیا جائے۔

یہ ہیں وہ بنیادی حقوق جنکے اعلان کو ایک نعمتِ عظمیٰ قرار دیا جاتا ہے اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ اس اعلان کے مداحوں میں ایک ایسی حکومت کو خود اپنے اوپر مسلط کرنے کے لیے جنگ کریں جسکی پالیسی کی تشکیل، جسکے قوانین کی تشریع اور جسکے احکام کی تنفیذ میں ہم وحدِ قومیت اور اصولِ جمہوریت کی بنیاد پر کسی طرح اپنا اثر استعمال نہیں کر سکتے۔ دوسرے الفاظ میں ہماری خدمات اسلیے مانگی جا رہی ہیں کہ بس فرعون کی جگہ اسکے بیٹے کو تخت نشین کرادیں، رہا ہمارا اپنا حال، تو جو بے اثری کی سی پوزیشن ہمیں فرعون کے عہد میں حاصل ہے، ابنِ فرعون اطمینان دلاتا ہے کہ وہی میرے عہد میں بھی حاصل رہے گی!

جنگ آزادی کی نوعیت

اب ہم اپنی آخری تنقیح کی طرف توجہ کرتے ہیں، یعنی یہ کہ وطن پرستوں کی یہ جنگ جسکو "جنگ آزادی" کہا جارہا ہے، دراصل ہے کس نوعیت کی جنگ؟ آیا یہ خالص انقلابی جنگ ہے یا نیم انقلابی اور نیم دستوری؟ عام طور پر سیاسی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے مسلمان اس سوال کی اہمیت کو نظر انداز کر جاتے ہیں، حالانکہ یہ سوال فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔

انقلابی جنگ کے معنی یہ ہیں کہ حکومت متسلّطہ کو بالکلیہ ختم کر دینے کیلیے جنگ کی جائے، اور جب تک اسکا تختہ الٹ نہ دیا جائے اسوقت تک ملک کے نظم ونسق سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے۔ اس قسم کی جنگ کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کسی عمارت کو بالکل ناپسند کرتے ہوں اور اس میں رو کر آہستہ آہستہ ترمیم کرنے کے قائل نہ ہوں، بلکہ اسکو قطعی طور پر منہدم کر کے دوسری عمارت بنانا چاہتے ہیں۔

نیم انقلابی نیم دستوری جنگ کے معنی یہ ہیں کہ پہلے انقلابی شورش سے حکومت متسلّطہ پر دباؤ ڈال کر نظام حکومت میں ترمیم و اصلاح کرائی جائے، پھر اصلاح شدہ نظام کو چلا کر اتنی طاقت حاصل کی جائے کہ دوبارہ انقلابی شورش برپا کر کے کچھ مزید اختیارات حاصل کیے جاسکیں، اور اس طرح بتدریج پرانے نظام حکومت کو ہٹا کر نیا نظام حکومت اسکی جگہ لیتا چلا جائے۔ اس قسم کی جنگ کی مثال ایسی ہے جیسے آپ ایک عمارت کو رفتہ رفتہ توڑتے جائیں اور ساتھ ساتھ دوسری عمارت بناتے بھی جائیں، یہاں تک کہ پرانی عمارت کا انہدام اور نئی عمارت کی تکمیل دونوں ساتھ ساتھ انجام کو پہنچیں۔

دونوں طرح کی لڑائیوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ پہلی قسم کی لڑائی میں دو ایسے فریق بھی

مل کر لڑ سکتے ہیں جو موجودہ نظام حکومت کی مخالفت میں تو متفق ہوں مگر اس امر میں اختلاف رکھتے ہوں کہ آئندہ نظام حکومت کس نقشہ پر بنایا جائے۔ انکے لیے یہ ممکن ہے کہ تعمیر نو کے سوال کو جنگ کے خاتمہ پر اٹھا رکھیں۔ وہ اس امر پر اتفاق کر سکتے ہیں کہ آؤ، ہم متحدہ قوت کے ساتھ پہلے اس نظام حکومت کو ختم کر دیں، اسکے بعد یا تو ہم باہمی مفاہمت سے کوئی بیچ کی راہ نکال لینگے، یا پھر بدرجۂ آخر قوت آزمائی کر دیکھینگے، اور ہم میں سے جو فریق بھی زیادہ طاقتور ہوگا اسکی مرضی کے مطابق نیا نظام حکومت بن جائیگا۔ لیکن دوسری قسم کی لڑائی میں آئندہ کے سوال کو بعد پر اٹھا کر نہیں رکھا جا سکتا۔ اس میں تو فریقین کے درمیان پہلے ہی مرحلہ پر یہ تصفیہ ہونا ضروری ہے کہ تدریجی تخریب کے ساتھ تدریجی تعمیر کس نقشہ پر ہو۔ اس لیے کہ یہاں تخریب اور تعمیر دونوں ساتھ ساتھ ہو رہی ہیں اور ساتھ ساتھ تکمیل کو پہنچنے والی ہیں۔ اگر ایک فریق اپنے نقشہ پر تعمیر کرتا رہے اور دوسرا فریق نقشہ کے سوال کو بعد پر چھوڑ کر اسکا ساتھ دیتا چلا جائے اسکے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک غلامی کے بند کھولنے کیساتھ ساتھ دوسری غلامی کے بند میں اپنے آپ کو خود جکڑواتا جائے اور اپنی آزادی کے سوال کو اسوقت کیلیے اٹھا رکھے جب یہ دوسری غلامی اس پر پوری طرح مسلط ہو چکی ہو۔ اس قسم کی جنگ اُس عقلمند فریق کیلیے تو ضرور جنگ آزادی کہی جا سکتی ہے جو آہستہ آہستہ پرانے آقا کی جگہ لے رہا ہو، مگر اُس بے وقوف فریق کیلیے یہ دراصل جنگ غلامی ہو گی جو ایک آقا کی جگہ محض دوسرا آقا لانے کیلیے لڑ رہا ہو۔

اگر ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد فی الواقع خالص انقلابی نوعیت کی ہوتی تو ہم اسکی کوئی پروانہ کرتے کہ مستقبل کا نقشہ پنڈت جواہر لال اور سوباش چندر بوس کیا پیش کرتے ہیں اور بھولا بھائی ڈیسائی اور ستیا مورتی کیا فرماتے ہیں۔ ہم بزدل ہوتے اگر ان باتوں سے ڈر کر جنگ سے منہ موڑ جاتے۔ ہم بہادروں کیطرح ان سے کہتے کہ جو کچھ آپ حضرات کے ارادے ہیں آپ انہی پر قائم رہیں، مگر آئیے، پہلے ہم اور آپ مل کر اس بد اصل عمارت کو تو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں جسے باہر والوں نے ہمارے سروں پر تعمیر

کردیا ہے۔ اسکے بعد ہم دیکھیں گے کہ یہاں ایک قومی جمہوری لادینی اسٹیٹ بنتا ہے یا کچھ اور۔ اس صورت میں جو فریق بھی آزادی کامل (بیرون سایۂ سلطنت برطانیہ) کیلیے انقلابی لڑائی سے منہ پھیرتا وہی بزدل قرار پاتا۔

مگر یہاں صورت حال کچھ دوسری ہے۔ نام آزادی کامل کا لیا جاتا ہے، اور منزل مقصود ٹھیرائی جاتی ہے کینڈا اور آسٹریلیا کی سی آزادی (یعنی برٹش کامن ویلتھ کے اندر نہ کہ باہر)۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ہماری جنگ انقلابی ہے اور طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وہی نیم انقلابی نیم دستوری جسکا مفہوم اوپر بیان کیا جاچکا ہے۔ دعوی یہ کیا جاتا ہے کہ ہم دوسروں کے بنائے ہوئے دستور کو قبول کرنے کیلیے ہرگز تیار نہیں ہیں، اور انکے مسلط کیے ہوئے نظام کو توڑ کر ایسا دستور چاہتے ہیں جو ہندوستان کے باشندے خود اپنے لیے بنائیں، مگر دوسروں نے جو دستور بنایا ہے اس کو عملاً قبول کرکے حکومت کے نظم ونسق کا چارج لے لیا جاتا ہے اور خوب دل لگاکر اسے چلایا جاتا ہے۔ اس طرح ایک عجیب پرفریب طلسمی جال تیار کردیا گیا ہے جسکے پھندے دن کی روشنی میں بھی ہمارے بہت سے بھائیوں کو نظر نہیں آتے۔ لہذا ضرورت ہے کہ اس جال کے ایک ایک پھندے کو پوری طرح نمایاں کیا جائے تاکہ مادرزاد اندھوں کے سوا ہر ایک اسکو دیکھ سکے۔

(۱)

آزادی کامل، (پورن سوراج Complete Independence) کے الفاظ سن کر ہر ذی ہوش آدمی یہی سمجھے گا کہ اس سے مراد وہ آزادی ہے اور وہی آزادی ہونی چاہیے جو فرانس، جرمنی، اٹلی، جاپان، روس اور ایسے ہی دوسرے آزاد ملکوں کو حاصل ہے۔ لیکن ہندوستان میں ان الفاظ کا یہ مفہوم نہیں ہے۔ یہاں اصرار تو انہی الفاظ کے استعمال پر کیا جاتا ہے، لیکن اگر انکی تعبیر بیرون سایۂ عاطفت برطانیہ کے ساتھ کردی جائے تو مہاتما گاندھی بیزان رہنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ یہاں آج بھی اس سے مراد وہی ہے جسکو آج سے دس سال پہلے نہرو رپورٹ میں مطلوب ومقصود ٹھیرایا گیا تھا، یعنی برطانوی دولت

مشترکہ میں خود مختار نوآبادیات کی سی حیثیت ۔ مگر اب اس کو نہرو رپورٹ کی طرح صاف الفاظ میں بیان نہیں کیا جاتا بلکہ زیادہ تر کوشش یہ کی جاتی ہے کہ اسکی تشریح و تفسیر کی نوبت ہی نہ آئے ، اور اگر کبھی مجبوراً کچھ کہنا پڑ جاتا ہے تو پھر یونانی زبان میں کلام کیا جاتا ہے تاکہ کوئی نہ سمجھ سکے ۔ تاہم انتہائی سعی خفا کے باوجود اصل مقاصد کسی نہ کسی طرح زبان پر آہی جاتے ہیں ۔ چنانچہ اسی سال ہری پورہ کانگریس کے خطبۂ صدارت میں مسٹر سوبھاش چندر بوس نے فرمایا ہے :

"برطانوی سلطنت اس وقت تاریخ کے دوراہوں میں سے ایک دوراہے پر کھڑی ہے۔ یا تو وہ اسی انجام سے دوچار ہوگی جو دوسری سلطنتوں کا ہوچکا ہے ، یا اسے اپنے آپ کو آزاد قوموں کے ایک وفاق میں تبدیل کرنا ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ برطانیۂ عظمیٰ کیلیے اپنے نظام سلطنت کے اندرونی تضاد و تبائن کو ختم کرنے کی صرف ایک صورت رہ گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ سلطنت کو آزاد قوموں کے ایک وفاق میں تبدیل کرے"

ابھی حال میں پنڈت جواہر لال نہرو کا ایک مضمون یورپ کی صورت حال پر شائع ہوا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں :۔

"اگر برطانیہ جمہوریت کا اب بھی معتقد ہے تو اسکے لیے ایک ہی ممکن العمل صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ قیصریت کو صدق دل سے ترک کردے اور بالکلیہ ترک کرکے ہندوستان اور فلسطین وغیرہ میں آزاد جمہوری ادارے قائم کردے ۔ اس سے برطانیہ کمزور نہ ہوگا بلکہ یہ ممالک اسکے حلیف و مددگار بن جائینگے" (نیشنل ہیرلڈ بحوالہ نیشنل کال مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۳۸ء)

اور اسی سال اگست میں جب پنڈت جی پراگ (Prague) تشریف لے گئے تھے تو انہوں نے ایک بیان میں فرمایا کہ :

"انگلستان کے دشمن ہمارے دشمن ہیں" (ٹریبیون مورخہ ۱۹ اگست ۱۹۳۸ء)

ٹریبیون ہی کا بیان ہے کہ اس پر انڈیا آفس کی طرف سے پنڈت جی کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔

یہ کانگریس کے ان دو لیڈروں کے اقوال ہیں جو انتہا پسند کانگریسیوں کے صنم سمجھے جاتے ہیں، جن میں سے ایک اسوقت کانگریس کا صدر ہے اور دوسرا ابھی مسلسل دو سال تک صدر رہ چکا ہے۔ ان کا مطمع نظر بھی اس سے زیادہ اونچا نہیں ہے کہ ہندوستان برطانوی دولت مشترکہ کے اندر آزاد قوموں کے اُس دائرے میں جگہ پالے جسکا مرکز و محور تاج برطانیہ ہو، جسکا مفاد مرکزی سلطنت کے مفاد سے متحد ہو جائے، جس کی دفاعی، اور لازمی نتیجہ کے طور پر، خارجی پالیسی بھی انگلستان کے دامن سے بندھی ہوئی ہو ــــ یہی رائے قریب قریب تمام بڑے بڑے کانگریسی رہنماؤں کی ہے، اور ان میں کوئی ایک شخص بھی آپ کو ایسا نہیں مل سکتا جو آزادی کامل بول کر آزادی کامل مراد لیتا ہو۔

اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ دنیا کی آزاد قوموں کے ساتھ ہمسری و مساوات حاصل کرنے کی خواہش، جو فطرۃً ہر خود دار ہندوستانی میں ہونی چاہیے، انکے اندر مفقود ہے۔ بلکہ دراصل اسکی وجہ یہ ہے کہ ان میں ایک کھلی اور بے لاگ مسابقت (Open and Fair Competition) کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ یہ اسکے لیے تیار نہیں ہیں کہ کھلے میدان میں گھوڑا کھڑا ہو، مقابلہ آزادانہ ہو، اور ان کا اس گھوڑے کی پیٹھ پر متمکن ہونا محض انکی قوت و شہسواری پر موقوف ہو۔ ان کی خواہش تو یہ ہے کہ سرکار سہارا دیکر انہیں گھوڑے پر چڑھا دیں اور جب تک یہ دوسرے امکانی مدعیوں کا خاتمہ نہ کر دیں، یا جب تک وہ انکی سائیسی قبول کرنے پر مجبور نہ ہو جائیں، اس وقت تک سرکار انکی پشتیبانی کیلیے کھڑے رہیں۔ یہ اور صرف یہی ایک وجہ ہے اس امر کی کہ ان کے بڑے سے بڑے مدعی حریت کو بھی جب اوپر سے کھرچا جاتا ہے تو اندر سے وہ درجۂ نو آبادیات کا پرستار ہی نکلتا ہے۔

پھر جب ان کا اصلی مدعا یہ ہے تو آخر یہ آزادی کامل کا نام کیوں لیتے ہیں؟ لبرل پارٹی کی طرح صاف کیوں نہیں کہتے کہ ہم درجۂ نو آبادیات چاہتے ہیں؟ آخر اس منافقت کی ضرورت کیا ہے کہ زبان پر وہ بات لائی جائے جو دل میں نہیں ہے اور دل میں وہ بات رکھی جائے جو زبان پر لانی مناسب نہیں؟

خصوصاً وہ لوگ جنکے ایمان میں اعضا سے بھی پہلے سنیہ (صداقت) کا مرتبہ ہے وہ اس جھوٹ کو کیوں جائز رکھتے ہیں؟ اس سوال کا جواب جو گذشتہ دس سال کی تاریخ پر غور کرنے سے مجھے ملا ہے اسے میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے ظاہر کر دینا چاہتا ہوں - اس منافقت کی وجہ صرف یہ ہے کہ درجۂ نو آبادیات یا اس سے فروتر درجہ کی اصلاحات کا نام لیتے ہی فوراً ملک کی دوسری قوموں کے حقوق کا سوال پیدا ہو جاتا ہے اور اس صورت میں دوہری مشکل پیش آتی ہے - اگر ان حقوق کے مسائل کو انصاف کے ساتھ ابتدائی مراحل ہی میں طے کر دیا جائے تو ہندوستان کو "ایک قوم" کا ملک بنا دینے کا خواب پریشان ہو جاتا ہے، اور اگر اپنے اصل ارادے بے نقاب کر دیئے جاتے ہیں تو پھر اس دام فریب کے سارے بند کھل جاتے ہیں جس میں ہندوستان کی دوسری قوموں کو پھانسنا مقصود ہے، اور کوئی توقع نہیں کی جا سکتی کہ حقیقی "بندگان وطن" کی قلیل تعداد کے سوا کوئی ایسا "بندۂ خدا" بھی اس کام میں تعاون کا ہاتھ بڑھائیگا جو اپنے قومی تشخص کو برقرار رکھنا ضروری سمجھتا ہو - اس دوگونہ اشکال کا عملی تجربہ ان حضرات کو نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد اچھی طرح ہو گیا تھا - چنانچہ انہوں نے یہ دانشمندانہ پالیسی اختیار کی کہ نہرو رپورٹ کو تو دریائے راوی میں غرق کر کے "آزادیٔ کامل" کا اعلان کر دیا، اور اس جھوٹ کے پردے میں اپنے اصل مقصد، یعنی تدریجی حصول اقتدار کی کوشش برابر جاری رکھی -

اگرچہ جاننے والوں کیلیے یہ راز اسوقت بھی راز نہ تھا - اور جنکے پاس کچھ عقل تھی انکے لیے اسکے بعد بھی بہت سے مواقع آئے جب اسکے چہرے سے نقاب اٹھتا رہا - مثلاً جب سول نافرمانی کے بعد گاندھی جی دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں لندن تشریف لے گئے تھے تو کامل آزادی لینے کے لیے نہ گئے تھے، نہ کامل آزادی دینے کے لیے ان کو بلایا گیا تھا - ....

...... اور جب ۱۹۳۵ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس کر دیا گیا تو جدید اسمبلیوں میں داخلہ کامل آزادی حاصل کرنیکا ذریعہ نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا - مگر باوجود اسکے یہ راز ہمارے بہت سے سادہ لوح بھائیوں کیلیے

راز ہی رہا اور آج بھی جبکہ برطانوی پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے دستور کو علانیہ چلایا جا رہا ہے، انکے لیے یہ بدستور راز ہے، چنانچہ وہ متحدہ قومیت کے راگ ہی سمجھ کر الاپ رہے ہیں، اور ماس کانٹیکٹ کے جال میں مسلمان کو یہی سمجھ کر پھنسوا رہے ہیں کہ کانگریس کی جنگ کامل آزادی کیلیے ہے ــــ یہ فائدہ ہے اس منافقت کا جو تقیہ اور اصنا کے معتقدین نے آٹھ نو سال سے اختیار کر رکھی ہے ۔

(۲)

جب آزادی کامل کا اعلان کیا گیا تھا تو ساتھ ہی یہ بھی کہدیا گیا تھا کہ ہماری جنگ انقلابی جنگ ہے، یعنی ہم اس ظالمانہ نظام حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں اور جب تک وہ جڑ سے اکھڑ نہ جائے، اس سے کوئی ربط و تعلق رکھنے کیلیے تیار نہیں ہیں ۔ بات بظاہر نہایت معقول تھی ۔ کیونکہ آزادی کامل صرف انقلابی جنگ ہی سے حاصل ہو سکتی ہے ۔ چنانچہ بہت سے لوگوں کو یقین آ گیا کہ جب یہ انقلابی جنگ کا علم بلند کر رہے ہیں تو ضرور ان کا مقصد آزادی کامل ہی کا حصول ہوگا ۔

اس کے بعد جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس ہو گیا اور جدید اسمبلیوں کیلیے انتخابات شروع ہوئے تو کہا گیا کہ ہم اسمبلیوں میں جائینگے مگر اسلیے کہ اس دستور کو اندر سے توڑیں ۔

پھر جب اسمبلیوں میں پہنچ گئے تو وزارتیں قبول کرنے یا نہ کرنے کا سوال پیدا ہوا ۔ کچھ مدت تک محبوبانہ ادا کے ساتھ ہاں اور نہیں کا سلسلہ جاری رہا اور آخر کار وزارت کی قلمدان بھی سنبھال لیے گئے ۔

جب وزارتیں بھی قبول کر لی گئیں تو کہا گیا کہ اس سے مقصود ہز میجسٹی کی حکومت کو چلانا نہیں ہے بلکہ دستور جدید کے نفاذ کو عملاً ناممکن بنا دینا ہے ۔ چنانچہ عہد قبول کرتے وقت کانگریس نے جس پالیسی کا اعلان کیا تھا وہ یہ تھی کہ :

" دستور جدید کا مقابلہ کر کے (یا اسکی مزاحمت کر کے) اسے ختم کر دیا جائے ۔ ووٹروں کی بڑی اکثریت کانگریس

کی اس پالیسی اور اسکے پروگرام کی توثیق کر چکی ہے۔ عوام الناس خود برطانوی حکومت ہی کے مقرر کیے ہوئے طریقہ پر آئین جدید کو نامنظور کرنے کا اعلان کر چکے ہیں (یعنی انہوں نے کانگریس کے نمائندوں کو بھاری اکثریت سے نمائندہ منتخب کیا ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ وہ اس دستور کو قبول نہیں کرتے)۔ وہ صاف طور پر اس امر کا اعلان کر چکے ہیں کہ ہم اپنا دستور حکومت خود بنانا چاہتے ہیں۔ ...... لہذا باشندگان ہند کی جانب سے کانگریس اس دستور کو از اول تا آخر مسترد کرتی ہے ...... کانگریس اپنے تمام ارکان پر واضح کر دینا چاہتی ہے کہ مجالس قانون ساز میں ان کا کام اس دستور کا مقابلہ کرنے اور اسے ختم کر دینے کی پالیسی پر مبنی ہونا چاہیے ...... اس پالیسی کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت برطانیہ کیلیے اس دستور کو نافذ کرنا غیر ممکن ہو جائیگا ...... اسی پالیسی کو مدنظر رکھتے ہوئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی اپنے نمائندوں کو ان صوبوں میں وزارتیں قائم کرنے کی اجازت دیتی ہے جنکی مجالس قانون ساز میں ان کو اکثریت حاصل ہے۔"

لیکن آج عملاً کیا ہو رہا ہے؟ اور عملاً کو بھی چھوڑیئے، وہی زبانیں جو پچھلے سال کے وسط تک دستور کو توڑنے کا اعلان کر رہی تھیں، آج بلا کسی شرم و لحاظ کے کیا کہہ رہی ہیں؟ اس کا جواب ہم سے نہیں خود انہی زبانوں سے سن لیجیے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل ہری پورہ کانگریس کے بھرے اجلاس میں فرماتے ہیں:

"چند مہینوں کی مختصر مدت میں کانگریسی وزارتوں نے اس سے زیادہ کام کیا ہے جتنا برطانوی حکومت گذشتہ ڈیڑھ سو برس میں کر سکی تھی" (ٹائمز آف انڈیا۔ مورخہ ۲۳ فروری ۳۸ء)

یعنی وہی دستور جو بالکل ناکارہ تھا اس قدر کار آمد بن گیا! اور سنیے۔ کانگریس کے صدر مسٹر سوبھاش چندر بوس فرماتے ہیں:

"کانگریس محض تخریبی طریق کار پر اعتقاد نہیں رکھتی بلکہ اندر رہ کر تعمیری طریق کار کو انسب سمجھتی ہے۔" (ٹریبیون مورخہ ۱۵ جون ۳۸ء)

اس سے بھی زیادہ کھل کر مسٹر بوس نے ابھی حال میں آسام کے قضیۂ وزارت پر تبصرہ کرتے ہوئے اس امر کی شکایت کی تھی کہ جب یورپین گروپ ملک معظم کی حکومت کو چلانے کیلیے ہے تو وہ کانگریس پارٹی کی مخالفت پر کیوں کمربستہ ہوگیا، درانحالیکہ کانگریس پارٹی بھی اس حکومت کو چلانے ہی کیلیے وزارت سنبھال رہی ہے۔

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اب دستور کو توڑنے کے بجائے اسکو چلانے کی پالیسی علانیہ اختیار کی جاچکی ہے۔ اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ آج ڈیڑھ سال سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی حدود کا پورا پورا لحاظ رکھ کر ہز میجسٹی کی حکومت چلائی جارہی ہے کہ کانگریسی وزارتیں اگر حقیقت میں دستور کو توڑنا چاہتیں تو انکے لیے بہت آسان تھا کہ عوام الناس کی فلاح وبہبود کیلیے ایسی تدابیر اختیار کرتیں جنکی اجازت دینے سے گورنر انکار کردیتے، اور پھر اس پر استعفے دیکر آئینی انقباض (Deadlock) پیدا کردیتیں۔ مگر یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ پوری وفاداری کیساتھ اس دستور کو اسی طرح چلا رہی ہیں جسطرح کوئی لبرل جماعت چلاتی۔ وہ پوری کوشش کررہی ہیں کہ گورنروں سے تصادم نہ ہو بلا سے خواہ عوام الناس کی فلاح وبہبود کے وہ بہت سے کام رہ جائیں جنکا انہوں نے وعدہ کرکے عوام سے ووٹ حاصل کیے تھے۔

انہوں نے عوام سے کہا تھا کہ ہم شرح مالگذاری میں ۵۰ فی صدی کمی کردینگے۔ مگر کس صوبہ میں تخفیف کی گئی؟ یوپی میں جب اس وعدہ کو یاد دلایا گیا تو وزارت نے صاف جواب دیدیا کہ سابقہ حکومت جتنی تخفیف کرچکی ہے اس سے زیادہ نہیں کی جاسکتی۔ اور یہ صرف اسلیے کہ مالگذاری کم کرنے سے بجٹ کا توازن بگڑتا ہے، اور بجٹ کا توازن بگڑنا اُس سامراج کے مفاد کے خلاف ہے جسکی وفادارانہ خدمت انجام دینے کیلیے یہ حضرات ایوان وزارت میں تشریف لے گئے ہیں۔

انہوں نے عوام کو سبز باغ دکھایا تھا کہ ہم تمہاری غریبی کا علاج کرینگے۔ مگر کون صداقت پسند

---

[1] ملاحظہ ہو نیشنل کال مورخہ ۱۸ جولائی ۳۸ء۔

آدمی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ احمد آباد، شولاپور، کانپور، بمبئی وغیرہ مقامات پر کانگریسی حکومتوں نے مزدوروں
کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ سابقہ حکومت کے ظالمانہ برتاؤ سے کچھ مختلف ہے ؟ اور اس پر طرفہ ماجرا یہ ہے کہ غریب
مزدور اگر اپنے حقوق تسلیم کرانے کیلیے ہڑتال یا پکٹنگ کرتے ہیں تو وہی گاندھی جی جو ان سب
ہتھیاروں کو برٹش گورنمنٹ کے خلاف استعمال کر چکے ہیں، ان پر تشدد کا الزام عائد کرتے ہیں اور
بے تکلف فرماتے ہیں کہ "کارخانہ دار انکے خلاف پولیس کی امداد طلب کرنے میں اور کانگریسی
حکومت ایسی امداد بہم پہنچانے میں بالکل حق بجانب ہیں"[1]۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ ہم اُن ظالمانہ
قوانین کو منسوخ کرائینگے جو انگریزی حکومت نے نافذ کر رکھے ہیں، اور باشندگان ہند کو انکی کھوئی ہوئی
مدنی آزادیاں (Civil Liberties) واپس دلائینگے - مگر واقعات کیا ہیں ؟ کیا
وہ اکثر و بیشتر قوانین بدستور موجود نہیں ہیں جو انگریزی حکومت نے نافذ کیے تھے ؟ کیا خود کانگریسی حکومتیں
ان قوانین کو استعمال نہیں کر رہی ہیں ؟ اور کیا انہیں استعمال کرنے میں ٹھیک انہی دلائل سے کام
نہیں لیا جا رہا ہے جو کسی زمانہ میں انگریزی حکام پیش کیا کرتے تھے ؟ وہی کانگریسی جو کہتے تھے کہ بغاوت
ہمارا مذہب ہے، مدراس میں مسٹر باٹلی والا پر بغاوت کا مقدمہ چلاتے ہیں اور بمبئی اور سی پی میں مسٹر باپٹ اور
مسٹر جگناتھ پرشاد ورما پر بغاوت کا مقدمہ چلانے کی دھمکی دیتے ہیں - شولاپور میں "یوم استقلال" کے موقع
پر بہت سے آدمیوں کو گرفتار کیا جاتا ہے اور ایک شخص کو سزائے تازیانہ بھی دی جاتی ہے، حالانکہ اس سزا
کے خلاف کسی زمانہ میں شور قیامت برپا کر دیا جاتا تھا۔ سیاسی ایجی ٹیشن کو روکنے کیلیے دفعہ ۱۴۴
کا نفاذ، گولیاں چلانا اور لاٹھی چارج کرنا آج بھی اسی طرح جاری ہے جسطرح پہلے تھا۔ کریمنل لا
امنڈمنٹ ایکٹ، جسکے خلاف کانگریس نے سب سے زیادہ شور مچایا تھا، آج کانگریسی حکومتیں بے تکلف
اسکو استعمال کر رہی ہیں۔ احمد آباد میں مزدوروں کا سر کچلنے کیلیے اسے استعمال کیا گیا، اور مدراس

---

[1] ہریجن ۔ مورخہ ۱۳ / اگست ۱۹۳۸ء ۔

میں ہندی کی اشاعت کے خلاف احتجاج کرنے والوں پر آج پوری آزادی کیساتھ اس سے کام لیا جارہا ہے۔ وہی سی آئی ڈی جسکی زیادتیوں پر کسی زمانہ میں ماتم کیا جاتا تھا آج کانگریسی حکومتیں اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف اسکی خدمات سے پورا فائدہ اٹھارہی ہیں اور مدراس کا وزیر اعظم صاف کہتا ہے کہ جب ہم نے حکومت کا انتظام ہاتھ میں لیا ہے، (یعنی جب ہم اس حکومت کو توڑنے کیلیے نہیں بلکہ چلانے کیلیے نکلے ہیں) تو سی آئی ڈی سے کام لیے بغیر چارہ نہیں- وہی پریس کی آزادی جسکو باشندوں کے مدنی حقوق کی فہرست میں نمایاں جگہ دی جاتی تھی، آج اس کو خود پامال کیا جارہا ہے۔ اخبارات کی ضمانتیں بھی ضبط ہوتی ہیں، نئی ضمانتیں بھی مانگی جاتی ہیں اور اڈیٹروں پر مقدمے بھی چلائے جاتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ حکومت بمبئی نے حال ہی میں پولیس کمشنر کو پورے اختیارات عطا کیے ہیں کہ جس شخص کو چاہے بغیر مقدمہ چلائے شہر بدر کردے[1]۔

اس پورے کارنامہ کا خلاصہ خود ایک صاف گو کانگریسی، مسٹر ایم این رائے کی زبان میں یہ ہے کہ:

"اسمبلیوں میں جانے کا پروگرام اختیار کرنیکے بعد، خصوصاً وزارتیں قبول کرنیکے بعد کانگریسی سیاست تیزی کیساتھ دستوریت (Constitutionalism) کی طرف ترقی معکوس کررہی ہے اور برطانوی امپیریلزم سے لڑنے کی انقلابی ذہنیت کافور ہوگئی ہے"[2]

"کانگریسی وزیروں نے امپیریلسٹ اسٹیٹ کی مشین کو اندر سے توڑنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی- جو جنگی مورچے (Strategic Positions) ان کے قابو میں آئے ان کو بھی غنیم پر حملہ

[1] تفصیلات کیلیے ملاحظہ ہو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کلکتہ کی رپورٹ مندرجہ ٹائمز آف انڈیا یکم نومبر ۳۷ء۔ نیز ٹریبیون کا مقالہ افتتاحیہ، ۲ اگست ۳۸ء اور اخبار سرونٹ آف انڈیا ۱۴ جولائی ۳۸ء۔

[2] ٹریبیون مورخہ یکم مئی ۳۸ء۔

کرنے کیلیے انہوں نے استعمال نہیں کیا۔ وہ تو کانگریس ہائی کمانڈ کی اجازت سے بلکہ اسکی ہدایت کے تحت اُسی امپیریلسٹ اسٹیٹ کے انتظام کو چلا رہے ہیں جسے توڑنے کا ارادہ ظاہر کرکے وہ گئے تھے۔

"ایمانداری کا تقاضا ہے کہ اس امر کا صاف صاف اعتراف کر لیا جائے کہ کانگریسی وزارتیں عوام کی معاشی حالت کو درست کرنے کیلیے کچھ بھی نہ کر سکیں اور نہ موجودہ دستور کی حدود میں رہ کر وہ آئندہ کچھ کر سکینگی"۔ [۱]

اب یہ بات بالکل عیاں ہو چکی ہے کہ کانگریس کی "جنگ آزادی" کوئی انقلابی جنگ نہیں ہے، بلکہ جیسا میں اوپر بیان کر چکا ہوں، نیم انقلابی نیم دستوری ہے۔ اس کا نقشۂ جنگ یہ نہیں ہے کہ مسلسل لڑ کر انگریزی سلطنت کے نظام کو توڑ ڈالا جائے۔ بلکہ نقشۂ جنگ دراصل یہ ہے کہ اسی نظام سلطنت کے اندر رہ کر حکمراں جماعت پر دباؤ ڈالا جائے اور اس سے بتدریج اختیارات حاصل کرکے اپنا اقتدار جمایا جائے۔ پہلے انہوں نے سول نافرمانی کی تاکہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کا دائرہ وسیع ہو اور زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل ہو سکیں۔ اسکے نتیجہ میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء حاصل ہو گیا۔ اب یہ اس ایکٹ کے مطابق صوبوں کی حکومتیں چلا رہے ہیں اور اپنے پروگرام کے مطابق، جسکی تشریح میں آگے کرونگا، ملک میں اتنا اقتدار حاصل کر لینا چاہتے ہیں کہ دوبارہ آئینی یا نیم انقلابی ذرائع سے برطانوی سلطنت پر دباؤ ڈال کر مرکزی حکومت میں زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل کریں چنانچہ آج کل اسی غرض کیلیے دوڑ دھوپ ہو رہی ہے۔ جواہر لال یورپ کا چکر لگا رہے ہیں۔ گاندھی جی وائسرائے اور نائب وزیر ہند سے راز کی ملاقاتیں فرما رہے ہیں، سینیہ مورتی وفاقی دستور کو قبول کرنے کی شرائط پیش کر رہے ہیں، اور سوباش چندر بوس دھمکیوں پر دھمکیاں دیے چلے جاتے ہیں۔ ایک ہی ٹیم ہے جس کا ہر کھلاڑی اپنا اپنا کام خوبی کیساتھ کر رہا ہے، اور سب کی منزل مقصود ایک ہے، یعنی ہندو راج زیر سایہ برطانیہ۔

[۱] نیشنل کال مورخہ ۱۳ رجولائی ۳۸ء۔

(۳)

یہاں پہنچ کر ہندو مہا سبھا اور کانگریس دونوں نظری اور عملی حیثیت سے ایک ہو جاتی ہیں گو انکے نام اور کام مصلحۃً جدا جدا ہیں۔

نظری حیثیت سے تو دونوں میں نہ پہلے فرق تھا نہ آج ہے۔ دونوں وطنی قومیت کی علم بردار ہیں۔ دونوں اس ملک میں "فرقوں" (قوموں) کے امتیازی وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہیں۔ دونوں علحدگی کے ہر رجحان (Separat est tendency) کی دشمن ہیں حتیٰ کہ کسی معاملہ میں بھی وہ مسلمانوں کے جداگانہ مفاد کا نام تک سننے کی روادار نہیں۔ دونوں کا آخری نصب العین یہ ہے کہ یہاں ایک قومیت پیدا ہو جائے جو تہذیب، تمدن، اخلاق، معاشرت، زبان، ادب، جذبات وحسیات غرض ہر لحاظ سے بالکل یک رنگ ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کانگریس جہاں "ہندوستانی" کا لفظ بولتی ہے وہاں مہا سبھا "ہندو" کا لفظ استعمال کرتی ہے، مگر معنی دونوں کے ایک ہیں۔

عملی حیثیت سے بظاہر چند سال تک دونوں میں فرق رہا مگر اب اس حیثیت سے بھی کوئی فرق باقی نہیں۔ کانگریس یہ دعویٰ کرتی تھی کہ اس کا نصب العین کامل آزادی ہے، اور وہ انقلابی جدوجہد سے اسے حاصل کریگی۔ بخلاف اسکے ہندو مہا سبھا کہتی تھی کہ انگریزی سلطنت سے آزاد ہو جانے کے بعد "ایک قوم" بنانے کا عمل دشوار بلکہ محال ہو جائیگا۔ یہ عمل صرف اسی طرح پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے کہ انگریزی سلطنت کے زیر سایہ رفتہ رفتہ حکومت کے اختیارات پر قبضہ کرو۔ انگریز اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ یہاں جمہوریت کے انہی تصورات کو درآمد کریگا جو اسکے اپنے ملک میں صدیوں سے پرورش پا رہے ہیں۔ وہ چاہے لڑا کر حکومت کرنے کی پالیسی پر کتنا ہی عمل کرے اور اس غرض کیلیے یہاں مختلف قومیتوں کے وجود سے فائدہ اٹھانے کی کتنی ہی کوشش کرے، مگر جب کبھی وہ جمہوری ادارات قائم کرنے کا ارادہ کریگا تو اس کا ذہن کوئی ایسی صورت نہ سوچ سکیگا جو اسکے اپنے ملک کے جمہوری ادارات سے اصولاً مختلف ہو۔ لہٰذا اس پر دباؤ ڈال کر جتنی بھی آئینی اصلاحات

ملینگی وہ سب ہندوؤں ہی کو بوجہ انکی عددی اکثریت کے سیاسی قوت واقتدار کا مالک بنائینگی ۔ اور اس قوت واقتدار کو اگر ہوشیاری کیساتھ استعمال کیا جائے تو معاشی دباؤ، تعلیمی انقلاب اور حاکمانہ نفوذ و اثر سے رفتہ رفتہ ہندوستان کی مختلف قومیتوں کو "ایک قومیت" میں تحلیل کیا جاسکتا ہے ۔ یہ اور صرف یہی ایک صورت ہے جس سے یہاں "ایک قوم" بنائی جاسکتی ہے، لہذا جب تک یہ عمل پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ جائے "آزادی کامل" کا نام بھی نہ لینا چاہیے ۔ اس سے پہلے انگریزی اقتدار کو مٹانے کی کوشش کرنا بھارت ورش کیساتھ دشمنی کرنا ہے ۔

پالیسی کا یہ اختلاف چند سال تک محض ظاہری طور پر کانگریس اور مہاسبھا میں رہا ۔ مگر آج ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ کانگریس ٹھیک اسی مقام پر آگئی ہے جہاں ہندو مہاسبھا تھی ۔ اور دونوں مل کر سامراج کے تحت ناظم (Administator) کی خدمات انجام دے رہے ہیں ۔ بہار میں، سی پی میں، یوپی میں اور دوسرے صوبوں میں کھلے ہوئے بدنام مہاسبھائی کانگریس کے ذمہ دار عہدوں پر فائز ہیں ۔ سی پی کی سابق کانگریسی وزارت میں ایک صاحب مسٹر دیسمکھ بھی شامل تھے اور یہ وہ صاحب ہیں جو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے موقع پر ہندو مہاسبھا کی طرف سے ایک وفد لیکر لندن پہنچے تھے ۔ سی پی کے موجودہ وزیر اعظم مسٹر شکلا وہ صاحب ہیں جنہوں نے سوراج پارٹی کے داخلہ کونسل کے زمانہ میں مالوی جی کے زیر قیادت کانگریس سے الگ انڈی پنڈنٹ پارٹی بنائی تھی اور جنہوں نے بعد میں کمیونل اوارڈ کے متعلق کانگریس کی پالیسی سے اختلاف کرکے اسکو انتخابات کا نزاعی مسئلہ بنایا ۔ سی پی اسمبلی کا صدر بھی کھلا ہوا مہاسبھائی ہے ۔ کانگریس کیطرف سے اسمبلی کی صدارت کرتا ہے اور مسٹر ساورکر سے مل کر حیدر آباد میں ریاست کے خلاف شورش برپا کرنے کی تدبیریں بھی کرتا ہے ۔ بہار میں بھاگلپور اور دوسرے مقامات پر جو فساد ہوئے ان میں کانگریس کے ذمہ دار کارکنوں نے پورا پورا مہاسبھائی پارٹ ادا کیا ۔ یوپی میں دوری اور ٹانڈہ وغیرہ کے فسادات ان مہاسبھائیوں نے برپا کرائے جو کانگریس کے عہدوں پر فائز تھے ۔ اس قسم کی بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں اور ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ "قومیت متحدہ" کی حمایت کرنے والے حضرات

کس آسانی کیساتھ کانگریس سے مہاسبھا میں اور مہاسبھا سے کانگریس میں آتے جاتے رہتے ہیں۔

ان دونوں جماعتوں میں اب اگر کوئی فرق باقی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ایک ہندو مہاسبھا ہے اور دوسری انڈین نیشنل کانگریس۔ مہاسبھا صریح طور پر ہندوؤں کی جماعت ہے۔ کوئی مسلمان اس میں شریک نہیں ہوسکتا۔ نہ وہ مسلمانوں کو اپنی طرف دعوت دے سکتی ہے۔ نہ مسلمانوں میں جاکر ماس کانٹیکٹ کرسکتی ہے نہ کسی صوبہ کی حکومت پارٹی سسٹم کی بنیاد پر قائم کرسکتی ہے۔ نہ کہیں خالص ہندو وزارت قائم کرکے یہ دعویٰ کرسکتی ہے کہ یہ "قومی وزارت" ہے۔ نہ مسلمانوں سے یہ کہہ سکتی ہے کہ ہمارے عہدنامہ (Pledge) پر دستخط کرو تب تمہیں وزارت میں شریک کیا جائیگا۔ نہ اسکو مولانا ابوالکلام کی خدمات حاصل ہوسکتی ہیں کہ مسلمانوں کی جماعت میں سے کمزور کیرکٹر کے آدمیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائیں اور اسکے آستانہ پر جھکا دیں۔ نہ اسے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی خدمات میسر آسکتی ہیں کہ وار دھا اسکیم تیار کریں۔ نہ وہ خان عبدالغفار خاں سے کام لے سکتی ہے کہ ۹۵ فیصدی اکثریت رکھنے والے سرحدی صوبہ کو فڈریشن کے قیام سے پہلے ہی اس وحدانی طرز حکومت (Unitary form of gouernment) کا تابع بنادیں جسکے مرکز پر ہندوؤں کا کامل اقتدار ہو۔ نہ وہ بہت سے علمائے کرام کی خدمات حاصل کرسکتی ہے کہ مسلمانوں کو مذہبی اقتدار کے زور سے اسکے دائرے میں کھینچ کھینچ کر لائیں اور فتوے دیں کہ اس جماعت میں شریک ہونا وجوب کا درجہ رکھتا ہے۔ نہ اسکے لیے یہ دعویٰ کرنا ممکن ہے کہ اسکے لیڈر مسلمانوں کے بھی ویسے ہی نمائندے ہیں جیسے ہندوؤں کے ہیں اور جو کچھ وہ بولتے ہیں "پوری قوم" کی طرف سے بولتے ہیں۔ نہ وہ اسلامی اکثریت رکھنے والے صوبوں میں وزارتوں کی توڑ پھوڑ اس خوبی کیساتھ کرا سکتی ہے کہ وزارت مسلمانوں ہی پر مشتمل رہے مگر اشاروں پر ہائی کمانڈ کے رقص کیا کرے۔ نہ اقلیت ہی کے صوبوں میں اسکو مسلمانوں پر یہ اقتدار حاصل ہوسکتا ہے کہ ان کے منتخب کردہ نمائندوں میں سے جسے چاہے وزارت پر سرفراز کرے اور جس کو چاہے کان پکڑ کر نکال دے۔ یہ سب کام کانگریس ہی سے بن آسکتے ہیں کیونکہ وہ ہندو مہاسبھا نہیں؛

انڈین نیشنل کانگریس ہے۔

اس فرق کیساتھ یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کر رہی ہیں۔ جو کام کانگریس کر سکتی ہے وہ مہاسبھا نہیں کر سکتی۔ اور جو کام مہاسبھا کر سکتی ہے وہ کانگریس نہیں کر سکتی۔ کانگریس پیش قدمی کرنیوالی فوج ہے جو آگے بڑھ کر غنیم کے علاقہ پر قبضہ کرتی ہے۔ اور مہاسبھا وہ محافظ دستہ ہے جو عقب میں رہتا ہے تاکہ آگے کی فوج کو حسب ضرورت مدد پہنچاتا رہے۔ کانگریس پر جب کبھی مشترک وطنی جماعت ہونے کی حیثیت سے دباؤ پڑتا ہے، ہندو مہاسبھا فوراً آگے بڑھ کر پشت کو سہارا دیتی ہے، اور مسٹر ساورکر، ڈاکٹر مونجے، بھائی پرمانند وغیرہ شور مچانے لگتے ہیں کہ ہندوؤں کے نمائندے ہم ہیں، گاندھی اور جواہر لال نہیں ہیں۔ ایسے نازک مواقع پر اگر عقب میں محفوظ فوج موجود نہ ہو تو مقدمتہ الجیش کو اپنی "قوم پرستی" کا دعویٰ نباہنا مشکل ہو جائے۔ اس فوج کی مدد کام بھی نکال دیتی ہے اور بات بھی بنی رہتی ہے۔

(۴)

ہندو مہاسبھا کیساتھ ساتھ برٹش گورنمنٹ سے بھی کانگریس کا مفاد اسی نقطہ پر متحد ہوتا ہے مسلمانوں میں شخصی اغراض رکھنے والی ایک قلیل جماعت کے سوا کوئی آپ کو ایسا نہ ملیگا جو برطانوی اقتدار سے کسی قسم کی مصالحت کرنے پر آمادہ ہو۔ مسلمان نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام مشرقی ممالک میں اس قیصریت کا فوری کلی اور قطعی زوال چاہتا ہے۔ برعکس اسکے ہندوؤں کی قومی پالیسی یہ ہے کہ انگریزی حکومت سے اچھی شرائط پر مصالحت کی جائے۔ یعنی ہندو لڑتا ہے نفع پر سودا کرنے کیلیے اور مسلمان لڑتا ہے معاملہ ختم کرنے کیلیے۔ مزید برآں مسلمان انگریزوں کے کسی کام کا نہیں کہ اسکی جیب خالی ہے۔ اور ہندو ایک سرمایہ دار قوم ہے جس کیساتھ تجارتی معاملہ بھی کیا جا سکتا ہے اور آڑے وقت میں مالی مدد بھی اس سے مل سکتی ہے۔ لہذا جسطرح فلسطین میں ایک سرمایہ دار قوم کا تعاون حاصل کرنے کیلیے مسلمانوں کو بھینٹ چڑھانا مفید تھا اسیطرح ہندوستان میں بھی ایک دوسری سرمایہ دار قوم کا تعاون حاصل کرنے کیلیے ان کو بھینٹ چڑھا دینا فائدے سے خالی نہیں۔ اسی

بنا بریں یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ برٹش گورنمنٹ اور کانگریس کے درمیان سوداگرانہ معاملہ ہو رہا ہے۔ صوبوں کی حکومت میں تو سودا پٹ چکا ہے، اور اب جو کچھ کھینچ تان ہو رہی ہے صرف مرکزی اقتدار کے معاملہ میں ہے۔ یہ کچھ زیادہ مانگتے ہیں اور وہ کچھ کم پر راضی ہیں۔ اسکے ساتھ ابھی چونکہ معاملہ نیا نیا ہے اسلیے کچھ بدگمانیاں بھی ہیں۔ وہ ابھی پوری طرح اعتماد بھی کرنے کیلیے تیار نہیں ہیں۔ تحفظات کی رسی انہوں نے انکے گلے میں باندھ رکھی ہے۔ جب یہ سلطنت برطانیہ کی محفوظ چراگاہ کی طرف بڑھتے ہیں تو وہ پوری طاقت کیساتھ رسی کھینچ لیتے ہیں۔ اور جب یہ کھلے میدان میں اقلیتوں کی کھیتی چرنے کیلیے بڑھتے ہیں تو وہ اطمینان کیساتھ رسی ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں۔ دستور میں اقلیتوں کی حفاظت کیلیے گورنروں کو جو مخصوص اختیارات دیئے گئے ہیں ان کا مقصد اسکے سوا کچھ نہیں کہ اگر کبھی خدانخواستہ کانگریسیوں نے اس سازش (گاندھی جی کے بقول "شریف آدمیوں کی سی قرارداد" (Gentleman's agreement) سے جو انکے اور برٹش گورنمنٹ کے درمیان ہو چکی ہے، انحراف کیا اور تاج کے مفاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو مفاد تاج کے بجائے اقلیتوں کے مفاد کی حفاظت کا بہانہ کرکے انکی گوشمالی کیجا سکے۔

(۵)

اس ملی بھگت میں برطانیہ کا مفاد پوری طرح محفوظ ہے۔ سول سروس پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا۔ یورپین باشندوں کے حقوق سے بھی تعرض نہیں کیا جا سکتا۔ سرکار کے مالی مفاد کو بھی نہیں چھیڑا جا سکتا۔ مختصر یہ ہے کہ جن جن چیزوں سے انگریزی سلطنت کی اغراض کا تعلق ہے دستور حکومت میں ان سب کی حفاظت اچھی طرح کر لی گئی ہے، اور کانگریسی وزارتیں جو اس دستور کو عملاً قبول کرکے حکومت کا نظم و نسق چلا رہی ہیں ان حدود میں نہ قدم رکھ سکتی ہیں اور نہ قدم رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ موجودہ دستور کی حدود میں رہ کر کسی ایسے پروگرام پر تو عمل کرنا ممکن ہی نہیں ہے جس پر حقیقت میں "جنگ آزادی" کا اطلاق ہو سکے، کیونکہ "جنگ آزادی" کو خواہ آپ کتنا ہی

نیچے گرائیں، بہرحال اسکا منشا یہ تو ہونا چاہیے کہ جہاں باشندگان ہند کا مفاد سرکار برطانیہ کے مفاد سے متصادم ہوتا ہو وہاں سرکار کے مفاد کو گرایا جائے اور ہندوستان کی "جنتا" کے مفاد کو ابھارا جائے مگر جس دستور میں سرکار کا مفاد محفوظ ہے اسکی پابندی قبول کرنیکے بعد ایسا کرنا غیر ممکن ہے۔ پھر یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ جنگ آزادی کا دعوےٰ لے کر اٹھنے والی جماعت اس دستور کو کس لیے قبول کر رہی ہے اور کیوں اسے چلانے پر مصر ہے؟

اس سوال کی تحقیق اگر آپ واقعات کی روشنی میں کرنیگے تو یہ حقیقت آفتاب کیطرح نمایاں ہوجائیگی کہ اس وقت کانگریس کے سامنے کوئی پروگرام اسکے سوا نہیں ہے کہ پراونشل آٹانومی سے جو اختیارات بھی حاصل ہوسکیں انہیں ایک جدید ہندوستانی قومیت کی تخلیق میں استعمال کیا جائے، اور اس ملک کی مختلف قلیل التعداد قوموں میں اپنے امتیازی وجود کو برقرار رکھنے کی جس قدر طاقت باقی ہے اسے حکومت کے زور سے ختم کردیا جائے۔ نئے دستور کی بنیادی کمزوریوں کے باوجود اس کے پراونشل آٹانومی والے حصہ کو اسی بنا پر قبول کیا گیا ہے کہ اس کا یہی ایک پہلو روشن ہے۔ اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے فڈریشن والے حصہ کو بھی باہزاراں عشوۂ وناز آخر کار اسی روشن پہلو کی خاطر قبول کیا جائیگا تاکہ مسلم اکثریت والے صوبوں کو مرکزی اقتدار کے واسطہ سے قابو میں لایا جائے۔

اس پروگرام کی ایک ایک دفعہ کو میں الگ الگ بیان کرونگا اور تفصیل کیساتھ بتاؤنگا کہ اس پر کس طرح عمل ہو رہا ہے اور اسکے نتائج کیا ہیں۔

(۶)

دستور جدید کے مطابق حکومت کے نظام کو چلانے کیلیے کانگریس نے پارٹی سسٹم اختیار کیا ہے۔ پارٹی سسٹم کی مختصر تشریح یہ ہے کہ جس مجلس قانون ساز میں کسی پارٹی کی اکثریت ہو وہاں خالصۃً اسی کی حکومت قائم ہوجائے اور وہ دوسری جماعتوں کو من حیث الجماعت، حکومت میں شریک نہ کرے۔ یہ حکمران

جماعت اپنی اکثریت کے زور پر جو قانون چاہے گی بنائیگی، اور جس تجویز یا مسودۂ قانون کو چاہیگی مسترد کردیگی۔ پھر اپنے بنائے ہوئے قوانین کو نافذ کرنا بھی اسی پارٹی کے اختیار میں ہوگا، کیونکہ حکومت کا نظم و نسق کلیتہً اسی کی وزارت کے ہاتھ میں رہیگا۔ جو لوگ اس کے اندر داخل ہوں وہ صرف اس صورت سے داخل ہوسکتے ہیں کہ پارٹی کے عہدنامہ پر دستخط کریں اور اُسکے ڈسپلن میں جکڑ دیے جائیں۔ پھر جب وہ اس طرح پارٹی ڈسپلن کے تابع فرمان ہوجائینگے تو انکے لیے یہ ناممکن ہوگا کہ کسی ایسی تجویز یا مسودۂ قانون کی مخالفت کریں جو پارٹی کی طرف سے پیش ہو، یا خود اپنی طرف سے کوئی ایسی چیز پیش کریں جسکی اجازت پارٹی نے نہ دی ہو، یا حکومت کی پالیسی پر نکتہ چینی کریں۔ انکو ہر حال میں پارٹی کی فرمانبرداری کرنی ہوگی اور اگر وہ آزادیٔ رائے استعمال کرنا چاہینگے تو انہیں پارٹی سے باہر نکل جانا ہوگا۔ نیز وہ پارٹی کے اندر رہ کر بھی اسکی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کراسکتے جب تک کہ وہ پارٹی میں اکثریت کو اپنا حامی نہ بنالیں۔

حکومت کا یہ سسٹم کانگریس نے ان تمام صوبوں میں اختیار کیا ہے جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ اسکے دوسرے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کو عملاً قانون سازی و تنفیذ قانون دونوں سے بے دخل کردیا گیا ہے۔ اگر مسلمان کانگریس پارٹی سے الگ رہیں تو وہ اپنی اقلیت کی وجہ سے نہ اپنے مفاد کیلیے کوئی قانون بنواسکتے ہیں، نہ اپنے مفاد کے خلاف کسی قانون کی منظوری کو روک سکتے ہیں، اور نہ قوانین کو نافذ کرنیوالی مشین، یعنی وزارت میں ان کا کوئی پرزہ شریک ہوسکتا ہے۔ اور اگر وہ اس پارٹی میں شامل ہوجائیں تو انہیں پارٹی ڈسپلن کے طوق و سلاسل پہننے پڑتے ہیں اور اسکے سوا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا کہ باہر رہتے ہوئے زبان کی جو آزادی وہ استعمال کرسکتے تھے وہ بھی چھن جائے۔ رہا اندر سے پارٹی کی پالیسی پر اثر ڈالنا، تو اقلیت میں ہونے کی وجہ سے یہاں بھی اسکا کوئی موقع نہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اڑیسہ اور سی پی میں تو علانیہ وہ حکومت کے نظم و نسق سے بے دخل ہیں اور جن صوبوں میں ایک یا دو مسلمان وزیر بنائے گئے ہیں وہاں دراصل مسلمانوں کی جماعت

کو بحیثیت جماعت کے حکومت میں حصہ نہیں دیا گیا ہے بلکہ ان کے ایک فرد یا دو افراد کو انفرادی حیثیت سے نوکر رکھا گیا ہے تاکہ محض اس بات کی نمائش کی جا سکے کہ وزارت میں مسلمان بھی شریک ہیں۔

آئینی حیثیت سے دیکھیے تو ان ملازموں کی حیثیت ذمہ دار وزراء کی نہیں ہے۔ کیونکہ ذمہ دار وزیر وہ ہوتا ہے جسکو اپنی جماعت کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہو، اور انہیں اپنی ذات کے سوا کسی کا اعتماد حاصل نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہیں اُن مسلمان ووٹروں کا اعتماد حاصل ہے جنہوں نے انکو منتخب کیا، مگر کل مسلمان ووٹروں میں انکے ووٹروں کا تناسب شاید پانچ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے اسکے معنی یہ ہوئے کہ وزارت میں جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، اکثریت کی نہیں بلکہ اقلیت کی حکومت ہے، اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے، انکی اکثریت حکمراں ہے، کیونکہ ہندو وزیر ہندو ووٹروں کی اکثریت کا اعتماد رکھتے ہیں۔

عملی حیثیت سے دیکھیے تو یہ بالکل بے زور ہیں۔ انکی پشت پر کوئی طاقت نہیں جسکے بل پر یہ کوئی بات زور کیساتھ کہہ سکیں۔ بخلاف اسکے ہندو وزراء کی پشت پر مجلس قانون ساز کی اکثریت کا زور ہے۔ یہ بے چارے بعض صوبوں میں تو کانگریس پارٹی کے اندر بالکل اکیلے ہیں، اور بعض جگہ صرف دو چار مسلمان انکی مدد پر موجود ہیں بھی تو وہ غریب خود پارٹی ڈسپلن میں جکڑے ہوئے ہیں۔

اسطرح ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان وزراء کی حیثیت ایک نوکر سے زیادہ نہیں ہے، اور اس حیثیت کا کھلا ہوا مظاہرہ سی پی کے سابق مسلمان وزیر مسٹر شریف کے معاملہ میں ہو چکا ہے۔ انہوں نے جب ایک مسلمان قیدی کو اپنے اختیارات سے کام لیکر رہا کیا اور اس پر مہاسبھائی ہندوؤں نے شور مچایا تو کانگرس ہائی کمانڈر نے کان پکڑ کر انکو ایوان وزارت سے باہر کر دیا، درانحالیکہ باقاعدہ تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا تھا کہ انہوں نے نہ تو اس معاملہ میں مذہبی عصبیت سے کام لیا، نہ کسی قسم کی بددیانتی کی، نہ جائز قانونی حدود سے تجاوز کیا[1]۔ اس کے برعکس ابھی حال میں مسٹر شریف کے جانشین ہندو وزیر نے اُسی قسم

[1] ملاحظہ ہو مدینہ مورخہ ۲۵ رجون ۳۸ء۔

کے ایک مجرم کو جسے ہائی کورٹ سے سزا ہو چکی تھی، اپنے اختیارات سے کام لے کر رہا کر دیا اور اس سے کوئی باز پرس نہ ہوئی۔ مسٹر شکلا نے وزارت کا قلمدان سنبھالتے ہی فسادات جبل پور کے ملزموں کو جنہیں سشن سپرد کیا جا چکا تھا، بلا کسی قانونی وجہ کے رہا کر دیا اور اس پر بھی کسی تحقیقات کی ضرورت نہ سمجھی گئی[1]۔ پنڈت شکلا سے پہلے ڈاکٹر کھرے کی وزارت پر خود کانگریسیوں نے رشوت، خیانت، غبن، اور اپنے متعلقین کو ملازمتوں میں بھرنے کے سخت الزامات عائد کیے تھے، مگر ان کے معاملہ کو گاندھی جی نے یہ کہکر رفع دفع کر دیا تھا کہ:

"کانگریس بہرحال معمولی انسانوں پر مشتمل ہے اور وہ خوبیوں اور برائیوں دونوں میں اس قوم کے ساتھ برابر کے حصہ دار ہیں جسکی وہ نمائندگی کر رہے ہیں[2]"،

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر کھرے کیساتھ بعد میں بہت سخت معاملہ کیا گیا، مگر کس وقت؟ جبکہ انہوں نے کھلم کھلا خدایان کانگریس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ مسٹر شریف کیطرح اگر وہ گھٹنے ٹیک کر ناک رگڑتے تو انہیں کبھی وزارت سے نہ نکالا جاتا۔

(۷)

پارٹی گورنمنٹ اور پارٹی ڈکٹیٹرشپ قائم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ جداگانہ انتخاب ہے کیونکہ اسکی بدولت مسلمانوں کی آواز نمایاں طور پر بلند ہو سکتی ہے اور اگر مسلمان نمائندوں کی بڑی اکثریت کانگریس پارٹی سے الگ رہے تو پارٹی گورنمنٹ قائم کرنے کی صورت میں کانگریس کی مہاسبھائیت بالکل بے پردہ ہونے لگتی ہے۔

مخلوط انتخاب کا مطالبہ اسی بدنمائی کو دور کرنے کیلیے بار بار پیش کیا جاتا تھا۔ مگر انگریز ابھی

---

[1] ملاحظہ ہو مدینہ مورخہ ۱۳ر اگست ۳۸ء

[2] ٹریبیون مورخہ ۱۹ر جون ۳۸ء

اس "شریف آدمیوں کی سی قرار داد" پر پوری طرح اعتماد کرنیکے لیے تیار نہ تھا جو اسکے اور کانگریس کے درمیان زیر تجویز تھی، اسلیے مسلمانوں کے مفاد کی خاطر نہیں بلکہ اپنے مفاد کی خاطر اس نے جداگانہ انتخاب کو برقرار رکھا۔

اس میں ناکام ہونیکے بعد دوسری تدبیر یہ نکالی گئی کہ جداگانہ انتخاب میں اندر سے نقب لگائی جائے، یعنی کانگریس براہ راست مسلمان حلقہ ہائے انتخاب میں جاکر مسلمان ووٹروں کو ہموار کرے اور ایسے مسلمانوں کو خود مسلمان رائے دہندگان ہی سے منتخب کرالائے جو پارٹی ڈسپلن اور ڈکٹیٹر شپ کو بخوشی قبول کرنے والے ہوں، اپنے صوبہ کی کانگریس پارٹی کے اور پھر اس کے اوپر ہائی کمانڈ کے غلام بنکر رہیں، جس طرح یہ آقا انہیں بٹھائیں اس طرح بیٹھیں اور جس طرح اٹھائیں اس طرح اٹھ جائیں، جس قسم کے قوانین ہندو اکثریت پاس کرنا چاہے انہیں مسلمانوں کیطرف سے بے چون وچرا منظور کرلیں، اور مسلمانوں کی قومیت کو فنا کرنے کیلیے جو تدبیریں کوئی مہاتما یا کوئی پنڈت سوچے ان کو مسلمانوں میں نافذ کرنے کی زحمت خود مہاتماجی یا پنڈت صاحب کو نہ اٹھانی پڑے بلکہ اس خدمت کو کوئی خاں صاحب یا کوئی سید صاحب انجام دیں۔ اس کا نہایت پاکیزہ نام مسلم ماس کانٹیکٹ رکھا گیا ہے۔

اگر یہ چیز کامیاب ہوجائے اور مسلمانوں کے حلقہائے انتخاب اس حد تک کانگریس پارٹی کے زیر اثر آجائیں کہ وہ اپنے مطلب کے جس مسلمان کو چاہے ان سے منتخب کراسکے، اور جو مسلمان اسکے مقابلہ پر کھڑا ہو وہ ناکام ہوجائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کبھی کسی موقع پر مسلمانوں کے مفاد کی شدید پامالی دیکھ کر کانگریس پارٹی کے کسی مسلمان رکن کو غیرت بھی آگئی اور وہ رکنیت سے مستعفی بھی ہوگیا تو کانگریس پارٹی خود اس کے حلقۂ انتخاب میں اسکو شکست دیگی اور اس سے کم تر غیرت رکھنے والے کسی مسلمان کو مسلمان ووٹروں سے منتخب کرالائیگی تاکہ وہ اس سے زیادہ بے پروائی کے ساتھ اپنی قوم کے مفاد کو پامال کرائے ماس کانٹیکٹ اس انتہائی نتیجہ تک پہنچ کر رہیگا اگر اس کی تائید میں ہمارے علمائے کرام چند سال اور اسی سرگرمی کیساتھ کوشش کرتے رہے۔ پھر جب تیر ہاتھ سے نکل چکیگا تو اسکو واپس لانے کیلیے بخاری شریف کا ختم پڑھا جائیگا۔

(۸)

اسکے بعد مسلم اکثریت کے صوبوں کا سوال باقی رہ جاتا ہے - سوانکے لیے اجتماعی ماہی گیری (MASS - CONTACT) اور انفرادی صید افگنی (INDIVIDUAL CONTACT) دونوں سے آج کل کام لیا جا رہا ہے -

مسلمان دس پندرہ برس سے جس خواب غفلت میں مبتلا تھے اسکے بدترین نتائج آج ہم دیکھ رہے ہیں - جدید آئین کے نافذ ہونے پر جب اسمبلیوں کیلیے انتخابات ہوئے تو یہاں کوئی ایسی منظم پارٹی نہ تھی، جو قوم کے مفاد کو سامنے رکھ کر کام کرتی اور مسلمان رائے دھندوں کو صحیح سیاسی تعلیم دے کر ایسے نمائندے منتخب کراتی جو بے غرض، مخلص، اور ایک مرکزی نظام کے مطیع ہوتے - جگہ جگہ مختلف جماعتوں نے محض شخصی اغراض اور طائفہ بندی کی بنیاد پر الکشن لڑائے - جس شخص کو کسی قسم کا اثر حاصل تھا وہ ایک پارٹی بنا کر کھڑا ہو گیا، اور دوسری پارٹی کے مقابلہ میں نبرد آزما ہوا - قومی پروگرام اور قومی پالیسی نہ اِسکے پاس نہ اُسکے پاس - ہر ایک کے سامنے وزارتیں، مناصب اور عزت وجاہ اسطرح یہ لوگ اسمبلیوں میں پہنچے، اور انکی بدولت مسلمانوں کی اکثریت ایک بندھے ہوئے جتھے کا روپ رکھنے کے بجائے بہت سی ٹکڑیوں میں بٹ کر بے زور ہو گئی - ان چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کے ساتھ ساتھ ایک اچھی خاصی تعداد میں انڈیپنڈنٹ ارکان بھی منتخب ہو کر پہنچے - انڈیپنڈنٹ کے معنی عام فہم زبان میں مرغ بادنما کے ہیں - یہ کوئی قومی مقصد یا قومی پروگرام لے کر نہیں جاتا بلکہ اس لیے جاتا ہے کہ شخصی حیثیت سے قسمت آزمائی کرے اور جدھر کامیابی کا موقع دیکھے اُدھر چلا جائے - عام مسلمان ووٹر ایسے جاہل کندۂ ناتراش تھے کہ انہوں نے نہ ان مرغان بادنما سے پوچھا اور نہ اُن جتھے بند پیڈروں سے کہ آپ حضرات کے پاس پروگرام کیا ہے؟ آپ کس لیے اسمبلی میں جانا چاہتے ہیں؟ آپ کس کیرکٹر کے لوگ ہیں؟

آپ نے پہلے ہماری قوم کیلئے کیا کیا اور اب کیا کرنیکا ارادہ رکھتے ہیں؟ یہاں کسی کے ذہن میں یہ تھا ہی نہیں کہ اسمبلی کیا بلا ہوتی ہے، جدید دستور کیا ہے، اور ان اسمبلیوں میں جو کچھ ہوگا اسکے کیا اثرات ہماری زندگی پر پڑینگے۔ یہاں تو دیکھنے والوں نے بس یہ دیکھا کہ اسمبلی کی کرسی عزت کی کرسی ہے تو کیوں نہ ہمارے قبیلہ کا آدمی اس کرسی پر پہنچے؟ چاہے وہ خرِ ناشخص ہی کیوں نہ ہو۔ غرض اس قومی حماقت کا، جو نہایت وسیع پیمانہ پر ملک کے کئی صوبوں میں کی گئی، یہ انجام ہوا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں کوئی منظم جماعت ایسی پیدا ہی نہ ہو سکی جو ہندو اکثریت کے صوبوں کی طرح مضبوط ہاتھوں سے حکومت کے اقتدار پر قبضہ کرتی اور ایک بنیانِ مرصوص بنکر جم جاتی۔

ادھر کانگریس جب ہندو اکثریت کے صوبوں میں ٹھوس بنیاد پر وزارتیں قائم کر چکی تو اس نے مسلم اکثریت والے صوبوں کیطرف دیکھا اور انکی کمزوری کو بھانپ لیا۔ انکے لیے اس نے جو پروگرام مرتب کیا وہ یہ تھا کہ ان صوبوں میں جو پارٹیاں برسرِ پیکار ہیں ان کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کیا جائے، ان کے افراد کی نفسانی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا جائے، ان میں جو ضعیف ترین کیرکٹر کے لوگ ہوں انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور چھانٹ چھانٹ کر آلۂ کار بنایا جائے، اور اس طرح مسلمانوں کی جمعیت میں سے جتنے آدمی توڑے جا سکیں انہیں کانگریسی اقلیت کے چھوٹے مگر منظم بلاک کیساتھ ملا کر ایسی وزارتیں قائم کرا دی جائیں جو کانگریس ہائی کمانڈ کی تابع فرمان ہوں، یا اگر اس میں کامیابی نہ ہو سکے تو کم از کم وہاں وزارت کو اس قدر کمزور اور اس قدر بے اثر بنا دیا جائے کہ وہ ادھ موئی ہو کر رہ جائے۔ ماتم کا مقام ہے کہ کانگریس کیطرف سے اس جلیل القدر خدمت کا بیڑا ہماری ہی قوم کے ایک شخص نے اٹھایا، اور اس سے بھی بڑھ کر ماتم کا مقام یہ ہے کہ یہ شخص وہ تھا جس سے ہم شیخ احمد مجدد سرہندی اور شاہ اسماعیل شہید کی جانشینی کی متوقع تھے، جو کبھی اسلامی نظام جماعت کا سب سے بڑا داعی تھا، جس نے برسوں مسلمانوں کو وحدت و مرکزیت کی دعوت دی، جسکی زبان سے ہم کبھی ایاکم والفرقۃ فان الشاذ من الناس للشیطان کما ان الشاذ من الغنم

للذئب[1] پر درس موعظت سنا کرتے تھے، جو کسی زمانہ میں ہم کو تلقین کیا کرتا تھا کہ "جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظام جماعتی کا نہ ہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے"۔ مسلمانوں کی بدقسمتی کہ بالآخر وہی امت کے پراگندہ سروں سے چوسر کھیلنے نکلا اور اس نے تمام ہندوستان کو اپنی قوم کی ذلت کا یہ تماشا دکھلایا کہ اس قوم کے چیدہ اور سربرآوردہ لوگ بھی کتنے ذلیل، کتنے بودے کیرکٹر کے لوگ ہیں، کس آسانی کے ساتھ انکو آپس میں لڑایا جا سکتا ہے اور کس بے شرمی کیساتھ یہ لیلائے وزارت کے پیچھے اس پارٹی سے اُس پارٹی میں اور اُس سے اس میں منتقل ہوتے جاتے ہیں۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو شدتِ الم سے بے اختیارانہ قلم سے نکل گیا۔ میں بتانا یہ چاہتا تھا کہ اس وقت مسلم اکثریت کے صوبوں میں کانگریس کی پالیسی کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں بھی انکو خود مختارانہ حکومت نہ کرنے دی جائے بلکہ انکے منافقات سے فائدہ اٹھا کر یا اس کانفلکٹ کے ذریعے سے انکے بڑے حصہ کو شدھ کر کے وہاں ایسی وزارتیں قائم کرائی جائیں جو کانگریس ہائی کمانڈ کی تابع فرمان ہوں۔ اگر اس مقصد میں کانگریس کامیاب ہو گئی (اور کیوں نہ ہو گی جبکہ آج ہماری قوم اٹھارویں صدی سے بھی زیادہ فیاضی کیساتھ اپنے فاتح خود مہیا کر رہی ہے) تو یوں سمجھیے کہ یہ فیڈریشن سے بھی پہلے ایک ایسے فیڈریشن کا قیام ہو گا جس میں مرکزی اقتدار تمام تر ہندو اکثریت کے ہاتھ میں رہیگا۔ اور یہ مرکز برطانوی حکومت کے تجویز کردہ وفاقی مرکز سے بدرجہا زیادہ سخت و ہمہ گیر ہو گا۔ اس میں بات بات پر وزراء کے کان کھینچے جائینگے، ذرا ذرا سے قصور پر انکو پکڑ بلایا جائیگا، ان پر تحقیقاتی کمیشن بٹھا دیے جائینگے، اور اگر انہوں نے کچھ مقابلہ کی ہمت کی تو لات مار کر انکو ایوان وزارت سے باہر کر دیا جائیگا۔ جب وزارتیں مرکزی اقتدار کے ہاتھ میں اسدرجہ بے بس ہوں، اور پھر اقتدار ہندو اکثریت کے ہاتھ میں ہو، تو اسکے معنی یہ ہیں کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں پرآونشل اٹانومی حرف غلط کی طرح مٹ گئی اور ہندو اس جگہ بھی مسلمانوں پر حکمراں ہو گئے جہاں وہ اقلیت میں ہیں۔

[1] اثر سیدنا علی رضی اللہ عنہ: "تفرقہ سے بچو کہ بچھڑا ہوا آدمی شیطان کا حصہ ہے جس طرح بچھڑی ہوئی بکری بھیڑیے کا حصہ ہوتی ہے"۔

صوبۂ سرحد کی مثال اس نتیجہ کی توضیح کیلیے بالکل کافی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جہاں ۹۵ فیصدی مسلم اکثریت ہے وہاں بھی حکومت کی پالیسی اور وزارت کی گردن کانگریس ہائی کمانڈ کے ہاتھ میں ہے۔ وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم کو سمجھنے اور سرحدی پٹھانوں میں نافذ کرنے کیلیے پشاور سے ماہرین تعلیم دہلی اور وردھا بھیجے جاتے ہیں۔ سرحد کا وزیراعظم ہندوؤں کو خوش کرنیکے لیے وعدہ کرتا ہے کہ انجمن حمایت اسلام کی ریڈروں میں مسلمان بچوں کو بھی نہ پڑھائی جائینگی، اور ایک ہندو کے معاوضہ میں قبائل کے دس مسلمانوں کو پکڑا جائیگا۔ اس نیاز مندی پر بھی یہ حال ہے کہ وزیراعظم صاحب اگر ایک مسلمان ملزم کو الزام سے بری پاکر ملازمت پر بحال کر دیتے ہیں تو ہندو مہاسبھا انکے خلاف شور محشر برپا کر دیتی ہے اور کانگریس ہائی کمانڈ اسکی بازپرس کیلیے وزیر صاحب کو بمبئی کھینچ بلاتی ہے۔ اسکے بعد بھی جو شخص نہ دیکھ سکے کہ یہ سڑک سیدھی ھندو راج کو جا رہی ہے، اسکے حق میں بس یہی دعا کرنی چاہیے کہ خدا اسے آنکھیں دے۔

یہ تمام تفصیلات جو نمبر ۶، ۷ اور ۸ میں بیان کی گئی ہیں ان پر غور کرنیسے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید دستوری اصلاحات سے فائدہ اٹھانیکا جو طریقہ کانگریس نے اختیار کیا ہے اسکا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس دستور کی بدولت جسقدر سیاسی طاقت برطانوی قیصریت سے ہندوستان کی طرف منتقل ہو وہ کلی طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں آجائے۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں تو وہ براہ راست ہندو اکثریت کے محکوم ہونگے۔ اور جہاں ان کی اکثریت ہے وہاں انکی حکومت کو کانگریس ہائی کمانڈ کا مطیع بنا لیا جائیگا۔ اور اسکے ساتھ ساتھ ماس کانٹیکٹ کے ذریعہ سے یہ کوشش برابر جاری رکھی جائے گی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا علیحدہ سیاسی وجود ختم ہو جائے، نہ انکی اپنی کوئی علیحدہ سیاسی پالیسی رہے اور نہ مستقل سیاسی قیادت بلکہ وہ اس بڑے سیاسی مجموعہ (BODY POLITIC) میں گم ہو کر رہ جائیں جس میں اصول جمہوریت کی بنا پر ہندو عنصر... کی حیثیت بہرحال غالب اور فیصلہ کن رہیگی۔ اس مجموعہ میں گم ہو جانیکے بعد جو مجموعہ کے لیڈر ہونگے وہی مسلمانوں کے بھی لیڈر ہونگے اور ظاہر ہے کہ اکثریت کی طاقت ہندوؤں ہی کو لیڈر بنائیگی۔ اسی طرح مسلمانوں کی سیاسی پالیسی بھی...

ملاحظہ ہو نیشنل کال مورخہ ۲۸ جون ۳۸ء و ٹریبیون مورخہ ۲۲ جولائی ۳۸ء

وہی ہوگی جو مجموعہ کی ہوگی، اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جہاں سر شماری پر ہر بات کا فیصلہ ہو وہاں ہر پالیسی کا ہندو پالیسی ہونا لازم ہے۔

ہندوستان کے آئندہ سیاسی ارتقار کو ہندو لیڈر جس راستہ پر لیجانا اور جس منزل تک پہنچانا چاہتے ہیں اسکا پہلا اور ضروری مرحلہ یہی ہے۔ اگر اس مرحلہ پر وہ سیاسی ارتقار کا رخ اپنی منزل کیطرف پھیرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر لازماً آئندہ جو قدم بھی اُٹھیگا اسی منزل کیطرف اُٹھیگا، کیونکہ اس مرحلہ پر انکی کامیابی کے معنی یہ ہیں کہ گھوڑے کی باگیں پوری طرح انکے ہاتھ میں آجائیں۔ اسی لیے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۳۵ء کو نامنظور کرنیکا بار بار اعلان کرنے پر بھی انہوں نے اسے منظور کر لیا۔

اب ہمارے بہت سے سادہ لوح بھائی بار بار پلٹ کر ہم سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ اس ڈیڑھ سال کی حکومت میں کانگریسی وزارتوں نے کہاں اور کیا مسلمانوں پر ظلم کیا؟ ایک صاحب نے تو اخبارات میں یہ چیلنج بھی چھپوایا تھا۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ بالفرض انہوں نے کوئی ظلم نہیں کیا۔ مان لیجیے کہ بڑی ہی اچھی طرح حکومت کی۔ مگر یہ کونسی عقلمندی ہے کہ اپنی باگیں بالکل دوسروں کے ہاتھ میں دیدی جائیں؟ سوال ان اشخاص کا نہیں ہے جو آج برسر اقتدار ہیں بلکہ سوال ادارہ کی نوعیت کا ہے۔ جس ادارہ کی نوعیت یہ ہو کہ ایک قوم دوسری قوم پر حکمراں بنجائے، اور ایک قوم دوسری قوم کے قبضۂ تصرف و اختیار میں چلی جائے، ظلم ایسے ادارہ کی عین فطرت میں داخل ہوتا ہے۔ آج بالقوہ ہے تو کل بالفعل ہوگا اور بالفعل ہوئے بغیر نہ رہیگا۔

(۹)

مختلف قوموں اور تہذیبوں کے ملک میں اگر سیاسی اقتدار کسی ایک قوم کے ہاتھ میں مرتکز ہو جائے اور پھر وہ تمام ملک کیلیے ایک قومیت اور ایک تہذیب و تمدن کی تشکیل کرنا چاہے تو یہ فطری اور لازمی بات ہے، کہ اس قومیت اور اس تہذیب و تمدن کی شکل اسی برسر اقتدار قوم کے منشا کے مطابق ہوگی۔ دوسری قوموں کی تہذیب اور ... قومیت کا رنگ اس میں پھیکا ہوگا اور پھیکا ہوتا چلا جائیگا یہاں تک کہ بالکل تحلیل ہو جائیگا۔ نامساوی آمیزش میں انصاف ممکن ہی نہیں، خواہ کتنی ہی نیک نیتی کیساتھ انصاف کی کوشش کیجائے۔

کانگریس نے اقتدار حاصل کرنیکے بعد مستقبل کے ہندوستان کی تشکیل جس ڈھنگ پر شروع کی ہے اس کو آنکھیں کھول کر دیکھیے، آپکو خود نظر آجائیگا کہ اس نقشہ میں مسلمانوں کی قومیت اور تہذیب کیلیے کوئی جگہ نہیں۔

سب سے پہلے وردھا اسکیم کو لیجئے[1] - یہ اسکیم مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں بنائی گئی ہے[2]۔ اسکی خصوصیت یہ ہے کہ اس اسکیم کے مطابق عام باشندگان ہند کے بچوں کو سات برس سے چودہ برس کی عمر تک لازمی جبری تعلیم دی جائیگی[3]۔ لازمی اور جبری تعلیم کا مفہوم خوب ذہن نشین کر لیجے۔ جس علاقے میں حکومت کے زور سے یہ اسکیم نافذ ہوگی وہاں کا کوئی باشندہ نہ تو اپنی اولاد کو اس نظام تعلیمی میں شریک ہونے سے روک سکیگا اور نہ کوئی دوسرا نظام تعلیمی ایسا موجود ہوگا جس میں وہ انہیں داخل کر سکے۔ آدمی کا کیرکٹر جس عمر میں بنتا ہے یا یوں کہیے کہ جس عمر میں اسکی آدمیت کی تشکیل ہوتی ہے وہ بیشتر بلکہ تمام تر اس اسکیم کے قبض و تصرف میں آجاتی ہے۔ انگریزوں کا بنایا ہوا نظام تعلیم لازمی و جبری نہ تھا۔ اس میں جبر کا عنصر صرف اس حیثیت سے تھا کہ جو اسکے دائرے سے باہر رھیگا وہ مادّی کامیابی کے مواقع سے محروم رھیگا۔ تاہم اس میں آدمی کیلیے یہ اختیار باقی تھا کہ اگر اس محرومی کو قبول کرلے تو اس نظام تعلیمی سے آزاد رہ کر جس نظام کو پسند کرے اس میں شریک ہوجائے لیکن وردھا اسکیم میں سرے سے یہ اختیار باقی نہیں رہتا۔ یہاں آدمی مجبور ہے کہ اپنی آئندہ نسل کو اسی نوعیت کا آدمی بنانے کیلیے سپرد کردے جس نوعیت کے آدمی یہ اسکیم بنانا چاہتی ہے۔

اچھا اب دیکھیے کہ یہ اسکیم کس نوعیت کے آدمی بنانا چاہتی ہے؟ وہ بنیادی تصورات جن پر یہ پوری اسکیم تیار کی گئی ہے حسب ذیل ہیں:

(۱) ہندوستان کی پوری آبادی کو "ایک قوم" فرض کیا گیا ہے۔ اسکیم میں جگہ جگہ ہمکو اس قسم

---

[1] میرے پیش نظر وہ اردو رپورٹ بھی ہے جو رسالہ جامعہ مورخہ جنوری ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی ہے اور وہ انگریزی پمفلٹ بھی ہے جو (BASIC NATIONAL EDUCATION) کے نام سے ہندوستانی تعلیمی سنگھ نے شائع کیا ہے۔ مگر میں زیادہ تر اردو رپورٹ ہی کا حوالہ دونگا۔

[2] جامعہ صفحہ ۱۱۱ [3] جامعہ صفحہ ۱۳۱

کے فقرے ملتے ہیں:

"(مہاتما گاندھی نے) اس کا بیڑا اٹھایا ہے کہ تعلیم کی ایک ایسی راہ نکالینگے جو ہندوستانیوں کی طبیعت کے مناسب ہو اور جس سے ساری قوم کی تعلیم کا کام کم سے کم وقت میں چل نکلے" (صفحہ ۱۱۱)

"اسے تعلیم کی اچھی پالیسی اور قوم کی ترقی کی ضروری تدبیر سمجھ کر قبول کرلینا چاہیے" (ص ۱۱۴)

"اور قوم کے بچوں کو اس تعلیمی اسکیم کا مقصد اور اسکی قیمت سمجھا سکے" (ص ۱۲۸)

اسکیم کا نام ہی "بنیادی قومی تعلیم" کی اسکیم ہے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ اس نظام تعلیم کی بنیاد ہی قومیتوں کی نفی پر رکھی گئی ہے۔ اس میں کسی کی جداگانہ قومیت کا رنگ نہیں آسکتا۔ یہ بنایا ہی اس لیے گیا ہے کہ ہماری آئندہ نسل کے ذہن سے اس تخیل کو نکال دے کہ "ہندوستانی" کے سوا انکی کوئی اور قومیت بھی ہے۔

(۲) شدھ ہندوستانی بن جانیکے بعد سب سے پہلی اور سب سے اہم صفت جس سے بچہ کو متصف ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ وہ ایک اچھا کاروباری آدمی ہو۔ ہر علم اسکو اسلیے سکھایا جائے، اور وہ اسی لیے اسکو سیکھے کہ روٹی پیدا کرنے میں اس سے مدد ملے۔ اسکیم کے واضعین کی نگاہ میں آدمیت اور کمانے کی قابلیت دونوں مترادف المعنیٰ الفاظ ہیں۔ پوری اسکیم پر تعلیم کا مادّی نقطۂ نظر اس قدر غالب ہے کہ اسکے زیر اثر جو نسل پرورش پائیگی وہ مادّہ پرست بنکر اٹھے گی اور خوردن برائے زیستن کے بجائے زیستن برائے خوردن کی معتقد ہوگی۔ ایک طرف تعلیم دینے والی حکومت رعایا کے بچوں کی تعلیم کا انتظام اس ذہنیت کے ساتھ کریگی کہ اس پر تعلیمی مصارف کا کم سے کم بار پڑے اور بچے کسی ایسی دستکاری کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کریں جسکی آمدنی سے استادوں کی تنخواہیں اور مدرسے کا خرچ نکل آئے۔ دوسری طرف پورا نظام تعلیم بچے میں یہ ذہنیت پیدا کریگا کہ کما کھانا اسکی زندگی کا اولین بلکہ شاید ایک ہی مقصد ہے۔ تعلیم کا مرکز و محور کسی نہ کسی بنیادی دستکاری مثلاً زراعت یا نوربافی یا لکڑی یا دھات

ل صفحہ ۱۱۲

کے کام کو رکھا گیا ہے اور پورے تعلیمی کورس کو اسی محور کے گرد گھما دیا گیا ہے - اس میں دو بنیادی مقصد واضعین کے پیش نظر ہیں - ایک یہ کہ :

"ہر سمجھدار شہری کو سماج کا کام کرنے والا رکن ہونا چاہیے" (ص ۱۱۴)

"یہ اسکیم اسلیے بنائی گئی ہے کہ ملک میں کام کرنیوالے پیدا ہوں جو ہر مفید کام کو چاہے وہ میلا اٹھانے ہی کا کام ہو عزت کے قابل سمجھیں، جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتے ہوں" (ص ۱۱۴)

"ہمارا مقصد عالم فاضل پیدا کرنا نہیں بلکہ ہوشیار سمجھدار پڑھے لکھے دستکار پیدا کرنا ہے جو صحیح خیالات اور سماج کی خدمت کا شوق رکھتے ہوں" (ص ۱۲۸)

دوسرا مقصد یہ ہے کہ :

"مہاتما جی نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ حکومت کو اسکا ذمہ لینا چاہیے کہ اپنے ہونے والے شہریوں کے کام کی پیداوار کو اس بھاؤ (بازار کے بھاؤ) پر خریدے گی ...... ہم اس رائے کی پوری طرح تائید کرتے ہیں - اس آمدنی سے جو مالی فائدہ ہوگا اسے چھوڑ کر یوں بھی ہمارا خیال ہے کہ سکھانیوالوں اور سیکھنے والوں کے کام کی اچھائی کو جانچنے اور ناپنے کا کوئی پیمانہ ہونا چاہیے" (ص ۱۱۵)

یعنی تعلیم کی کامیابی کو جانچنے اور ناپنے کا پیمانہ یہ ہے کہ طلبہ نے کتنا کمایا اور استادوں نے انکو کتنا کمانیکے قابل بنایا - اسی مادّی نقطۂ نظر کی بنا پر ساڑھے پانچ گھنٹے کے اوقات تعلیمی میں سے ۳ گھنٹے ۲۰ منٹ دستکاری کے لیے وقف کیے گئے ہیں، اور باقی اوقات میں جو دوسرے علوم پڑھائے جائینگے ان میں بھی بنیادی مقصد یہ رکھا گیا ہے کہ وہ کاروباری زندگی میں مددگار ہوں - اس پوری اسکیم پر نظر ڈالنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اسکے پیش نظر ایک صنعتی سماج (INDUSTRIAL SOCIETY) پیدا کرنا ہے جس کے افراد زیادہ تر مادّی قدروں ہی سے واقف ہوں، مادّی پیمانے ہی سے

زندگی کی ہر چیز کوتاہیں، اور بلند تر اخلاقی و روحانی چیزوں کی قدر کرنیکا ذوق ہی ان میں پرورش نہ پاسکے
ایسی سماج کے ماحول میں ہر روحانی تہذیب خود ٹھٹھر کر رہ جائیگی۔[1]

(۳) اس مادّہ پرست سوسائیٹی میں "شہریت" (CITIZENSHIP) کا جو مطمح نظر (IDEAL)
اختیار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ :

"یہ ہونیوالی بات ہے کہ نئے ہندوستان کی سماجی زندگی، سیاست، معیشت اور تہذیب
میں جمہوریت کا رنگ دن پر دن بڑھتا جائیگا" (ص ۱۱۳)

جمہوریت کے رنگ کا مفہوم شائد عام لوگ نہ سمجھ سکیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندے اپنی معاشرت اور تہذیب میں آئندہ یک رنگ ہوتے چلے جائینگے۔ یہ دراصل اسکیم کے واضعین کا نصب العین ہے جسکو انہوں نے شدت یقین کی بنا پر پیشین گوئی کے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نصب العین کو سامنے رکھکر وہ آئندہ نسل کو ایسی تعلیم دینا چاہتے ہیں جس سے :

"بچے کو عام طور پر انسانوں اور خاص طور پر ہندوستان کے لوگوں کی ترقی سے دلچسپی ہو جائے"۔

"اسکے دل میں وطن کی محبت ہو۔ وہ ہندوستان کے پچھلے زمانے کی عزت کرے اور آنیوالے
زمانے کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے کہ یہ ایک ایسی سماج کا گھر ہوگا جسکی نیو مل کر کام کرنے
اور محبت سچائی اور نیاؤ پر رکھی جائیگی"۔

"سب کے دل میں ایک دوسرے کے مذہب کی اور دنیا کے سب مذہبوں کی عزت پیدا ہو جائے"۔

---

[1] کوئی شخص ہماری اس تنقید سے یہ نہ سمجھے کہ ہم کسب رزق کو غیر اہم اور غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمیں اسکی اہمیت سے ہرگز انکار نہیں۔ مگر ہمارے اور وردھا اسکیم کے نقطۂ نظر میں وہی فرق ہے جو خوردن برائے زیستن اور زیستن برائے خوردن میں ہے۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ روٹی مقصود بالذات ہو اور دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مقصد حیات اس سے بلند تر ہو اور روٹی اس مقصد کی خاطر زندہ رہنے کیلیے ہو۔ پہلا نقطۂ نظر اگر کسی سوسائیٹی پر چھا جائے تو اسلام اس میں زندہ نہیں رہ سکتا۔

...... دنیا کے مذہبوں کے اصول بتا کر یہ ثابت کیا جائے کہ خاص خاص باتوں میں سب مذہب ایک ہیں۔"

"قومی تہواروں اور قومی ہفتے کا منانا ہر اسکول کی زندگی میں ایک خاص چیز ہونا چاہیے" (ص ۱۱، ۱۹)

ان سب بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ اسکیم بنانے والوں کے پیش نظر مختلف مذاہب کے پیروؤں کو ملا کر ایک سماج یعنی ایک حیثیت اجتماعی یا ایک سوسائٹی بنانا ہے۔ اسلیے وہ ہر مذہب کی ایسی تعلیمات کو بچوں کے ذہن سے خارج رکھنا ضروری سمجھتے ہیں جو ان میں مذہبی انفرادیت پیدا کرتی ہوں۔ تمام مذاہب کے متعلق یہ نظریہ انکے ذہن میں بٹھانا چاہتے ہیں کہ ان میں اصلاً کوئی فرق نہیں۔ وطن پرستی ان میں پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ مذہبیت کی بنیاد پر الگ الگ رہنے کے بجائے وطنیت کی بنیاد پر ایک دوسرے کی پیوست ہو جائیں۔ ہندوستان کے پچھلے زمانے کی عزت انکے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان سب میں قومی افتخار کے جذبات ایک ہی سرچشمے یعنی ہندوستان کے زمانۂ ماضی سے پیدا ہوں اور بیرون ہند کی تاریخ سے انکے جذبات کا تعلق منقطع ہو جائے۔

وطنی قومیت بنانے کے لیے یہ چار عنصر ضروری ہیں، اور ہر وہ تعلیمی اسکیم جسکا بنیادی مقصد وطنی قومیت بنانا ہو اس پر مجبور ہے کہ مذاہب کے ایسے علم کو آئندہ نسل کے دل و دماغ سے دور رکھے جو ان کے فرق اور اختلاف کو نمایاں کرنیوالا ہو۔ اگر وہ شرک اور توحید، خدا پرستی اور بت پرستی، پیغمبر اور اوتار، عقیدۂ آخرت اور عقیدۂ تناسخ کے فرق کو بچوں کے ذہن میں اُتر جانے دیگی تو اپنے عین مقصد کو نقصان پہنچائیگی۔ اسکے لیے تو ناگزیر ہے کہ بچوں کے مذہبی علم کو صرف اس قسم کی باتوں تک محدود رکھے کہ دیکھو جھوٹ بولنا سب مذہبوں میں گناہ ہے، چوری سب میں حرام ہے، زنا کو سب منع کرتے ہیں، وغیرذالک۔ اسی طرح وہ اس پر بھی مجبور ہے کہ جن قوموں کو افتخار کے جذبات بیرون ہند کی تاریخ سے ملتے ہیں ان کے اس سرچشمے کو بند کرے اور پراچین سمے کے ہندوستان سے ان کا تعلق جوڑے۔ اگر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور عمر اور علی اور

خالد رضی اللہ عنہم سے وابستگی کو یونہی قائم رہنے دیگی تو اپنے اساسی مقصد پر خود ضرب لگائیگی۔ اس چیز کو مہاتما گاندھی نے صاف طور پر بیان کر دیا ہے:

"ہم نے وردھا کی تعلیمی اسکیم سے مذاہب کی تعلیم کو باہر رکھا ہے اسلیے کہ آج مذاہب جس طرح پڑھائے جاتے ہیں اور جسطرح ان پر عمل کیا جاتا ہے وہ وحدت پیدا کرنیکے بجائے اختلاف پیدا کرنیکا موجب ہے۔ مگر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ جو سچائیاں تمام مذاہب میں مشترک ہیں وہ سکھائی جاسکتی ہیں اور سکھائی جانی چاہئیں[1]"

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی عقائد کی تعلیم دینا اُس پالیسی اور اُس مقصد ہی کے خلاف ہے جسکے لیے یہ ساری اسکیم بنائی گئی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب اپنے ایک بیان میں فرماتے ہیں کہ "وردھا اسکیم میں یہ تو کہیں نہیں لکھا کہ مذہبی تعلیم نہ ہونی چاہیے۔ اس وقت جو طریقہ جاری ہے، ہم نے اُسی کو برقرار رکھا ہے، یعنی مدرسہ کے اوقات کے ماسوا جو گروہ چاہے اپنے بچوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام کرلے[2]۔" لیکن مہاتما گاندھی کا بیان اور خود ڈاکٹر ذاکر حسین کی اپنی اسکیم اُنکے اس قول کی تکذیب کیلیے کافی ہے۔ جس قسم کی شہریت پیدا کرنے کو انہوں نے اپنی تعلیمی اسکیم کا مقصود ٹھیرایا ہے، اسکو یہ چیز بھی نقصان پہنچائیگی کہ مسلمان یا دوسرے مذاہب کے پیرو اپنے بچوں کو مذہبی عقائد کی تعلیم خارج از اوقات مدرسہ دیں۔ اگر وہ متضاد باتیں نہیں کرنا چاہتے تو انہیں یوں کہنا چاہیے کہ ہماری خواہش تو یہی ہے کہ کوئی گروہ اپنے بچوں کو ایسے عقائد کی تعلیم نہ دے جو ہمارے نصاب تعلیم کے برعکس انہیں یہ سکھاتے ہوں کہ سب مذاہب کے اصول ایک نہیں ہیں۔ لیکن اگر کوئی گروہ اوقات مدرسہ کے ماسوا ایسی تعلیم دینا چاہے تو ہم مجبوراً اسے برداشت کرینگے کیونکہ جبراً ہم اسے روک بھی نہیں سکتے۔ ڈاکٹر صاحب ایک معقول اور تعلیم یافتہ آدمی ہیں۔

---

[1] نیشنل کال مورخہ ۸ر جولائی ۱۹۳۸ء

[2] ٹریبیون مورخہ ۷ر جولائی ۱۹۳۸ء

وہ کم از کم اضداد میں تمیز تو کرسکتے ہیں۔ انکے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ ایک نظام تعلیمی کی پالیسی یا تو یہ ہوسکتی ہے کہ بچے میں اسلامی قومیت کا شعور پیدا کیا جائے یا یہ ہوسکتی ہے کہ اس میں ہندوستانی قومیت کا (ہندوستانیت کا نہیں بلکہ ہندوستانی قومیت کا) شعور پیدا کیا جائے۔ اگر انکے تجویز کردہ نظام کی پالیسی پہلی ہے تو وہ بتائیں کہ انکے نصاب میں کونسی چیز ہے جو کسی مسلمان بچے میں اسلامی قومیت کا شعور پیدا کرتی ہو، یا پیدا کرنا در کنار اسکو کم از کم باقی ہی رکھتی ہو؟ اور اگر انکی پالیسی دوسری ہے تو وہ صاف صاف اس بات کا اقرار کیوں نہیں کرتے کہ ہم اسلامی قومیت کا شعور مٹا کر ہندوستانی قومیت کا شعور پیدا کرنا چاہتے ہیں؟ یہ کیا ہے کہ وہ عمر بجا دوسری پالیسی اختیار بھی کرتے ہیں، اور پھر مسلمانوں کو یہ بھی یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہم تمہارے بچوں میں سے اسلامی قومیت کا شعور مٹانا نہیں چاہتے؟ اگر وہ شمال کیطرف چل کر یہ سمجھتے ہیں کہ جو لوگ جنوب کیطرف جانا چاہتے ہیں ان کا مقصود بھی فوت نہ ہوگا، تو وہ ہمیں معاف فرمائیں، ہمیں انکے ذی عقل ہونے میں بھی شبہ ہے۔ اور اگر وہ ارادہ یہی رکھتے ہیں کہ جنوب کیطرف پہنچنے کی خواہش رکھنے والوں کا مقصد فوت ہو جائے، مگر انہیں یقین یہ دلانا چاہتے ہیں کہ ان کا مقصد فوت نہ ہوگا تو پھر منافقت کا شدید تر الزام ان پر عائد ہوتا ہے، اور بہتر ہے کہ وہ اس سے بچنے کی کوشش فرمائیں۔

وردھا اسکیم کے انگریزی ایڈیشن میں تفصیلی نصاب درج کیا گیا ہے، افسوس کہ اس کا ترجمہ اردو میں شائع نہیں کیا گیا ورنہ اسے دیکھنے کے بعد ہر شخص اندازہ کرسکتا تھا کہ اس نصاب میں مسلمان بچوں کے شعور اسلامی کو فنا کرنیکا کس قدر مکمل انتظام کیا گیا ہے۔

مادری زبان کے شعبہ میں تیسرے درجہ والوں کو بودھ، عیسیٰ اور محمدؐ کی اور چوتھے درجہ والوں کو بڑے بڑے آدمیوں، مثلاً زرتشت، سقراط، حسینؓ، ابراہام لنکن، ٹالسٹائے، سن یات سین اور گاندھی کی کہانیاں پڑھائی جائینگی۔

سماج کے علم میں ویدک عہد کی کہانیوں کیساتھ موسیٰؑ، ابراہیمؑ اور مارکس اریلیس کے حالات

اور درجہ چہارم میں قدیم ہندوستان، بودھ مت جین اور عیسیٰ اور عیسائیوں کے حالات بتائے جائینگے۔

درجہ پنجم میں خاص طور پر اسلامی دور کو رکھا گیا ہے اور اسکے خاص خاص مضامین یہ ہیں:

۱۔ محمدؐ، عمرؓ، علیؓ، حسینؓ، عمرؓ ابن عبدالعزیز کے حالات۔

۲۔ ہندوستان سے مسلمانوں کے تعلق کی ابتدا۔ محمدؐ بن قاسم۔ خواجہ معین الدین چشتی۔

۳۔ ہندی اسلامی تہذیب کے ارتقار کی داستان۔

۴۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب ایک دوسرے پر کس طرح اثر انداز ہوئے۔ اس کی توضیح امیر خسرو، کبیر، گرونانک، اکبر اور داراشکوہ کے حالات سے۔

۵۔ مشترک تمدنی زندگی کا ارتقار:۔ غذا، لباس، تفریحات، مشترک تہوار، معاشرتی رسوم اور آداب و اطوار۔

۶۔ مشترک سیاسی زندگی اور ملکی نظم و نسق: شیر شاہ، اکبر اور ٹوڈرمل۔

۷۔ زبان و ادب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات اور "ہندوستانی" کا ارتقار بحیثیت مشترک زبان کے۔

۸۔ فنون لطیفہ اور موسیقی۔ امیر خسرو، تان سین۔ ہندو مسلم فن تعمیر اور اسکے نمونے۔

۹۔ حسب ذیل شخصیتوں کے حالات زندگی: البیرونی، ابن بطوطہ، فیروز شاہ تغلق، بابر، چاند بی بی، نورجہاں، اور چند صوفی بزرگ مثلاً دادو، کبیر، نانک، بابا فرید۔

۱۰۔ دنیا کو اسلامی تہذیب نے کیا دیا۔ علیؓ بحیثیت انسان اور عالم۔ بلالؓ بحیثیت نمائندہ حبشی جمہوریت۔ ہارون الرشید کی علمی سرپرستی۔ صلاح الدین بحیثیت نمائندہ شجاعت مسلمین۔ عبدالرحمٰن الناصر اور اندلس کی اسلامی تہذیب۔ اسلامی سلطنت کی وسعت جغرافی تعلق کیا تھا۔

اس پورے نقشہ میں دیکھیے، مسلمانوں کے پیغمبر اور مذہبی پیشوا عام مشاہیر کی صف میں بیٹھے

ہیں۔ بلکہ کہیں کہیں انکو گوتموں کیساتھ بٹھایا گیا ہے۔ مسلمان بچے ان کو اس حیثیت سے نہ جانینگے کہ وہ ان کے دین کے ستون ہیں بلکہ اس حیثیت سے جانینگے کہ دنیا کے دوسرے بڑے بڑے آدمیوں میں سے وہ بھی ہیں۔ ہندوستان میں اسلامی تہذیب کی تاریخ اس طرح ان کے دماغ میں اتاری جائیگی کہ ہندو اور مسلمانوں کے مذہب اور تہذیب کے میل جول سے جو چیز اکبر اور دارا شکوہ اور کبیر اور نانک نے پیدا کی اس کی خوبی اور معقولیت ان پر نقش ہو جائے۔ اس سے ان میں کبیر پنتھی اور برہمو سماجی شعور تو پیدا ہو سکتا ہے، مگر اسلامی شعور ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس تعلیم کیساتھ اگر ہمارے علماء نے لڑ بھڑ کر کچھ مذہبی تعلیم کا پیوند لگوا بھی دیا تو اس سے کیا حاصل ہوگا؟ سارا نظام تعلیمی جس بنیاد پر اٹھایا گیا ہے، جو مقصد اسکی اساس میں رکھ دیا گیا ہے اور جس تعلیمی پالیسی پر یہ تعمیر شروع سے آخر تک ہوئی ہے اس میں دینیات کی تعلیم کا جوڑ قطعاً بے نتیجہ ہوگا۔ اسلامی ہائی اسکولوں میں دینیات کی تعلیم سے جو کچھ نتائج حاصل کیے گئے ہیں بس ویسے ہی کچھ نتائج اس وردھا اسکیم میں بھی دینیات کی قلم لگانے سے حاصل ہوجائینگے

(۴) واحد قومیت، مادہ پرست سوسائٹی اور مخلوط سماج کی اس تشکیل میں اخلاقی رنگ بھی ضروری تھا، اسلیئے کہ اخلاق کے بغیر نئی ہندی تہذیب نامکمل رہی جاتی ہے۔ مذاہب اور انکی شریعتوں کو تو تعلیم سے خارج کر دیا گیا۔ اسکے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر ان شہریوں کی اخلاقی تربیت کس بنیاد پر ہو؟ وردھا اسکیم نے اس سوال کو اس طرح حل کیا کہ ہند جدید کے "پیغمبر" مہاتما گاندھی کی روحانی تعلیم پر "ہندوستانی قوم" کے اخلاق کی بنیاد رکھ دی:۔

"ہندوستان کی زندگی کا راستہ الگ ہے۔ اس نے ہر طرح کی آزادی حاصل کرنے کیلیے اہنسا کا طریقہ لیا ہے۔ ہمارے بچوں کو یہ سکھانیکی ضرورت ہے کہ اہنسا کا طریقہ ہمسا سے اچھا ہے" (جامعہ صفحہ ۱۱۱)

"جن لوگوں نے قوموں کو آزاد کرایا ہے اور امن کے ذریعہ سے صلح حاصل کی ہے ان

کی کہانیاں کورس کی کتابوں میں خاص طور پر ہونی چاہییں۔ انسانوں کی زندگی سے ایسے سبق سکھانے چاہییں جن سے اہمسا اور اسکے ساتھ کی خوبیوں کا اہمسا اور دھوکے اور دغا سے اچھا ہونا ثابت ہو" (ص ۱۱۹)

اس طرح تمام مذاہب کی تعلیم خارج کرکے مہاتما گاندھی کے مذہب کی تعلیم داخل کردی گئی۔ اب جو نسل ہندوستان کی درسگاہوں سے پرورش پاکر نکلے گی اس کے اخلاقی تصورات دین گاندھی پر مبنی ہونگے۔ ہندوستان کی زندگی کا راستہ ــــــ اور مذہب کا کوئی مفہوم اسکے سوا نہیں کہ وہ زندگی کا راستہ ہی ہے ــــــ یہ ہوگا کہ وہ جہاد بالسیف کو دھوکے اور دغا کا قریبی رشتہ دار سمجھیگا اور اہمسا کو عقیدۃً اس پر ترجیح دیگا۔

سات برس سے چودہ برس کی عمر تک لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ تعلیم لازماً اور جبراً دی جائیگی اور اس عمر میں یہ بچے اس نظام تعلیمی کے سوا کسی دوسرے نظام تعلیم میں شامل نہ ہو سکینگے، اور جو والدین خود غیر تعلیم یافتہ ہیں یا جن کے پاس مالی ذرائع مفقود ہیں وہ بطور خود بھی انکی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہ کرسکینگے۔ حد سے حد پانچ فی صدی آدمیوں نے اگر اپنے بچوں کی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام کر بھی لیا تو وہ بس موجودہ نسل تک ہے۔ دوسری نسل جو وردھا اسکیم کے مدرسوں سے تعلیم پاکر اٹھے گی اس پر مادّی نقطۂ نظر اور جدید ہندی قومیت کے تصورات کا اتنا غلبہ ضرور ہوگا کہ اسے اپنی اولاد کو مذہبی تعلیم دینے کی زیادہ پروا نہ ہوگی۔ لہذا یقین رکھنا چاہیے کہ تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے ہندوستان "ایک قوم" بن جائیگا۔

انگریزوں نے کامل سیاسی اقتدار حاصل کرکے میکالے کی تعلیمی اسکیم نافذ کی تھی جو نہ آدھے ہندوستانیوں کو پورا انگریز بنا سکی نہ پورے ہندوستانیوں کو آدھا انگریز، مگر ہندوؤں نے ابھی سیاسی اقتدار کی پہلی سیڑھی پر ہی قدم رکھا ہے اور اسی مرحلہ پر وہ اسکیم ہماری جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ سے بنوالی ہے جو انشاءاللہ سارے ہندوستانیوں کو پورا "ہندوستانی" بناکر چھوڑیگی۔ اسکے بعد کسے شک ہوسکتا ہے کہ تاریخ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا مرتبہ میکالے سے بلند تر نہیں ہے، اور یہ مہاتما گاندھی کی مہربانی

ہے کہ انہوں نے یہ شرف خود حاصل کرنے کے بجائے ڈاکٹر صاحب کیطرف منتقل کر دیا!

(۱۰)

سی پی میں ایک دوسری تعلیمی اسکیم بنائی گئی ہے جو "ودیا مندر اسکیم" کے نام سے مشہور ہے۔ اسکے مصنف صوبہ کے وزیر اعظم پنڈت شکلا ہیں جو مالوی جی کے خاص چیلوں میں سے ہیں۔ انہوں نے یہ نام الہ آباد کے ودیا مندر ہائی اسکول سے لیا ہے جو مالوی خاندان کا قائم کیا ہوا ہے۔ تخیل اور نقشہ گروکل سسٹم سے ماخوذ ہے۔ کانگریس پارٹی نے ۳۰ر جولائی ۳۷ء کو انکی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی تھی جسکا مقصد دیہات میں عمومی لازمی تعلیم کیلیے ایک اسکیم وضع کرنا تھا۔ ۱۴ر اگست کو یہ کام مکمل ہوا، ۵ر نومبر کو حکومت سی پی کے تسلیم کردہ تعلیمی ادارات کی فیڈریشن نے اور ۲۴ر نومبر کو محکمۂ تعلیم کے افسروں کی مجلس نے، اور ۲۴ر دسمبر کو سی پی اسمبلی کی کانگریس پارٹی نے اسے منظور کیا،[۲] مگر مارچ ۳۸ء تک اس کی زیارت نہ اسلامی تعلیمی ادارات کو، نہ اسلامی اخبارات کو، نہ خود سی پی اسمبلی کے مسلمان ممبروں کو نصیب ہوئی۔ مسلمانوں کے سامنے یکایک مارچ کے اجلاس اسمبلی میں یہ اسکیم اس وقت آئی جب حکومت کے بجٹ میں اسکے لیے دو لاکھ روپیہ سالانہ کی امداد منظور کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ اسمبلی کے ۱۴ مسلمان ممبروں میں سے ۱۳ نے سختی کیساتھ اسکی مخالفت کی۔ چودھویں مسلمان مسٹر شریف تھے جنہیں اس وقت وزارت کا شرف حاصل تھا۔ مگر انہوں نے بھی رکن حکومت ہونیکے باوجود رائے دینے سے احتراز کیا۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ ۸ لاکھ مسلمانان صوبۂ متوسط کے باضابطہ نمائندے ہیں وہ اسے بالاتفاق نامنظور کر چکے ہیں اور اسکے بعد سے مسلمانوں کی تمام نمائندہ جماعتیں، حتی کہ

[۱] نیشنل کال مورخہ ۲۸ر جون ۳۸ء

[۲] "ودیا مندر اسکیم" شائع کردہ حکومت صوبۂ متوسط۔ صفحہ ۶-۷۔ میرے پاس سی پی گورنمنٹ کی شائع کردہ اردو اور انگریزی دونوں اسکیمیں ہیں مگر میں اردو داں ناظرین کی سہولت کیلیے اردو ایڈیشن ہی کا حوالہ دونگا۔

صوبہ متوسط کی مسلم قوم پرست جماعت، اور اسلامی اخبارات نے بالاتفاق اسکی مخالفت کی ہے لیکن ۱۴ ستمبر ۳۸ء کو کانگریسی حکومت کی جانب سے جو پریس کمیونک شائع کیا گیا ہے اس میں "چند مسلمان افراد اور بعض مسلمان جماعتوں کی مخالفت" کہہ کر اس متحدہ قومی مخالفت کو ہلکا کرنیکی کوشش کی گئی ہے، بالکل اسی انداز میں، جس میں انکے انگریز اُستاد اب سے دو سال پہلے تک خود انکی چیخ پکار کو ہلکا قرار دیا کرتے تھے۔

اسکیم کو منظور کرنیکے بعد جو مجلس نصاب بنائی گئی اس میں سی پی کا ایک مسلمان بھی نہ لیا گیا بلکہ باہر سے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور ڈاکٹر اشرف کی خدمات حاصل کی گئیں تاکہ نئی سرکار کے منشا کے مطابق کام کرسکیں۔ مسلمانوں کے یہ "نمائندے" بھی صرف نصاب کے اصول مقرر کرنے کی حد تک مامور رکھے گئے۔ اصل کام تو نصاب کے اصولوں کو عملی جامہ پہنانا یعنی کتب نصاب مقرر کرنا ہے جسے ٹکسٹ بک کمیٹی کرتی ہے، اور اس کمیٹی میں برائے نام بھی کوئی مسلمان نہ رکھا گیا۔ یہ بالکل اس کمیٹی کے اختیار میں ہے کہ انھوں کو جس شکل میں چاہے ڈھال دے، اور یہ اختیار بالکل ہندوؤں کا حصہ ہے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ سی پی کے محکوم مسلمان اپنی آئندہ نسل کی تعلیم کے معاملہ میں کچھ نہیں بول سکتے۔ انکے نئے حکمراں جو کچھ انکے حق میں فیصلہ کردیں اسکے آگے انہیں سر جھکا دینا چاہیے۔ یہ ہے اُس "سوراج" کی حقیقی تصویر جس کے لیے کانگریس جدوجہد کر رہی ہے اور اس تصویر کو قبولیت کا شرف جناب مولانا ابوالکلام نے عطا فرمایا ہے کہ ۲۵ رجون ۳۸ء کو آپ بنفس نفیس ودیا مندر ٹریننگ اسکول (وردھا) میں تشریف لے گئے اور "قومی تہذیب" کو ترقی دینے والے اس ادارہ کی مدحت سرائی فرمائی۔[1]

یہ اسکیم خالصتہً دیہی علاقوں کیلیے بنائی گئی ہے[2]، یعنی اسکا اثر سی پی کے ان لاکھوں مسلمانوں پر

[1] نیشنل کال مورخہ ۲۷ رجون ۳۸ء۔ "قومی تہذیب" کا لفظ خود حضرت والا ہی کی زبانی اس اخبار نے نقل کیا ہے۔

[2] سی پی گورنمنٹ کا پریس کمیونک مورخہ ۱۴ ستمبر ۳۸ء۔

پڑیگا جو ۶۲,۳۹ دیہات میں بکھرے ہوئے اور ۹۰ فیصدی ہندو اکثریت میں گویا آٹے میں نمک کی حیثیت سے پسے ہوئے ہیں۔ نئی کانگریسی حکومت ان کی تعلیم کا انتظام کرنے کا ذمہ نہیں لینا چاہتی بلکہ یہ چاہتی ہے کہ یہ لوگ ۹۰ فیصدی ہندو اکثریت کیساتھ مل کر اس تعلیمی انتظام کو قبول کریں جو مجموعی طور پر کیا جائے۔ اسی غرض کیلیے یہ اسکیم بنائی گئی ہے۔ خصوصیات حسب ذیل ہیں:

(۱) جو مدارس اس اسکیم کے تحت قائم کئے جائینگے انکا نام "ودیا مندر" تجویز کیا گیا ہے۔ لفظ مندر سے صاف مذہبیت کی بو آتی ہے ایک عام ہندوستانی "مندر" کے معنی ہندوؤں کی عبادت گاہ ہی کے سمجھتا ہے۔ مگر سی پی کی حکومت کا ادعا ہے کہ اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں، دونوں کو اعتراض ہے کہ یہ نام قابل اعتراض نہیں ہے۔ گویا اس امر کا فیصلہ کہ مسلمانوں کے نزدیک کیا چیز قابل اعتراض ہونی چاہئے اور کیا نہ ہونی چاہئے، خود مسلمانوں کو نہیں کرنا ہے بلکہ انکی غیر مسلم حکمرانوں کو کرنا ہے۔ اس پر مزید فریب کاری ملاحظہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمان اپنے خرچ سے جو مدرسے قائم کریں انکا نام ودیا مندر نہیں، بیت العلم رکھ لیں۔[۳] مگر اسکیم کے تحت مدرسہ صرف اس جگہ قائم کیا جا سکتا ہے جہاں کم از کم چالیس لڑکے پڑھنے والے ہوں اور جس کیلیے کم از کم دو سو روپے سالانہ آمدنی کی جائداد وقف کی جائے۔[۴] اسکے معنی یہ ہیں کہ جہاں مسلمان اتنی اقلیت میں ہیں کہ انکی آبادی سے ۴۰ لڑکے فراہم نہیں ہو سکتے یا جہاں وہ اس قدر غریب ہیں کہ مطلوبہ زمین وقف نہیں کر سکتے وہاں ان کے بچوں کو صبح اٹھ کر مندر جانے کی تیاری کرنی ہوگی۔ اس کا نفسیاتی اثر جو کچھ آئندہ نسل پر ہوگا اسکا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔

(۲) اسکیم سر دست اختیاری ہے، مگر آگے چل کر اسکو جبری بنا دیا جائیگا، یعنی ہر اس گاؤں یا مجموعہ دیہات کو جس سے چالیس لڑکے لڑکیاں فراہم ہوں ایک ودیا مندر لازماً قائم کرنا ہوگا۔

---

[۱] "ودیا مندر اسکیم" صفحہ ۲

[۲] ہریجن مورخہ ۱۵ اکتوبر ۳۸ء - اور سی پی گورنمنٹ کا پریس کمیونک مورخہ ۱۴ ستمبر ۳۸ء۔

[۳] سی پی گورنمنٹ کا کمیونک مورخہ ۱۴ ستمبر۔

[۴] ودیا مندر اسکیم۔ صفحہ ۶-۸

وہاں لوگوں کو مجبور کیا جائیگا کہ وہ سو روپے ماہانہ آمدنی کی جائداد وقف کریں - اور اس علاقہ کی تمام خیرات بھی ودیا مندر کیطرف منتقل ہوگی۔[1] اسکیم کے آخر میں ارشاد ہوا ہے :

"چھوٹے بڑے مٹھوں اور دیگر مذہبی اور خیراتی اداروں، مندروں، مسجدوں وغیرہ کے مالکوں اور متولیوں کو احساس ہونا چاہیئے کہ ہندوستان کی تاریخ میں اب وہ وقت آگیا ہے کہ وہ از خود پیش قدمی کریں اور اس سے پہلے کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے اپنی خدمات پیش کرنیکا فخر حاصل کریں (اسکیم - صفحہ ۱۵)

اسکے معنی یہ ہیں کہ یہ ایک جبری و لازمی اسکیم ہے اور مسلمانوں کے مذہبی اوقاف اور مساجد کے اوقاف بھی اس میں حصہ لینے پر مجبور کیے جائینگے -

(۳) ہر مدرسہ کیلیے ایک کمیٹی بنائی جائیگی جسکے ارکان کا بیشتر حصہ حق رائے دہندگی بالغان کے اصول پر مخلوط انتخاب سے منتخب ہوگا - اور مدرسہ کی جائداد منقولہ وغیر منقولہ دیہاتی پنچایت یا ڈسٹرکٹ کونسل یا حکومت صوبہ کی ملک متصور ہوگی۔[2] اسکے معنی یہ ہیں کہ مسلمان انتظام سے بھی بے دخل اور ملکیت سے بھی بیدخل - ان کا کام صرف اپنا مال اور اپنے بچے حوالہ کر دینا ہے -

(۴) مدرسے میں عموماً ایک ہی مدرس ہوا کریگا جسے ۵ سال کیلیے امتحاناً مقرر کیا جائیگا، پھر ہمیشہ کیلیے مستقل کر دیا جائیگا - اگر کمیٹی کی رائے میں اسکا رویہ نامناسب ہو تو وہ اسے نکال دیگی - اسکے فرائض یہ ہونگے کہ مقررہ نصاب کے مطابق تعلیم دے اور گاؤں کے تمام معاملات کو "قومی رنگ" (National Out Look) میں رنگنے کی کوشش کرے۔[3] قومی رنگ کا مطلب صاف ہے - بچوں میں اور اپنے

---

[1] ودیا مندر اسکیم صفحہ ۶ - ۸ - ۹ - ۱۵

[2] ایضاً صفحہ ۱۰ و ۱۱

[3] ایضاً صفحہ ۱۳ و ۱۴

زیر اثر آبادی میں واحد قومیت کی روح پھونکنا اور ملی امتیاز کو مٹا دینا۔ یہ کام قریب قریب کلیتہً ہندو مدرسین ہی سے لیا جائیگا۔ مسلمان کا اول تو انتخاب میں آنا مشکل۔ اور اگر کوئی قسمت کا مارا آ گیا تو کمیٹی یہ کہہ کر بآسانی اسے نکال دیگی کہ یہ "قومی رنگ" نہیں دیتا یا مقررہ نصاب کے خلاف بھی کچھ (یعنی کلمہ، نماز وغیرہ) سکھاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ سات برس تک مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کو (اس لیے کہ تعلیم مخلوط ہوگی[1]) کلیتہً ایک ہندو استاد کے زیر اثر اور کثیر التعداد ہندو بچوں میں گھرا ہوا رہنا پڑے گا جہاں "قومی رنگ" ہر طرف سے ان کو محیط ہوگا اور خدا اور رسول کا نام تک ان کے کانوں میں نہ پڑے گا چہ جائیکہ اسلامی زندگی کا کوئی نشان وہ دیکھ سکیں۔

(۵) اغراض و مقاصد میں تصریح کی گئی ہے کہ گاؤں کے بچوں میں "قومی نقطۂ نظر" پیدا کیا جائیگا۔ "ودیا مندر ایک اہم سوشل مرکز کا کام دیگا جہاں استاد، بچوں کے والدین، لڑکے لڑکیاں سب جمع ہو کر ان مسائل کو جن سے انکو سابقہ پڑتا ہے بحث مباحثہ کرکے حل کرنے کی کوشش کرینگے خواہ وہ مسائل "قومی" ہوں، سوشل ہوں یا تعلیمی"[2]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان ودیا مندروں کے ذریعہ سے دیہات کی منتشر و پراگندہ مسلمان آبادی کو کثیر التعداد ہندو آبادی میں جذب کرنے کی ایک منظم کوشش کی جائے گی اور تربیت یافتہ مہاشے تمام دیہی علاقوں میں پھیلا دیے جائیں گے تاکہ وہ گاؤں کی پوری زندگی کو اپنے گرد مرتکز کرلیں اور نہ صرف تعلیم کے ذریعہ سے بلکہ سوشل اور سیاسی سرگرمیوں کے ذریعہ سے بھی سب کو ایک اجتماعی وحدت بنا دیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ دیہات کی مسلمان آبادی خود بخود ناپید ہو جائے گی اور چند سال بعد جو مسلمان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھینگے تو انہیں معلوم ہوگا کہ وہ صرف شہروں

[1] ودیا مندر اسکیم صفحہ ۸

[2] " " "

میں رہ گئے ہیں، اصلی ہندوستان یعنی دیہی ہندوستان میں ان کا کہیں پتہ نہیں۔

(۶) ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو گی اور مادری زبان کی تفسیر حکومت کے کمیونک میں یہ کی گئی ہے کہ اس سے مراد علاقہ کی زبان ہے[1] یعنی وہ زبان نہیں جو بچہ کی ماں بولتی ہے بلکہ وہ زبان جو علاقہ کی ماں بولتی ہے۔ اب صوبۂ متوسط میں تلاش کیجیے کہ کون علاقہ ہے جس کی ماں اردو بولتی ہو۔ وہاں کے آٹھ لاکھ مسلمانوں کی مائیں تو سب کی سب خالص اردو بولنے والی ہیں، مگر بحیثیت مجموعی علاقے دو ہی قسم کے ہیں، یا مرہٹی بولنے اور لکھنے والے، یا ہندی (ناگری رسم الخط کے ساتھ) لکھنے اور بولنے والے۔ لہٰذا مادری زبان کی تفسیر علاقہ کی زبان سے کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ اردو خود بخود خارج از بحث ہو گئی۔ مسلمان اگر چاہیں تو اردو مدرسہ قائم کر سکتے ہیں، مگر صرف اس جگہ جہاں وہ چالیس بچے اردو پڑھنے والے فراہم کریں اور دو سو روپے سالانہ آمدنی کی جائداد دے سکیں۔ جہاں اقلیت یا غربت کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکیں گے (اور شاید سی پی میں بہت ہی کم مقامات پر وہ ایسا کر سکیں گے) وہاں ان کے بچوں کو مرہٹی یا ہندی ہی میں سب کچھ پڑھنا ہو گا۔ اس کے بعد "متحدہ قومیت" آپ سے آپ پیدا ہو گی۔

(۷) حکومت کی پوری طاقت اس اسکیم کو کامیاب بنانے میں صرف ہو گی۔ ابتداءً ہر تعلقہ اور تحصیل میں حکومت اپنے خرچ سے چند ودیامندر قائم کرے گی۔ مدرسوں کی تنخواہیں حکومت کے خزانہ سے ملیں گی۔ ودیامندر تعمیر کرنے کے لیے

---

[1] سی پی گورنمنٹ کا کمیونک مورخہ ۱۴ ستمبر ۳۸ء۔

ضروری سامان بھی حکومت دے گی[1] تمام سرکاری محکمے ودیا مندر کی پشت پر مدد کے لیے حاضر رہیں گے۔ محکمۂ زراعت، محکمۂ طبابت و حفظانِ صحت، محکمہ امداد باہمی، محکمۂ علاج حیوانات، محکمۂ تعلیم، غرض سب اپنے اپنے دائرہ میں ودیا... مندروں کو مادّی، علمی و فنی اور اخلاقی و نفسیاتی امداد دینگے۔ یہ معنی ہیں قومی جمہوری حکومت کے۔ ۸ لاکھ مسلمان اس جمہوریت کا ایک جز ہیں تو ہوا کریں۔ دولت مشترکہ کی پیدائش میں ان کا حصہ ہے تو ہوا کرے۔ مگر ہیں تو وہ اقلیت میں۔ لہذا جس دولت اور طاقت کے فراہم کرنے میں ان کا حصہ ہے اس کا مصرف متعین کرنے میں ان کا حصہ نہیں ہے۔ اس کو اکثریت اپنے منشا کے مطابق استعمال کرے گی اور ایسے کاموں میں استعمال کرے گی جو ان بے زور حصہ داروں کی ہستی ہی کو ختم کر دیں۔

(۸) سی پی میں ابتدائی تعلیم لوکل بورڈوں اور میونسپل کمیٹیوں کے حدودِ عمل سے تعلق رکھتی ہے، اور چونکہ ہر جگہ اکثریت ہندوؤں کی ہے اسلیے یہ جماعتیں اردو مدرسوں کو بند کر رہی ہیں اور ان کی جگہ ودیا مندر قائم کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ مسلمان اپنی اقلیت کے باعث کسی طرح اس ظلم کو نہیں روک سکتے۔ آگے چل کر آپ دیکھینگے کہ ان مجلسوں کی پوری طاقت ودیا مندر قائم کرنے میں صرف ہو گی۔ جو ٹیکس مسلمانوں سے لیا جائے گا وہ ان کی مرضی اور ان کے مفاد کے خلاف صرف کیا جائے گا اور مسلمانوں کے احتجاج کو استحقار کے ساتھ ٹھکرا دیا جائے گا۔ حال میں ضلع امراؤتی کی ورود میونسپل کمیٹی نے اردو اسکول کو اردو ودیا مندر بنا دیا۔ مسلمانوں نے احتجاج

[1] ودیا مندر اسکیم صفحہ ۱۱

کیا، مگر پر کاہ کے برابر بھی اسکی وقعت نہ کی گئی[۱]۔ سچ فرمایا پنڈت جواہرلال نہرو نے۔ جمہوریت کے معنی یہی ہیں کہ اکثریت اقلیت کو دبا کر رکھے!

(۹) وردھا میں ودیا مندروں کیلیے اساتذہ تیار کرنے کا انتظام کیا گیا ہے اور ایک ٹریننگ اسکول قائم کردیا گیا ہے۔ اس میں ۱۰۲ ہندو اور ۸ مسلمان تعلیم و تربیت حاصل کررہے ہیں اور حکومت صوبۂ متوسط نے اپنے احسانات کی جو فہرست گنائی ہے اس میں ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کو اردو کی تعلیم دی جاتی ہے تاکہ وہ ودیا مندروں میں جاکر بچوں کو اردو اور ہندی دونوں سکھا سکیں[۲]۔ مگر اصل حالات کیا ہیں؟ اس صوبہ کے قوم پرست مسلمانوں تک نے اپنی کانفرنس میں شکایت کی ہے کہ سارا زور صرف ہندی تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے اور اردو کی محض شُد بُد پیدا کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ یہ ودیا مندروں میں اردو تعلیم کے انچارج ہوں۔ جن بیچاروں کا املا اور تلفظ تک درست نہیں، جو اردو کی معمولی عبارت تک صحیح نہیں پڑھ سکتے وہ ہمارے بچوں کو اس زبان کی تعلیم دینے جائینگے[۳]۔

سی پی اسمبلی کے ممبر مولوی عبدالرحمٰن خانصاحب جب اس ٹریننگ اسکول کا معائنہ کرنے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ہندو مسلمان سب کے سب دھوتیاں باندھے ہوئے تھے۔ یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ ان میں مسلمان کون ہے۔ تمام مضامین ہندی اور مرہٹی میں پڑھائے جاتے ہیں۔ محض اردو رسم الخط سکھانے کیلیے ایک مسلمان استاد نوکر رکھا گیا ہے۔ مسلمان طلبہ اچھوتوں کی طرح رہتے ہیں، الگ کھاتے ہیں، پانی پینے کے برتنوں تک کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ روزانہ بندے ماترم سے مدرسہ شروع ہوتا ہے

---

[۱] سی پی اسمبلی میں سوال نمبر ۱۹۶ کا جواب مورخہ ۸ مارچ ۳۸ء

[۲] حکومت سی پی کا پریس کمیونک مورخہ ۱۲ ستمبر ۳۸ء

[۳] مدینہ مورخہ ۲۸ جولائی ۳۸ء

اور مسلمان طلبہ کو مجبور کیا جاتا ہے (یا اگر مجبور نہیں تو تربیت سے ایسا بنایا جاتا ہے) کہ پرارتھنا کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر کھڑے ہوں[۱]۔ یہ ہے وہ مدرسہ جس میں "قومی تہذیب" کے نشوونما پر جناب مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ نے اظہار مسرت فرمایا ہے اور جس کا افتتاح مہاتما گاندھی کی "برکتوں" کے ساتھ ہوا ہے![۲]

---

[۱] مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب کا مضمون مندرجہ انقلاب ۲۲ راگست ۱۹۳۸ء

[۲] وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم پر مسلمانوں کی طرف سے جو اعتراضات کئے گئے ہیں اُن کے جواب میں منجملہ اور باتوں کے ایک بات یہ بھی بار بار دُہرائی جارہی ہے کہ جس ملک میں بہت سے مذاہب کے پیرو رہتے ہوں وہاں سب کی مذہبی تعلیم کا انتظام حکومت کیسے کرسکتی ہے۔ ایسی جگہ تو حکومت کی طرف سے عام دنیوی تعلیم ہی کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ اور تعلیم کو عام کرنے کیلئے اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ وسیع پیمانے پر لازمی جبری اور غیر مذہبی تعلیم کا انتظام کیا جائے لیکن عام ناظرین کی معلومات کے لئے میں یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ یورپ کے سخت "مہذب" ممالک میں بھی جہاں مذہب کی کوئی اہمیت نہیں ہے فرانس، چیکوسلواکیا، روس اور دو چار دوسرے ملکوں کے سوا کسی ملک نے وہ پوزیشن اختیار نہیں کی جو یہاں ہندوستان میں اختیار کی جارہی ہے۔ جرمنی میں باشندوں کی تعلیم کا انتظام کرنا حکومت کے فرائض میں سے ہے اور یہ نظریہ اختیار کیا گیا ہے کہ سب کی تعلیم کا نظام ایک ہونا چاہیئے۔ اس بنا پر وہاں پرائیویٹ مدارس قائم کرنے کی اجازت بھی کم دی جاتی ہے۔ لیکن دستور سلطنت میں ہر شخص کو یہ مطالبہ کرنے کا حق دیا گیا ہے کہ اُس کے بچے کو اُس کے عقیدہ کے مطابق مذہبی تعلیم دی جائے اور حکومت کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اوقات مدرسہ میں اس تعلیم کا انتظام کرے۔ نیز اگر ایک مذہبی عقیدہ کے لوگ کسی جگہ کافی تعداد میں ہوں اور وہ مطالبہ کریں کہ اُن کے لئے الگ مدرسہ قائم کیا جائے جہاں مذہبی تعلیم کا انتظام اُن کی خواہش کے مطابق ہو تو حکومت (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(۱۱)

ان تفصیلات سے اچھی طرح اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ "جنگ آزادی" کے نام سے برطانوی حکومت کے زیرِ سایہ بتدریج سیاسی طاقت حاصل کرنے کی جو پالیسی اختیار کی گئی ہے وہ کس طرح مسلمانوں کی قومیت اور اُن کی قومی طاقت کو فنا کرنے کے لئے استعمال کیجا رہی ہے، اور کس طرح ہمارے ہمسایہ رفیق قومی امپیریلزم کے وہ تمام ہتھکنڈے اختیار کرتے جارہے ہیں جنکو انہوں نے اپنے انگریز استادوں سے سیکھا ہے۔ لیکن یہ بیان نامکمل رہ جائیگا اگر اسی سلسلہ میں ان کارروائیوں کا بھی ذکر نہ کر دیا جائے جو زبان کے باب میں کی جارہی ہیں۔

(بقیہ حاشیہ) کا فرض ہے کہ اس کا انتظام کرے۔ انگلستان میں مذہبی تنظیمات کو خود اپنے مدارس قائم کرنے اور چلانے کا حق ہے اور حکومت کا محکمۂ تعلیم صرف اُن کی نگرانی کرتا ہے۔ ایسے مدارس کو حکومت مالی امداد بھی دیتی ہے۔ یوگوسلیویا میں ہر تسلیم شدہ مذہب کی تعلیم کا انتظام سرکاری مدارس میں کیا جاتا ہے اور ہر بچے کے والدین پر اسکا فیصلہ چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس کے لئے کس نوعیت کی مذہبی تعلیم چاہتے ہیں نیز وہاں تسلیم شدہ مذاہب کو اپنے تعلیمی نظام خود بنانے کا بھی حق ہے اور حکومت کے خزانہ سے اُن کی اعانت کیجاتی ہے۔ لیتھوانیا کے سرکاری مدارس میں بچوں کے لئے مذہبی تعلیم لازمی رکھی گئی ہے۔ اور صرف وہ بچے اس سے مستثنیٰ کئے گئے ہیں جن کے والدین مذہبی تعلیم نہ دلوانا چاہتے ہوں۔ اس کے علاوہ وہاں بھی مذہبی تنظیمات کو اپنے مدارس خود قائم کرنے کا حق ہے اور حکومت انکو اس شرط کیساتھ امداد دیتی ہے کہ ان میں دنیوی تعلیم کا انتظام سرکاری تعلیمی پالیسی کے مطابق کیا جائے گا۔ پولینڈ کے تمام سرکاری اور امدادی مدارس میں مذہبی تعلیم لازمی ہے، اور یہ کام مختلف مذاہب کی تسلیم شدہ انجمنوں کے سپرد کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے پیروؤں کے لئے خود نصاب تجویز کریں اور مدارس میں ان کی مذہبی تعلیم کی نگرانی کریں۔ ایستھونیا میں بچے کے والدین کی درخواست پر سرکاری مدارس (بقیہ اگلے صفحہ)

ایک قوم کی زبان اور اُس کا رسم الخط اُس کی تہذیب اور اُس کی قومیت کے بقا و فنا میں فیصلہ کُن اہمیت رکھتا ہے۔ کسی قوم کو اگر آپ دوسری قوم میں تبدیل کر دینا چاہیں تو اُس کی زبان اور رسم الخط کو بدل دیجئے۔ رفتہ رفتہ وہ خود بخود دوسرے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے گی۔ اُس کی آئندہ

(بقیہ حاشیہ) میں مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا حکومت کے لئے لازم ہے۔ ملاحظہ ہو:-

THE NEW DEMORATIC CONSTITUTIONS OF EAUROPE.

BY AGNES HEEDLAM - MORLEY, P 53 - 57

بلجیم میں جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں قسم کے مدارس میں مذہبی تعلیم لازمی ہے اور تسلیم شدہ مذاہب کے کلیساؤں کو حق دیا گیا ہے کہ مذہبی تعلیم کی نگرانی کے لئے اپنے انسپکٹر مقرر کریں۔ ناروے میں ابتدائی تعلیم تمام تر مذہبی تنظیمات کے ہاتھ میں رکھی گئی ہے۔ اٹلی میں مذہبی تعلیم لازمی ہے اور کوئی بچہ اس سے مستثنٰی نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس کے والدین استثناء کا مطالبہ نہ کریں۔ ہالینڈ میں مذہبی تنظیمات اپنے اپنے پیروؤں کی تعلیم کا انتظام خود کرتی ہیں اور حکومت اس کا خرچ ادا کرتی ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں سرکاری طور پر صرف اس مذہب کی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے جس کے پیروؤں کی تعداد مدرسہ میں زیادہ ہو۔ لیکن جن اقلیتوں کی کافی تعداد موجود ہو ان کے لئے علیحدہ انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا چودھواں ایڈیشن مضمون ایجوکیشن)

اس کے بعد یہ کہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ پبلک مدارس میں مذہبی تعلیم کا انتظام ممکن نہیں ہے۔ صاف کیوں نہیں کہا جاتا کہ قومیتوں کو فنا کرنے اور قوموں کے احساسِ خودی کو مٹانے کے لئے ہم اس چیز کو قصداً نہیں رکھنا چاہتے۔

نسلوں کا تعلق اپنے اسلاف سے منقطع ہو جائے گا اور وہ بالکل نئی ذہنیت، نئے افکار اور نئی صورت قومی لیکر اٹھینگی جن جن لوگوں نے قومیتوں کے بنانے اور بگاڑنے کا کھیل کھیلا ہے اُن سب نے یہ ہتھیار ضرور استعمال کیا ہے۔ زار روس کی حکومت نے اپنے امپیریلزم کی بنیادیں مستحکم کرنے کے لئے روسی زبان اور رسم الخط کو تمام غیر روسی قوموں پر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ یہ سب قومیں روسی بن جائیں، اور اُس کی مملکت میں کوئی قوم ایسی نہ رہ جائے جو خود اپنی زبان بولنے والی اور اپنے مذہب کا اتباع کرنے والی اور اپنے رسوم پر چلنے والی ہو۔ اصطلاح میں اس کو RUSSIFICATION یعنی "روسی بنانے" کی پالیسی کہا جاتا ہے بعد میں اسی پالیسی کی پیروی اشتراکی جماعت نے بھی کی لینن نے انقلاب کے بعد ہی مشرقی قوموں کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے لئے اُن کے رسم الخط کو لاطینی رسم الخط سے بدل دیا اور اب تازہ اطلاع ہے کہ روس کی ۲۹ قوموں کا رسم الخط لاطینی کے بجائے روسی کر دیا گیا ہے۔ تاکہ اُس علیحدگی کے احساس کو بالکل مٹا دیا جائے جو اُن کے روسی بن جانے میں مزاحم ہوتا ہے ازبک، ترکمان، تاجیک، کرغیز اور داغستانی مسلمان جن کو عربی رسم الخط نے اسلامی روایات سے وابستہ کر رکھا تھا، اس ضرب کے اثرات کو ابھی سے محسوس کر رہے ہیں۔ ابھی ایک چوتھائی صدی بھی اس انقلاب پر نہیں گزری ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی قومیت تحلیل ہو کر اشتراکی سوسائٹی میں تبدیل ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہی پالیسی فرانس نے شمالی افریقہ میں اختیار کی ہے وہاں عربوں اور بربریوں کو فرانسیسی قومیت میں ڈھالنے کے لئے ساری طاقت اس پر صرف کی جا رہی ہے کہ عربی زبان اور رسم الخط کو مٹا دیا جائے۔ اسی پالیسی کا تختۂ مشق ہندوستان میں ہم کو بنایا جا رہا ہے۔

پنڈت جواہر لال کے بقول ہندوستان میں "نیشنلسٹ" جماعت کی خواہش اور کوشش

یہ ہے کہ "یہاں ایک متحد قوم پیدا ہو"۔[۱] اس غرض کے لئے زبان کی وحدت ناگزیر ہے۔ زبانیں الگ ہونگی تو الگ قومیں بھی رہینگی۔ الگ قوموں کو فنا کر کے ایک قوم میں تبدیل کرنا ہو تو الگ زبانوں کو مٹا کر دولت، تنظیم اور حکومت کی طاقت سے ایک زبان تمام ملک میں پھیلانی ہی پڑیگی۔ یہاں تک تو بات کھلم کھلا ہے۔ اس کے بعد کام تقسیم ہو جاتا ہے۔ کچھ باتیں دکھانے کے لئے ہیں اور کچھ کرنے کے لئے۔ دکھانے کے لئے تو یہ ہے کہ "قومی" زبان "ہندوستانی" ہے جس کا اطلاق اُردو اور ہندی دونوں پر ہوتا ہے۔ فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخط مسلّم ہیں اور دونوں کو نشو و نما کا پورا موقع ملنا چاہئیے۔ لیکن فی الواقع کیا کیا جا رہا ہے؟ اس کے لئے ذیل کی تفصیلات ملاحظہ ہوں:-

(۱) فارسی اور عربی کے وہ عام فہم الفاظ بھی جو "ہندوستانی" کے مشترک سرمایہ ہیں مدتوں سے داخل ہو چکے ہیں، جن کو ہر ہندو اور مسلمان بولتا اور سمجھتا ہے، قصداً ترک کئے جا رہے ہیں اور اُن کی جگہ ٹھیٹھ سنسکرت اصل کے، یا بالکل نامانوس ہندی زبان کے الفاظ پھیلائے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر

مشہور	بجائے	پرسدھ	تعلیم	بجائے	شکشا	وقت	بجائے	سمے
شہر	"	نگر	صوبہ متحدہ	"	جکت پرانت	آدمی	"	منش یا پرش
ضروری	"	اوشک	مقابلہ	"	ٹنطا	شیر	"	سنگھ
آزادی	"	سوتنترتا	صدر	"	سبھاپتی	بندر	"	وانر
صوبہ	"	پرانت	ہندوستان	"	بھارت ورش	دوستی	"	مترتا
صوبہ متوسط	"	پرانت کوشل	حاکم	"	اتھ	ترقی	"	انتی

[۱] "جامعہ" اکتوبر ۳۶ء

نافذ	بجائے	لاگو	اختلاف	بجائے	مت بھید	مسل	بجائے	پوتھی
برار	،،	ودربھا	تجویز	،،	پرستاؤ	مدعی	،،	جھگڑا بیلھڑو
لیڈر یا رہنما	،،	اگوا	ترمیم	،،	سنشودھن	اصول	،،	سدھانت
مدعا علیہ	،،	جھگڑا دوجے	منظور	،،	گرہن	اعلان	،،	گھوشن

یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ اس فہرست کو بہت زیادہ طویل کیا جاسکتا ہے۔ مگر اتنی ہی مثالیں یہ اندازہ کرلینے کے لئے کافی ہیں کہ یہاں "ہندوستانی" کے پردے میں دراصل ہندی زبان کو قومی زبان بنانے کی کوشش کی جارہی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ "ہندوستانی قوم" کے بجائے دراصل "ہندو قوم" میں اس ملک کی قوموں کو جذب کرنا مقصود ہے۔ ہندوستانی زبان و ادب میں سے ہمارے حصہ کو اس طرح نکال پھینکنے کی کوشش کی جارہی ہے جس طرح کوئی قوم کسی ظالم قوم کی حکومت سے آزاد ہونے کے بعد جوشِ انتقام میں اُس کے باقی ماندہ آثار کو مٹایا کرتی ہے۔

(۲) متحدہ قومیت کے علمبردار جو زبان اپنی تقریروں اور تحریروں میں استعمال کررہے ہیں اس کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔ گاندھی جی بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس ناگپور میں فرماتے ہیں:۔

"اس سبھا کا پتی تو مجھے دینے کا کارن جب میں ڈھونڈتا ہوں تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں۔ ایک میرا ساہتیہ کار نہ ہونا اور اس لئے کم سے کم دوش کا کارن ہونا۔ تھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم۔ جو کچھ ہو میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کرینگے اور بھوشیہ میں اپنا سیوا کشیتر بڑھائینگے یدی ہم شری نگر سے لیکر کنیا کماری تک اور کراچی سے لیکر ڈبرو گڈھ تک جو پردیش ہے اسے ایک مانتے ہیں اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں۔

تواس پر دیش کے پرتیک بھاگ کے ساھتیہ کار بھاشا شاستری اپنا دی
آپس میں کیوں نہ ملیں اور بعض بعض بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی ہتھا
یوگیہ سیوا کیوں نہ کریں[۱]"

آنریبل مسٹر سمپورنانند وزیر تعلیم صوبہ متحدہ کی ایک تقریر کا اقتباس یو۔پی کے محکمۂ اطلاعات کی رپورٹ سے :-

"آدھنک کال جس میں کہ ہم رہ رہے ہیں اس کی یہ بھی ایک شبتا ہے کہ شکشت شمیا کے پرت لوگوں کا اگر شٹر بہت وشدھ اور بیاپک ہو گیا ہے۔ یہ بات ادھکانش بسمئے سنسار پر گھٹت ہوتی ہے اور ترن سار ہم اپنے دیش میں بھی اس شیو بیاپی اندولن کے بعض بعض پہلوؤں کو دیکھ رہے ہیں اور ان کا ان بھو کر رہے ہیں۔ آجکل ہم اپنے کو جس مالک اور پدمعارک پرستھت میں پاتے ہیں اور ہماری اس استھت کا جو ساجک راج نیتک اور آرتھک آدھار ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہم نے اپنے پوروجوں سے جو سنسکرت پائی ہے اس سے اس وشیو ویاپی پرگت کو ہمارے سنمکھ نش سندیہ ایک شیس روپ میں اپستھت کیا ہے اور ایک وشیس بھارتیہ سمیہ بنا دیا ہے[۲]"

بابو موہن لال سکسینہ صدر صوبہ کانگریس کمیٹی کے خیر مقدم میں ہیلی بھیت کی کانگریس کمیٹی حسب ذیل اعلان شائع کرتی ہے :-

"ہمارے صوبہ کے پرسدھ نیتا شری یت موہن لال جی سکسینہ ایم۔ ایل اے

---

[۱] جامعہ مئی ۱۹۳۶ء۔ [۲] مدینہ ۱۳ ستمبر ۳۸ء

(سینٹرل) جو پرانتی کانگریس کمیٹی کے پردھان ہیں، ۲۰ مئی ۱۹۳۸ء کو پرات
کال ۵ بجے کی گاڑی سے پدھار رہے ہیں۔ جنتا کو چاہئے کہ اس سنہرے
اوسر سے لابھ اُٹھانے کے لئے یوب ویش کے پرت اپنے سچے کرتو کو جاننے
کے لئے ۲۶ تاریخ کی شام کو اعلاء معک سنکھیا میں راشٹر ساکاؤں کیساتھ
میں آجانا چاہئے اور ۲۷ مئی ۱۹۳۸ء کی صبح کو ۵ بجے آن کے سواگت کے
جلوس کی رونق بڑھائیے۔

پروگرام ۲۷ مئی کا

پرت کال ۷ بجے سے ۹ بجے تک جلوس

" ۹ بجے سے ۱۰ بجے تک جل پان

مدھیاں " " ۲ بجے تک بھوجن وشرام

۲ " ۵ " کاریہ کارتاؤں کی بیٹھک

نویدک

دستخط پریزیڈنٹ دستخط ادپ منتری

شہر منڈل کانگریس کمیٹی۔ پیلی بھیت"

اس حمام میں سوشلسٹ ہندو بھی بے تکلف کپڑے اُتار دیتے ہیں۔ حال میں آگرہ کی سوشلسٹ جماعت کی طرف سے ایک جلسہ کا اعلان بدیں الفاظ ہوا ہے:-

"آگرے میں سماج وادی مہاسمیلن۔ لگاتار چھ دن تک۔ اکیل بھارتیہ سماج وادی نیتاؤں کے دوارا۔"

"ہمیں جنتا کو یہ سوچنا دیتے ہوئے پرسنتا ہوتی ہے کہ تاریخ ۱۱ راکتوبر سے برابر

چھ دن تک اکیل بھارتیہ سوشلسٹ نیتا راج نیتی کے انیک وشئوں پر اپنے سنا گر بہت اور دو تا پورنٹر بھاشنٹر دیں گے۔ آگرہ کی جنتا کے لئے یہ اپور وادسر ہے کی وسے دیش کے درگج سوشلسٹوں کے سمپرک میں آکر یہ سمجھ لیں کہ برٹش سامراج وادکو کس پرکار اُکھاڑ پھینکنا چاہیئے۔ بھاشنٹروں کے وشے کیونزم، سوشلزم، پونجی واد، ورک بندہ، سامراجیہ واد، فیسنرم، نرم وگرم دَل فیڈریشن، کسان، کرانتی وشوشانتی کی سمیا۔ ودیارتھی اندولن۔ کسان مزدور اندولن۔ روس کی کرانتی سماج وادی روس۔ انتر راشٹریہ۔ شر سبتھمت آدی۔ آدی۔ بھاشنٹر میں پر دلیش چارآنہ کے ٹکٹ سے ہوگا۔ آپ کو ٹکٹ ہر پڑ کمہ کانگریس ودیارتھی کاریہ کرتا، تتھا وارڈ شہر کانگریس کمیٹی کے دفتر دوارا مل سکتا ہے۔ جن نیتاؤں کے آنے کی آشا ہے اُن کے نام اس پرکار ہیں:۔

"ڈاکٹر اشرف کے ایم آبھاگا کانگریس کمیٹی کے راج نیتک وبھاگ کے پردھان۔ آچاریہ نریندر دیو اکیل بھارتیہ کانگرس سوشلسٹ پارٹی کی کارکارنی کے پڑ کمہ سدسے تتھا کانگرس کارتھتی کے بھوت پورو سدسے۔ ڈاکٹر زیڈ اے احمد اکیل بھارتیہ کانگرسی سوشلسٹ پارٹی کی کارکارنی کے سدسے تتھا آبھا کانگرس کمیٹی کے آرتھک دیباگ کے بھوت پورو۔ ڈاکٹر رام منوہر لوہیہ اکیل بھارتیہ کانگرس کمیٹی کے دیدیشکیا ربھاگ کے منتری تتھا آبھا کا سوشلسٹ پارٹی کے کارکارنی کے سدسے۔ کا سجاد ظہیر بار ایٹ لا آبھا کا سوشلسٹ پارٹی کی کارکارنی کی سدسے۔ کا ہرش دیو مالوی یوپی کسان سبھا کی کارکارنی کے پرکمہ سدسے۔"

"دھیان رہے یہ بھاشنٹر ۱۱ راکتوبر سے شام کو ۵ بجے سے ۸ بجے تک ہوں گے۔"

استھان کی سوچنا شنکر دی جائے گی۔ یہ بھاشٹر شہر کانگرس کمیٹی کانگرس سوشلسٹ پارٹی اور آگرہ ودیارتھی سنگھ کے سنیکت پلیٹ فارم پر ہوں گے۔

مہا دیو نرائن ٹنڈن

پردھان منتری کانگرس سوشلسٹ پارٹی آگرہ

یہ محض چند نمونے ہیں۔ ورنہ یہ زبان جس طرح ذمہ دار لیڈروں اور ذمہ دار "قومی مجلسوں" سے لیکر اخبارات، رسائل اور سینماؤں تک ہر آلۂ نشر و اشاعت کے ذریعہ سے پھیلائی جارہی ہے اس کا مشاہدہ ہر آنکھوں والا کر رہا ہے اور اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر حکومت کی باگیں ان لوگوں کے ہاتھ میں پوری طرح آگئیں تو کیسی "ہندوستانی" زبان بنائینگے۔

(۳) اگرچہ ابھی سیاسی اقتدار پوری طرح ان کے ہاتھ میں نہیں آیا ہے، لیکن جسقدر بھی اقتدار انہیں مل چکا ہے اس کو انہوں نے عملاً اس کام میں استعمال کرنا شروع کر دیا ہے اقتدار تو حاصل کرتے ہیں یہ کہہ کر کہ ہم مشترک وطنی اغراض کے لئے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ مگر اس اقتدار کو استعمال کیا جاتا ہے اس کام میں کہ وطن کی ایک جماعت پر دوسری جماعت کی زبان کو بزور مسلط کر دیا جائے۔ صوبہ بہار میں ۳۵ ہزار سے زیادہ مسلمان بچے ہندی مدرسوں (پاٹھ شالاؤں) میں جانے پر مجبور ہیں کہ اُن کے لئے تعلیم کا کوئی دوسرا انتظام ہی نہیں۔ پٹنہ ڈویژن میں ۷۵ فیصدی، چھوٹا ناگپور ڈویژن میں ۸۰ فی صدی۔ بھاگلپور ڈویژن میں ۷۱ فیصدی اور ترہٹ ڈویژن میں ۵۵ فیصدی مسلمان طلبہ ہندی زبان میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مجموعی طور پر جو مسلمان بچے صرف ایک صوبہ میں ہندی اللسان بنائے جا رہے ہیں اُن کی تعداد ۲۵ ہزار کے قریب ہے، یعنی کل مسلمان طلبہ کا ۷۰ فیصدی حصّہ۔ اور ان کو پڑھایا کیا جاتا ہے؟ متعدد کتب نصاب میں یہ چیز آپ کو ملیگی کہ "دو بنی" کے

معنی "رام اوتار" کے ہیں[۱]۔ ایک چاول سے اندازہ کر لیجئے کہ پوری دیگ بن کیا ہے۔ پروفیسر عبدالحق سکریٹری انجمن ترقی اردو نے رسالہ "اردو" کی ایک قریبی اشاعت میں اپنے ایک دوست کا خط نقل کیا ہے جو یوپی میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس سال مجھے ڈسٹرکٹ بورڈ کے بہت سے مدرسوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا اور اُن میں عموماً میں نے دیکھا کہ اردو پڑھانے والے مدرسوں کی بہت کمی ہے۔ مسلمان بچوں کو مجبوراً ہندی پڑھنی پڑتی ہے اور وہاں زبان کے واسطہ سے ان پر ھندویت کا گہرا رنگ چڑھ رہا ہے۔ مثلاً ایک ابتدائی مدرسہ میں بچے کو پکاریئے تو وہ "حاضر جناب" کہنے کے بجائے "اپستھت شریمان" کہیگا۔ یہ اس صوبہ کا حال ہے جو صدیوں سے ہماری قومی تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ ان سب سے زیادہ بدتر حالت صوبۂ متوسط کی ہے۔ ضلع بیتول کی ڈسٹرکٹ کونسل نے پورے ضلع میں جبری تعلیم نافذ کرنے کی جو سکیم بنائی ہے اس میں تعلیم کی زبان لازماً ہندی رکھی گئی ہے اور حکومت نے اس شرط کے ساتھ اس کو مالی امداد دی ہے کہ تمام تعلیم ہندی میں ہو۔ اس جدید اسکیم کے ماتحت ۱۰۷ ہندی اسکول قائم کئے گئے اور پورے ضلع میں اردو کا ایک اسکول تھا سو وہ بھی بند کر دیا گیا[۲]۔ یہ صرف ابتدا ہے۔ ودیا مندر سکیم جب نافذ ہوگی تو آپ دیکھیں گے کہ دیہات کی مسلمان آبادی کو ۲۵ سال کے اندر قریب قریب کلیتہً ہندی اللسان بنا دیا جائیگا۔ ابتدائی تعلیم تمامتر لوکل بورڈوں کے قبضہ میں ہے اور وہاں حال یہ ہے کہ ۵ سو انتخابی حلقوں سے

---

[۱] عبدالغنی صاحب ایم ایل اے (سنٹرل) کا مراسلہ مندرجہ اسٹار آف انڈیا یکم مارچ ۱۹۳۸ء

[۲] "ھتواد" مورخہ ۲۵ فروری ۱۹۳۸ء۔ خود سی پی کے وزیراعظم نے بھی اپنے سرکاری کمیونک میں اس واقعہ کا اعتراف کیا ہے کہ ضلع کا واحد اردو اسکول بند کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۸ جون ۱۹۳۸ء

نصف درجن مسلمان بھی منتخب نہ ہو سکے۔ یہ عصبیت جہاں کام کر رہی ہو، وہاں کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ پبلک کے خزانے سے کہیں اردو و دیا مندر یا "بیت العلم" بھی قائم کیا جائیگا۔ لوکل بورڈوں میں تو پھر بھی محدود نظر اور پست ذہنیت کے لوگ جاتے ہیں۔ صوبہ کی حکومت جن اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذمہ دار کانگریسی لیڈروں کے ہاتھ میں ہے خود وہی کانگریس کے اس زبانی دعوے کو جھوٹا اور منافقانہ دعویٰ ثابت کر رہے ہیں کہ "ہندوستانی" زبان اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں کے ساتھ تسلیم شدہ سرکاری زبان ہے۔ سی پی اسمبلی میں خود صدر مجلس کے زیر ہدایت رولز کمیٹی نے جو قواعد بنائے ہیں ان میں ۵ لاکھ مسلمانوں کی زبان کا نام تسلیم شدہ زبانوں کی فہرست میں کہیں نظر ہی نہیں آتا۔ عبدالرحمان خاں صاحب ایم ایل اے نے جب اپنے سوالات اُردو زبان میں لکھ کر بھیجے تو اسمبلی کے سکرٹری نے اُنہیں واپس کر دیا اور ہدایت کی کہ انگریزی زبان میں سوالات بھیجے۔[1] اسمبلی کی کارروائی قلمبند کرنے کے لئے ہندی رپورٹر تو رکھا جا سکتا ہے مگر اردو رپورٹر رکھنے اور اُردو میں کارروائی شائع کرنے کے لئے بجٹ میں گنجائش نہیں نکلتی۔ اسمبلی میں کانگریس کے کراچی ریزولیوشن کا حوالہ دیکر مطالبہ کیا جاتا ہے کہ کارروائی اُردو اور ہندی دونوں میں لکھی جائے تو کانگریسی حکومت کا وزیر عدل و انصاف جواب دیتا ہے کہ:-

"جو لوگ کانگریس کو ایک قومی جماعت تسلیم نہیں کرتے اُنہیں کانگریس کی کراچی والی تجویز پر ہماری توجہ مبذول کرانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اُنہیں کیا حق ہے کہ اس تجویز کا حوالہ دیکر وہ ہم پر نکتہ چینی کریں ہم اقلیتوں کے معقول مطالبے ماننے کو تیار ہو سکتے ہیں لیکن اس ترمیم میں مسلمانوں کی طرف سے جو مطالبہ کیا

[1] عبدالرحمٰن خاں صاحب کا مراسلہ۔ اسٹار آف انڈیا مورخہ ۲۰ ستمبر ۳۸ء

گیا ہے وہ نہ تو معقول ہے اور نہ قابل عمل۔ کسی اقلیت کو یہ حق حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ ایوان کی اکثریت سے نامعقول مطالبے منوانے کی کوشش کرے۔

مسلمان ممبروں کو اس وقت بھی یہ رعایت حاصل ہے کہ وہ چاہیں تو اردو میں تقریر کریں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اردو خط صوبہ کی سرکاری عدالتوں اور دفتروں میں بھی رائج نہیں، اسمبلی میں بھی اُسے رائج نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بے انتہا مصارف بڑھ جائیں گے"[1]

(۴) عمل کے ساتھ زبانوں پر بھی علانیہ یہ بات آگئی ہے کہ "قومی" زبان حقیقت میں "ہندی" ہے نہ کہ وہ "ہندوستانی"۔ جو یوگو سلویا کی "سرب لوکرد ٹوسلافینی" زبان کی طرح محض ایک دھوکے کی ٹٹی بنائی گئی ہے۔ اس تخیلی زبان کے متعلق تو ابھی حال میں گاندھی جی نے خود فرمایا ہے کہ خارج میں اس کا وجود کہیں نہیں ہے بلکہ وہ آئندہ پیدا کی جانیوالی ہے۔[2] اب مقابلہ رہ جاتا ہے اردو اور ہندی میں، تو اس کے متعلق "متحدہ ہندوستانی قوم" کے لیڈر کا فیصلہ یہ ہے کہ ہندی زبان ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور دیوناگری رسم الخط ہی ہندوستان کا رسم الخط ہونا چاہئے۔[3] ہری پورہ کانگریس کے موقع پر "راشٹر بھاشا سمیلن" (قومی زبان کی کانفرنس) کا ساتواں اجلاس مسٹر جمنا لال بزاز کے زیر صدارت ہوتا ہے اور کانگریس کا صدر اُس کو پیغام بھیجتا ہے کہ:۔

---

[1] مدینہ مورخہ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۳۸ء۔

[2] HINDUSTANI OF THE CONGRESS CONCEPTION HAS YET TO BE CRYSTALLISED INTO SHAPE (HARIJAN, 29 oct. 1938)

[3] ہریجن بحوالہ ٹریبیون مورخہ ۸ر جولائی ۱۹۳۸ء۔

"صوبوں کے باہمی تعلقات کی ترقی کے لئے ایک مشترک زبان کی ضرورت ہے اور وہ زبان ہندی یا ہندوستانی ہی ہو سکتی ہے۔ جن لوگوں نے ابھی تک ہندی نہیں سیکھی انہیں سیکھنی چاہئے کہ یہ ہندوستانی قوم کی تعمیر میں مددگار ہو گی"[1]

یو۔پی کا وزیر تعلیم ۱۹ راگست ۱۹۳۸ء کو ناگری پرچارنی سبھا' بنارس کے ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے:۔

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندی کو' جسے ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے' ہمارے جنوبی ہند کے ہموطن آسانی سے سیکھ لیں تو لازم ہے کہ ہم ہندوستانی زبان میں سنسکرت کے کافی الفاظ استعمال کریں"

اسی صوبہ کی اسمبلی کا صدر اسی وزیر تعلیم کے پاس وفد لے جاتا ہے اور اس سے درخواست کرتا ہے کہ ہندی کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے پہلے اس کو سرکاری زبان قرار دیا جائے اور محکموں میں اور خصوصاً عدالتوں میں سارا کام ہندی کے ذریعہ سے ہو۔

(مدینہ یکم ستمبر ۱۹۳۸ء)

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے متحدہ ہندوستان کے نام سے سیاسی طاقت حاصل کی ہے' اور اب یہ اس طاقت کو ہندوستان کی ایک قوم کی زبان مٹانے اور دوسری قوم کی زبان سارے ملک پر مسلط کر دینے میں استعمال کر رہے ہیں۔

یہ ساری روداد آپ کے سامنے ہے۔ اسے آنکھیں کھول کر پڑھئے اور اندازہ کیجئے کہ اس "جنگ آزادی" کی حقیقی نوعیت کیا ہے۔ اس کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ میرا

---

[1] ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۳۸ء

قیدخانہ کا رفیق مجھ سے کہتا ہو کہ آؤ میں اور تم دونوں مل کر جیلر سے لڑیں اور ہم دونوں اپنی بیڑیاں اور ہتھکڑیاں کاٹ پھینکیں۔ اگر معاملہ یہی ہوتا تو مجھ سے بڑھ کر کون احمق ہوتا کہ ایسے کارِ خیر میں اس کا ہاتھ بٹانے سے انکار کرتا۔ لیکن یہاں صورتِ معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ میرا رفیقِ زنداں اس تدبیر میں ہے کہ جیلر کو ہٹا کر خود اس کی جگہ لے لے اور اپنے ہاتھ پاؤں کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بھی میرے ہاتھ پاؤں میں ڈال کر مجھے اپنا قیدی بنالے۔ وہ مجھ سے تو کہتا ہے کہ آؤ اس قید وبند سے آزادی حاصل کرنے کے لئے جیلر سے لڑیں۔ مگر جیلر کے ساتھ یہ معاملہ طے کرتا ہے کہ حضور مجھے برقنداز بنادیں، جیل کا انتظام حضور کے حسب منشا ہوگا اور قیدیوں کو میں قابو میں رکھونگا۔ اس طرح جو کچھ اختیارات اُسے جیلر سے ملتے جاتے ہیں اُن سے کام لے کر وہ اپنی قید کے طوق وسلاسل اُتار کر مجھے کستا چلا جاتا ہے۔ اور مزید غضب یہ ہے کہ جیلر صاحب تو نرے جیلر تھے مگر یہ ہمارے رفیق زنداں صاحب جواب برقنداز بنے ہیں، ان کو مردم خوری کا چسکا بھی ہے۔ یہ مجھے فقط اپنا قیدی ہی نہیں بنانا چاہتے بلکہ میرے گوشت اور خون کو آہستہ آہستہ اپنا جزوِ بدن بھی بنالینے کی فکر میں ہیں۔ اب اگر میری عقل ماری گئی ہے تو میں ان کے ساتھ ضرور تعاون کرونگا تاکہ یہ میری مدد سے جیلر پر دباؤ ڈال کر اور زیادہ اختیارات حاصل کریں اور زیادہ آسانی سے مجھے نوشِ جان فرما سکیں۔ اور اگر میری جیسے کی آنکھیں پھوٹ چکی ہیں تو میں جیل کی کوٹھری میں بے فکر بیٹھا ان برقنداز صاحب کی ترقی کو دیکھتا رہوں گا۔ اور اگر جیل کی زندگی نے مجھے پست ہمت اور ذلیل بنادیا ہے تو میں بوڑھے جیلر کی خدمت میں دوڑا ہوا جاؤنگا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کرونگا کہ حضور کا دم سلامت رہے، جبتک آپ جیتے ہیں اُس وقت تک تو آپ ہی جیل کا انتظام فرمائیں، جب خدانخواستہ آپ کا وقت آن پورا ہوگا، اُسوقت

دیکھی جائے گی جس کی قید بھی قسمت میں لکھی ہوگی بھگت لینگے۔ لیکن اگر میں عقل و خرد سے کچھ بھی بہرہ رکھتا ہوں اور میری رگوں میں ابھی شرافت کا بھی کچھ خون باقی ہے تو میں ہمت کرکے اُٹھونگا اور جیل کی دیواریں اپنے ہاتھ سے توڑنے کی کوشش کروں گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوسکتا ہے کہ اس کوشش میں جیلر یا برقنداز کی گولی کا نشانہ بن جاؤنگا، تو بہت اچھا مجھے اس کو گوارا کرلینا چاہئے۔ قیدی کی زندگی سے، اور برقنداز کی غذا بننے سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ لڑکر مارا جاؤں۔ اس مردانہ کام میں دور ہی کا سہی مگر یہ امکان بھی ہے کہ مجھے اپنی کوشش میں کامیابی نصیب ہوجائے اور میں اپنے مکّار رفیقِ زنداں سے کہہ سکوں کہ برادرم! جیل کی ہوا بھول جاؤ اور سیدھی طرح شریف ہمسایہ بنکر رہو۔

نوٹ:۔ یہ پرچہ کی کتابت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ ۱۹ نومبر کے زمزم میں جناب مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک بیان نظر سے گزرا جس میں مولانا نے سی پی کے متعلق بعض شکایات کی تردید فرمائی ہے، اور بعض کے متعلق بیان فرمایا ہے کہ جب وہ ان کے علم میں آئیں تو انہوں نے کانگریس پارلیمنٹری کمیٹی کو توجہ دلائی۔ اور اُس نے اُن کی تحقیقات یا تلافی کرنے کی کوشش کی۔ یہاں اس بیان پر تفصیلی تبصرہ کی گنجائش نہیں مگر مختصراً میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جن باتوں سے مولانا خود اطمینان حاصل فرماسے ہیں اور جن پر مسلمانوں کو مطمئن کرنے کی کوشش فرمارہے ہیں وہ درحقیقت قابلِ اطمینان نہیں ہیں۔ خود انکے اپنے بیان سے یہ حقیقت واضح ہورہی ہے کہ اس سراسر غلط جمہوری نظام میں طاقت تو سمٹ سمٹا کر اکثریت کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ اور ہماری اصلی حیثیت اب یہ ہے کہ اگر وہ ہم پر ظلم کریں تو ہمارا کوئی نمائندہ جاکر سردار پٹیل کی خدمت میں، کسی اور سرکار کی خدمت میں عرض معروض کردے، اور اس ظلم کی تلافی صرف اس وقت ہوسکے جبکہ

وہ بربنائے عنایت و مہربانی یا بربنائے مصلحتِ وقت تلافی کرنا چاہیں۔ یہ پوزیشن کسی طرح بھی اس غلامی کی پوزیشن سے مختلف نہیں جو اب تک انگریزی سلطنت میں ہم کو حاصل رہی ہے۔ یہاں بھی کوئی مصیبت مسلمانوں پر پیش آتی ہے تو کوئی فضل حسین یا کوئی شفیع خود اس کا تدارک نہیں کرسکتا بلکہ جا کر وائسرائے بہادر سے عرض کرتا ہے یا کسی صوبہ کے گورنر صاحب کو توجہ دلاتا ہے، اور وہ اگر مہربان ہوں یا مصلحتہً اس کی ضرورت سمجھیں تو تدارک ہو جاتا ہے، ورنہ اکزیکٹو کونسل کے ممبر صاحب اپنا سامنہ لے کر رہ جاتے ہیں اور بدستور اس امید میں رکنیت کی کرسی سے چپکے رہتے ہیں کہ شاید کسی دوسرے موقع پر منصب کام آجائے۔ ہمارا اصلی اعتراض دراصل اسی پوزیشن پر ہے۔ مان لیا کہ کانگریسی حکومتوں میں اس وقت بڑی حق پسندی اور غایت درجہ کے عدل و انصاف کے ساتھ حکومت ہو رہی ہے اور یہ بھی تسلیم کر لیا کہ جتنی شکایات اب تک اُردو اخبارات میں شائع ہوئی ہیں سب کی سب جھوٹی ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ دستور کی نوعیت کیا ہے اور آئندہ کی لڑائی کس نوعیت کے دستوری ارتقا کیلئے ہو رہی ہے۔ اگر اس کی نوعیت یہی ہے کہ ہم اس جھوٹے جمہوری نظام میں محض اپنے سروں کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے محکوم ہوں اور ہندو صرف اس لئے ہم پر حاکم ہوں کہ ان کے سر ہم سے زیادہ ہیں، تو ظلم اس نظام کی عین فطرت میں پوشیدہ ہے۔ آج اگر مولانا ابوالکلام کی اس لئے سن لی جاتی ہے کہ ان سے کچھ زیادہ بڑا کام لینا ہے تو کل کسی ابوالکلام کی نہ سنی جائیگی اور کسی ابوالکلام میں یہ طاقت نہ ہوگی کہ جب اسکی نہ سنی جائے تو وہ کچھ کر سکے۔ ہمارا اصلی جھگڑا اسی غلط اصول سے ہے اور مولانا یہ سمجھ رہے ہیں کہ بس تمام شکایت بیتول کے مدرسے اور ودیا مندر کے نام ایسی ہی چند چھوٹی چھوٹی چیزوں کے متعلق ہے۔ جو لوگ مولانا کے علم اور ان کی دانائی کے معترف تھے ہیں وہ اس سے کچھ زیادہ دانشمندی و بصیرت کی توقع اُن سے رکھتے تھے۔

تنبیہ الغافلین

گزشتہ صفحات میں نیشنلزم اور آزادیٔ ہند کی وطن پرستانہ تحریک کا جو علمی اور واقعاتی تجزیہ کیا گیا ہے اس سے یہ بات آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہوجاتی ہے کہ ہمارے اور اس تحریک کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ ہماری موت اس کی زندگی ہے اور اُس کی موت ہماری زندگی۔ ہمارے اور اس کے درمیان اصول میں، مقاصد میں اور طریق کار میں نہ صرف یہ کہ کسی قسم کا اتحاد نہیں ہے، بلکہ درحقیقت کلّی اختلاف ہے، ایسا شدید اختلاف کہ کہیں کسی ایک نقطہ پر بھی ہم اور وہ جمع نہیں ہوتے۔ ہمارا اور اُس کا تباین اس نوعیت کا ہے جیسا مشرق اور مغرب کا تباین ہے کہ جو شخص مشرق کی طرف جانا چاہتا ہو اُس کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ ہی نہیں کہ مشرق سے مُنہ موڑ لے۔

اب جو شخص اس تحریک کے ساتھ چلتا ہے اور اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتا ہے وہ لامحالہ دو حالتوں میں سے کسی ایک حالت میں مبتلا ہے۔ یا تو وہ اس تحریک کی حقیقت اور اس کے منطقی اور واقعی نتائج کا پورا شعور رکھتا ہے اور اس شعور کے ساتھ اُس نے اپنے لئے یہ راستہ منتخب کیا ہے۔ یا پھر وہ کسی غلطی کا شکار ہے۔

پہلے شخص سے ہمارا کوئی جھگڑا اس کے سوا نہیں ہے کہ ہمیں اُس کی منافقت پسند نہیں ہم اُس سے صاف کہتے ہیں کہ جب تم اسلامی قومیت کی نفی کرنے کے لئے بالارادہ تیار ہو اور اُس جمہوری نظام میں صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے شریک ہونا چاہتے ہو جسکو

واحد وطنی قومیت کی بنیاد پر تعمیر کیا جارہا ہے تو تمہیں آخر کس نے مجبور کیا ہے کہ اپنے آپکو نام چارے کے لئے اسلامی جماعت سے بھی وابستہ رکھو؟ یہ نہ صرف منافقانہ حرکت ہے بلکہ اس میں تمہارا اپنا سراسر نقصان ہے۔ اقلیت کا ٹھپہ جبتک تمہارے اوپر لگا رہے گا اُس وقت تک اکثریت کی حکومت میں تمہارے ساتھ امتیازی برتاؤ بہرحال ہوگا خواہ تم ایک سو ایک فیصدی نیشنلسٹ بن جاؤ۔ تمہارا نام ہر جگہ تمہاری راہ میں حائل ہوگا۔ ہر ذمہ داری کا منصب تمہیں دیتے ہوئے اکثریت جھجکے گی۔ صدارت کی کرسی، وزارت غرض، پارٹی لیڈرشپ، مالی اعانت، غرض ہر اہم چیز تم کو دینے میں فطری طور پر بخل سے کام لیا جائے گا۔ اس معاملہ میں اگر تم ایثار کے لئے تیار ہو تب بھی یہ تو تمہیں سمجھ لینا چاہئے کہ ایک علیحدگی پسند قوم سے ظاہری وابستگی برقرار رکھ کر تم اپنے مقصد ـــ واحد قومیت کی تعمیر ـــ کو نقصان پہنچا رہے ہو۔ جبکہ ایک قوم اپنی جداگانہ ہستی قائم رکھنے پر اصرار کر رہی ہے تو تمہارے اوپر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ اُس سے علیحدگی اختیار کرو بشرطیکہ تم اپنے مقصد کے سچے وفادار رہو۔

اب رہ جاتا ہے وہ شخص جو اپنی قومیت کی نفی نہیں کرنا چاہتا، بلکہ دل سے اس کے بقا اور نشوونما کا آرزومند ہے، اور اس امر کی حقیقی خواہش رکھتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں اُس کی قومیت کو آزادی، خود اختیاری اور ترقی کا پورا موقع ملے، مگر اس کے باوجود کسی غلطی یا غلط فہمی کی وجہ سے اس تحریک میں شامل ہو گیا ہے جو اُس کے قومی نصب العین سے اصولی، مقصدی، اور فعلی مخالفت رکھتی ہے۔ ایسے شخص کی حالت کا ہمیں تجزیہ کر کے دیکھنا ہوگا کہ وہ کس نوعیت کی غلطی یا غلط فہمی میں مبتلا ہے۔

اس کے مرض کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس تحریک کی حقیقت سے واقف

نہ ہو، بلکہ چند سطحی باتیں اپنے حسب منشا پاکر اس کے ساتھ لگ گیا ہو۔ گذشتہ صفحات اس بیماری کا علاج کرنے کے لئے کافی ہیں۔ آنکھیں کھول کر انہیں پڑھے گا تو ان شاء اللہ شفایاب ہو جائے گا۔

دوسرا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس تحریک کی حقیقت اور اس کے نتائج کو سمجھتا ہو، مگر علم و واقفیت کی کمی نے اُسے اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہو کہ ہندوستان میں آزاد حکومت کا نشوونما اُن جمہوری اصولوں کے سوا کسی دوسری صورت سے ممکن ہی نہیں ہے جن کو یہاں رواج دیا جا رہا ہے، لہٰذا وطنی آزادی کی خواہش رکھنے والے کو چار و ناچار انہیں قبول کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ پھر دوسرا راستہ اور ایک ہی راستہ انگریز کی غلامی کا ہے۔ جو لوگ اس غلط فہمی کے شکار ہوئے ہیں انہیں اس کتاب کا آخری باب کھلے دل سے پڑھنا چاہئے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اُن کی پوری تشفی ہو جائے گی۔

تیسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ علمی و نظری حیثیت سے تو ایک شخص کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہے۔ مگر یاس، بزدلی اور کم ہمتی نے اس کے دل پر قابو پا لیا ہے۔ اسے یہ تو خبر ہے کہ ہندوستان کے مسئلہ کو حل کرنے کی دوسری صحیح تر صورتیں بھی موجود ہیں۔ مگر وہ ایک طرف اپنی قوم کی بے چارگی کو دیکھتا ہے اور دوسری طرف یہ دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتا ہے کہ وطنی قومیت اور جمہوریت کی پشت پر زبردست طاقتیں ہیں جن کا مقابلہ یا تو کیا ہی نہیں جا سکتا، یا اگر کیا جا سکتا ہے تو اپنے آپ کو بربادی و ہلاکت کے خطرے میں ڈالنا پڑے گا اور پھر بھی کامیابی کی اُمید کم ہی ہے۔ ایسے شخص کے لئے ہم خدا سے دعا کریں گے کہ اس کے دل میں ایمان کی طاقت پیدا ہو اور خود اس شخص کو بھی مشورہ دیں گے کہ بندہ خدا! اگر تجھ میں تائید حق کا بل بوتا نہیں ہے تو باطل کی تائید کر کے اپنی قبر میں آگ کیوں بھرتا ہے۔

جا"، اور گوشے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرے یہ فتنہ کا وقت ہے۔ جو مردِ میدان بن کر نہیں نکل سکتا اُس کے لئے سلامتیِ ایمان کی راہ صرف یہی ہے کہ اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے۔

چوتھا سبب یہ بھی ممکن ہے کہ آدمی پر جذبۂ انتقام مستولی ہو گیا ہو۔ اسے انگریز کے ہاتھوں سے اتنی تکلیفیں پہنچی ہوں کہ وہ جوشِ غضب میں اندھا ہو گیا ہو اور کہتا ہو کہ اگر حق کی تلوار نہیں ملتی تو پروا نہیں، میں باطل ہی کی تلوار سے اس دشمن کا سر اڑاؤنگا۔ چاہے ساتھ ہی ساتھ میری اپنی ملت کی بھی رگِ جان کٹ کے رہ جائے۔ ایسے شخص کی بیماریٔ دل کا علاج خداوندِ عالم کے سوا اور کسی کے پاس نہیں۔ اللہ اُس کو توبہ کی توفیق عطا فرمائے ورنہ ڈر ہے کہ جس راہ پر وہ اس جذبہ کے ساتھ چل رہا ہے اسمیں اپنی عمر بھر کی کمائی ضائع کر دے گا اور قیامت کے روز اس حال میں خدا کے سامنے حاضر ہوگا کہ ساری عبادتیں اور نیکیاں اُس کے نامۂ اعمال سے غائب ہونگی اور ایک قوم کی قوم کو گمراہی و ارتداد میں مبتلا کرنے کا مظلمۂ عظیم اس کی گردن پر ہوگا۔ لیحملوا اوزارھم واوزار الذین یضلونھم۔

پانچواں سبب یہ ہے کہ ایک شخص اس فعل کو کارِ ثواب سمجھ کر کر رہا ہو۔ وہ اس خیال میں مبتلا ہو کہ دنیائے اسلام کو انگریزی امپیریلزم کے پنجے سے چھڑانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ آزادیٔ ہند کی اس تحریک کا ساتھ دیا جائے۔ اب اگر اس میں ہندوستان کی مسلمان قوم ختم ہو جائے تو پروا نہیں۔ ہندوستان سے باہر کے مسلمان تو اس بلا سے نجات پا جائیں گے۔ اس خیالِ خام نے جس شخص پر قابو پا لیا ہے اُس سے ہم تین باتیں عرض کریں گے:۔

(۱) انگریزی امپیریلزم کو اگر کوئی چیز ختم کر سکتی ہے تو وہ آزادی کامل کی خالص انقلابی تحریک ہی ہے۔ اس کے بغیر نہ یہ بلا دور ہوگی نہ آپ کا مقصد حاصل ہوگا۔ لیکن یہ تحریک جسکا

ساتھ آپ دے رہے ہیں، نہ آزادی کامل کی تحریک ہے، اور نہ خالص انقلابی تحریک۔ اسکی جو حقیقت ہم پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں اُس کی تردید میں اگر آپ کے پاس کانگریسی لیڈروں کے بعض زبانی دعووں کے سوا کوئی ثبوت ہو تو بسم اللہ، اسے سامنے لے آیئے۔ ورنہ صریح واقعات کے خلاف آپ کا اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھنا کہ اس تحریک کی حمایت سے آپ دنیائے اسلام کو آزاد کرالیں گے محض بے معنی ہے۔ اور بلادت ذہن کے سوا کسی دوسری چیز پر دلالت نہیں کرتا۔

(۲) پھر اگر بالفرض اس وطنی قومیت کی تحریک سے آپ کو فی الواقع دنیائے اسلام کی آزادی حاصل بھی ہو سکتی ہو تو ہم کہیں گے کہ اس پاک مقصد کے لئے یہ ناپاک ذریعہ اختیار کرنا ہرگز جائز نہیں۔ خوب سمجھ لیجئے کہ اس تحریک کی کامیابی اور ہندوستان کی مسلمان قوم کا ارتداد دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اس کا مآل یہ ہے کہ آٹھ کروڑ مسلمانوں کی عظیم الشان قوم رفتہ رفتہ مرتد ہو جائے اور اُس کی آئندہ نسل سے مادہ پرست دہریئے پیدا ہوں، جن کے عقائد، اخلاق اور اعمال میں اسلامیت کا شائبہ تک نہ پایا جائے۔ کیا اس نتیجہ کو سامنے رکھ کر کوئی شخص جو علم دین سے ذرہ برابر بھی بہرہ رکھتا ہو، یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ دنیائے اسلام کی آزادی کے لئے یہ قربانی دینا بھی جائز ہے؟ اگر محض جان اور مال کی قربانی کا سوال ہوتا تو پروا نہ تھی ہم کھلے دل کے ساتھ کہتے کہ اس سرزمین کا ایک ایک مسلمان اس مقصد کے لئے کٹ مرے حتّٰی کہ ایک بچہ بھی زندہ نہ رہے۔ لیکن یہاں سوال دین و اخلاق کی قربانی کا ہے۔ یہاں یہ قربانی دینی پڑتی ہے کہ ہماری نسلیں باقی رہیں مگر مسلمان نہ رہیں۔ تو یہ قربانی دنیا کی کسی بڑی سے بڑی اور مقدس سے مقدس چیز حتّٰی کہ بیت اللہ اور گنبدِ خضراء کے لئے بھی نہیں دی جا سکتی۔

(۳) وطن پرستی کی یہ تحریک اگر کامیاب ہو جائے تو دنیائے اسلام کے لئے انگریزی

امپیریلزم کے بجائے ہندوستانی امپیریلزم کا خطرہ پیدا کردیگی نیشنلزم تاریخ کے دوران میں اکثر امپیریلزم کی شکل اختیار کرتا رہا ہے اور آج بھی اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ چھپا لینے سے کچھ حاصل نہیں۔ آپ کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ نیشنلزم کا نشہ جب کامیابی سے ہمکنار ہوگا تو امپیریلزم کا جنون بن جائے گا اور اس وقت دنیائے اسلام کے قلب میں ایک دوسرا جاپان پیدا ہوگا۔ آپ کی موجودہ نسل نے تو محض پیٹ کی خاطر ارضِ عرب میں دادِ مردانگی دی ہے لیکن آپ کی آئندہ نسل جو وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم سے تیار ہوگی وہ اعتقاد کی قوت کے ساتھ یہ خدمت انجام دیگی۔ اس کا ضمیر اس فعل پر ملامت نہ کریگا بلکہ اُلٹا فخر کرے گا کہ اُس نے ہندوستان کا نام اونچا کیا اور اپنی "قوم" کے آگے دور و نزدیک کی قوموں کے سر جھکا دیئے۔ پس درحقیقت ہندوستان کے مسلمان پر نیشنلزم کے شیطان کو مسلط کرا دینا سے اسلام کی بھی کوئی خدمت نہیں ہے۔

اب ایک غلط فہمی اور رہ جاتی ہے جسے دور کر دینا ضروری ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس ملک میں کانگریس ایک طاقت بن چکی ہے اور ایسی طاقت بن گئی ہے جس نے سیاسی قوت و اقتدار کے تمام سرچشموں پر قابو پا لیا ہے۔ اُس سے الگ رہنا یہ معنی رکھتا ہے کہ ہم ان سرچشموں سے خود دستبردار ہو گئے اور دوسرے لوگوں کو آپ سے آپ ان کا قبضہ دیدیا۔ زیادہ صحیح تدبیر یہ ہے کہ اس جماعت کے اندر گھس جاؤ اور وہاں طاقت پیدا کرو۔ اس کا کم سے کم فائدہ یہ ہے کہ ہندو راج کے حامیوں کا زور ٹوٹ جائے گا اور مسلمان سیاسی طاقت میں حصہ دار بن جائینگے۔ اور اس میں زیادہ سے زیادہ فائدہ کے بھی امکانات ہیں۔ مثلاً یہ کہ مسلمان سوشلسٹ گروہ کے ساتھ مل کر مہا سبھائی عنصر کو شکست دے دیں۔ اور یہ کہ مسلمان اپنی بالاتر تہذیب سے ہندوؤں کو متاثر کریں اور آگ کی طرح اُن کی تہذیب

ہندوؤں میں پھیلتی چلی جائے۔

یہ بڑی دل خوش کن باتیں ہیں۔ مگر ہمیں تنقید کرکے دیکھنا چاہئے کہ اس میں حقیقت کتنی ہے اور جنّت حمقائی کی ہوائیں کس قدر شامل ہوگئی ہیں۔

بلاشبہ کانگریس کا نظام جمہوری ہے اور اس کے آئین میں اتنی گنجائش موجود ہے کہ جو گروہ چاہے اس میں شریک ہوکر اقتدار کے مرکز پر قبضہ کرنے کی جدوجہد کرسکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح انگلستان کے آئین میں اس امر کی گنجائش موجود ہے کہ لبرل، کنزرویٹو، سوشلسٹ، کمیونسٹ جو چاہے پارلیمنٹ میں جانے اور وزارت پر قبضہ کرنے کی کوشش کرسکتا ہے۔ نظری حیثیت سے یہ بھی ممکن ہے کہ دو یا تین چھوٹی جماعتیں مل کر ہر دوسری جماعت سے زیادہ طاقتور ہوجائیں اور مرکزی اقتدار حاصل کرلیں۔ لیکن یہاں سوال آئین اور اس کی نظری گنجائشوں کا نہیں بلکہ امورِ واقعیہ کا ہے۔ جو جماعت خالص جمہوری اصولوں پر بنی ہو اس میں کسی ایسی پارٹی کے برسرِ اقتدار ہونے کا ہرگز کوئی امکان نہیں جس کی حیثیت دراصل قومی اقلیت (NATIONAL MINORITY) کی ہو اور کثیر التعداد قوم کی تمام پارٹیوں میں جس کے خلاف قومی امتیاز اور قومی امپیریلزم کا جذبہ بطورِ ایک قدرِ مشترک کے پایا جاتا ہو۔ ایسی اقلیت نہ تو کبھی اکثریت بن سکتی ہے، اور نہ یہ امید کرسکتی ہے کہ کثیر التعداد قوم کی کوئی پارٹی اس کو برسرِ اقتدار ہونے میں مدد دے گی۔

ہمارے سامنے آئرلینڈ کی مثال موجود ہے۔ ۱۸۰۱ء میں انگلینڈ اور آئرلینڈ کی یونین (وحدت) عمل میں آئی اور دونوں قوموں کو ایک قوم قرار دے کر ایک جمہوری نظام میں شریک کردیا گیا۔ دونوں کی ایک ہی پارلیمنٹ تھی۔ ایک ہی طریقِ انتخاب سے دونوں اپنے اپنے نمائندے منتخب کرکے اس جمہوری ادارہ میں بھیجتے تھے۔ اور جہاں تک نظریہ کا تعلق ہے،

آئین میں کوئی ایسی رکاوٹ موجود نہ تھی کہ آئرش نمائندے پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کرکے گورنمنٹ پر قابض نہ ہوسکیں یا کسی دوسری پارٹی کے ساتھ مل کر وزارت نہ بنا سکیں لیکن فی الواقع ہوا کیا ۔ او کانل (O'CONNELL) جیسے آتش بیان خطیب اور ہوشیار قانون داں کی تدبیریں اور پارنل (PARNELL) جیسے قابل پارلیمنٹری لیڈر کی پالیسی بھی کچھ نہ کرسکیں ۔ ایکسو بیس سال کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ ایک دن کیلئے بھی آئرش نمائندوں کو برطانوی پارلیمنٹ میں اقتدار نصیب نہ ہوا ۔ اور اقتدار تو درکنار وہ غریب کسی آئینی تدبیر سے ان مصائب کو بھی دور نہ کر سکے جو انگریزی حکومت کے ہاتھوں ان پر نازل ہوئے تھے حتیٰ کہ آخر کار انکو باہر سے لڑنا پڑا ، اور آج کی آئرستانی جمہوریت کسی آئینی جدوجہد کسی اندرونی تعاون کا نہیں بلکہ بیرونی جنگ کا نتیجہ ہے یہی سبق ہم کو چیکوسلوواکیا کے جمہوری نظام سے ملتا ہے جہاں جرمن اور سلاوک اقلیتیں چیک اکثریت کے مقابلہ میں پارلیمنٹری طریقوں سے کچھ نہ کرسکیں ۔ یہی سبق ہمیں یوگوسلیویا سے ملتا ہے جہاں کروٹس اور سلاوینی آج تک کبھی کسی آئینی چال سے حکومت کے نظام پر قابض نہ ہوسکے ۔ یہی سبق ہمیں امریکہ سے ملتا ہے جہاں ہر پارٹی حکومت پر قبضہ کرسکتی ہے مگر حبشی قوم کیلئے اسکا قطعاً کوئی امکان نہیں ۔ لہٰذا جو لوگ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ ہم جب تک مسلمان ہیں یہاں ہماری حیثیت محض ایک سیاسی پارٹی کی نہیں بلکہ ایک قومی اقلیت کی ہے ، وہ کانگرس پر قبضہ کرنے کے خواب جسقدر چاہیں دیکھتے رہیں مگر عقل سے نہیں سمجھتے تو تجربہ انہیں بتادے گا کہ یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکیں گے ۔

بھول نہ جانا چاہئے کہ کانگرس کا اور ہمارا اختلاف محض ذرائع اور طریقوں (MEANS AND METHODS) کے اختلاف کی حیثیت نہیں رکھتا ۔ یہ اصول مقاصد اور پالیسی کا بنیادی اختلاف ہے ۔ اُسکے اصول قومیت وجمہوریت کو ہم بالکل بدل ڈالنا چاہتے ہیں ۔ اسکے مقصد یعنی ایک قومی جمہوری لادینی اسٹیٹ کے قیام کو بھی ہم قبول نہیں کرسکتے ۔ اسکی پالیسی یعنی بتدریج سیاسی اختیارات

حاصل کرنے اور انکی مدد سے ہندوؤں کی بالادستی عملاً قائم کر دینے کو بھی ہم گوارا نہیں کر سکتے۔ یہ تینوں بنیادی چیزیں جبتک بدل نہ جائیں کانگرس کیساتھ ہمارا تعاون اسلامی اغراض کیلئے ذرہ برابر مفید نہیں۔ اب دیکھنا چاہئے کہ آیا کانگرس کے اندر جا کر ہم یہ مقصد حاصل کر سکتے ہیں ؟

داخلی مقاومت یا تعاون سے کسی جمہوری تنظیم کے اصول، مقاصد اور پالیسی میں تغیر پیدا کرنے کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں :

یا تو تغیر چاہنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ وہ اس جماعت پر چھا جائیں۔ اس صورت میں کلی تغیر بھی ہو سکتا ہے

یا اس جماعت کے اندر ان کا نظام اتنا زبردست ہو کہ وہ اپنی منظم مقاومت سے اس جماعت کو پریشان کر دیں۔ اس صورت میں کلی تغیر تو نہیں البتہ کسی حد تک تغیر ضرور ممکن ہے۔

یا پھر تغیر چاہنے والے اپنے اخلاقی اثر اور اپنے دلائل کی قوت سے اس جماعت کی رائے کو متاثر کر دیں۔ اور اس طرح وہ جماعت خود ہی حق اور عدل کی طرف مائل ہو جائے۔ اس طریقہ کی کامیابی تمامتر اس جماعت کی انصاف پسندی و حق آگاہی پر منحصر ہے۔

انمیں سے پہلی صورت تو یہاں ناقابلِ عمل ہے کسی حسابی معجزے کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے کہ کانگریس میں مسلمانوں کے ووٹ ہندوؤں کے ووٹوں سے زیادہ ہو جائیں۔ لہذا جو لوگ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ کثرت سے کانگرس میں داخل ہو اور اس پر قابض ہو جاؤ انکی بات اتنی ہی قابلِ التفات ہے جتنی اس شیر خوار بچے کی بات قابلِ التفات ہو سکتی ہے جو بیچارا ایک اور چار کی نسبت سے بھی واقف نہیں۔

رہی دوسری صورت تو داخل میں منظم جد وجہد اور مقاومت صرف اس طرح ممکن ہے کہ کانگرس میں جتنے مسلمان شریک ہیں اور آئندہ شریک ہوں، وہ سب کے سب یا انکی ایک بہت بڑی اکثریت ایک پارٹی، بلکہ ایک ٹیم بنکر رہے۔ انکی قیادت ایک ایسے دیندار گروہ کے ہاتھ میں ہو جو اسلامی مفاد کا صحیح احساس و شعور رکھتا ہو، اور وہ اس گروہ کی ایسی کامل اطاعت کریں کہ انکا کانگریس میں رہنا یا نکل آنا اسکے حکم پر موقوف ہو۔ مگر کیا

بحالات موجودہ کانگریس میں ایک مسلم پارٹی کی تنظیم اس طرز پر ہو سکتی ہے؟ واقعات سے اسکا جواب نفی میں ملتا ہے۔ وہاں جو مسلمان شریک ہیں ظاہر میں ان سب پر لفظ مسلمان کا اطلاق ہوتا ہے اور آزادی ہند کے مسئلے میں وہ ہم آہنگ بھی ہیں لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے انکے خیالات اسقدر متضاد ہیں کہ انکو ایک پارٹی میں منسلک کرنیکا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں سے ایک گروہ تو قطعی طور پر اسلام سے منحرف ہو چکا ہے اور حتمًا یہ رائے رکھتا ہے کہ ہندوستان کے آئندہ نظام اجتماعی میں مذہب کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ دوسرا گروہ نہ منحرف ہے اور نہ معتقد۔ اس گروہ میں اتنی مختلف اقسام پائی جاتی ہیں جتنی سانپوں کی اقسام ہیں۔ انہیں سے بعض اسلام کے متعلق خود اپنے کچھ تصورات رکھتے ہیں جن کیلئے کتاب و سنت کی سند غیر ضروری ہے۔ بعض کو "مسلمان" کے سیاسی معاشی مفاد سے تو ضرور دلچسپی ہے مگر اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بعض ایسے ہیں جو مسلمانوں کے مفاد کو کسی حد تک اہمیت ضرور دیتے ہیں مگر اتنی نہیں کہ "ملک" کے مفاد کا جو تصور انکے دماغ میں ہے اس پر مسلمانوں کے مفاد کو قربان کرنے میں انہیں کوئی تامل ہو۔ تیسرا گروہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو دیندار، اہل علم اور نیک نیت ہیں۔ کانگرس میں جب کبھی ہندوستان کے مشترک مفاد کا کوئی مسئلہ اٹھے گا تینوں گروہ ایک آواز بلند کرینگے۔ مگر جب اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کا سوال آئیگا تو یہ اسقدر بھانت بھانت کی بولیاں بولینگے کہ اسلام اور مسلمان دونوں غیر مسلموں کے لئے مضحکہ بنکر رہ جائینگے اور یہ متعین کرنا بھی مشکل ہو جائیگا کہ حقیقت میں اسلام کیا چیز ہے اور مسلمانوں کا مفاد کس چڑیا کا نام ہے۔

ماس کانٹیکٹ کے ذریعہ سے یہ تینوں گروہ مسلمانوں کو کانگرس میں بھرتی کر رہے ہیں اور اب علمائے کرام کے صدقے میں کانگرس کے ہندو کارکن بھی بھرتی کا کام کرنیکے قابل ہو گئے ہیں۔ اس طرح جو مسلمان کانگرس میں جا رہے ہیں وہ ان تینوں گروہوں اور انکی بیشمار شاخوں میں تقسیم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کانگرس کے ہندو ارکان کی ہمدردیاں تمامتر پہلے گروہ سے وابستہ ہیں۔ خواہ وہ گاندھی جی ہوں یا جواہر لال یا کوئی سخت مہا سبھائی۔ بہرحال فطرۃً ان سب کا میلان ان نام نہاد مسلمانوں کی طرف ہے جو اسلام سے اعتقاداً اور عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور جو اس وقت ہندوستان میں اسلام اور اسلامی قومیت کی جڑیں کاٹنے کیلئے بدترین منافقوں کا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ کانگریس

کے ذمہ دار عہدے اور کانگریسی حکومتوں کے تحت عزت و منفعت اور اثر و اقتدار کے مناصب تمام تر انہیں منافقین کیلئے وقف ہیں اور رہینگے۔ انکے بعد کانگریسی لیڈروں کے نزدیک اگر کوئی گروہ قابل ترجیح ہے تو وہ دوسرا گروہ ہے اور اس گروہ میں سے بھی خصوصیت کیساتھ وہ طبقہ جو منافقین کے مقام سے اقرب ہے باقی رہا تیسرا گروہ اور اس سے قریب تر تعلق رکھنے والے طبقے تو انکو محض آلہ کار کی حیثیت سے استعمال کیا جارہا ہے جبتک یہ وفادار خدام کی حیثیت سے سر نگوں رہ کر خدمت کرتے رہینگے ان سے مداہنت برتی جائیگی۔ جہاں انہوں نے کچھ زور پکڑا اور اسلامی مفاد کا نام لیا، ان پر منافقین کی اس فوج کو ہنکا دیا جائیگا جو انہی کیلئے پرورش کی جارہی ہے۔ ایسے موقع پر ہندو لیڈروں کو خود سامنے آنیکی کی تکلیف بھی نہ اٹھانی پڑیگی۔ ہماری اپنی قوم کے منافقین ہی ہمارے لیڈروں کو مجبور کر دینگے۔ کیا ایسی حالت میں کانگریس کے اندر اسلامی مفاد کیلئے کوئی منظم جد و جہد کی جاسکتی ہے؟

اسکے بعد تیسری صورت باقی رہ جاتی ہے۔ جہاں تک اخلاقی اثر اور دلیل و حجت کا تعلق ہے اسکے لئے کثرت تعداد کی کوئی حاجت نہیں۔ اگر کوئی جماعت واقعی حق پسند اور نصفت شعار ہے تو اس کو ایک تنہا شخص بھی حق کا اعتراف کرنے اور انصاف سے کام لینے پر آمادہ کرسکتا ہے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ گذشتہ چند مہینوں میں کانگریسی حکومتوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو صریح اور ناقابل انکار بے انصافیاں کی ہیں، ان میں سے کس کی تلافی ہمارے لیڈر کانگریسی بھائیوں نے اپنے اخلاقی اثر اور زور استدلال سے کرلی ہے؟ کیا وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم میں ایک شوشے کا بھی تغیر کرالیا؟ کیا گائے کی قربانی کو دفعہ ۱۴۴ کی زد سے بچالیا؟ کیا اس صریح بے انصافی کا کوئی تدارک کرالیا جو بہار اور سی پی کے ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں میں مسلمانوں کے ساتھ روا رکھی گئی؟ جگہ جگہ مدرسوں اور پبلک جلسوں میں مسلمانوں کو بندے ماترم کیلئے قیام تعظیمی پر جو مجبور کیا جارہا ہے، کیا اسکا کوئی تدارک کرالیا؟ اور اگر یہ نہیں تو یہی ارشاد ہو کہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلواۃ

وسلام بھیجنے ہی کیلئے قیام تعظیمی ممنوع ہے' اور صرف اسی پر رسالے تصنیف کرنے اور فتوے شائع کرنے کی بھی ضرورت ہے؛ باقی رہا بندے ماترم تو وہ اس سے بالاتر ہے کہ اس کے لئے قیام تعظیمی کرنے یا نہ کرنے کا سوال معرض بحث میں لایا جا سکے؛ سی پی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ہندو وزراء اور ایک مسلمان وزیر کے ساتھ جو مختلف قسم کے طرزِ عمل اختیار کئے' کیا اس پر کوئی نتیجہ خیز باز پرس کر لی ؟ حکومت کی طاقت سے اُردو کو دبانے اور ہندی کو اُبھارنے کی علی الاعلان جو کوششیں ہو رہی ہیں' کیا ان کو رکوا دیا؛ کانگریسی حکومتوں میں نہایت متعصب اور بدنام مہا سبھائیوں کو جو ذمہ دار عہدے دیئے گئے ہیں' کیا ان پر کوئی مؤثر احتجاج کر دیا؛ اگر کوئی کانگریسی مسلمان سخن پروری کیساتھ نہیں بلکہ دیانت اور صداقت کے ساتھ ان امور کے متعلق اپنا کوئی کارنامہ پیش کر سکتا ہے' تو سامنے آئے اور ضرور آئے ۔ اور اگر اسکے پاس ہمارے ان سوالات کا کوئی جواب اسکے سوا نہیں ہے کہ "ہماری پشت پر دیندار مسلمانوں کی اتنی طاقت ہی نہیں جس سے ہم ان بے انصافیوں کا تدارک کرا سکیں" تو ہمارا مدعا خود اسکے اپنے اعتراف سے ثابت ہو گیا۔ ہم بھی اس سے یہی اعتراف کرانا چاہتے ہیں کہ وہ ایک ایسی جماعت سے تعاون کر رہا ہے جو حق کو حق اور انصاف کو انصاف کی حیثیت سے قبول کرنے والی نہیں ہے' بلکہ صرف زور اور طاقت کے آگے سر جھکانے والی ہے' لہٰذا اسکے ساتھ تعاون کر کے محض اخلاقی طاقت سے وہ کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا ۔

ہمارا نصب العین اور طریق کار

یہ تمام بحث جو اس تفصیل کے ساتھ پچھلے صفحات میں کی گئی ہے، اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم مسلمانوں کو ان کے غیر مسلم ہمسایوں سے لڑانا چاہتے ہیں، یا یہ بات ان کے دل میں بٹھانا چاہتے ہیں کہ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ ان کے اشتراک عمل کی کوئی صورت نہیں ہے یا یہ کہ ہم ان کو نفس آزادی ہند کا مخالف بنانے کی فکر میں ہیں محض اس خوف سے کہ ہندو یہاں کثیر التعداد ہیں اور وہ ہم کو کھا جائینگے۔ کچھ لوگ سمجھ بوجھ کی کمی کے سبب سے اور کچھ دوسرے لوگ ہوشیاری کی زیادتی کے باعث ہمارے دلائل سن کر بے صبری کیساتھ اسی نوعیت کے شبہات پیش کرنے لگتے ہیں لیکن ہمارا مدعا دراصل کچھ اور ہے جس کی طرف اپنے مقدمہ میں ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں اور اب ذرا زیادہ تفصیلی صورت میں اسے پیش کرتے ہیں۔

اس وقت ہندستان میں ہمارے سامنے اصلی سوال یہ نہیں ہے کہ ہمیں اپنی ہمسایہ اقوام کے ساتھ اشتراک عمل کرنا چاہئیے یا نہیں۔ ہم آزادی وطن کیلئے جد وجہد کریں یا معطل ہو کر بیٹھے رہیں۔ ہمسایہ قوموں کے ساتھ مل کر چلیں یا لڑ کر گذر کریں۔ اس باب میں ظاہر ہے کہ دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ کم از کم کوئی ذی ہوش آدمی تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ مسلمان یہاں تمام دوسری قوموں سے قطع تعلق کر کے بھی رہ سکتے ہیں، یا یہ کہ انہیں آزادی کی ضرورت نہیں ہے، یا یہ کہ ہمسایوں کے درمیان تعلقات کی تلخی اور آئے دن کی سر پھٹول اور اجنبی حکمرانوں کا اس سے فائدہ اٹھانا کوئی مرغوب چیز ہے۔ اسی طرح ہمارے سامنے اصلی سوال یہ بھی نہیں ہے کہ اس ملک کے نظام حکومت کا ارتقاء جمہوریت کے راستہ پر ہو یا کسی دوسرے راستہ پر۔ کوئی خردمند نفس جمہوریت کی مخالفت نہیں کر سکتا، اور نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ یہاں پادشاہی، یا امراء گردی (ارسٹاکریسی) یا اور

کسی طرز کی حکومت ہونی چاہئے ۔ درحقیقت جو سوال ہمارے لئے ایک مدت سے پریشان کن بنا ہوا ہے اور روز بروز زیادہ پریشان کن بنتا جارہا ہے وہ یہ ہے کہ گذشتہ ستر اسّی سال سے ہندوستان میں انگریزوں کی غلط رہنمائی و فرمانروائی اور ہندوؤں کی خوش نصیبی و خود غرضی کے سبب سے نظام حکومت کا نشوو ارتقاء واحد قومیت کے مفروضے پر جمہوری طرزِ ادارہ کی صورت میں ہورہا ہے ۔۔۔ نفس جمہوریت کو اور اُس جمہوری طرز ادارہ کو جو واحد قومیت کے مفروضہ پر مبنی ہو، ایک دوسرے سے خلط ملط نہ کرنا چاہئے ۔ دونوں میں زمین و آسمان کا بُعد ہے اور ایک سے اختلاف کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم دوسرے سے اختلاف کر رہے ہیں ۔۔۔

اب حقیقت نفس الامری تو یہ ہے کہ یہاں واحد قومیت موجود نہیں ہے اور واحد قومیت جن بنیادوں پہ تعمیر ہوسکتی ہے وہ بھی موجود نہیں ہیں لیکن فرض یہ کر لیا گیا ہے کہ ہم ہندو، مسلمان، اچھوت، سکھ، عیسائی وغیرہ سب ایک جغرافی نام اور ایک سیاسی نظام رکھنے والے ملک میں پیدا ہونے اور رہنے سہنے کی وجہ سے ایک قوم ہیں لہٰذا ہمارے درمیان جمہوریت کا یہ قاعدہ جاری ہوسکتا ہے اور ہونا چاہئے کہ ہم میں سے جو جماعت کثیر التعداد ہو اسی کی مرضی کے مطابق حکومت چلے ۔ اسی نظریہ کی بنا پر دستورِ حکومت بنایا گیا ہے اور آئندہ جو دستوری ارتقاء ہونے والا ہے اس کے لئے یہی راستہ متعین کر دیا گیا ہے ۔ انگریز اپنے نزدیک اسی کو صحیح سمجھتا ہے اور اسکے پاس طاقت ہے جسکے بل پر وہ ہندوستان کو اس راستہ پر لئے جارہا ہے ۔ ہندو اپنے لئے اس کو سراسر مفید پاتا ہے اور وہ قوم پرستانہ جوش کے ساتھ اس پہ جانے کے لئے آمادہ ہے ۔ اس صورت حال نے اُس کے لئے ہندو قوم پرستی اور ہندوستانی وطن پرستی دونوں کو ایک کر دیا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ وطن کی سچی محبت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کو آزادی" خود مختاری ایسے ہی جمہوری نظام کی شکل میں حاصل ہو ۔ ہندو قوم پرستی کے جتنے حوصلے اس کے سینے میں فطری طور پر پیدا ہوتے ہیں وہ بھی سب کے سب اسی ایک چیز میں پورے ہوجاتے ہیں ، لہٰذا وہ اس میں نہ تو کوئی قباحت محسوس کرتا ہے ، نہ اس امر کی کوئی وجہ ہے کہ وہ قباحت محسوس کرے ، اور نہ اس کے لئے یا اس کے سرپرست انگریز کے لئے ان لوگوں کے

احساسات کو سمجھنا آسان ہے جو اس میں قباحت پاتے ہیں۔ اپنے سرپرست کے ساتھ اسکی کشاکش جو کچھ بھی ہے صرف اس امر میں ہے کہ وہ اس راستہ پر جلدی بڑھنا چاہتا ہے اور دور تک پہنچ جانا چاہتا ہے اور وہ اسکی خواہشات کو پورا کر دینے میں تامل کر رہا ہے۔ مگر ہمارا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ ہمارے لئے اس نظام میں قباحت ہے۔ اور اس کی مزید ترقی میں مضرت ہے اور اسکی تکمیل میں ہلاکت ہے۔ ہندو کے برخلاف ہمارا حال یہ ہے کہ اس نظام میں ہمارے قومی حوصلے پورے نہیں ہوتے بلکہ ان کا گلا گھٹ جاتا ہے، انکی جڑ کٹ جاتی ہے اسلئے کہ ہم شمار میں کم ہیں، اور یہ نظام جو کچھ دیتا ہے ان کو دیتا ہے جو شمار میں زیادہ ہوں۔ جو کچھ یہ دیتا ہے اگر ہم اسے لینا چاہیں تو لازم آتا ہے کہ اپنی قومی خودی کو خود ہی مٹا دیں، اور اگر ہم اپنی خودی کو باقی رکھنا چاہیں تو یہ ہمیں کچھ نہیں دیتا جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دستوری ارتقاء کے ساتھ ساتھ تمام طاقت دوسروں کے ہاتھ میں چلی جائے اور وہ بزور ہماری خودی کو مٹائیں۔ اس صورت حال نے ہم کو ایسی جگہ لا کر کھڑا کر دیا ہے جہاں ہمیں صرف یہ اختیار رہ جاتا ہے کہ خودکشی اور سزائے موت میں سے کسی ایک چیز کو منتخب کرلیں۔ ہمارے سامنے زندگی اور آزادی پیش ہی نہیں کی جاتی بلکہ صرف یہ چیز پیش کی جاتی ہے کہ یا تو اپنے وجود کی خودنفی کر دو، یا پھر اپنے آپ کو سپرد کر دو تاکہ یہ نفی کرنے کی خدمت دوسرے انجام دے دیں۔ پس جو سوال ہم کو حل کرنا ہے وہ یہ ہے کہ جس تنگی میں لاکر ہم پھنسا دیے گئے ہیں اس سے نکلنے کی بھی کوئی صورت ہے یا نہیں؟

دوسری قلیل التعداد قوموں کی پوزیشن کیا ہے؟ اس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے۔ یہ ان کا اپنا کام ہے کہ اسکو سمجھیں اور رائے قائم کریں کہ واحد قومیت پر جمہوری نظام کی تعمیر کے منطقی اور واقعی نتائج انہیں قبول ہیں یا نہیں۔ ہم صرف اپنی پوزیشن کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں اور اسی کے متعلق ٹھیک طور پر کہہ سکتے ہیں ہم ایک مستقل قوم ہیں جس کی اجتماعی زندگی ایک مخصوص اخلاقی و تمدنی قانون پر مبنی ہے۔ اکثریت کی قوم میں اور ہم میں اساسی اور اصولی اختلافات ہیں۔ اس کے اخلاقی و تمدنی اصول ہمارے اصولوں سے مختلف ہیں۔ جب تک یہ اختلاف باقی ہے، یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ہم اور وہ من کل الوجوہ ایک ہو جائیں۔

جن امور کو مشترک کہا جاتا ہے ان میں بھی تفصیلات پر پہنچ کر ہمارے اور ان کے درمیان اختلاف، نقطۂ نظر کا، مقاصد اور ضروریات کا، اصولوں اور طریقوں کا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً تعلیم کو لیجئے جہالت کو دور کرنا اور تعلیم کو عام کرنا اور کارآمد تعلیم دینا ہم بھی چاہتے ہیں اور وہ بھی۔ اس حد تک ہمارے اور ان کے درمیان اشتراک ہے اور ہم بڑی خوشی کے ساتھ اس کار خیر میں ان کے ساتھ مل کر جدوجہد کر سکتے ہیں۔ مگر تعلیم کا مسئلہ تخلیق مقصد حیات، تعمیر ذہنیت، تشکیل اخلاق، تصویر عادات، اور فی الجملہ اس نیشنل ٹائپ کی پرورش کے ساتھ لازمی طور پر جڑا ہوا ہے جسے ایک قوم اپنے اسلاف سے پاتی ہے اور اپنی آئندہ نسلوں میں ترقی کے ساتھ برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ تعلیم کی اس تفصیلی صورت میں ہمارے اور ان کے درمیان اتفاق نہیں ہے۔ ہم یہ ضرور چاہیں گے کہ ہماری اور اُن کی آئندہ نسلوں میں حسن سلوک ہو، سنجوگ ہو، شریفانہ ہمسائگی کے تعلقات ہوں اور یہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہندوستان کی بھلائی کے لئے کام کریں۔ مگر یہ سب کچھ ہم اپنے نیشنل ٹائپ کا تسلسل قائم رکھنے کے ساتھ چاہیں گے، نہ یہ کہ ہمارا نیشنل ٹائپ ان کے ٹائپ میں گم ہو جائے، یا دونوں گڈمڈ ہو کر کسی بے صورت ساجی یا کبیر پنتھی وضع کے ٹائپ میں تبدیل ہو جائیں۔ لہٰذا تعلیم عمومی کے مسئلہ میں ہمارے اور ان کے درمیان کلّی اشتراک عمل ممکن نہیں، نہ یہ ممکن ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک اپنی آئندہ نسل کو اطمینان کیساتھ دوسرے کے حوالہ کر دے اور اسے اختیار دے دے کہ ان کچی لکڑیوں کو جس صورت کا چاہے بنائے۔ ایسا ہی حال زندگی کے دوسرے اہم مسائل کا بھی ہے۔ خوشحالی ہم بھی چاہتے ہیں، مگر ہمارے اور ان کے معاشی اصول، مناہج، مسائل بالکل یکساں نہیں ہیں۔ اصلاح معاشرت کے ہم بھی خواہاں ہیں۔ مگر اصلاح کے مفہوم و معیار اور معاشرت کے اصول و قوانین میں ہم اور وہ بالکل متفق نہیں ہیں۔ تمدنی ترقی ہمیں بھی مطلوب ہے، مگر تمدن کے قالب میں جو

روح قائم کرتی ہے اور جو روح اس کی ترقی کا راستہ معین کرتی ہے وہ ہمارے اور ان کے درمیان بالکل ایک نہیں ہے۔ پنڈت جواہر لال اور ان کی طرح کے سطح بین لوگوں کے لئے یہ کہدینا آسان ہے کہ اس سائنٹفک تمدن کے دور میں ریل، ہوائی جہاز، ریڈیو اور کثیر پیداآوری (MASS - PRO-DUCTION) نے قوموں کے حدود امتیاز کو توڑ دیا ہے اور اب قومی تمدنوں کا زمانہ ختم ہو گیا مگر ہم جانتے ہیں کہ اس وقت جو تمدن پھیل رہا ہے اس کی یہ خاص صورت مغربی تہذیب نے بنائی ہے اور اس تہذیب کو دنیا پر چھا جانے کا موقع اسلئے مل گیا ہے کہ وہ سائنس کے طاقتور وسائل سے کام لے رہی ہے یہی وسائل ہماری تہذیب کے ہاتھ آجائیں تو وہ اس سے زیادہ صالح اور زیادہ درخشاں تمدن پیدا کریگی اور وہ بھی اسی طرح قوموں کی حدود امتیاز کو توڑ کر دنیا کے کونوں تک پھیلتا چلا جائیگا۔ لہٰذا پنڈت جی جیسے حضرات کی زبان سے بس یہ خبر سن کر کہ اب قومی تمدنوں کا زمانہ لد گیا ہے، ہم ہتھیار ڈال دینگے اور نہ اس بات کیلئے راضی ہونگے کہ جو تمدن پھیل رہا ہے اسی میں اپنے آپ کو گم کر دیں ــــــ خلاصہ یہ کہ ہماری اور انکی راہیں متوازی (PARELLEL) تو چل سکتی ہیں، اور کہیں کہیں مل بھی سکتی ہیں لیکن از اول تا آخر ایک ہو جائیں یہ کسی طرح ممکن نہیں۔

جب صورت حال یہ ہے تو نہیں اور انکو ملا کر ایک ایسا نظام حکومت کیونکر بنایا جا سکتا ہے جس میں جمہوریت کا قاعدہ نافذ ہو، ہم اس بات پر کیسے راضی ہو سکتے ہیں کہ زندگی کے کسی معاملہ کا جو فیصلہ چار ہندو کر دیں اسے ایک مسلمان بھی مان لے، اور صرف اسلئے مان لے کہ یہ ایک ہے اور وہ چار ہیں خصوصاً اس زمانہ میں جبکہ حکومت کا دائرہ غیر محدود ہے اور پرانے نظریہ ریاست نے جتنے حرم بنائے تھے ان سب کو توڑ کر شخصی زندگی تک میں گھس گیا ہے، ہم اس اصول کو کس طرح مان سکتے ہیں؟ اس کو مان لینے کے بعد تولامحالہ دو ہی صورتیں پیش آسکتی ہیں:-

(۱) اگر ہم حکومت میں عملاً حصہ دار بننا چاہیں تو اپنے امتیازی وجود کو خود مٹا دیں۔

(۲) اور اگر اپنے امتیازی وجود کو قائم رکھنا چاہیں تو حکومت سے علانیہ دست کش ہو جائیں۔

یہ ممکن ہے کہ اکثریت فیاضی سے کام لیکر ہمیں ان دونوں مشکلوں سے بچالے، لیکن یہ تو اسکے رحم و کرم کی بات ہے اور کوئی قوم ہمیشہ ہمیشہ کیلئے کسی دوسری قوم کے رحم و کرم پر نہ زندہ رہی ہے نہ رہ سکتی ہے۔ یہاں سوال فیاضی کا نہیں ہے بلکہ اس امر کا ہے کہ اس قسم کے جمہوری نظام کی فطرت کیا ہے۔ ایسا جمہوری نظام جب ایک چھوٹی اور ایک بڑی قوم کو ملا کر بنایا جائیگا تو لامحالہ چھوٹی قوم کو بڑی قوم کا محکوم بنا دیگا۔ اس میں بڑی قوم کو خود اختیاری ملے گی اور چھوٹی قوم کو بے اختیاری۔ اس میں عمومی حاکمیت کا جمہوری نظریہ قطعی باطل ہو جائیگا۔ بڑی قوم کو بہرحال حاکمیت حاصل ہوگی چاہے وہ اپنی جداگانہ قومیت پر اصرار کرے یا نہ کرے مگر چھوٹی قوم حاکمیت میں حصہ دار نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اپنی قومیت سے دست بردار نہ ہو جائے۔ بڑی قوم اپنے تمام اصولوں پر قائم رہ سکتی ہے اور ان کو نہ صرف اپنے اوپر بلکہ دوسروں پر بھی نافذ کر سکتی ہے مگر چھوٹی قوم کیلئے رفتہ رفتہ اپنے تمام اصولوں کو قربان کر دینا لازم آجاتا ہے۔ وہ دوسروں پر نافذ کرنا تو درکنار خود اپنے اوپر بھی انکو نافذ نہیں کر سکتی۔ اسکو اپنے اصول تہذیب پر قائم رہ کر ترقی کرنے بلکہ زندہ رہنے کا بھی موقع نہیں ملسکتا۔ اسکے اپنے ہاتھ میں کوئی ایسی طاقت نہیں آتی جس سے وہ اپنی خودی کو آپ برقرار رکھ سکے۔ اسکی خودی دوسروں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے کہ چاہیں اسے برقرار رہنے دیں یا اپنی خودی میں جذب کرلیں۔ کیا اسکا نام آزادی ہے؟ کیا اسے جمہوریت کہتے ہیں؟ کیا یہ عمومی حاکمیت ہے؟ کیا اسکے لیے ہم لڑیں اور جانفشانی دکھائیں؟ ہمیں آزادی کیلئے لڑنے سے انکار نہیں، مگر ہم یہ پوچھتے ہیں کہ اس نوعیت کے نظام میں ہمارے لئے آزادی ہے کہاں؟ ہم جمہوریت کے مخالف نہیں، مگر ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جس عمومی حاکمیت کو جمہوریت کہتے ہیں اسکے اندر ہمارا حصہ کہاں ہے؟ ہم اپنی ہمسایہ قوم کیساتھ اشتراک عمل کرنے سے انکار نہیں کرتے مگر سوال یہ ہے کہ اشتراک عمل کی صورت کیا ہے؟ اسکی بنیاد کیا ہے؟ مشترک زندگی کیلئے تو اشتراک عمل کرنے سے ہمیں انکار نہیں۔ مگر یہاں ہم سے کہا جاتا ہے کہ اپنی تہذیب چھوڑنے کے کام میں گورکنوں کے ساتھ اشتراک عمل کرو۔ ہمارا جھگڑا اس پر ہے کہ اشتراک عمل کی

کونسی بنیاد ہے؟ ہم نے یہ تو کبھی نہیں کہا کہ ہم اپنی ہمسایہ قوم سے ملنا نہیں چاہتے یا لڑکر گذر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ملنے کی صورت کیا ہے۔ ہم اسکے ساتھ اس صورت سے ملکر چلنے کیلئے راضی ہیں کہ ہم بھی زندہ رہیں اور وہ بھی۔ مگر وہاں قومی استعلاء و استکبار (NATIONAL INPERIALISM) کا کھبوت سوار ہے اور مردم خوری کا چسکا لگ گیا ہے۔ کیا ہمیں اس بھوت سے ملنے کیلئے کہا جا رہا ہے؟ کیا اس سے بھی صلح اور دوستی ہو سکتی ہے؟

یہ باتیں ہیں جن پر ہمارے اُن بھائیوں کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے جو ہمارے خیالات کو سُنتے ہی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور چیخنا شروع کر دیتے ہیں کہ تم آزادی کے مخالف ہو اور متحدہ جدوجہد کا دروازہ بند کرتے ہو اور انگریزی امپیریلزم کو تقویت پہنچاتے ہو۔ ہم ان سے عرض کرتے ہیں کہ بات کی پچ کرنیکی ضرورت نہیں۔ یہ معاملہ کسی شخصی جائداد یا کسی پارٹی کے گرنے اور اُٹھنے کا نہیں ہے، بلکہ اس قوم کی زندگی کا ہے جس کی فلاح و بہبود کیلئے ہم اور آپ سب خدا کے سامنے جوابدہ ہیں۔ ضد اور ہٹ دھرمی شاید دنیا میں بات بنادے مگر آخرت میں تو نہ بنا سکیگی۔ لہذا اطائل بلند آہنگی اور بے اصل سخن پروری کو چھوڑ دیجئے اور ایمانی احتساب نفس کیساتھ سوچیئے کہ جو کچھ ان صفحات میں عرض کیا جا رہا ہے وہ حق ہے یا نہیں۔

اگر تسلیم کر لیا جائے کہ فی الواقع سوال ہندوستان میں ملت مسلمہ کی زندگی و موت کا ہے اور اسکو حل کرنیکا یہ وقت ہے اور اسکو آزادی ہند کا مسئلہ حل ہونے تک ٹھا رکھنا موجودہ سیاسی حالات میں صحیح نہیں ہے تو بات آسان ہو جاتی ہے! اسکے بعد صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اس چکی سے مسلمانوں کو نکالنے کی معقول صورت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینا ہمارا فرض ہے اور ہم اس فرض کو کما حقہ ادا کرنیکی کوشش کرینگے۔

سب سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا چاہئے کہ ہم چاہتے کیا ہیں۔ پھر یہ معلوم کرنیکی ضرورت ہو گی کہ اس مقصد تک پہنچنے کا صحیح راستہ کونسا ہے۔

۱- ہمارے پچھلے بیان سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ واحد قومیت کا مفروضہ اور اس پر جمہوریت کی تعمیر ہی دراصل خرابی کی جڑ اور ہر بس کی گانٹھ ہے۔ اب تک ہماری سیاسی پالیسی یہ رہی ہے کہ وطنی قومیت کے اصول کو ہم نے جوں کا

نوں بننے دیا۔ ان جمہوری ادارات کو بھی قبول کر لیا جو اس غلط قاعدے پر بنائے جاتے ہیں ! اور اپنا تمام زور صرف اس بات پر صرف کیا کہ اس بد اصول دستور کے اندر کسی طرح اپنے تحفظ کا سامان کریں۔ یہ بنیادی غلطی تھی اور اب اسکے تلخ نتائج واضح طور پر ہمارے سامنے آگئے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ ہم نئے سرے سے اس پوری سیاست پر نظرثانی کریں۔ ہمیں جان لینا چاہئے کہ جس دستور حکومت کی بنیاد ان اصولوں پر ہو اس میں کسی قلیل التعداد قوم کا تحفظ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ جداگانہ انتخاب، پاسنگ (WEIGHTAGE) نمائندوں کی نشستوں کا تعین، عہدوں اور مناصب میں حصہ کی تخصیص، یہ سب قطعی بیکار ہیں جبکہ قلیل و کثیر کو ایک مجموعہ فرض کر کے کثیر کی رائے کو قوت نافذہ عطا کر دی جائے۔ خرابی کی اس جڑ کو پا لینے کے بعد ہمیں شاخوں کو چھوڑ کر اس پر وار اور اسی کے استیصال پر صرف کرنا چاہئے۔ ہماری قومی سیاست کا اولین نصب العین اب یہ ہونا چاہئے کہ اس واحد قومیت کے مفروضہ کی دھجیاں بکھیر دیں اور اپنی مستقل قومیت تسلیم کرائے بغیر ایک قدم آگے نہ چلنے دیں۔

۲۔ واحد قومیت کا مفروضہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی جمہوریت کا وہ غلط نظریہ بھی آپ سے آپ پاش پاش ہو جاتا ہے جس پر ہندوستان کے موجودہ دستور کی ساخت کی گئی ہے اور جس کو انہی خطوط پر آگے بڑھانے کے لئے کانگریس اور ہندو مہاسبھا کوشش کر رہی ہیں۔ اگر ہندوستان ایک قوم کا نہیں بلکہ کم از کم دو یا اس سے زائد قوموں کا ملک ہے تو یہاں خالص جمہوریت کے وہ اصول ہرگز نہیں چل سکتے جو صرف ایک قوم کے لئے موزوں ہیں۔۔۔ دو الگ قوموں کی ایک ڈیموکریسی اصولاً غلط ہے، عین اصول جمہوریت کی نفی ہے عملاً دنیا کے کسی ملک میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔ اور یہ قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ ایسی جمہوریت دراصل ایک قوم پر دوسری قوم کی قیصریت مسلط کرنے کا مجرب نسخہ ہے۔ ہم اس کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں کہ اس نسخہ کو یہاں ہم پر آزمایا جائے۔

۳۔ دو یا زائد قوموں کے ملک میں عمومی حاکمیت کی تفسیر بھی قطعاً غلط ہے کہ ہر باشندۂ ملک کو محض باشندۂ ملک ہونے کی حیثیت سے حاکمیت حاصل ہو۔ محض ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے دولت مشترکہ میں حصہ دار ہونا اور حاکمیت سے متمتع ہونا ہمارے لئے بالکل بے معنی اور بے کار ہوگا۔

ہماری ہندوستانیت ہماری مسلمانیت سے نہ تو منفک ہوسکتی ہے اور نہ ان دونوں کو الگ الگ خانوں میں تقسیم
کیا جاسکتا ہے مسلمان کسی حال اور کسی حیثیت میں بھی غیر مسلم نہیں ہے۔ وہ اپنے بچے کا باپ،
اپنی بیوی کا شوہر، اپنے باپ کا بیٹا اور اپنے بھائی کا بھائی بھی مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہے، اور اسلام
ہی کا قانون اسے بتاتا ہے کہ ان سب کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہئے۔ وہ اپنے اہل محلہ
کا ہمسایہ، اپنے شہر والوں کا رفیق، اپنے وطن والوں کا معاون، اور اپنے بنی نوع کا بھائی بھی مسلمان ہونے
کی حیثیت ہی سے ہے، اور اسلام ہی اسے ہمسایگی، رفاقت، تعاون اور برادری کے
اصول و حدود بتاتا ہے۔ انسانی تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت، اور نظم اجتماعی کے
جملہ معاملات میں وہ جیسا اور جس قدر حصہ لے گا، مسلمان ہی کی حیثیت سے لے گا اس لئے
کہ اس کے عین مسلمان ہونے ہی کا اقتضا یہ ہے کہ ان سب معاملات میں وہ اسلام کا نقطۂ نظر
اختیار کرے اور اسلام کے اصولوں پر چلے۔ اس سے یہ کہنا کہ تو ہندوستان کی اجتماعی زندگی
میں اپنی مسلمان ہونے کی حیثیت کو الگ کر کے ہی حصہ لے سکتا ہے، در اصل اس سے
یہ کہنا ہے کہ تو ہندوستان میں مسلمان بن کر نہیں رہ سکتا۔ دوسری قوموں کے متعلق تو ہمیں کچھ
کہنے کا منصب نہیں، مگر مسلمانوں کے متعلق ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے لئے یہ
پوزیشن کسی طرح قابل قبول نہیں ہے۔ علاوہ بریں اگر عمومی حاکمیت کی تفسیر یہ کی جائے کہ
ملک کی حکومت میں ہمارا حصہ صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ہے تو اس کے دوسرے
معنی یہ ہیں کہ ہماری زندگی دو الگ الگ خانوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ ایک خانہ ہندستانیت*
کا ہے جس میں ہم حکومت کی طاقت اور اس کے اختیارات سے محروم ہیں۔ بالفرض یہ تقسیم
صحیح بھی ہو تو سوال یہ ہے کہ اپنی زندگی کے اس دوسرے خانے کو درست کرنے اور درست رکھنے
کے لئے جن وسائل و ذرائع، جن اختیارات و اقتدارات کی ہمیں ضرورت ہے وہ ہم کہاں سے

* [illegible]

لائیں گے۔ وطنی حکومت میں سے تو یہ چیزیں ہم کو مل نہیں سکتیں کیونکہ اس میں ہمارا حصہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں ہے۔ کہیں باہر سے بھی ہم اسے نہیں لا سکتے۔ اور خود اپنے اندر سے بھی اسے پیدا نہیں کر سکتے کیونکہ ان دونوں صورتوں میں وطنی حکومت سے تصادم ہوتا ہے۔ پس لامحالہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کو آزادی وطن کے بعد بھی آزادی میسر نہ ہو، اور ہماری تہذیب کا نظام جس طرح انگریزی کی غلامی میں زندگی کے اسباب اور ترقی کے وسائل نہ پانے کے سبب سے مضمحل ہو رہا ہے اسی طرح آزادی ہند کے دور میں بھی مضمحل ہوتا چلا جائے ــــ کوئی شخص جو دستوری مسائل کا ذرہ برابر بھی فہم رکھتا ہو، اس نتیجہ کا انکار نہیں کر سکتا، اور کوئی شخص جس کے دل میں اسلام کی ذرہ برابر بھی وقعت اور مسلمان رہنے کی کچھ بھی خواہش موجود ہو، اس نتیجہ کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ہمارے لئے اس امر پر اصرار کرنا قطعاً ناگزیر ہے کہ آزاد ہندوستان کے جمہوری نظام میں ہمارا حصہ مسلم ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ہونا چاہیے نہ کہ محض ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے۔

یہ تین اہم ترین نکات ہیں جنہیں آئندہ کے لئے مسلمانوں کی قومی پالیسی اور ان کے سیاسی نصب العین کا سنگ بنیاد قرار دینا چاہیے ــــ ان میں یک سرمو بھی کسی ترمیم کی گنجائش نہیں ہے، اس لئے کہ ان نکات سے ہٹنا در اصل موت کے گڑھے میں جانا ہے ــــ اب یہ ظاہر بات ہے کہ برٹش گورنمنٹ کا بنایا ہوا دستور حکومت اور کانگریس اور مہا سبھا دونوں کا نصب العین ہمارے ان نکات سے اصولاً متصادم ہوتا ہے اور ہمارے لئے لازم ہو جاتا ہے کہ اسکو بالکلیہ رد کر دیں لیکن محض رد کر دینا کافی نہیں ہے۔ یہ محض سلبی چیز ہے جس پر کسی عمارت کی تاسیس نہیں ہوتی۔ ہمیں ایجابی طور پر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتانا چاہیے کہ ہمارے نکات کی بنیاد پر کونسا دستور حکومت بنایا جا سکتا ہے جو ممکن العمل بھی ہو، ملک کی دوسری قوموں کیلئے قابل قبول بھی ہو اور جس میں ہمارے قومی حوصلے بھی ٹھیک ٹھیک پورے ہو سکتے ہوں۔

اس سلسلہ میں ہمارے سامنے مستقبل ہند کی تعمیر کے لئے تین خاکے آتے ہیں جنہیں ہم

الگ الگ پیش کریں گے۔

پہلا خاکہ

دو یا زائد قوموں کے ملک میں ایک جمہوری ریاست بنانے کی صحیح اور منصفانہ صورت یہ ہے:۔

اولاً وہ بین الاقوامی وفاق (INTERNATIONAL FEDERATION) کے اصول پر مبنی ہو، یا دوسرے الفاظ میں وہ ایک قوم کی ریاست نہیں بلکہ متوافق قوموں کی ایک ریاست (A STATE OF FEDERATED NATIONS) ہو۔

ثانیاً اس وفاق میں شریک ہونے والی ہر قوم کو تہذیبی خود اختیاری (CULTURAL AUTONOMY) حاصل ہو۔ یعنی ہر قوم اپنے مخصوص دائرۂ زندگی میں اپنے گھر کی تنظیم و اصلاح کے لئے حکومت کے اختیارات استعمال کر سکے۔

ثالثاً مشترک وطنی معاملات کے لئے اس کا نظام عمل مساویانہ حصہ داری (EQUAL PARTNERSHIP) پر تعمیر کیا جائے۔

ہندوستان کے حالات کو سیاسی نقطۂ نظر سے سمجھنے اور حل کرنے کی جن لوگوں نے کوشش کی ہے انہوں نے یہ بات تو تسلیم کر لی ہے کہ اس ملک کیلئے وحدانی (UNITARY) طرز کی حکومت موزوں نہیں ہے بلکہ یہاں ایک سٹیٹ اگر بن سکتا ہے تو وہ صرف وفاقی اصول پر بن سکتا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ وہ حالات کے صرف ایک پہلو کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں، دوسرا پہلو انکی نگاہوں سے اوجھل رہ گیا ہے ۔ انہوں نے صرف اس حد تک واقعات کو دیکھا اور سمجھا کہ یہاں دیسی ریاستیں اور برٹش انڈیا کے صوبے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور خود صوبوں کی زبان، روایات، معاشرت اور عمرانی مسائل میں کافی تفاوت ہے۔ اسلئے وہ صرف اس نتیجہ تک پہنچ سکے کہ ان سب کو ایک مرکزی اقتدار کا بالکلیہ تابع بنا دینا درست نہیں ہے بلکہ انکی اندرونی خودمختاری کو برقرار رکھ کر انکے درمیان وفاقی تعلق قائم کرنا چاہئے۔ لیکن واقعات کے اس پہلو پر انکی نگاہ نہیں پہنچی کہ یہاں ریاستوں

اور صوبوں کی طرح، قوموں کے درمیان بھی اصول تہذیب طرز زندگی روایات قومی اور ضروریات اجتماعی میں کافی تفاوت ہے۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے انہوں نے مختلف قوموں کو ایک وحدانی طرز کی حکومت میں پابند کر کے رکھ دیا۔ درانحالیکہ جو وجوہ ریاستوں کے معاملہ میں وفاقی اصول اختیار کرنے کے مقتضی ہوئے تھے، ان سے زیادہ قوی وجوہ قوموں کے معاملہ میں وفاقی اصول اختیار کرنے کے مقتضی ہیں۔

وفاق کی روح کیا ہے؟ مختصراً اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ جو جماعتیں کچھ ایسے مشترک اغراض و مفاد رکھتی ہوں کہ ایک دوسرے سے علیحدہ زندگی بسر کرنا ان کے لئے ممکن نہ ہو، اور اس کیساتھ انکے کچھ مخصوص حالات بھی ہوں جن کی بنا پر وہ بالکل ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا بھی گوارا نہ کر سکتی ہوں، وہ آپس میں ملکر اس طرح کی ایک مصالحت (COMPROMISE) کر لیتی ہیں کہ اپنے مخصوص معاملات میں انکی خود مختاری بھی برقرار رہے اور مشترک معاملات میں اشتراک عمل بھی ہو سکے۔ اس قسم کے وفاق میں مرکز اور وفاقی اجزا کے درمیان حاکمیت منقسم ہو جاتی ہے۔ مرکز اور ہر ایک وفاقی جزو اپنے اپنے دائرۂ عمل میں مختار ہوتا ہے۔ نہ ایک کو دوسرے کے دائرے میں گھس آنیکا اختیار ہوتا ہے اور نہ آئینی حیثیت سے کسی ایک کو یہ اقتدار حاصل ہوتا ہے کہ دوسرے کو مٹا دے۔ اسطرح کی مصالحت یہ موقع بہم پہنچا دیتی ہے کہ مختلف النوع جماعتیں مشترک اغراض و مصالح رکھنے والی جماعتیں ملکر ایک اسٹیٹ بنا سکیں۔

وفاق کی اس روح کو سمجھ لینے کے بعد کسی سیاسی فہم و بصیرت رکھنے والے شخص کیلئے اس حقیقت کا ادراک کر لینا مشکل نہیں ہے کہ اس نوعیت کا وفاق جسطرح ریاستوں (یعنی الگ الگ جغرافی خطے رکھنے والی جماعتوں) کے درمیان ہو سکتا ہے، اسطرح قوموں یعنی ایک ہی جغرافی خطہ میں رہنے والی مختلف المذہب یا مختلف التمدن جماعتوں کے درمیان بھی ہو سکتا ہے۔ البتہ اصول وفاق کا انطباق (APPLICATION) دونوں صورتوں میں مختلف طرز پر ہوگا۔ متوافق ریاستوں اور مرکز کے درمیان اختیارات کی تقسیم جس طریقہ پر کیجاتی ہے متوافق قوموں کے درمیان وہ اس سے مختلف طریقہ پر ہوگی۔ پہلی چیز کو ہندوستان میں صوبائی خود اختیاری سے تعبیر کیا گیا ہے، دوسری چیز کو ہم تہذیبی خود اختیاری (CULTURAL AUTONOMY) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے بنیادی اصول حسب ذیل ہونے چاہئیں:

(۱) وفاقی اسٹیٹ بنانیوالی ہر قوم صاحبِ حاکمیت قوم (SOVEREIGN NATION) ہو، یعنی وہ اپنے دائرہ عمل میں خود حکومت کے اختیارات استعمال کرے۔

(۲) تعلیم، مذہبی معاملات (مثلاً عبادت گاہوں اور اوقاف کا نظم ونسق اور مذہبی احکام کو اپنے افرادِ قوم پر نافذ کرنا اور ان احکام کے خلاف انکی سرکشی کو روکنا) اور مخصوص تمدنی ومعاشرتی مسائل (مثلاً نکاح، طلاق، وراثت اور قومی طرزِ معاشرت (NATIONAL SOCIAL SYSTEM) میں ہر قوم کو پوری حکومت خود اختیاری حاصل ہو اور مرکز کو اس میں دخل دینے کا حق نہ ہو۔

(۳) ان اغراض کیلئے ہر قوم کی الگ الگ ضلع وار اور صوبہ وار کونسلیں ہوں اور ان پر ایک سپریم کونسل ہو، مذکورۂ بالا معاملات انہی کونسلوں میں پیش ہوں اور وہیں سے انکے لئے قوانین منظور کئے جائیں۔ ان قوانین کا مرتبہ عام ملکی قوانین کے مرتبہ سے کسیطرح کم نہو۔ انکو نافذ کرنیکے لئے ایک مستقل ہیئت انتظامیہ (EXECUTIVE) ہو اور وہ قومی کونسل کے سامنے جوابدہ ہو۔ مصارفِ نظم ونسق کیلئے ٹیکس عائد کرنے اور وصول کرنیکے پورے اختیارات اس قومی نظام کو حاصل ہوں۔ اور ملکی خزانہ میں سے ایک مخصوص حصہ ہر قوم کیلئے مقرر کردیا جائے جسطرح وفاقی ریاستوں اور وفاقی مرکز کے درمیان مالیات کی تقسیم ہوا کرتی ہے۔

(۴) متوافق قوموں کے درمیان، یا کسی وفاقی جز اور مرکز کے درمیان جو آئینی اختلافات پیدا ہوں اُن کا تصفیہ وفاقی عدالت (FEDERAL COURT) کرے۔

(۵) اپنے مخصوص قوانین کے مطابق فصلِ خصومات کرنیکے لئے ہر قوم کا مستقل عدالتی نظام بھی ہو جسے عام ملکی عدالتوں کی طرح پورے عدالتی اختیارات حاصل ہوں۔

اس مرحلہ پر تہذیبی خود اختیاری کے صرف اصول بیان کئے جاسکتے ہیں۔ اگر ان پر اتفاق ہوجائے تو انکا تفصیلی نقشہ ایک بین الاقوامی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس یا آئین ساز مجلس (CONSTITUENT ASSEMBLY) میں بنایا جاسکتا ہے[1]

(۱؎ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

اس کے بعد مرکزی حکومت کا سوال سامنے آتا ہے۔ مرکزی حکومت سے یہاں ہماری مراد ریاستوں کے وفاق کا مرکز نہیں ہے بلکہ قوموں کے وفاق کا مرکز ہے، یعنی وہ نظام حکومت جسے متوافق قومیں اپنی مشترک اغراض کیلئے بنائیں۔ اس معنی میں صوبوں اور ریاستوں کی حکومت بھی اسیطرح مرکزی ہے جسطرح وفاقی مرکز (FEDERAL CENTRE)

یہ مشترک نظام حکومت لامحالہ "مساویانہ حصہ داری" کے اصول پر مبنی ہونا چاہیئے اسلئے کہ یہ صاحب حاکمیت قوموں کا وفاق ہے نہ کہ ایک قوم کا وحدانی نظام حکومت۔ یہاں پوری احتیاط کیساتھ اس امر کا انتظام کرنا پڑیگا کہ اصول جمہوریت کے لحاظ سے ایک وفاقی جزر کو جو حاکمیت حاصل ہے، دوسرا وفاقی جزر اسے سلب نہ کرلے۔ تہذیبی خود اختیاری کی طرح اس کا بھی ایک ڈھانچہ بناکر ہم یہاں پیش کرتے ہیں جس کی تفصیلی صورت بعد میں ایک آئین ساز مجلس بنا سکتی ہے۔

(۱) اسٹیٹ کے تشریعی، انتظامی، عدلی اور دفاعی چاروں شعبوں میں ہر قوم کا حصہ[له] (حاشیہ اگلے صفحہ پر) اس کی آبادی کے تناسب سے مقرر کردیا جائے جو تناسب کے تغیرات کے ساتھ ساتھ متغیر ہوسکتا ہو۔ پاسنگ (WEIGHTAGE) کا طریقہ بالکل اڑا دیا جائے۔

(۲) موجودہ طریق انتخاب کو بھی بالکل بدلدیا جائے۔ چھوٹے چھوٹے حلقہائے انتخاب بنانیکے بجائے ایک ریاست کے پورے حدود ارضی کو ایک حلقۂ انتخاب قرار دیا جائے جس میں ایک ایک نشست کیلئے الگ الگ امیدوار کھڑے نہ ہوں بلکہ تسلیم شدہ سیاسی جماعتیں (RECOGNISED POLITICAL PARTIES) اپنے اپنے امیدواروں کی فہرستیں پیش کریں اور انکو کامیاب کرنیکے لئے جد وجہد کریں۔ اس صورت میں (اور یاد رکھئے کہ صرف اسی صورت میں) جداگانہ انتخاب کے طریقہ کو موقوف کردینا چاہیئے، اس لئے کہ پھر بند قلعوں میں رہنا ہر قوم کے لئے

(حاشیہ له) بعض جہلا اس موقع پر فوراً بول اٹھتے ہیں کہ اسلام میں زانی اور سارق اور قاذف کیلئے جو حدیں مقرر ہیں، یا ہندو شاستر میں جو مخصوص قوانین ہیں کیا انکو جوں کا توں نافذ کیا جائیگا؟ یہ سوال سراسر ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں بین الاقوامی تعلقات کا تناسب قائم کرنے کیلئے ہم صرف ان قوانین کے نفاذ پر زور دینگے جو عام ملکی قوانین سے متصادم نہ ہوتے ہوں۔ اسکے بعد ہر قوم اپنی تہذیب کے اصولوں کا مظاہرہ کرکے اور انکے حق میں علمی و عقلی دلائل پیش کرکے رائے عام کو ہموار کرنیکی کوشش کرتی رہیگی اور جسکی تہذیب کے اصول زیادہ طاقتور ہونگے وہ عام ملکی قوانین کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوجائیگی

مضر ہوگا۔ جداگانہ طریق انتخاب کی ضرورت صرف اسیوقت تک ہے جبتک کہ یہاں انگلستان کی بوسیدہ ڈیمو کریسی کے نمونہ پر چھوٹے چھوٹے یک نشستی حلقہ ہائے انتخاب بنائے جاتے ہیں۔ یورپ کی جدید جمہوریتوں میں متناسب نمائندگی (PROPORTIONAL REPRESENTATION) کے جو تجربات کئے گئے ہیں، اگر ان سے استفادہ کرکے ایک زیادہ صحیح جمہوری طریق انتخاب اختیار کر لیا جائے تو پھر جداگانہ انتخاب کو آزاد بنا ہوگا تاکہ اولاً آبادی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی نمائندگی سے محروم نہ رہ سکے، ثانیاً مقابلہ اشخاص کا اشخاص سے نہ ہو بلکہ پارٹیوں کے اصول اور پروگرام ایک دوسرے کے مقابلہ میں آئیں، اور ثالثاً ہر پارٹی اپنا اصول اور پروگرام لے کر سب قوموں کے پاس جا سکے۔ بہت ممکن ہے کہ ابتداءً ہم اپنے نظم کی کمزوری کے باعث کسی زیادہ منظم جماعت کے مقابلہ میں شکست کھا جائیں، لیکن تہذیبی خود اختیاری کے بعد یہ شکست ہمارے لئے کچھ زیادہ مضر نہ ہوگی اور مزید براں کھلے مقابلہ ہی میں زور آزمائی کرنے سے ہم سیاسی تنظیم کا سبق سیکھ سکیں گے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ مقابلۃً آزادانہ اور مساویانہ ہو۔ اس کے بعد اگر ہم اپنے نظم کی کمزوری یا اپنے اصول اور پروگرام کی کمزوری کے باعث شکست کھائیں گے تو اس شکست کے مستحق ہوں گے

(۴) جمہوریت کو مؤثر بنانے کے لئے استصواب عام (REFERENDUM) کا طریقہ اختیار کیا جائے نیز رائے دہندوں کو یہ حق بھی دیا جائے کہ جن نمائندوں پر ان کو اعتماد نہ رہا ہو انکو واپس بلا لیں۔ یہ بھی انگلستان کی دقیانوسی جمہوریت کا سراسر غیر جمہوری طریقہ ہے کہ نمائندوں کو منتخب کرنے کے بعد رائے دہندے ایک معین

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) لہ خود غرض لوگ یہاں یہ اعتراض پیدا کر دیتے ہیں کہ اس طرح حصے مقرر کرنے سے مناصب حکومت کی اہلیت (EFFICIENCY) متاثر ہو جاتی ہے۔ مگر یہ محض ایک فریب ہے اور اسکا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں کہ جو حق سے زیادہ جو لوگ لے چکے ہیں۔ وہ اسکو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ ورنہ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ کسی قوم میں اہل آدمیوں کی اتنی کمی نہیں ہے کہ وہ نظام حکومت کو چلانے کیلئے اپنے تناسب آبادی کے مطابق کام کے آدمی نہ دے سکتی ہو۔ حصہ کے سوال کو یہ معنی پہنانا کہ ہم اہلیت کے بجائے محض قومیت کو مدار انتخاب قرار دینا چاہتے ہیں ایک ذلیل قسم کی چالاکی ہے۔

مدت تک اپنے ہاتھ کٹوا بیٹھتے ہیں تردسو کے بقول انگریز صرف اُس وقت آزاد ہوتے ہیں جب وہ پارلیمنٹ کے ارکان کا انتخاب کرتے ہیں اور جب وہ انہیں منتخب کر لیتے ہیں تو پھر اپنے ہی منتخب کردہ نمائندوں کے غلام بن جاتے ہیں۔

(۴) استصواب عام کیساتھ یہ اصول مقرر کردیا جائے کہ جس چیز کی مخالفت ایک قوم کے ووٹر بالاتفاق یا عظیم اکثریت کے ساتھ کریں وہ مجلس قانون سازی میں پاس نہ ہوسکے، کیونکہ یہ مخالفت اس بات کی دلیل ہوگی کہ جمہوری نظام کے حصہ داروں میں سے ایک حصہ دار اسکو اپنے لئے مضر پاتا ہے اور دوسرا حصہ دار صرف اس لئے اس کا مؤید ہے کہ وہ اس کے لئے مفید ہے۔ اس قسم کے کسی قانون یا ریزولیوشن کا پاس ہونا عین اصولِ جمہوریت کی نفی ہوگا۔

(۵) استصواب عام کے لئے یہ اصول بھی مقرر کرنا پڑیگا کہ اگر کسی قوم کے ووٹروں کی کم از کم استقدر فی صدی تعداد استصواب کا مطالبہ کرے تو اس کا انعقاد ضروری ہوگا۔

(۶) دستور کی ترمیم پر بھی سخت پابندیاں عائد کرنی ہونگی جن کے لئے امریکہ، سوئٹزرلینڈ، آسٹریلیا اور دوسرے جمہوری ممالک کے دساتیر سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا خاکہ

اگر بین الاقوامی وفاق کی یہ صورت قبول نہ کی جائے تو دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ مختلف قوموں کے لئے الگ الگ حدود ارضی مقرر کردیئے جائیں جہاں وہ اپنے جمہوری اسٹیٹ بنا سکیں۔ پچیس سال یا اس سے کچھ کم وبیش مدت تبادلۂ آبادی کے لئے مقرر کردی جائے۔ ہر اسٹیٹ کو زیادہ سے زیادہ اندرونی خودمختاری دی جائے، اور وفاقی مرکز کے اختیارات کم سے کم رکھے جائیں۔ اس صورت میں ہم غیر مسلم ریاستوں کے ساتھ ملکر ایک وفاقی اسٹیٹ بنانے پر نہ صرف راضی ہوجائینگے، بلکہ اس کو ترجیح دینگے۔

میرے دوست ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب نے حال میں ہندوستان کے تہذیبی مستقبل

(CULTURAL FUTURE OF INDIA) پر جو مقالہ حیدر آباد سے شائع کیا ہے وہ ہندوستان کی مختلف قوموں کے درمیان ارضی حدود کی تقسیم کا بہترین نقشہ پیش کرتا ہے۔ یہ ایک منصفانہ تقسیم ہے جس کی رو سے مشرقی بنگال، حیدر آباد، بھوپال، جوناگڈھ، جاورہ، ٹونک، اجمیر، دہلی و اودھ، شمالی و مغربی پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے حلقے مسلمانوں کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ ممکن ہے کہ پچیس سال کی مدت میں ہندوستان کے دوسرے خطوں سے ہجرت کرکے مسلمان ان حلقوں کے اندر سمٹ جائیں اور ہندو قریب کے علاقوں میں چلے جائیں۔ بقیہ ہندوستان میں اگر اچھوت اپنی الگ قومیت بنانا چاہیں تو اُن کے لئے بلحاظ اُن کی آبادی کے مستقل رقبے معین کئے جاسکتے ہیں (بشرطیکہ گاندھی جی خودکشی کی دھمکی دیکر اُن کی آزادیٔ رائے کو پھر نہ سلب فرمالیں) اسیطرح سکھوں کو بھی اُن کی آبادی کے لحاظ سے ایک رقبہ دیا جاسکتا ہے۔

تیسرا خاکہ

اگر یہ صورت بھی منظور نہ ہو تو پھر مجبوراً ہم یہ مطالبہ کریں گے کہ ہماری قومی ریاستیں الگ بنا دی جائیں اور اُن کا علیحدہ وفاق ہو، اسی طرح ہندو ریاستوں کا بھی ایک جداگانہ وفاق ہو، اور پھر ان دو یا زائد وفاقی مملکتوں کے درمیان ایک طرح کا تحالف (CONFEDRACY) ہوجائے جس میں مخصوص اغراض، مثلاً دفاع اور مواصلات (COMMUNICATIONS) اور تجارتی تعلقات کے لئے مقرر شرائط پر تعاون ہوسکے۔

یہ تین خاکے جو ہم نے تجویز کئے ہیں، ان میں سے جس کو بھی قبول کرلیا جائے اس پر ہم مفاہمت کرسکتے ہیں۔ اور اگر کوئی چوتھی یا پانچویں صورت پیش کی جائے تو اس پر بھی غور کرسکتے ہیں۔ مگر ہمارے ہندو ہمسایوں اور اُن کے انگریز سرپرستوں کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ موجودہ کانسٹی ٹیوشن

اور ہر وہ نظام حکومت جو واحد قومیت کی بنا پر جمہوری ادارات قائم کرتا ہو کسی حال میں ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس بنیادی غلطی سے پاک کرکے جو دستور بھی پیش کیا جائے اُس کو اور صرف اسی کو زیرِ غور لایا جاسکتا ہے۔

اپنے قومی نصب العین کی اس تشریح کے بعد ہمارے لئے آخری سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اس کو حاصل کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ یہاں اس سوال کی تفصیلات پر بحث کرنے کا موقع نہیں مختصراً ایک بات میں صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ حالات جس حد تک پہنچ گئے ہیں ان میں ہمارے لئے انقلابی ذرائع اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے قومی رہنماؤں اور سیاسی اداروں نے گذشتہ دس پندرہ سال کی مدت میں انتہا درجہ کی بے بصیرتی اور ناعاقبت اندیشی سے کام لیا ہے، اور اس کے برعکس ہماری ہمسایہ قوم کو اعلیٰ درجہ کے دانشمند اور مدبر رہنما میسر آگئے ہیں۔ اس نامساوی مقابلہ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج ہم اس ملک کے سیاسی ترازو میں بہت بے وزن ہیں اور اُن کا پلڑا بہت جھک چکا ہے۔ اب وہ اپنی کامیابی کی منزل سے بہت قریب ہوچکے ہیں، اور متعدد اسباب سے، جن کی طرف میں پہلے اشارہ کرچکا ہوں، انگریز بھی دالستہ و نادانستہ وہی طریق دستورسازی اختیار کرنے پر اصرار کر رہا ہے جو سراسر اُنہی کے لئے مفید ہے۔ ایسی حالت میں یہ توقع کرنا انتہادرجہ کی خام خیالی ہوگی کہ محض زورِ استدلال یا افہام وتفہیم سے یا آئینی چالوں سے ہم ہندوؤں اور انگریزوں کو انکے وہ اصول اور مقاصد یکسر بدلڈالنے پر آمادہ کرسکینگے جو نہ صرف اُنکے عقیدے میں درست ہیں بلکہ انکی اغراض کیلئے مفید بھی ہیں۔ اب آئینی تدبیروں کیلئے کامیابی کا کوئی موقع باقی نہیں رہا ہے۔ اب کوئی پارٹی اور کوئی اوکانل ہماری لڑائی نہیں جیت سکتا! اب صرف جان و مال کی قربانیوں ہی سے واقعات کی رفتار بدلی جاسکتی ہے۔ جبتک ہم یہ ثابت نہ کردینگے کہ کانسٹی ٹیوشن ہمارے زندہ سروں پر نہیں بلکہ صرف ہماری قبروں ہی پر نافذ کیا جاسکتا ہے،

اور جبتک ہم اپنے عمل سے یہ نہ بتادینگے کہ مسلمان اپنی قومی زندگی کیلئے مرنیکی طاقت رکھتا ہے اُسوقت تک اس کانسٹی ٹیوشن کا ایک شوشہ بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹے گا، اور نہ وہ قومی جمہوری لادینی اسٹیٹ ہم پر مسلط ہونیسے باز رہیگا۔ جس کے لانے پر انگریز، ہندو، اور ہمارے منافقین اور بہت سے صم بکم عمی فہم لا یعقلون مل جل کر کوشش کررہے ہیں۔ مسلمان انتہا درجہ کے نادان ہونگے اگر وہ اب بھی حالات کی نزاکت کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھینگے۔ وہ ابھی تک اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ اُنکو یہ نمائشی جلسے اور جلوس اور کھوکھلے مظاہرے قومی ہلاکت سے بچالینگے۔ وہ اُن لوگوں کی لیڈری پر اعتماد کررہے ہیں جن کے سامنے اپنی وزارت اور وجاہت کے سوا کوئی چیز نہیں جو اپنی قوم کے لئے اپنا بال تک بیکا ہونا گوارا نہیں کرسکتے، جو مسلمانوں کے مفاد کا نام صرف اس لئے بلند آہنگیوں کیساتھ لیتے ہیں کہ ایوانِ وزارت پر ان کا قبضہ ہو، جن کی بزدلی پر دشمنوں تک کو پورا پورا اعتماد ہے جنہیں چیلنج کیا جاتا ہے کہ اگر تم ہمارے ساتھ جیل جانے اور لاٹھیاں کھانے کو تیار ہو تو ہم تمہاری ہر بات ماننے کیلئے تیار ہیں اور وہ اس چیلنج کو قبول کرنے کے بجائے کنی کاٹ جاتے ہیں، جن کا حال یہ ہے کہ یورپ میں سرکارِ برطانیہ کو جنگ کا خطرہ پیش آتا ہے تو یہ سب سے پہلے آگے بڑھ کر اپنی وفادارانہ خدمات پیش کرتے ہیں۔ ایسے لیڈروں سے اگر مسلمان یہ توقع باندھے بیٹھے ہیں کہ یہ اُن کی کشتی کو بھنور سے نکال لینگے تو میں پیشینگوئی کرتا ہوں کہ انکی کشتی ڈوب کر رہیگی۔ یہ تقریروں کا نہیں بلکہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ اگر مسلمان جینا چاہتے ہیں تو اُن کو اور خصوصاً اُن کے نوجوانوں کو اپنا گرم خون زندگی کے لئے بھینٹ چڑھانے پر تیار رہنا چاہئے۔

پوچھا جاتا ہے کہ انقلابی ذرائع سے تمہاری مراد کیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اسکا کیا جواب دوں۔ جبتک کہ قوم کی ایک بڑی تعداد ایک نصب العین پر متحد نہ ہوجائے اور ہر قیمت پر اُسے حاصل کرنے کا عزمِ صمیم اسمیں پیدا نہو جائے، انقلابی ذرائع کی ایک فہرست پیش کردینا کسی یاوہ گوئی کا کام ہوسکتا ہے اور میں یاوہ گوئی سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

تالیف ابوالاعلیٰ مودودی

حصہ اوّل

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے ذیل کے نرخوں پر آپ اسے طلب فرما سکتے ہیں

ایک روپے میں ۵ نسخے — علاوہ محصول ڈاک

نو روپے میں ۵۰ نسخے
پندرہ روپے میں ۱۰۰ نسخے } کرایہ ریل بذمہ خریدار

حصہ دوم

اس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کرکے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اس وقت تک ملک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصول اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ اس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے:-

۲ روپے ۴ آنہ میں ..... ۵ نسخے — محصول ڈاک بذمہ خریدار

۱۱ روپے ۴ آنہ میں ۲۵ نسخے
۲۲ روپے میں ۵۰ نسخے
۴۰ روپے میں ۱۰۰ نسخے } کرایہ ریل بذمہ خریدار

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجیے۔

صرف سرورق پچن پریس نبل روڈ لاہور میں طبع ہوا

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینہ کے آخری ہفتہ میں شائع ہوا کریگا۔ دوسرے مہینہ کے پہلے ہفتہ تک اگر کسی خریدار کو پرچہ نہ پہنچے تو بر وقت اُن کو شکایت کرنی چاہیئے۔

رسالہ کی قیمت میں رعایت ممکن نہیں ہے۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے۔ جو حضرات نمبر درج نہ کریں گے۔ اُن کی شکایات پر کوئی توجہ نہ کی جائے گی۔

جن معاملات کا تعلق دفتر سے ہے اُن میں ایڈیٹر کو مخاطب نہ کیا جائے۔

منیجر

نرخنامہ و قواعدِ اشتہار

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	عنہ ۱۰	عـہ ۲۵	للعہ ۴۵	لتہ ۸۰
نصف صفحہ	ـــہ ۶	عـہ ۱۵	عـہ ۲۵	للعہ ۴۵
ربع صفحہ	للعہ ۴	عنہ ۱۰	معہ ۱۷	عـہ ۲۵

۱۔ کوئی خلافِ شریعت یا خلافِ تہذیب و اخلاق اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

۲۔ اشتہار کی اشاعت سے پہلے اُجرت پیشگی وصول ہونی ضروری ہے۔

۳۔ صرف وہی چربے قبول کیے جائیں گے جو اس رسالہ کے مسطر کے مطابق ہوں

۴۔ نرخنامہ میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی۔

۵۔ ٹائٹل کے صفحات پر کوئی بیرونی اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

Registered No. L. 4186

ذی القعدہ ۱۳۵۷ھ

جلد ۱۳ — عدد ۵

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دار الاسلام (پٹھان کوٹ - پنجاب)

چندہ سالانہ پانچ روپے

قیمت فی پرچہ ۸ آنے

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے :-

۱- اسلامی جہاد کی حقیقت اسمیں بتایا گیاہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے
۲- مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے -
۳- مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں
۴- اشاعت اسلام اور تلوار- دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے -
۵- قوانین جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور اُن میں اسلام کی اصلاحات -
۶- جنگ دوسرے مذاہب میں- جنگ کے متعلق ہندو مذہب بودھ مت یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ-
۷- جنگ اور تہذیب جدید- بین الاقوامی قانون جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ- قیمت مجلد للعہ غیر مجلد للعہ

رسالہ دینیات یہ رسالہ سرکار آصفیہ کے محکمہ تعلیمات نے میٹرک کے طلبہ کو پڑھانے کیلئے لکھوایا ہے - اور علمائے دکن کی ایک مستند مجلس اسکی تالیف میں شریک مشورہ رہی ہے مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے- اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصول شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانہ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں-
طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں وہ بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے

قیمت ۱۰/

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجئے

ضروری اطلاع

ادارۂ دارالاسلام کی مجلس شوریٰ کے فیصلہ کے مطابق
دارہ کا مرکز اور اسکے ساتھ ترجمان القرآن کا دفتر ۵ ذی الحجہ
۵ھ (۲۶ جنوری ۳۹ء) کو بستی جمال پور سے لاہور منتقل ہو جائیگا۔
ہذا تاریخ مذکور کے بعد ادارہ دارالاسلام اور دفتر
رجمان القرآن سے جملہ مراسلت ذیل کے پتہ پر
کی جائے:۔

پونچھ روڈ۔ مبارک پارک۔ لاہور

معاصرین سے بھی گذارش ہے کہ آئندہ اپنے
وقر رسائل و جرائد مذکورہ بالا پتہ پر ارسال
فرمائیں۔

فہرست مضامین

ماہ ذی القعدہ سنہ ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۹ء جلد ۱۳ عدد ۵

باہتمام چودھری نیاز علی خاں صاحب پرنٹر و پبلشر، گیلانی الیکٹرک پریس لاہور
میں طبع ہو کر دار الاسلام نزد پٹھان کوٹ سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

آج کی اشاعت میں پہلے صفحہ پر ناظرین کو یہ اعلان دیکھ کر حیرت ہوگی کہ ادارۂ دارالاسلام کا مرکز اور ترجمان القرآن کا دفتر اس مقام سے (جس کا نام ہی اس نصب العین کی رعایت سے دارالاسلام رکھا گیا تھا) منتقل ہو رہا ہے۔ بلکہ جو حضرات اس اسکیم سے نسبتہً زیادہ گہری دلچسپی لیتے رہے ہیں ان کے لیے تو یہ امر شاید حیرت سے بڑھ کر کچھ پریشانی کا بھی موجب ہو۔ اس لیے مختصراً اس نقل مکان کے وجوہ و اسباب کی طرف اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، ورنہ قابل ترجیح تو یہی تھا کہ یہ معاملہ یونہی خاموشی کے ساتھ گذر جاتا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس ادارہ کے تخیل کو کسی خاص مقام یا سرزمین سے کوئی تعلق نہیں ہے حقیقتہً دارالاسلام تو ہندوستان میں کوئی ایک چپہ بھر زمین بھی نہیں۔ البتہ ہمارا مقصد پورے ہندوستان کو دارالاسلام بنانا ضرور ہے، سو اس مقصد کے لیے اس جزیرہ نما کے ہر خطہ میں ادارۂ دارالاسلام قائم ہو سکتا ہے۔ رہا یہ خاص مقام، تو اس کو میں نے شخصی طور پر، بعض حضرات کی دعوت اور وعدۂ اعانت پر ایک ایسی نمونہ کی بستی کے لیے پسند کیا تھا جہاں دارالاسلام کا نصب العین رکھنے والے ہر حصۂ ملک سے سمٹ کر مجتمع ہو سکیں اور اپنے مقصد کے لیے اجتماعی سعی و جہد کرنے کی قوت و قابلیت بہم پہنچا سکیں۔ اسی خیال کو سامنے رکھ کر میں حیدر آباد سے یہاں ڈیڑھ ہزار میل اپنا گھر بار اٹھا لایا تھا اور اپنے نزدیک یہ سمجھ رہا تھا کہ شائد یہی میرا مستقر بھی ہوگا اور مستودع بھی۔ لیکن جب ادارہ باقاعدہ قائم ہوا اور رفقائے کار مجتمع ہوئے تو تمام حالات کو سامنے رکھ کر بالاتفاق

یہ رائے قائم کی گئی کہ جو مقاصد اور اصول ہمارے پیش نظر ہیں ان کے تتبع میں کام کرنے کا موقع یہاں نہیں مل سکتا۔ خود میرا اپنا دس مہینہ کا تجربہ بھی اسی پر شاہد تھا۔ لہٰذا یہ طے ہوا کہ ادارہ کا مرکز یہاں سے کسی مناسب تر مقام پر منتقل کر دیا جائے، اور اس کے لیے متعدد حیثیات سے لاہور کو پسند کیا گیا۔

جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں ہمیں کسی زمین کی خاک سے کوئی دلچسپی و محبت نہیں ہے۔ محبت اس نصب العین سے ہے کہ اللہ کا کلمہ سب کلموں پر غالب اور اس کا قانون سب قوانین سے بالاتر ہو۔ اس لیے اس مقصود کے پیچھے جہاں جہاں جانے کی ضرورت ہوگی جائیں گے اور جس جس سرزمین کی خاک چھاننی پڑے گی چھانیں گے۔ مقصد اگر عزیز ہے تو اس کے لیے ہر زحمت گوارا ہونی چاہیے، اور زحمت اگر خوفناک ہے تو مقصد کا نام بھی زبان پر نہ آنا چاہیے، خصوصاً دار الاسلام جیسے مقصد عالی کا نام جسے زبان پر لانے کا حق ہی اس وقت تک کسی کو نہیں پہنچتا جب تک کہ اس کے قلب پر لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ کی عزیمت اور اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ کے سودے کی کامل رضامندی ثبت نہ ہو جائے۔

اس نقل مقام سے ادارہ کے دستور العمل اور لائحۂ عمل میں ان شاء اللہ یک سر مو فرق نہ آئے گا۔ البتہ اس لائحہ کا صرف یہ حصہ سردست معرض التویٰ میں رہے گا کہ شہری آبادی سے ہٹ کر ایک علٰحدہ مقام میں دار الاسلامی ماحول پیدا کیا جائے اور وہاں تعلیم و تربیت کے اسباب فراہم کیے جائیں۔ بلاشبہ یہی اس ساری اسکیم کی جان ہے، لیکن جس خدا کے نام پر یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے اس سے کچھ بعید نہیں کہ اس کا بھی سامان کر دے وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

ادارہ کا باقاعدہ قیام اگرچہ حال ہی میں ہوا ہے، لیکن اس کے لیے عملی جد و جہد شروع ہوئے

پورا ایک سال ہو چکا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ایک سال کے واردات و صادرات کا حساب (۵ ذی القعدہ سنہ ۵۷ھ۔ ، جنوری سنہ ۳۹ء تک) پیش کر دیا جائے۔

خرچ		جمع	
۴۵۸—۰—۶	طباعت لٹریچر	۸۹۵—۲—۹	عطایا جو معاونین ادارہ سے وصول ہوئے
۱۵۲—۶—۹	ڈاک خرچ	۲۰۰—۰—۰	عطیہ چودھری نیاز علی خاں صاحب
۴۹—۱۳—۰	اسٹیشنری	۳۵۷—۳—۳	فروختِ کتب
۳۱—۶—۹	متفرق سامان برائے ضروریاتِ ادارہ	۳۱—۵—۰	زکوٰۃ و صدقاتِ واجبہ
۱۸۵—۱۰—۰	تنخواہ ملازمین	۴۶—۱۰—۹	از ابوالاعلیٰ بصورت کرایہ مکان[1]
۲۰۱—۱۲—۳	قرض حسنہ بنام عزیز ہندی صاحب	۴۹—۸—۰	از ابوالاعلیٰ و دیگر ارکانِ ادارہ بابت قیمت غلہ[1]
۱۳—۱۰—۳	مصارف دورۂ عزیز ہندی صاحب	۱۵۷۹—۱۳—۹	
۲—۴—۰	خیرات از مد زکوٰۃ		
۱۰۹۵—۱—۶			

جملہ آمدنی	۱۵۷۹—۱۳—۹
جملہ خرچ	۱۰۹۵—۱—۶
بقایا	۴۸۴—۱۲—۳

اس بقایا میں سے جناب چودھری نیاز علی خاں صاحب کے مطالبہ پر ۲۵۲ روپے ۲ آنے ان کو نقد واپس کر دیے گئے اور اسٹیشنری (جو ۹ جنوری سنہ ۳۹ء کو دفتر ادارہ میں موجود تھی) اور وہ سامان جو ضروریاتِ ادارہ کیلئے خریدا گیا تھا ان کے حوالہ کر دیا گیا۔[2] اس طرح ٹرسٹ کے جمع حساب ذیل باقی

[1] مکان سے مراد مکان موقوفہ ہے۔ اور غلہ سے مراد زمینِ موقوفہ کی پیداوار ہے جو ارکانِ ادارہ نے استعمال کی۔ لہٰذا کرایہ مکان اور قیمت غلہ کی رقوم دراصل چودھری نیاز علی خاں صاحب کے ٹرسٹ کو ادا کی گئی تھیں اور ٹرسٹ کی طرف سے ادارہ کے بیت المال میں داخل ہوئی تھیں۔

[2] نیز جناب خانصاحب شیخ محمد نصیب صاحب بار ایٹ لاء گورداسپور کی طرف سے ان کا عطیہ مبلغ سو روپیہ بھی واپس کر دیا گیا۔

کرنے کے بعد ادارہ کی خزانہ میں صرف ایک سو بتیس روپے باقی ہیں، اور سامان کی صورت میں کچھ موجود نہیں۔

(اس موقع پر مجھے یہ بیان کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ذاتی طور پر میں اور میرا رسالہ ترجمان القرآن کسی شخص یا جماعت کی مالی اعانت کا کبھی شرمندۂ احسان نہیں ہوا۔ میں یہاں اپنے خرچ پر آیا، اپنے خرچ پر رہا اور اپنی شخصی ذمہ داری پر رسالہ چلاتا رہا۔ اس تصریح کی کوئی حاجت نہ تھی اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ بعض حضرات اس باب میں غلط فہمیاں پھیلا رہے ہیں)۔

اس حساب کی رو سے ہم ایک سو بتیس روپے کا عظیم الشان سرمایہ لیے ہو دوسرے سال کی سرحد میں داخل ہو رہے ہیں۔ دنیوی لحاظ سے یہ سروسامان بہت حقیر ہے۔ شاید اسے دیکھ کر لوگ ہمارا مذاق اڑائیں گے کہ اس بل بوتے پر آپ کفر کی اُن زبردست طاقتوں کا مقابلہ کرنے چلے ہیں جن کے سرمایہ کو اربوں اور سنکھوں کے حساب سے بھی شمار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اسلام کی تاریخ پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ یہ جب کبھی اٹھا ہے، بے سروسامانی کے ساتھ ہی اٹھا ہے، اور اسی حال میں اس نے بڑی سروسامان والی طاقتوں کے ساتھ ٹکر لی ہے۔ لہٰذا سرمایہ کی قلت وہ چیز نہیں ہے جو ہمارا دل توڑنے والی ہو۔ ہاں! دل توڑنے والی چیز اگر کوئی ہے تو وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے سینوں میں اب وہ دل نظر نہیں آتے جو اسلام کی صحیح کیفیت سے سرشار ہوں۔ کاش، ان سو سو روپوں کے بجائے صرف سوا پیسے ہمارے بیت المال میں ہوتا مگر ہمارے ساتھ مردانِ حق کی ایک ایسی جماعت صف بستہ ہوتی جن کے دل حب الدنیا وکراھیۃ الموت سے خالی ہوتے۔ یہ ہے وہ اصلی سرمایہ جس کے فقدان کا ہمیں افسوس ہے۔ غلط کہتا ہے جو کہتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس دولت نہیں اس لیے یہ کمزور ہیں۔ مسلمانوں میں دولت اب بھی موجود ہے مگر زیادہ تر ان طبقوں میں ہے جو دو خداؤں کی پوجا کرتے ہیں، مسجد میں خداوند عالم کی اور مسجد سے باہر شیطان نفس کی۔ اور جن طبقوں میں دولت نہیں ہے ان کے ضعف کا بھی اصلی سبب دولت کا فقدان نہیں بلکہ معبودِ زر کی بندگی ہے جسے راضی کرنے کی فکر ان میں سے بہتوں کو خدا سے بے فکر کر دیتی ہے۔ گھن اس قوم کو سر سے پاؤں تک کھا گیا ہے ورنہ ممکن نہ تھا کہ اس میں حقیقی خدا پرستی زندہ ہوتی اور پھر یہ غلام ہوتی۔

ادارۂ دارالاسلام کا دستور العمل شائع ہوئے تقریباً تین مہینے ہو چکے ہیں۔ اس دوران میں ہمارے ارکان کی تعداد پانچ سے بڑھ کر چھ ہو گئی اور خوشی کی بات ہے کہ چھٹی رکن ایک خاتون ہیں۔ ان کے علاوہ حیدرآباد، مدراس، پشاور، دہلی، لاہور، اور پٹنہ سے چھ اصحاب نے اپنے آپ کو رکنیت کے لیے پیش کیا ہے لیکن بنابر احتیاط ان کو ابھی آزمائشی دور میں رکھا گیا ہے تاکہ کچھ مدت تک وہ اپنے نفس کا پورا احتساب کریں اور پہلے خود اس امر کا اندازہ کرلیں کہ آیا وہ رکنیت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے اپنے آپ میں پوری طاقت پاتے ہیں یا نہیں۔ معاونین کی فہرست میں بھی چھ اصحاب نے اپنا نام پیش کیا ہے جسے قبول کرلیا گیا کیونکہ رکنیت کی بہ نسبت اس باب میں کم چھان بین کی ضرورت ہے۔

رفتار ترقی کی سستی بجائے مایوس کن ہونے کے ہمارے لیے امید افزا ہے۔ ہمارے پیش نظر تعداد کی کثرت نہیں بلکہ کیفیت کی شدت ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ جن لوگوں تک اس ادارہ کا تخیل پہنچا ہے وہ اس کے وزن کو محسوس کر رہے ہیں، اور انھیں اس امر کا شعور ہے کہ اس ادارہ کی شرکت عام انجمنوں کی شرکت سے مختلف چیز ہے۔ اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ بہت سے وہ لوگ بھی جو ہمارے مقاصد اور طریق کار سے کلی اتفاق رکھتے ہیں، اپنے آپ کو رکنیت یا معاونت کے لیے پیش کرتے ہوئے جھجکتے ہیں، اور جو اقدام کرتے ہیں ان کی محتاط پیش قدمی سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ وہ کسی ہنگامی جوش میں ایسا نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ ان کے گہرے تفکر اور حقیقی شرح صدر کا نتیجہ ہے۔ فطری بات ہے کہ اس صورت میں رفتار ترقی تیز نہیں ہو سکتی، مگر جتنی ترقی بھی ہو گی ان شاء اللہ مستحکم اور پائدار ہو گی۔ اور ہم اپنے آپ کو اس وقت خوش نصیب سمجھیں گے جب اس ٹھنڈی رفتار کے ساتھ ہمیں آٹھ نو کروڑ مسلمانوں کی اس بستی میں سے پچاس مومن قانت مل جائیں گے۔

دوسری طرف بہت سے حضرات نے مراسلات میں بھی اور زبانی گفتگوؤں میں بھی مختلف قسم کے

شبہات کا اظہار کیا جن کا دائرہ اتنے وسیع مباحث پر پھیلا ہوا ہے کہ انھیں سمیٹنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ ان سے ہمیں یہ معلوم کرنے کا اچھا موقع مل گیا کہ اس وقت ہمارے اربابِ فکر عموماً کس قسم کی الجھنوں میں مبتلا ہیں، اور ساتھ ہی یہ دیکھ کر اطمینان بھی ہوا کہ اس تمام ذہنی بدنظمی کی تہ میں ایک حقیقی تجسس چھپا ہوا ہے جس کی تشفی کا سامان اگر بہم پہنچ جائے تو ہماری قوم کی یہ ساری قوتیں جو فضول ضائع ہو رہی ہیں، رفتہ رفتہ ایک اجتماعی نصب العین کی طلب میں لگ جائیں گی۔

ہر شبہ کا جواب برموقع دیا جاتا رہا ہے لیکن ایک خاص شبہ ایسا بھی ہے جسے مختلف پہلوؤں سے مختلف حضرات نے پیش کیا ہے، اور خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ نسبتہً زیادہ عام ہے، لہٰذا ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ یہاں اسے بیان کر کے صاف کر دیا جائے۔ اس شبہ کا خلاصہ دو سوالوں کی شکل میں بیان کیا جا سکتا ہے:

(۱) تم نے اس ادارہ کو ایک تربیت گاہ یا ایک علمی مرکز کے بجائے ایک تحریک اور وہ بھی آل انڈیا قسم کی تحریک کی صورت دے دی ہے۔ کیا اس سے تمہارا مقصد آل انڈیا انجمنوں میں ایک اور کا اضافہ کرنا ہے؟

(۲) تم نے مسلمانوں کی تمام انجمنوں پر حتیٰ کہ مسلم لیگ پر بھی، جو تم سے نسبتہً قریب تر تھی تنقید کر ڈالی۔ کیا تم اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ چننا چاہتے ہو اور ان سب کے رقیب کی حیثیت سے میدان میں آ رہے ہو؟

ان دونوں سوالوں کا مختصر جواب ہم ایک ہی سلسلہ میں دیں گے۔

یہ گمان کہ ہم کوئی بڑی یا عمومی تحریک (Mass movement) لے کر اٹھ رہے ہیں، صرف اسی ایک بات سے بآسانی دور ہو سکتا ہے کہ ہم نے رکن تو درکنار، معاون بننے کے لیے بھی اتنی کڑی قیود رکھی ہیں جو شاید کسی دوسرے ادارہ میں قیادت علیا کے لیے بھی نہیں ہیں۔ اسی سے اندازہ کر لیا جا سکتا ہے کہ کم از کم مستقبل قریب میں تو یہ ادارہ کوئی عمومی تحریک نہیں بن سکتا۔ اس قسم کا خطرہ جن حضرات کے دل میں گذرا ہے وہ شاید مسلمانوں کی طرف سے بہت ہی خوش گمان واقع ہوئے ہیں کہ اتنی سخت قیود کے باوجود وہ توقع

رکھتے ہیں کہ اس حالت میں اس قوم کے درمیان ایسا ادارہ بھی ایک عمومی ادارہ بن سکتا ہے لیکن اگر فی الواقع ایسا ہو جائے، اگر لاکھوں آدمی دارالاسلام کا نصب العین لے کر اس کیرکٹر کی طاقت کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں جس کا نقشہ ہمارے دستور العمل میں پیش کیا گیا ہے تو یہ گھبرانے کی نہیں، خوشی کی بات ہوگی وہ دن تو اسلام کی فتح کا دن ہوگا جس کی تمنا ہر مسلمان کے دل میں ہونی چاہیے نہ کہ خوف!

دستور العمل سے گذر کر جب آپ ہمارے لائحۂ عمل کو دیکھیں گے تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ یہ لائحۂ عمل کسی آل انڈیا قسم کی عمومی تحریک کا نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ایک خشک، بے مزہ، سخت محنت طلب اور خاموش تعمیری پروگرام ہے جس کو عمل میں لانے کے لیے اعلیٰ درجہ کی اخلاقی، ذہنی اور عملی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، انتھک عمل کی ضرورت ہے اور وہ بھی بے مزد و بے اجر، ایثار و قربانی کی ضرورت ہے اور وہ بھی صرف آسائش اور جذباتِ نفس ہی کی حد تک نہیں بلکہ مال اور جان کی حد تک بھی۔ کیا یہ چیز عوام کے مطلب کی ہو سکتی ہے کہ اس کی طرف ان کے فوج در فوج متوجہ ہو جانے کا اندیشہ کیا جا سکے؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم نے اپنے نظام کو ایک مقام پر محدود نہیں رکھا ہے بلکہ ان سب لوگوں کے لیے اس سے وابستہ ہونے کا موقع فراہم کر دیا ہے جو ہمارے ہم خیال ہوں، خواہ ہندوستان کے کسی گوشے میں بیٹھے ہوئے ہوں۔ لیکن اس کا مدعا اس ادارے کو عام اصطلاحی معنوں میں "آل انڈیا" بنانا نہیں ہے بلکہ مقصد کچھ اور ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہندوستان کے ہر کونے میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اسی ایک نصب العین کے لیے جی رہے ہیں جو ہمارے پیش نظر ہے ان میں سے بعض کی قوتیں منتشر سعی و جہد میں ضائع ہو رہی ہیں، اور بعض مایوس بیٹھے ہوئے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ ان سب کو ایک سلک میں منسلک کر دیں تاکہ اس نصب العین کے لیے اجتماعی طاقت فراہم ہو سکے۔ انہی لوگوں میں سے، یا ان کے ذریعہ سے ہم کو اپنے کام کے آدمی مل سکیں گے ورنہ یہاں کس کے پاس اتنا وقت اور اتنا سرمایہ ہے کہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں کام کے آدمی ڈھونڈتا پھرے۔ انہی

لوگوں کے ذریعہ سے ہم اپنے خیالات منظم طریقہ پر پھیلا سکیں گے، اور یہی لوگ آخر کار ان تربیت یافتہ آدمیوں کے لیے میدانِ عمل فراہم کریں گے جنھیں ہمارا ادارہ مختلف تعمیری خدمات کے لیے تیار کرے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام فوائد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک کہ ادارہ کے نظام کو وسیع نہ کیا جائے۔

بلاشبہ مسلمانوں کو ایک ایسی جمہوری تحریک کی بھی ضرورت ہے جو عوام میں بیداری پیدا کرے اور وسیع پیمانے پر منظم جد و جہد کر کے ہندوستان کی اجتماعی زندگی میں مسلمانوں کے لیے ان کی قوم کے شایانِ شان مرتبہ حاصل کرے۔ جو لوگ اس کام کے لیے موزوں ہیں ان کو یہی کام کرنا چاہیے لیکن اس جمہوری تحریک کی پشت پر ایک ایسی تعمیری تحریک کی بھی ضرورت ہے جو قوم کو بنانے والی حقیقی طاقت فراہم کرے، اور جمہوری حرکت کو حیاتِ اجتماعی کی اصلی غذا بہم پہنچائے۔ صدیوں سے مسلمان اس حقیقت کو بھولے ہوئے ہیں کہ خلافتِ الٰہی کا قیام وہ واحد غرض ہے جس کے لیے ان کو ایک الگ قوم بنایا گیا ہے۔ اسی خود فراموشی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی قومی تحریکیں، اور ان کے کارکنوں کی طاقتیں ایسے مختلف راستوں پر بھٹکتی رہی ہیں اور اب تک بھٹک رہی ہیں جن میں سے کوئی راستہ بھی سیدھا ان کی منزلِ مقصود کی طرف نہیں جاتا۔ لہٰذا کوئی جماعت ایسی بھی ہونی چاہیے جو ان کے سامنے اس نصب العین کو ہر وقت نمایاں اور روشن کرتی رہے، اور ان کی ہر جمہوری حرکت کو اسی کی طرف بڑھنے پر اکسائے اور اگر اس منتہا سے فروتر کسی مقام پر وہ ٹھیر رہے ہوں تو انھیں دھکیل کر آگے بڑھنے پر مجبور کرے۔ پھر وہ اصلی کمزوری جس نے مسلمانوں کو اپنے قومی نصب العین کی طرف پیش قدمی سے درماندہ کر رکھا ہے، یہ ہے کہ صدیوں سے ان کے ہاں اصولِ اسلام کی بنیاد پر تعمیر کا کام بند پڑا ہے، اور بعد کی نسلیں صرف اسی سرمایہ پر زندگی بسر کرتی رہی ہیں جو ابتدائی تین چار صدیوں میں ان کے قومی معماروں نے فراہم کیا تھا۔ یہ سرمایہ اب بالکل ناکافی ہو چکا ہے۔ زندگی کے بدلے ہوئے حالات میں جس جس قسم کے مسائل سے اب وہ دوچار ہو رہے ہیں ان کو حل

مفصل، مرتب، قابلِ عمل حل ان کو نہیں ملتا۔ ان کے ہاں عقائد اور اخلاقیات سے لیکر تمدنی، معاشی، سیاسی اور بین الاقوامی قوانین تک ہر چیز ہزار برس پرانی زبان میں ہے جسے اب کوئی نہیں سمجھ سکتا، اور ہزار برس پرانی زندگی سے وابستہ ہے جو آج کہیں موجود نہیں ہے۔ اگرچہ مسلمان آج بھی کبھی کبھی اسلامی حکومت کا نام زبان پر لے آتے ہیں لیکن اگر کسی خطۂ ارضی میں ان کو حکومت کا موقع مل بھی جائے تو صحیح معنوں میں کوئی اسلامی حکومت قائم نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے پاس اس زمانہ کی ضروریات کے مطابق ایک ترقی پذیر نظام تمدن و سیاست کو چلانے کے لیے کوئی چیز بھی مرتب نہیں ہے، حتی کہ قرآن و سنت کے اصول و کلیات کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے والے بھی ان میں کہیں شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ٹرکی و ایران جیسی سلطنتوں کو مجبوراً فرنگی قوانین کی طرف رجوع کرنا پڑا، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں بھی جو لوگ اس وقت اسلام کے نام سے ہماری قومی جمہوری حرکت کو چلا رہے ہیں، وہ غریب صحیح اسلامی اسپرٹ اور صحیح اسلامی اصولوں پر ہمارے قومی مسائل کو حل نہیں کر سکتے۔ پس ہماری ہر جمہوری تحریک کی کامیابی کا، بلکہ ہماری قوم کے مستقبل کا انحصار اس پر ہے کہ ہمارے ہاں ایک جماعت ایسی پیدا ہو جو اس حقیقی ضرورت کو پورا کرے۔ جو ایک ایسا مخزنِ ہدایت ہو جس کی طرف ہر ضرورت کے موقع پر رجوع کیا جا سکے جس میں اتنی زبردست قوت محرکہ موجود ہو کہ موجودہ زمانہ کی غیر اسلامی تحریکات کا نہ صرف مقابلہ کر سکے بلکہ افکار کے سیلاب کا رخ اسلامی نصب العین کی طرف پھیر دے، اور مادی حکومت سے پہلے اسلام کی عقلی و دماغی حکومت قائم کرے۔ خوب یاد رکھنا چاہئے کہ کوئی تہذیب محض سیاسی و فوجی طاقت کے بل پر قائم نہیں ہو سکتی۔ وہ اصلی طاقت جو کسی تہذیب کو قائم کرتی اور قائم رکھتی ہے، عقلی و دماغی طاقت ہے۔ تاتاریوں نے تلوار کے زور سے اسلامی مملکتوں کا تختہ الٹ دیا، مگر وہ کوئی تہذیبی انقلاب برپا نہ کر سکے، بلکہ خود ان کی تہذیب سے مغلوب ہو گئے جن کو انھوں نے تلوار کے زور سے مغلوب کیا تھا، اس لیے کہ ان کے پاس عقلی و دماغی حکومت قائم کرنے والی کوئی طاقت نہ تھی۔ لہٰذا اگر ہمیں سیاسی قوت حاصل ہو بھی جائے تو ہم اسلام کی حکومت دنیا کے کسی خطہ میں بھی قائم نہیں کر سکتے جب تک کہ ہمارے پاس قرآن کا صحیح فہم نہ ہو، اور اتنی صلاحیت نہ ہو کہ خالص قرآنی بنیادوں پر

کسی تہذیب و تمدن کی عمارت اٹھا سکیں۔

یہی دو کام ہیں جن کے لیے ادارہ دار الاسلام قائم کیا گیا ہے۔ ہمیں اپنے کام اور اس کی نوعیت اور اس کے دائرے کا پورا تصور رہا ہے، اور ہم اپنی تمام کوششوں کو اسی کے حد اندر محدود رکھیں گے جو اس کام کی فطرت چاہتی ہے۔ لہٰذا کسی جماعت کو یہ اندیشہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم ان کے دائرہ عمل میں مداخلت بیجا کریں گے۔ بلکہ اگر وہ سمجھیں تو انہیں خود محسوس ہو جائے گا کہ ہم ان کے رقیب نہیں بلکہ حقیقی خادم ہیں۔

رہیں مسلمانوں کی وہ مختلف جماعتیں جو اس وقت جمہوی تحریکیں چلا رہی ہیں، تو ہمیں معلوم ہے کہ ان میں سے کون ہمارے راستے سے قریب تر ہے اور کون بعید تر، لیکن ہم نے قصداً کسی خاص جماعت کی تائید و حمایت سے احتراز کیا ہے تاکہ اس جتھے بندی کے دور میں، جبکہ اشخاص اور پارٹیوں کے لیبل ہی حق اور باطل کے معیار بن کر رہ گئے ہیں، ہم کو کسی پارٹی کا نقیب نہ سمجھ لیا جائے۔ ہمارا خطاب عام ہے۔ ہم ہر مسلمان کو اور مسلمانوں کی ہر جماعت کو اس کا وہ نصب العین یاد دلاتے ہیں جو خدا نے اس کے لیے مقرر کیا ہے، اور دلیل کے ساتھ بتاتے ہیں کہ کونسا راستہ تمہیں اس نصب العین کی طرف لے جانے والا ہے، اور وہ راستہ جس سے دور ہٹا دینے والا ہے۔ اب جس کے دل میں خدا کی محبت ہوگی وہ اگر غلطی بھی کر رہا ہوگا تو اس سے باز آجائے گا اور خود ہی اس راستے پر چلا جائے گا جو الٰہی نصب العین کی طرف جانے والا ہے۔ اور جو اشخاص یا پارٹیوں کی محبت میں گرفتار ہوگا، وہ اپنی ضد پر اڑا رہے گا، اور اس کی حقیقت آج نہیں تو کل ساری قوم پر کھل جائے گی اور مسلمان بحیثیت مجموعی اس کے فتنے سے بچ جائیں گے۔

اسی طرح تنقید میں بھی ہم نے کبھی کسی کی حمایت یا مخالفت کو مقصود بالذات نہیں بنایا بلکہ ہمیشہ اسلامی نصب العین ہی ہمارا مقصود رہا ہے، اور ہم نے ہر اسلامی جماعت کو اس کی کوتاہیوں پر (خواہ وہ تھوڑی ہوں یا بہت) صرف اس غرض سے متنبہ کیا ہے کہ وہ ان کا تدارک کر کے اس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرنے کی قوت و قابلیت بہم پہنچائے۔ ہر جماعت اور ہر رہنما کو ایسے بہت سے لوگوں کی تائید حاصل ہے جو اس کی غلطیوں اور کمزوریوں پر پردہ ڈالتے اور اس کی غیر مشروط حمایت کرتے ہیں۔ اس تائید بے جا میں کسی اضافہ کی حاجت نہیں۔ البتہ ایک ایسے دردمند دوست کی سب کو ضرورت ہے جو انہیں ان کی کوتاہیوں سے باخبر کرے اور اس خدمت کی معاوضہ میں سب سے برا بننے پر راضی ہو۔ ایک نقطۂ نظر یہ چاہتا ہے کہ آدمی کسی کو اپنا کر کے نہ رکھے۔ مگر دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ عقلمندی یہ ہے کہ صرف خدا کو اپنا کرے۔

مقالات

دین میں تحریف اور بدعت کے اسباب

ازافادات حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

جو صاحب سیاست کبریٰ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا دین لے کر آیا ہو جو تمام ادیان کا ناسخ ہو اس کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ اپنے دین کو فتنۂ تحریف کی دست برد سے محفوظ کر دے۔ کیونکہ اس کی عام اور ہمہ گیر دعوت مختلف استعداد مختلف مزاج اور مختلف اغراض و مقاصد رکھنے والی جماعتوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرتی ہے۔

ایسا ہوا کرتا ہے کہ لوگ اپنی ہوا پرستی یا اپنے پہلے مذہب کی محبت کی وجہ سے یا مصالح شریعت کا کامل احاطہ نہ کرنے والی فہم نارسا کے اشارہ پر بہت سی منصوص تعلیمات شرع کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ اور کبھی اس میں غیر شرعی تخیلات اور تعلیمات ٹھونس دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سارا دین مسخ اور درہم برہم ہو جاتا ہے جیسا کہ بہت سے قدیم مذاہب کی تاریخ گواہ ہے۔ لیکن چونکہ اس فتنہ کے دروازے بے شمار اور ان کی تعداد غیر متعین ہے اور سب کا استقصا ممکن نہیں۔ لہذا شارع کے لئے ضروری تھا کہ امت کو اجمالاً اسباب تحریف سے ڈرا کر متنبہ کر دے اور اس کے لئے چند ایسے اصولی مسائل کو مخصوص کرے جن کے بارے میں قیاس کہتا ہے کہ عموماً تہاون اور تحریف کے فتنے بنی نوع انسان میں انہیں راستوں سے گھسا کرتے ہیں۔ اور ان راستوں کو اچھی طرح بند کر دے۔ اس تہدید و انذار کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی شریعت میں ایسی چیزوں کو داخل کرے جو مسخ شدہ اور باطل مذاہب کے اصولی اور مشہور ترین رسوم و شعائر کے بالکل مخالف

ہوں مثلاً نماز وغیرہ۔ تاکہ کوئی ظاہری تشابہ باقی نہ رہ جائے اور کسی پرانے مذہب کے شعائر سے مداہنت کا امکان باقی نہ رہے۔

تہاون تحریف کے اسباب میں سے ایک تہاون ہے یعنی احکام شرع سے بے پروائی۔ تہاون کی حقیقت یہ ہے کہ رسول کو تربیت یافتہ حواریوں کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہونے لگیں جو نماز کو ضائع کرکے شہوات کی پیروی میں غرق ہوں، علم و عمل اور تعلیم و تعلم کے ذریعہ دین کی اشاعت کا اہتمام چھوڑ دیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اور اس طرح چند روز بعد مخالف دین رسوم پیدا ہو جائیں اور بحیثیت مجموعی عام طبائع انسانی کا رجحان مزاج شریعت کے خلاف ہو جائے۔ پھر ایسے دوسرے خلف آئیں جو شریعت سے بے اعتنائی کے اس جرم میں اور زیادہ آگے بڑھ جائیں یہاں تک کہ علم دین کا اکثر حصہ نسیاً منسیاً ہو کر رہ جائے۔ یوں تو امت کے ہر طبقہ کا تہاون خطرناک اور مضرت رساں ہے مگر جب اس کا صدور رؤسا اور اکابر قوم سے ہو تو پھر اس کی مضرتوں کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اسی سبب سے حضرت نوح و ابراہیم علیہما السلام کی شریعتیں برباد ہو گئیں اور آج اس کے اصلی خط و خال کا سراغ لگانا قریباً ناممکن ہو گیا ہے۔

تہاون کے چند اسباب و ذرائع ہیں۔

(۱) پہلا سرچشمہ تہاون کا صاحب شریعت کی روایات کو محفوظ نہ رکھنا اور ان کے مطابق عمل نہ کرنا ہے۔

مندرجہ ذیل ارشاد نبوی اسی فتنہ سے باخبر کر رہا ہے:۔

"دیکھو! عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب طعام و شراب سے ایک بدمست انسان اپنے تخت پر بیٹھ کر کہے گا کہ تم اس قرآن کو مضبوط پکڑو اور اس میں جس چیز کو حرام پاؤ اسی کو حرام سمجھو اور جس شے کو حلال پاؤ اسی کو حلال سمجھو۔ حالانکہ خدا کے رسول کی حرام کی ہوئی چیز بھی ویسی

ہی قطعی الحرمت ہے جیسی خود اللہ کی حرام کی ہوئی۔"

اسی بات کو دوسری جگہ یوں فرمایا :-

"اللہ تعالیٰ لوگوں کے سینوں سے علم نہیں اٹھائے گا بلکہ علماء کو اٹھائے گا اور ان کے اٹھ جانے سے علم اٹھ جائے گا۔ یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہ رہ جائے گا اس وقت لوگ جاہلوں کو امام بنا کر ان کی طرف رجوع کرنے لگیں گے، ان سے مسئلہ پوچھا جائے گا اور وہ بغیر کسی علم و بصیرت کے فتویٰ دیں گے۔ خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہی کے جہنم میں ڈال دیں گے۔"

(۲) دوسرا سبب ایسی اغراض فاسدہ ہیں جو من گھڑت تاویلات پر آمادہ کرتی ہیں مثلاً نفس پرست امراؤ ملوک کی طلب رضا جس کی وجہ سے انسان اُن کی ہوا پرستیوں کے لئے کلام الٰہی کی غلط تاویلیں کر کے سند جواز مہیا کرتا ہے۔ آیت ذیل ایسے ہی ایمان فروشوں کو مخاطب کرتی ہے :-

"جو لوگ اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام کو چھپاتے ہیں اور اس کے عوض تھوڑا سا معاوضہ حاصل کرتے ہیں، وہ اور تو کچھ نہیں مگر اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں۔" (بقرہ۔ رکوع ۲۱)

(۳) تہاون کا تیسرا منبع منکرات اور فحشات کا امت میں پھیل جانا اور علماء کا ان پر خاموشی اختیار کر لینا ہے۔ اسی حالت کے متعلق قرآن کہتا ہے :-

" تم سے پہلے گذرنے والی اقوام میں ایسے ارباب خیر کیوں نہ ہوئے جو لوگوں کو ارض الٰہی میں فساد برپا کرنے سے روکتے۔ (ہاں ایسے لوگ تھے تو سہی) مگر بہت کم تھے جنہیں ہم نے عذاب سے بچا لیا۔ رہے ظالم و نافرمان لوگ تو وہ اسی لذت دنیوی میں سرشار رہے جو انہیں دی گئی تھی اور یہ لوگ کچھ تھے ہی بدکردار۔" (ہود۔ رکوع ۱۰)

بنی اسرائیل کی معصیت پرستی پر تبصرہ کرتے ہوئے آنحضرت صلعم فرماتے ہیں :-

"ان کے علماء نے انہیں برائیوں سے روکا لیکن وہ نہ رکے۔ پھر علماء ان سے قطع تعلق کرنے کے بجائے ان کی مجلسوں میں اٹھنے بیٹھنے اور ان کے ساتھ کھانے پینے لگے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ایک دوسرے سے مار دیا (یعنی سب کو معصیت کی سیاہی میں رنگ دیا) اور داؤد[۱] و عیسیٰ ابن مریم[۲] کی زبان سے ان پر لعنت کی، کیونکہ وہ خدا کی نافرمانی کرتے اور حد سے بڑھ گئے تھے۔"

تعمق | تحریف کا دوسرا سبب تعمّق ہے یعنی خواہ مخواہ بال کی کھال نکالنا۔ اس کی متعدد صورتیں ہیں۔ مثلاً یہ[۱] کہ جب شارع کسی چیز کا حکم دے یا کسی کام سے روکے تو اس کے حکم کو سن کر کوئی شخص اپنے ذہن کے مطابق خود ایک معنی متعین کرے، پھر وہی حکم اپنی طرف سے کسی ایسی دوسری چیز پر عائد کر دے جو بعض وجوہ سے پہلی شے کے مشابہ ہو، یا دونوں میں کسی پہلو سے اس کو اشتراک علت نظر آئے۔ یا[۲] ایک شے کے حکم کو اس کے تمام اشکال اور مظنات اور اجزاء پر علیحدہ علیحدہ جاری کر دے۔ یا[۳] جب کبھی روایات کے تعارض کی وجہ سے اصل حکم اور اس کے صحیح محل و موقع کی تمیز نہ کر سکے تو تمام صورتوں میں سے سخت ترین صورت کو اختیار کر کے اسے واجب سمجھ لے۔ یا[۴] رسول اللہ صلعم کے ہر فعل کو عبادت پر محمول کرے (حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے بہت سے افعال محض عادۃً کے طور پر کئے ہیں، عبادت سے ان کا کوئی تعلق نہیں) اور یہ خیال کر کے کہ یہ تمام امور شریعت کی حیثیت رکھتے ہیں اور امر و نہی کے ذیل میں آتے ہیں، حکم لگا دے کہ خدا نے ان کاموں سے روکا ہے اور ان کاموں کا حکم دیا ہے۔ یہ تمام صورتیں تعمق فی الدین کی ہیں۔ مثال کے طور پر روزہ کے احکام کو لے لو۔ شارع نے جب نفس حیوانی کو مغلوب کرنے کے لئے روزہ رکھنے کا حکم دیا اور اس میں مباشرت سے منع فرمایا تو بعض لوگوں نے سمجھا کہ سحری کھانا بھی خلافِ شرع ہے کیونکہ اس سے روزہ کا مقصد (یعنی نفس کشی) فوت ہو جاتا ہے۔ نیز روزہ دار کے لئے بیوی کا بوسہ لینا بھی ناجائز ہے کیونکہ وہ بھی مباشرت کا داعیہ ہے، بلکہ قضائے شہوت میں ایک طرح مباشرت کے مشابہ ہے۔ رسول اللہ صلعم کو جب ان خیالات کی اطلاع پہنچی تو آپ نے ان کی غلطیوں کو واضح

رجم کی سزا کو مجرم کا منہ کالا کرنے اور کوڑے مارنے کی سزا سے بدل دینا بہتر سمجھا، اور ایسا کیا بھی۔ رسول اللہ صلعم نے ان کے اس فعل کو تحریف اور ترک احکام الٰہی قرار دیا۔

ابن سیرین سے روایت ہے کہ:-

"سب سے پہلے ابلیس نے قیاس کیا۔ چاند اور سورج کی پرستش محض قیاس نے کرائی۔"

امام حسن نے آیت خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ پڑھ کر فرمایا "یہاں ابلیس نے قیاس کیا تھا اور وہ سب سے پہلا قیاس کرنے والا ہے۔"

امام شعبی سے منقول ہے کہ:-

"قسم خدا کی اگر تم نے قیاس سے کام لیا تو حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر کے رہو گے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:-

"تین چیزیں قصر اسلام کو ڈھا دیں گی، ایک عالم کی لغزش، دوسری منافق کا قرآن سے استدلال تیسری گمراہ ائمہ کے احکام۔"

یہ تمام باتیں اس قیاس کے متعلق ہیں جس کا سر رشتہ کتاب و سنت سے نہ ہو، بلکہ محض وہمی و عقلی ہو۔

اتباع اجماع | فتنۂ تحریف کا چوتھا ذریعہ اتباع اجماع ہے۔ اجماع سے مراد یہ ہے کہ حاملین شریعت کا ایک گروہ جس کی اصابت رائے پر عام لوگوں کو اعتقاد ہو کسی چیز پر اتفاق کرلے اور لوگ یہ سمجھیں کہ مجرد یہ اتفاق ہی حجت شرعی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس قسم کا اتباع اجماع اسوقت تحریف دین کے مترادف ہو جاتا ہے جب اس اجماع کی اصل کتاب و سنت میں موجود نہ ہو۔ اور یہ وہ اجماع نہیں ہے جس کے حجت ہونے پر امت کا اتفاق ہے۔ کیونکہ امت کا اتفاق تو اسی اجماع کے اتباع پر ہے جس کی سند کتاب و سنت میں موجود ہو یا جو کتاب و سنت سے مستنبط ہو۔ رہا وہ اجماع جس کی اصل نہ قرآن میں ہو نہ حدیث میں، سو اس کو کسی نے بھی حجت نہیں مانا۔ بلکہ اس کے اتباع کی مذمت میں تو قرآن کہتا ہے کہ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا

عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا" جب ان سے کہا گیا کہ ایمان لاؤ اس چیز پر جو خدا نے اتاری ہے تو انھوں نے کہدیا کہ ہم تو اس طریقہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا" حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے انکار میں یہود نے جو دلیل پیش کی تھی وہ اسی اتباع اجماع پر مبنی تھی۔ ان کے اسلاف نے بزعم خود ان انبیائے صادقین کے حالات کا تفحص کیا اور انہیں نبوت کے معیار پر نہ پایا، لہذا ان کا انکار ہمیشہ کے لئے ایک برہان قاطع بن گیا۔ نصاریٰ کے اندر بھی اسی اتباع اجماع نے بے شمار گمراہیاں پیدا کر دی ہیں۔ ان میں توراۃ و انجیل کے خلاف اور ان کے احکام سے زائد صدہا باتیں شریعت کی حیثیت سے موجود ہیں، جن کے بارے میں ان کے پاس "اجماع سلف" کے سوا اور کوئی دلیل نہیں۔

تقلید | پانچواں سرچشمہ جہاں سے تحریفِ دین کا سیلاب پھوٹتا ہے کسی غیر معصوم (غیر نبی) انسان کی کورانہ تقلید ہے یعنی کوئی عالم دین کسی مسئلہ میں اجتہاد کرے اور اس کے مقلدین بغیر دلیل و حجت محض حسن ظن کی بنا پر یہ خیال کریں کہ امام کا اجتہاد قطعاً یا غالباً صحیح ہے، پھر اس خیال کے ماتحت کسی صحیح حدیث کو اس کے اجتہاد سے رد کر دیں۔ یہ تقلید وہ تقلید نہیں ہے جس کے جواز پر امت مرحومہ کا اتفاق ہے۔ امت نے مجتہدین کی تقلید کے جواز پر جو اتفاق کیا ہے وہ چند قیود کے ساتھ ہے۔ اولاً آدمی کو یہ علم و اعتقاد رکھنا چاہئے کہ مجتہد معصوم نہیں ہے۔ اس کا اجتہاد صحیح بھی ہوتا ہے اور غلط بھی۔ ثانیاً اسے ہمہ وقت ارشادِ نبوی کی تلاش میں اس عزم کے ساتھ لگا رہنا چاہئے کہ جب کبھی کوئی صحیح حدیث اجتہاد امام کے خلاف مل جائے گی تو وہ امام کی تقلید اس مسئلہ میں ترک کر دے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے متعلق فرمایا کہ یہود اپنے علماء و مشائخ کی پرستش نہیں کرتے تھے بلکہ کرتے یہ تھے کہ جس چیز کو یہ لوگ حلال کہہ دیتے اسے وہ بغیر کسی حجت شرعی کے حلال سمجھ لیتے تھے اور جسے یہ حرام کہہ دیتے اسے حرام سمجھ لیتے تھے۔

خلط مذاہب | دین کے اندر فتنۂ تحریف کے گھسنے کا چھٹا راستہ مختلف مذاہب اور شرائع کا باہم اس

طرح خلط ملط کر دینا ہے کہ ایک دوسرے سے متمیز نہ ہو سکے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک آدمی پہلے کسی اور مذہب کا پیرو رہتا ہے اور اس کے دل و دماغ پر اپنی سابق مذہبی سوسائٹی کے علوم و نظریات پوری طرح حاوی ہوتے ہیں۔ پھر وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے لیکن قلب میں اُن پرانی نقوش کا اثر باقی رہتا ہے، انجام کار یہاں بھی وہ ان علوم و نظریات کی توقیر و قبولیت چاہتا ہے خواہ وہ بجائے خود کیسے ہی بے جان اور بے اصل ہوں۔ حتیٰ کہ بسا اوقات وہ اس کے لئے روایتیں گھڑنے پر اتر آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "بنی اسرائیل برابر راہ اعتدال پر قائم رہے یہاں تک کہ ان میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جو خالص اسرائیلی نہ تھے (باپ اسرائیلی تھا اور ماں دوسری قوم سے) یعنی لونڈی زادے تھے۔ ان لوگوں نے دین میں رائے کو دخل دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ خود گمراہ ہوئے اوروں کو بھی گمراہ کر دیا"۔ چنانچہ خود ہمارے دین میں بھی آج بے شمار علوم اسی نوع کے داخل ہو چکے ہیں مثلاً اسرائیلی علوم، خطباء جاہلیت کے اقوال، یونان کا فلسفہ، ایران کی تاریخ، علم نجوم، رمل اور علم کلام وغیرہ۔ رسول اللہ صلعم کے حضور میں جب توراۃ پڑھی گئی تو آپ بہت خفا ہوئے، اس خفگی میں یہی راز تھا۔ نیز کتاب دانیالؑ کے طالب کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی وجہ سے سزا دی تھی۔

(ماخوذ از حجۃ اللہ البالغہ)

دلائل السنن والآثار

از

جناب مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی

(۱)

جس طرح آج کل موجودہ بر اسی کشمکش مسلمانوں کے لئے انتہائی صبر آزما اور فتنے کا باعث ہے اسی طرح اہل علم اور مسلمانوں کے لئے دو اور فتنے سخت ہیں۔ ایک تکفیر و تفسیق۔ دوسرا انکار حجیت حدیث۔ اول الذکر کے متعلق ایک مضمون بعنوان "کفر و ایمان" رسالہ ترجمان القرآن ماہ شوال ۱۳۵۵ھ میں احتیاط و ذمہ داری سے شائع ہو چکا ہے جس میں اہل علم کی تحقیقات جو تمام تر کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں پیش کر دی گئی ہیں۔ اب موخر الذکر پر اصولی حیثیت سے گفتگو کی جاتی ہے۔ شاید میری یہ کاوش خدا کے نزدیک شرف قبول حاصل کرے اور لوگوں کے لئے مفید ثابت ہو وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ طالب حقیقت کے لئے ہر ہر قدم پر دو مشکلیں پیش آتی ہیں۔ ایک طرف تو یہ کہ وہ کسی مسئلہ کو محض اسلئے کہ فلاں شخص نے کہا ہے صحیح نہیں مانتا بلکہ بڑے سے بڑے عالم کی رائے کا غلط ہونا ممکن سمجھتا ہے دوسری طرف ائمہ کی رایوں کو بغیر کامل غور کے غلط سمجھنا خود نہایت خطرناک ہے۔ جس مسئلہ میں کسی امام نے غلطی کی ہے اس میں طالب حقیقت بھی ممکن ہے کہ غلطی کر جائے اور سب سے بڑی غلطی یہ ہو گی کہ صحیح رائے موجود ہونے کے ساتھ اس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے غلطی میں پڑے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ چراغ ہوتے ہوئے آدمی اپنی غفلت سے ٹھوکر کھائے۔ حضرت امام غزالی کا یہ قول کس قدر ٹھیک اور نصیحت بخش ہے کہ جس نے شک نہیں کیا وہ تحقیق

نہیں کرے گا اور جو تحقیق نہیں کرے گا وہ ہمیشہ اندھا رہے گا۔ اسی اندھے پن کے دور ہونے کا نام بصیرت، یقین، ایمان، ایقان، کشف غطا، اطمینانِ قلب اور ثلج صدر و علم و معرفت ہے۔ بلاشبہ شک کی تہ میں دو چیزیں ہیں جو تحقیق کی بنیاد ہیں، جہل اور اس کی ناگواری۔ جب انسان اپنے تقلیدی علم کی بے حقیقتی کو سمجھتا ہے تو وہ علم اس کو جہل معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے علم کو علم نہیں سمجھتا، اور جب اس پر یہ حالت پوری طرح طاری ہو جاتی ہے تو طبیعت فطرتاً علم کی خواہش مند ہوتی ہے۔ پس طالب حقیقت کو ایک طرف آزادی اور دوسری طرف وقعت رائے سلف کا خیال رکھ کر قدم رکھنا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ دونوں پہلو مخالف یکدیگر ہیں لہذا اگر ایک طرف اس نے زیادتی کی تو دوسری طرف کمی کر دے گا۔ یہی خیال کا اثر تھا اس شخص پر جس نے یہ کہا ہے کہ:-

مراد خضر عناں گیر باید از چپ و راست که خضر وہی نکنم ورنہ عزم راہ خطا است

پس کسی حکیم و امام کی ایسی رائے کے متعلق جو بادی النظر میں غلط معلوم ہوتی ہو زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہے اور سخت احتیاط درکار ہے۔ بالخصوص ایسے مسائل میں جو معرکۃ الآراء رہے ہیں، ورنہ طالب حق سلف سے فائدہ نہیں اٹھا سکے گا اور آزادی اس کو اس سے زیادہ سطحی بنا دے گی جتنا تقلید سے ڈر ہے۔ ممکن ہے کہ اس آزادی اور حریت بلکہ نام نہاد تحقیق سے زمانہ میں کسی کو "وقعت رائے سلف" کے حملہ سے استخفاف ہو سو اس کو قرآن حکیم میں سورہ حشر کی دسویں آیت وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ الخ پر غور کرنا چاہئے جس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ جو مہاجرین و انصار کے بعد عالم وجود میں آئے وہ سابقین کے لئے دعاء مغفرت کرتے ہیں اور کسی مسلمان بھائی کی طرف سے دل میں عداوت اور بغض نہیں رکھتے بلکہ ظنوا المومنین خیرا پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

لیکن آج یہ عالم ہے کہ بلا سوچے سمجھے سب پہلے سلف کی خدمات اور ان کی جد و جہد اور ناقابلِ نکا

ومحیر العقول علمی وعملی کارناموں پر تیشہ چلا دیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک یہ وبا دو طرح سے پھیلی۔ ایک تعلیم قرآن کی کمی، احادیث نبوی سے بے اعتنائی اور ان کے تراجم کی کثرت۔ دوسرے ایک محدود نصاب تعلیم اور انگریزی تمدن تہذیب کی تقلید وغیرہ۔ یقیناً مترجمین کی نیتیں صالح اور مقاصد بلند تھے لیکن اس کا دوسرا رخ نہایت خطرناک تھا جس کا تجربہ ومشاہدہ آج ہر ہر قدم پر ہو رہا ہے۔ ہاں یہ بات خیال میں رکھنی چاہئے کہ مروجہ نصاب تعلیم جس میں زیادہ تر جماعتی عصبیت کے ماتحت تعلیم دی جاتی ہے اس سے نہ تو تحقیق کا دروازہ کھل سکتا ہے اور نہ اجتہاد و تفقہ فی الدین کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہی ہوتا تو پھر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو ۸ سال تک صرف سورۂ بقرہ کے حقائق ومعارف بارگاہِ رسالت میں نہ حل کرنے پڑتے، نہ حضرت مجاہد بن جبیرؒ کو تین بار تفسیر قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے پڑھنے کی نوبت آتی، نہ ابو محمد عبداللہ بن عطیۃ الدمشقی المتوفی ۳۸۳ھ کو قرآن کے افہام وتفہیم کیلئے ۵۰ ہزار اشعار حفظ کرنے پڑتے، اور نہ امام ابن تیمیہؒ کو ایک ایک آیت قرآن پر سو سو تفسیریں دیکھنی پڑتیں اور پھر متروک وغیر آباد مسجد میں جاکر بارگاہ رب العزت میں "یارب ابراہیم فھمنی" کی دعائیں مانگنی پڑتیں اور اس وقت تک یہ مشغلہ جاری رہتا جب تک کہ شرح صدر نصیب نہ ہو جاتا[۱]، نہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ کو ۴۲ سال مسجد میں معتکف رہ کر درس وتدریس کلام الٰہی میں بسر کر دینے کی ضرورت تھی، نہ استاذ امام علامہ فراہیؒ کو ۳۰-۴۰ سال اس لیلائے مقصود کی طلب میں دل ودماغ کو محو کر دینا پڑتا۔

بلاریب وسائل وذرائع اور علوم الٰہیہ کی تحصیل کے بعد افہام وتفہیم کلام الٰہی کا واحد ذریعہ اگر کوئی چیز ہے تو وہ تزکیۂ نفس اور فیضان الٰہی ہے۔ اسی حقیقت کی جانب حضرت علامہ اقبالؒ اشارہ فرماتے ہیں:۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

آنحضرت صلعم کی صفت قرآن نے جابجا یہ بیان کی ہے، یَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ یہ تلاوت آیات، تزکیۂ نفس اور تعلیم کتاب وحکمت پر بھی کبھی غور

[۱] الرد الوافر

کیا گیا ہے؟ اس کا جواب خود شمع نبوت کے پروانوں کی زبانوں سے سنیئے۔

حرف از زبان دوست شنیدن چہ خوش بود یا از زبان آنکہ شنید از زبانِ دوست

حضرت ابو عبدالرحمٰن سلمیؓ صحابہ کرام کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلعم سے قرآن مجید کی دس دس آیات پڑھا کرتے تھے۔ الفاظ کے ساتھ عمل کا طریقہ بھی سیکھتے جاتے۔ جب ہم قرآن کا ایک حصہ ختم کرتے تو الفاظ و معانی کے ساتھ اس کے طریق عمل سے بھی واقف ہوتے جاتے[1]۔ حضرت عمر بن الخطابؓ فرماتے تھے کاش میں تین باتوں کی بابت تفصیلی معلومات آپ سے حاصل کر لیتا کہ آپ ہمیں فیصلہ کن معلومات دیتے۔ دادا کی میراث کا مسئلہ، کلالہ اور چند مسائل ربوا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں خدا کی قسم قرآن کی کوئی سورۃ ایسی نہیں جس کے متعلق مجھے یہ علم نہ ہو کہ کہاں اتری اور کس کے متعلق۔ اگر مجھے یہ علم ہو جائے کہ مجھ سے زیادہ کسی کو قرآن کا علم ہے اور سواری وہاں تک پہنچ سکے تو یقیناً اس کے پاس جا کر علم قرآن حاصل کروں۔ تمام صحابہ اس سے بخوبی واقف ہیں کہ میں سب سے قرآن کی بابت زیادہ واقف ہوں حالانکہ میں سب سے بہتر نہیں ہوں[2]۔ حبر الامۃ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے متعلق تو پوچھنا نہیں کیونکہ یہاں تو ملکوتی تائید "اللّٰھم علمہ الکتاب" حاصل تھی۔ ان واقعات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کا ادعائے علم قرآن اس دریا کے مقابل قطرہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلاشبہ آج وسائل و ذرائع کی فراوانی ہے تحصیل علوم و فنون کے لئے جو دشواریاں اگلوں کو تھیں وہ اب باقی نہیں رہیں۔ تاہم بارگاہِ رسالت سے بواسطہ او بلا واسطہ فیض پانے والوں کی ہمسری کا دعویٰ کون کر سکتا ہے؟ کہ یہاں تو فانھم ابرھذہ الامۃ قلوبا واعمقھا علما واقلھا تکلفا۔ اور شھداء اللہ علی الناس کی سند حاصل ہو چکی تھی۔

بہت ممکن ہے کہ کسی کو میری اس بات سے یہ گمان ہو کہ میں تفسیر کی ہر اس روایت کو صحیح سمجھتا ہوں جو بطریق حدثنا و خبرنا ابن جریر و درمنثور وغیرہ میں موجود ہے۔ سو میرا یہ خیال ہرگز نہیں ہے، اور یہ بھی

[1] ابن جریر [2] بخاری و مسلم

نہیں ہے کہ تمام کو ترک کر کے، خود ساختہ اصول کے ماتحت قرآن حکیم کے افہام و تفہیم کے صد ہا حقائق و معارف کو چھوڑ کر سلف کے طریق تفسیر کو بے معنی یقین کر لوں۔ کیونکہ مجھے علم ہے کہ تفسیری روایتوں میں سب سے زیادہ کمزور اور لغو طریق تفسیر کلبی ابو نصر محمد بن سائب کا ہے اور اگر محمد بن مروان سدی صغیر کی روایت کو شامل کر لیا جائے تو یہ سلسلہ پورا کا پورا سلسلۂ کذب بن جاتا ہے۔ اسی طرح طریق مقاتل بن سلیمان ازدی اور ضحاک بھی منقطع ہے۔ بے شک طریق قیس بن مسلم کوفی جو عطا بن سائب سے روایت کرتے ہیں اور طریق ابن اسحٰق جید اور صحیح ہیں۔ صحابہ میں جن سے تفسیری روایتیں کم ہیں وہ انس بن مالکؓ، ابو ہریرہؓ، عبداللہ بن عمرؓ، جابر بن عبداللہؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، زید بن ثابت کاتب وحیؓ ہیں۔ تابعین میں اصحاب عبداللہ بن عباس یعنی علمائے مکہ مکرمہ ہیں جن میں مجاہد بن جبیر المتوفی ۱۰۳ھ کی تفسیر پر امام شافعی اور امام بخاری وغیرہ نے اعتماد کیا ہے۔ علامہ ابن جوزیؒ اور سیوطیؒ وغیرہ نے طبقات مفسرین میں حقیقت بالا کا ذکر کیا ہے جس سے میرے بیان کی تائید ہوتی ہے جو اہل علم پر مخفی نہیں۔

قرآن حکیم نے مختلف مقامات پر تدبر و تفکر کی جو ترغیب دلائی ہے سو اس کا یہ مقصد نہیں کہ علوم الٰہیہ اور سنن نبویہ، و اشارات سلف کو ترک کرتے ہوئے حسبنا کتاب اللہ کی آڑ میں اپنے اہواء و خواہشات کے ماتحت قرآن کی تفسیر شروع کر دی جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہدایت کے بجائے ضلالت کی نشر و اشاعت ہوگی اور شاید اسی لئے قرآن نے بھی يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور شارع علیہ السلام نے اس کی تشریح من قال فی القرآن برأیہ الخ سے فرما کر ہمیشہ کے لئے اس خطرہ کا سد باب کر دیا ہے۔

مجھے اس وقت اصول تاویل پر گفتگو کرنی نہیں ہے تفصیل کے لئے فوز الکبیر وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے۔ مختصراً یہ مد نظر رکھنا چاہئے کہ قرآن کی تفسیر جہاں تک ممکن ہو قرآن کی دوسری آیات سے کرنی چاہئے۔ پھر نظم کلام، سیاق و سباق آیات، شواہد کلام عرب، سنن و آثار نبویہ، اور طریق تفسیر اصحاب رسول اللہ صلعم

کے ماتحت مفہوم کلام الٰہی کا سراغ لگایا جائے۔ اور قرآن حکیم کو اصل قرار دیتے ہوئے تاریخی شواہد کے لئے اگر اسفار یہود سے بھی مدد لی جائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔ بہرحال ان سب میں مقدم ترین اصول تحصیل زبان عربی کے ساتھ ساتھ تزکیۂ نفس اور تدبر و تفکر آیات انفس و آفاق ہے۔ جس کے بغیر نحو و بلاغت قرآن اور روح و اسرار کلام الٰہی سمجھنا دشوار ہے۔

سلسلہ خلاف امید دراز ہوگیا اور بات سے بات نکل آئی۔ یہاں مجھے جس چیز پر کسی قدر مفصل کلام کرنا ہے وہ سنن و آثار نبوی علیہ الصلوۃ والتسلیم ہیں۔ اگرچہ ائمہ سلف اور علمائے دور حاضر نے اس کے اصول و قوانین، نوعیت و حیثیت اور حجت دینی ہونے پر کافی سے زیادہ بحثیں فرمائی ہیں اور داد تحقیق دی ہے جو اپنی جگہ پر براہین قاطعہ ہیں لیکن افسوس مخالفین نے سطحی معلومات سے کام لے کر عوام میں سنن و آثار نبوی سے بدظنی پیدا کر دی جو تمام تر غلط فہمی و قلت مطالعہ پر مبنی ہے، ورنہ اصول حدیث کے ماله وما علیہ کے سمجھ لینے کے بعد وہ جرأت نہیں ہوسکتی جو موجودہ عہد تحقیق میں کی جارہی ہے۔ یہ ناچیز کوئی نئی بات نہیں پیش کرے گا بلکہ اہل علم کی ان تحقیقات کو سامنے لائے گا جو معرض خفا میں ہیں تاکہ فیصلہ کرنے میں حق و باطل کی تمیز ہوسکے۔ السعی منی والاتمام من اللہ تعالیٰ۔

اصول حدیث یہ ایک تاریخی بات ہے کہ حضرت امام شافعی نے سب سے پہلے اصول فقہ میں ایک رسالہ لکھا اور اصول حدیث میں ابتدا قاضی ابو محمد رامہرمزی اور حاکم ابو عبداللہ نیشاپوری نے کی۔ پھر تو یہ قطرہ دریا بن گیا۔ مگر ان سب کا ماخذ قرآن کریم اور سنن و آثار نبوی ہی تھی جس کو غلطی سے آج کچھ اور ہی سمجھ لیا گیا ہے۔ سب سے بڑی خصوصیت اس فن کو یہ حاصل ہے کہ اس کے اندر اجتہاد، ظن اور تخمین کو قطعاً باریابی نہیں بلکہ یا تو مشاہدات ہیں یا مسموعات وغیرہ۔ تفصیلی بحث آگے آئے گی جس سے معلوم ہوگا کہ محدثین الفاظ جرح و تعدیل جو کچھ بیان فرماتے ہیں سب کی بنیاد محسوس مشاہدہ اور کسی نصی امر پر ہے نہ کہ رائے و قیاس پر۔ ثبوت میں ذیل کے شواہد کو بغور ملاحظہ کیا جائے کہ یہی اصول حدیث کی

اساس اور بنیاد ہیں۔

(۱) یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَاۗءَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْا الخ

لفظ فسق باصطلاح قرآن متعدد معنوں میں مستعمل ہے۔ آیات ذیل پر غور کیا جائے: اَفَمَنْ کَانَ مُؤْمِنًا کَمَنْ کَانَ فَاسِقًا۔ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّہٖ۔ فَفَسَقُوْا فِیْھَا۔ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِیْنَ۔ وَلَا تَقْبَلُوْا لَھُمْ شَہَادَۃً اَبَدًا اُولٰۗئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ۔ اِنْ جَاۗءَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّہٗ فُسُوْقٌ بِکُمْ۔ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ۔

احادیث میں بھی یہ لفظ آیا ہے۔ سباب المؤمن فسوق۔ اقتلوا الفویسقۃ۔ لا یرمی رجل رجلا بالفسق او الکفر۔ اہل عرب کا قول ہے "فسق الرطب اذا خرج عن قشرہٖ" یعنی خرمے کا چھلکے سے علٰحدہ ہوجانا چنانچہ ابن الاعرابی کہتا ہے کہ "فاسق کا لفظ انسان کی صفت میں کلام عرب میں نہیں پایا جاتا ہے"۔ بہرحال ارباب لغت وغیرہ نے "فسق فلان خرج عن حجر الشرع" "الترک لامر اللہ" "الخروج عن طریق الحق" "من بسترنعمۃ اللہ فقد خرج عن طاعتہ" وغیرہ کے الفاظ جو استعمال فرمائے ہیں اس کی اصلیت کلام عرب اور لفظ کے اصلی معنی سے ماخوذ ہے۔ رہ گیا مفہوم آیت اِنْ جَاۗءَکُمْ الخ سو وہ یہ ہے کہ اکثر نزاعات ومناقشات کی ابتدا جھوٹی خبروں سے ہوتی ہے اس لئے اول اختلاف وتفریق کے اسی سرچشمہ کو بند کرنے کی تعلیم دی یعنی کسی خبر کو یوں ہی بے تحقیق قبول نہ کرنا چاہئے۔ امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں اس آیت کو بھی ذکر فرما کر یہ عبارت تحریر فرمائی ہے: فدل بما ذکرنا من ھذہ الآی ان خبر الفاسق ساقط غیر مقبول وان شہادۃ غیر العدل مردودۃ۔ مفہوم اصح ہے۔ مگر حافظ ابن تیمیہؒ کی تقریر ذیل پڑھ کر تھوڑی سی الجھن بڑھ گئی "نبأ الفاسق لیس بمردود

...... وانما امر بالتبیین عند خبر الفاسق الواحد ولم یامر به عند خبر الفاسقین وذالک ان خبر الاثنین یوجب من الاعتقاد مالا یوجب خبر الواحد الخ (توجیہ النظر صفحہ ۲۹)۔

بظاہر یہ تقریر قدما محدثین کے خلاف ہے۔ غالباً اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ آیت اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌ الخ کی تاویل علامہ موصوف کے نزدیک اور ہے اور محدثین کے نزدیک اور۔ خیر امام ابن تیمیہؒ کا جو بھی منشا ہو میرے نزدیک صحیح توجیہ یہ ہے کہ خبر فاسق نقل و روایت حدیث میں سرے سے غیر مقبول ہے چاہے سامع کے دل میں اس کی صداقت پیدا ہو یا نہ ہو۔ وجہ یہ ہے کہ خبر تو محض ترجیح صدق ہی کی بنا پر حجت ہوتی ہے بخلاف فسق کے کہ اس سے ترجیح صدق کا قلع قمع ہوجاتا ہے اور کذب ہی کا پہلو راجح قرار پاتا ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ جب عقل اور دین نے اس کو ارتکاب گناہ سے باز نہیں رکھا تو پھر جھوٹ سے کیسے بچ سکتا ہے۔ بدیں وجہ فاسق کی خبر قطعاً حجت نہ ہونی چاہئے۔ ہاں اگر وہ حلت و حرمت طعام یا پانی کی نجاست و عدم نجاست کی خبر دے تو اس وقت قبول ہوگی جبکہ اس کی تائید زبردست رائے سے ہوتی ہو۔ وجہ یہ ہے کہ حلت و حرمت، نجاست و طہارت ایک امر خاص ہے بمقابل روایت حدیث کے، کیونکہ خبر کے متعلق بسا اوقات ایسی دشواریاں لاحق ہوتی ہیں کہ اس پر وقوف و اطلاع پانا متعذر ہوتا ہے۔ اسی لئے جب تک دوسرے قرائن اور شواہد سے تائید نہ ہو قبول نہیں کی جاسکتی وغیرہ وغیرہ۔ اور روایت حدیث میں اس کی ضرورت نہیں کیونکہ یہاں تو عادل اور ثقہ نے تلقی اور نقل اخبار ایسے لوگوں سے کی ہے جن کو معرفت حدیث پر سماعاً پوری اطلاع حاصل ہے لہذا ان کو فاسق کی خبر پر اعتماد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس تقریر سے یہ واضح ہوگیا کہ عام خبریں اور شہادتیں دوسری چیز ہیں اور روایت حدیث امر دیگر۔ لہذا علامہ موصوف کی تقریر کو ان امور و اخبار پر محمول کیا جائے گا جن کا روایت حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

روایت اور شہادت کا فرق اس موقع پر روایت اور شہادت کے فرق کو سمجھ لینا چاہئے جس سے صدہا اشکلات

کا حل ہو جاتا ہے اور جس میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے بہتوں نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ علامہ سیوطیؒ نے تدریب میں مفصلاً اور حافظ ابن قیمؒ نے بدائع الفوائد میں مجملاً بحثیں کر کے شہادت اور روایت کے فرق کو واضح کیا ہے۔ اصل کتاب کی جانب رجوع کرنا چاہئے۔ مباحث علم حدیث کے سمجھنے کے لئے چند اصولی فروق کو یہاں لکھا جاتا ہے:-

روایت نام ہے عام لوگوں کو خبر دینے کا کہ جس کا مرافعہ حکام کی طرف نہ کیا جا سکے۔ بخلاف شہادت کے کہ اس میں یہ بات نہیں ہوتی اور اسی بنا پر احکامات میں آگے چل کر اختلاف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح روایت میں عدد شرط نہیں ہے اور شہادت میں یہ بحث پیدا ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سواد امت آنحضرت صلعم پر کبھی جھوٹ کی نسبت نہیں کر سکتی کیونکہ اسے ہر طرح کا خوف اور خطرہ ہے جو دارین کی ہلاکت اور تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ بخلاف شہادت کے کہ دن دھاڑے جھوٹی گواہی لوگ دیتے رہتے ہیں[۱]۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ کبھی راوی منفرد ہوتا ہے۔ اگر ایسی حالت میں روایت قبول نہ کی جائے تو اہل اسلام کی صدہا مصلحتیں فوت ہو جائیں بمقابل اس بات کے کہ ایک شخص کا حق ایک شخص کی وجہ سے ضائع ہو جائے تو چنداں مضائقہ نہیں نیز یہ وجہ بھی ہے کہ لوگوں میں باہم عداوتوں کی بنا پر جھوٹی گواہی دینے کا جذبہ پیدا ہوتا رہتا ہے نہ کہ آنحضرت صلعم سے جھوٹ روایت کرنا وغیرہ۔ روایت میں ذکوریت شرط نہیں ہے بخلاف شہادت کے کہ اس میں

[۱] ترجمان القرآن۔ یہ حجت محل نظر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ امت کا سواد اعظم نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان باندھنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ مگر احاد امت نے ایسا کیا ہے اور امت نے اکثر دھوکا بھی کھایا ہے۔ اعداء دین تو خیر قصداً شرارت کی نیت سے حدیثیں گھڑیں، مگر کیا واعظوں اور زاہدوں نے موضوعات اور ضعاف کو تکیۂ کلام نہیں بنایا؟ اور کیا ان حضرات کے اعتماد پر غیر معتبر روایتیں عامۃ الناس کے زبان زد نہیں ہوئیں؟ اسی بنا پر تو محدثین نے روایات کی چھان بین میں اس سے زیادہ سختی کی ہے جس قدر قانون شہادت کی رو سے قاضی کرتا ہے۔ اور اسی بنا پر اخبار احاد کا حدیث میں وہ درجہ نہیں جو مشہورات کا ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ خبر واحد کو محض خبر واحد ہونے کی وجہ سے رد نہیں کر دیا گیا، بلکہ راویوں کے احوال اور سلسلہ اسناد کی کیفیت کو دیکھ کر رائے قائم کی گئی ہے جو سراسر معقول ہے۔

بعض مواقع میں ذکوریت شرط ہے۔ اسی طرح جھوٹ سے توبہ کرنے والے کی شہادت مقبول ہے لیکن روایت غیر مقبول۔ اگر کوئی ایک روایت میں جھوٹا ثابت ہوگیا تو اس کی تمام روایات غیر مقبول ہوجاتی ہیں۔ بخلاف شہادت کے کہ اگر ایک شہادت جھوٹی معلوم ہوجائے تو اس سے پہلے کی شہادتیں رد نہیں کی جاتیں۔ اہل علم پر مخفی نہیں کہ صحیح مذہب کی بنا پر تنہا ایک شخص کی جرح و تعدیل روایت میں معتبر ہوجاتی ہے نہ کہ شہادت و رگواہی۔ غور کرو اگر کسی نے روایت کی اور پھر اس سے رجوع کرلیا تو روایت اور عمل دونوں ساقط ہوجاتے ہیں لیکن شہادت میں یہ بات نہیں ہوتی ہے۔ بہاں تو حکم کے بعد رجوع کرہی نہیں کرسکتا۔ اس فرق کو سمجھو تاکہ فن حدیث کی اہمیت کا اندازہ ہو اور آنے والے مباحث کے پیچ و خم ایک ایک کرکے واضح ہوجائیں۔

(۲) یَحْکُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ۔ وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ۔ لفظ عدل کی لغوی تحقیق طویل ہے۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ مختلف مقامات پر بیان ہوا ہے۔ سورہ مائدہ کی ایک آیت میں یہ لفظ دو جگہ موجود ہے۔ یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا الخ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عبادات ہوں خواہ معاملات، اخلاقیات ہوں خواہ سیاسیات، مذہب سب کا ضامن اور قرآن مہیمن ہے۔ قرآن کریم کا یہ حکم ہے کہ تم میں سے وہ لوگ ایسے امور میں فیصلہ کریں جو صاحب بصیرت، معتبر، اور تجربہ کار ہوں کیونکہ یہ چیزیں ایسی ہیں جن سے ایک شخص کے کیرکٹر کی بلندی، صداقت اور اس کے عادل ہونے کی شہادت دی جاسکتی ہے، جو عند اللہ معتبر ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ عند الناس معتبر نہ ہو۔ ہاں بعضوں کو یہ طالب علمانہ شبہہ ہوسکتا ہے کہ "متقی اور عادل وغیرہ ہونا اوصاف باطنی ہیں۔ اس کی تمیز کس چیز پر رکھی جائے؟ رہا ظاہری تقویٰ و طہارت تو اس کی بابت خود محدثین لوگ مجرب ہیں"۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آیات بالا کے عموم سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ظاہر پر حکم نہ دینا اور باطن پر معلق رکھنا تکلیف مالا یطاق ہے۔ لَا یُکَلِّفُ

اللہ نفسا الا وسعھا۔ پھر کیا یہ حکم مصلحت و حکمت خداوندی کے خلاف نہیں ہے؟ خدا تو حکم دیتا ہے کہ تم میں سے دو عادل شخص اس پر حکم لگائیں۔ اب کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ عدالت کا علم نہیں ہو سکتا لہذا خدا کا یہ حکم نعوذ باللہ بے معنی اور لائق اعتماد نہیں ہے؟ کیا آیات مذکورہ میں محض تصرف باطنی کا حکم ہے یا محض ظاہر بینی کا؟ خوب غور کر لیا جائے تاکہ یحکم بہ ذوا عدل منکم کا مفہوم واضح ہو جائے۔ بخاری میں ہے "عن عبد اللہ بن عمر عن سعد بن وقاص عن النبی صلعم انہ مسح علی الخفین وان عبد اللہ بن عمر سأل عمر عن ذلک فقال نعم اذا حدثک شیئاً سعد عن النبی صلعم فلا تسأل عنہ غیرہ۔ نیز بیہقی نے مدخل میں حضرت عبد اللہ بن عباس سے مرفوعاً اور موقوفاً روایت کیا ہے "لا تاخذ وا العلم الا ممن تقبلون شہادتہ" وروی ایضا من طریق الشعبی عن ابن عمر عن عمر قال کان یامرنا ان لا ناخذ الا عن ثقۃ۔

لفظ ثقہ کوئی غیر مانوس لفظ نہیں ہے، بلکہ اس کی اصل کلام عرب میں پائی جاتی ہے۔ زہیر کہتا ہے:-

اخو ثقۃ　لا تہلک الخمر مالہ　　ولکنہ قد یہلک المال نائلہ

اس کی جمع ثقات وغیرہ آتی ہے یعنی قابل اعتبار، دیانت دار، اور معتبر لوگ۔ لہذا سمجھ لینا چاہئے کہ محدثین کرام جب اس لفظ کو بولتے ہیں تو تنہا یہ لفظ قبول روایت کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اور یہ ایک ایسا وصف ہے کہ دنیا میں خبروں کے رد و قبول کے لئے ہر جگہ مسلم ہے، اسی وصف کو ہر شخص ہر خبر دینے والے میں دیکھتا ہے اور عرفاً اس کے مفہوم کو بھی جانتا ہے۔ مگر کسی قوم نے مسلمانوں سے بڑھ کر اس کا عملاً لحاظ نہیں کیا چنانچہ علامہ ابن حزم بالکل صحیح فرماتے ہیں :-

"نقل الثقۃ عن الثقۃ حتی تبلغ بہ النبی صلعم مع الاتصال خص اللہ بہ المسلمین دون سائر الملل"[1]

خلاصہ یہ ہے کہ محدثین جب لفظ عدالت بولتے ہیں تو اس کے متداول معنی مراد نہیں ہوتے بلکہ صرف

[1] تدریب

عدالت فی روایت الحدیث مراد ہوتی ہے۔ اور اس عدالت کی حقیقت روایات میں اجتناب عن الکذب ہے
شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ راویوں کو سچا سمجھنا تو خود محدثین کی رائے ہے جو محض ظنی اور اجتہادی چیز ہے۔ سو اسے
معلوم ہونا چاہئے کہ شخص عادل وضابط کے بیان پر وثوق کرنا اور سچا سمجھنا تو نصی اور اتفاقی مسئلہ ہے صرف
اہل اسلام کا نہیں بلکہ تمام دنیا کا۔ گواہ عادل کی گواہی پر حکم لگانا نصی اور اتفاقی بات ہے۔

نصوص پر ایک اجمالی نظر

(۳) یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَتَبَیَّنُوْا (۴) لِمَنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ (۵) لَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا وَّقَالُوْا هٰذَا اِفْكٌ مُّبِیْنٌ (۶) وَلَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا یَكُوْنُ لَنَا اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ (۷) لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِیْنَ (۸) لَقَدْ كَانَ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۹) وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (۱۰) کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع (۱۱) من کذب علی متعمدا فلیتبوء مقعدہ من النار (۱۲) نضر اللہ امرأ سمع مقالتی فوعاها واداها (۱۳) من رغب عن سنتی فلیس منی (۱۴) لیبلغ الشاهد الغائب (۱۵) ارجعوا الی اهلیکم فعلموهم (۱۶) صلوا کما رأیتمونی اصلی (۱۷) بلغوا عنی ولو آیة وحدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج (۱۸) من حدث عنی بحدیث یری انه کذب فهو احد الکاذبین۔

ان نصوص پر غور کرنے اور ان کے صریح اور لطیف اشارات کو مدنظر رکھنے سے مندرجہ ذیل باتیں بادنیٰ تامل سامنے آجاتی ہیں،

(۱) قرآن حکیم کے حکم وَذَكِّرْهُمْ بِاَیّٰمِ اللّٰهِ وغیرہ آیات نے مسلمانوں کو فن حدیث کی طرف متوجہ کیا اور لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ نے آتش بر روغن کا کام دیا۔

(۲) نصوص بالا ہی نے مجبور کیا کہ سنن و آثار نبوی کے تحفظ کے لئے اصول و قوانین مرتب و منظم شکل میں پیش کئے جائیں جو ذریعہ ہوں آنحضرت صلعم کے اقوال و افعال کے تحفظ کا۔

(۳) قانون تنقید کی ایجاد، احکامات اور فضائل و ہدایات جن کو آنحضرت صلعم نے وقتاً فوقتاً ارشاد فرمایا تھا اور جو درحقیقت انہیں نصوص بالا کی تفسیریں ہیں، ان کو بقا اور دوام حاصل ہونا۔

(۴) آنحضرت صلعم کے ساتھ صحابہ کی محبت، ان کا اخلاص اور جوش فدویت و شغف جس نے اصحاب رسول اللہ صلعم کو آنحضرت صلعم کی ہر ادا کا شیدا بنا دیا تھا۔ اس لئے ضرورت داعی ہوئی کہ مستقل قوانین و اصول کے ماتحت آئندہ تحریف اور تصحیف سے آپ کے ارشادات کو پاک رکھا جائے۔

(۵) محدثین نے رواۃ کی نسبت جو کچھ الفاظ جرح و تعدیل بیان فرمائے ہیں تمام کی بنا حس اور مشاہدہ ہے نہ کہ رائے و قیاس۔ بلکہ زیادہ تر تجربیات ہیں۔ قرآن نے خود تجربہ کے لئے امارات بتائے، چنانچہ آیت ۹ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز حسی اور مشاہدات سے ہے۔ غرض جو کچھ ثقاہت و عدالت کی نشانیاں قرآن میں بتائی گئی ہیں یا احادیث میں وارد ہوئی ہیں وہ سب حسی او مشاہدات سے ہیں۔ پس ان امارات و علامات سے ثقاہت و عدالت ثابت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ نفسی امر ہے۔ ان امارات ثقاہت و عدالت کے ساتھ عدم ظہور فسق اور غیر متہم ہونا ان امارات کا موثق اور مصدق ہے۔ راوی اور مروی عنہ کی معاصرت، ان کا آپس میں لقا، سماع، یہ سب امور مسموعات یا مشاہدات سے ہیں۔ دو شخصوں کی معاصرت یا آپس کے ملنے جلنے اور سماع کو شخص حاضر رویت و مشاہدہ سے جانتا ہے۔ غائب حاضر کی شہادت سے جان سکتا ہے۔ رواۃ کا ثقہ ہونا حاضرین کو ملاقات اور تجربہ سے معلوم ہوتا ہے اور غائبین کو ان کی شہادت اور ان کے درمیان شہرت سے۔ پس کسی محدث کا کسی حدیث کو صحیح یا ضعیف یا موضوع وغیرہ کہنا مسائل اجتہادیہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ فقیہ اپنی رائے و قیاس پر خود ایسا اعتماد نہیں رکھتا کہ حتمی حکم لگائے اور عمل کرنا واجب قرار دے۔ بخلاف محدثین کے کہ وہاں روایت کے صحیح ثابت ہو جانے پر عمل کرنا واجب ہو جاتا ہے" انھم اتفقوا علی وجوب

العمل بکل ما صح، یعنی تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ جو حدیث آنحضرت صلعم سے صحت کو پہنچ جائے گی اس پر عمل واجب ہوگا۔

یہ ایک اجمالی نقشہ تھا جو پیش کیا گیا۔ اصحاب رسول اللہ صلعم نے انہیں نصوص سے اصول حدیث اور قواعد روایت استنباط فرمائے۔ احادیث کی تحقیق و تنقید اور فن جرح و تعدیل کی ایجاد خود حضرت عمر فاروقؓ نے کی ہے۔

واقعات ذیل پر غور کیا جائے:۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ایک مرتبہ آپ سے ملنے آئے اور تین دفعہ استیذان کے قاعدہ پر السلام علیکم فرمایا حضرت عمرؓ اس وقت کسی کام میں مصروف تھے اس لئے متوجہ نہ ہوئے۔ کام سے فارغ ہو چکنے کے بعد فرمایا کہ ابوموسیٰ کہاں ہیں؟ وہ آئے تو فرمایا کہ کیوں واپس گئے؟ ابوموسیٰؓ نے کہا میں نے رسول اللہ صلعم سے سنا ہے کہ تین مرتبہ اذن مانگو، اگر اس پر بھی اجازت نہ ملے تو واپس جاؤ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس روایت کا ثبوت دو ورنہ میں سزا دوں گا۔ ابوموسیٰ اشعریؓ گھبرائے ہوئے صحابہ کے پاس گئے اور نفس واقعہ بیان کیا۔ حضرت ابوسعید خدریؓ نے آکر تصدیق کی کہ میں نے آنحضرت صلعم سے یہ حدیث سنی ہے۔ ابی بن کعب نے فرمایا عمر تم رسول اللہ صلعم کے اصحاب کو عذاب دینا چاہتے ہو؟ فرمایا میں نے ایک روایت سنی اور اس کی تصدیق کرنی چاہی۔ چنانچہ جب سقط کا مسئلہ پیش آیا تو حضرت عمرؓ نے صحابہ سے مشورہ طلب کیا مغیرہ بن شعبہؓ نے اس کے متعلق ایک حدیث روایت کی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم سچے ہو تو اور کوئی گواہ لاؤ۔ جب محمد بن مسلمہ نے تصدیق کی تب حضرت عمرؓ نے تسلیم کیا۔ اسی طرح حضرت عباسؓ کے مقدمہ میں ایک حدیث پیش کی گئی تو حضرت عمرؓ نے تائیدی شہادت طلب کی۔ لوگوں نے شہادت دی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا مجھ کو تمہاری نسبت بدگمانی نہ تھی لیکن میں نے حدیث کے متعلق اطمینان کرنا چاہا۔ غرضیکہ حضرات خلفائے اربعہ نے اسی اصول کے ماتحت ضرورت کے وقت صحابہ سے استفسار فرما کر احادیث و فیصلۂ نبوی کی

جستجو وتحقیق فرمائی۔ یہ اور اس طرح کے کتنے واقعات ہیں جن سے روایات کے رد وقبول پر روشنی پڑتی ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ لوگوں نے ان واقعات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مخلوق الٰہی کو سنن وآثار نبوی سے بدظن کردینے کی کوشش کی ہے، حالانکہ انھیں اگر تحقیق مدنظر ہے تو اس کا موقع قیامت تک ہے۔ کر دیں۔ لیکن تصویر کے ہر رخ پر نظر رکھتے ہوئے قدم اٹھائیں اور جس طرح اپنے مدعا کے ثبوت میں کتب طبقات ورجال وغیرہ سے دلائل پیش کرتے ہیں خدارا اسی جگہ دوسرے رخ کو بھی ملاحظہ فرمالیں۔ یہ عیب کی بات ہے کہ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ پر عمل کیا جائے اور اس کا نام تحقیق واجتہاد رکھا جائے اس طرح کے جملہ شکوک وشبہات پر مفصل بحثیں تذکرۃ الحفاظ، فتح الباری، اور جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبدالبر، وتاویل مختلف الحدیث وغیرہ میں پوری دیانت اور ایمانداری کے ساتھ موجود ہیں جن کے اعادہ کی ضرورت نہیں ستم تو یہ ہے کہ حضرات شیخینؓ پر یہ اتہام لگایا جاتا ہے کہ روایت حدیث کے مخالف تھے لیکن انہیں کیا معلوم کہ خود حضرت ابوبکرؓ سے (۱۴۲) اور حضرت عمرؓ سے (۵۳۷) احادیث مروی ہیں[1] نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے تو خلیفہ اول ؓ کی مرویات کو آٹھ سو بیان فرمایا ہے[2]۔

اصحاب رسول اللہ صلعم کو اپنی ذمہ داری اور رسول اللہ صلعم پر غلط گوئی سے بچنے کی اس درجہ احتیاط تھی کہ جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ صرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اس واقعہ کو سامنے رکھئے۔ عمر بن شیبانی کہتے ہیں کہ میں ابن مسعودؓ کے پاس بیٹھا کرتا تھا وہ قال رسول اللہ کبھی نہیں کہتے تھے اور جب قال رسول اللہ کہتے تھے تو مارے ڈر کے کانپنے لگتے تھے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ نے اس طرح فرمایا یا ایسا ہی فرمایا یا تقریباً ایسا ہی فرمایا، یا۔ یا۔ یا۔ اس کامل احتیاط کے باوجود آپ سے (۸۴۸) احادیث مروی ہیں[3] حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اپنے تلامذہ کو تاکید فرماتے کہ روایت حدیث میں کسی طرح بے احتیاطی نہ ہونے پائے۔ علماء نے لکھا ہے، یُشدد فی الروایۃ ویزجر تلامذتہ عن التھاون فی ضبط

[1] تلقیح فہوم الاثر [2] تقصار جیود الاحرار صفحہ ۷ [3] تلقیح فہوم الاثر۔

الالفاظ" چنانچہ اسی احتیاط کی بنا پر ایک صحابی دوسرے صحابی کو غلط فہمی کے سوا کذب کا مصداق نہیں ٹھہراتا تھا۔ تاہم عامہ صحابہ کا خوف یکساں نہ تھا اور نہ سب کی طبیعت یکساں ہونی ممکن ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم سیرۃ رسول سے بالکل محروم رہ جاتے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کا واقعہ بخاری میں موجود ہے فرماتے ہیں، لو وضعتم الصمصامۃ علی ھذہ واشار الی قفاہ ثم ظننت انی انفذ کلمۃ سمعتھا من النبی صلعم قبل ان تجیزوا علی لانفذتھا" یہ ہیں وہ واقعات جن کی روشنی میں اصول حدیث کی اہمیت اور ناقابل تردید جدوجہد کا سراغ ملتا ہے کہ یہ فن کس قدر اپنے اندر صحیح اور علمی حقائق و معارف رکھتا ہے۔ (باقی)

تنزیل و تاویل

امثال القرآن

از جناب مولوی محمد ایوب صاحب جیراجپوری

[قرآنی مباحث میں امثال کی جو اہمیت ہے اس کا اندازہ قرآن کے ہر طالب علم کو ہوگا۔ یہ مثلیں اپنے اندر بے شمار اسرار اور حقائق کا خزانہ رکھتی ہیں، جن کے سمجھنے کے بعد قرآنی اعجاز بلاغت کا کمال معلوم ہو سکتا ہے۔ علامہ ابن قیمؒ کا نام قرآنی بصیرت رکھنے والوں میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ موصوف کی مجتہدانہ ژرف نگاہی اور قرآن فہمی کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اپنی تصنیف اعلام الموقعین میں انھوں نے ایک مفید بحث خاص امثال القرآن کے متعلق فرمائی ہے۔ عام استفادہ کی خاطر اس کا آزاد ترجمہ ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں (ایوب جیراجپوری)]

تمثیل کی غرض یہ ہوتی ہے کہ کسی غیر واضح اور غیر محسوس حقیقت کو مخاطب کے فہم سے قریب تر لانے کیلئے کسی ایسی چیز سے تشبیہ دی جائے جو واضح اور محسوس ہو۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھو کہ جو چیز عام نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہے تمثیل کے ذریعہ سے گویا اس کا مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں یہ طرز بیان بڑی کثرت کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے کیونکہ جن حقائق سے وہ آگاہ کرنا چاہتا ہے وہ قریب قریب سب کے سب غیر مرئی و غیر محسوس

ہیں۔ لہذا قرآن مجید کی تمثیلات کا مضمون بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس میں تدبر کرنا مطالب قرآن کو سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔

(۱) قرآن منافقین کے بارے میں کہتا ہے :-

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ۝ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝ أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ۝ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (بقرہ - ۲)	ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی پھر جب اسکے آس پاس کی چیزیں چمک اٹھیں تو اللہ نے ان کا نور سلب کر لیا اور ان کو تاریکیوں میں چھوڑ دیا کہ ان کو کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ بہرے گونگے اندھے ہیں کہ وہ پھر (راہ راست پر) نہیں آ سکتے یا مثلاً آسمانی بارش آئی جس میں تاریکیاں ہیں اور گرج اور بجلی کڑک کا یہ حال ہے کہ وہ جان کے خوف سے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں اور چمک کا یہ زور ہے کہ آنکھیں اندھی ہوئی جاتی ہیں۔ اور کافروں کو چاروں طرف سے اللہ نے گھیر رکھا ہے۔ جب جب انکے آگے بجلی چمکی وہ اس کی روشنی میں کچھ دور چل لئے اور جب ان پر تاریکی چھا گئی تو کھڑے (کے کھڑے) رہ گئے۔ اور اگر اللہ چاہے تو ان کی سننے اور دیکھنے کی قوتیں سلب کرے بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے منافقین کے حسب حال دو مثلیں بیان کی ہیں۔ ایک ناری دوسری آبی۔ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ اس میں فلسفہ ہدایت کی گہری حکمت پنہاں ہے۔ یہی دونوں چیزیں (آگ اور پانی) روشنی اور زندگی کا سرچشمہ ہیں۔ آگ روشنی کی اصل ہے اور پانی زندگی کی اصل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی وحی کے متعلق فرماتا ہے کہ اس کے اندر دلوں کے لئے زندگی اور نور ہے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام اس نے روح

اور نور رکھا ہے۔ اسے قبول کرنے والوں کو "احیاء" (زندہ) کہتا ہے جو روشنی میں ہیں، اور منکرین کو "اموات" (مردہ) بتاتا ہے جو تاریکی کی وادیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ یہاں منافقین کی حالت اس مناسبت سے بیان کی ہے کہ انھوں نے وحی الٰہی کو دلیل راہ بنایا لیکن اپنی ہی خریدی ہوئی بدبختیوں کی بدولت اس پر قائم نہ رہ سکے اسی لئے ان کو اس شخص کے مشابہ قرار دیا ہے جس نے آگ جلائی روشنی حاصل کرنے اور بہرہ مند ہونے کے لئے لیکن اس کی یہ کوشش نتیجہ خیز نہ ہوئی منافقین کی حالت اس سے بالکل ملتی جلتی ہے بایں طور کہ انھوں نے دائرہ اسلام میں قدم رکھا، اس کی روشنی میں چلنا چاہا، فوائد حاصل کئے، اس کے دامن میں پناہ لی اور مسلمانوں میں مل گئے لیکن چونکہ اس میل ملاپ کا محرک کوئی ایمانی جذبہ نہ تھا جس کا نور ان کے دلوں میں واقعۃً موجود ہوتا اس لئے اللہ نے اسلام کی یہ روشنی ان کے دلوں سے بجھا دی اور ان پر ظلمت و تاریکی کا پردہ ڈال دیا۔ ذرا قرآن کی اس حکمت پر بھی ایک نظر ڈالو کہ اس نے "ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُورِهِمْ" (ان کی روشنی زائل کردی) کہا ہے "بنارھم" یعنی ان کی آگ بجھا دی نہیں کہا۔ آگ کی خاصیت روشنی بخشنا اور جلانا دونوں ہے سو اللہ نے روشنی تو ان سے سلب کرلی اور جلانے کی تاثیر باقی رکھی اور ان کو تاریکیوں میں بھٹکتا چھوڑ دیا۔ یہی اس شخص کی صحیح تصویر ہے جس نے بینائی سے کام لیا پھر آنکھوں پر خود ہی پٹی باندھ لی۔ معرفت و ہدایت کی سعادت حاصل کی پھر خود ہی انکار و تکذیب کی لعنت اوڑھ لی۔ حدودِ اسلام میں داخل ہوا پھر باطنی لحاظ سے آپ ہی آپ الٹے پاؤں پھر گیا اور ادھر کا رخ نہ کیا۔ اسی وجہ سے ان کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ "وہ اب لوٹنے والے نہیں"۔

اب ذرا قرآن کی آبی تمثیل کے آئینہ میں بھی منافقین کی تصویر دیکھ لو۔ قرآن کہتا ہے کہ منافقین کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جو چلتے چلتے زور شور کی بارش میں گھر گئے ہوں۔ بادلوں کی ہمہ گیر تاریکی ان پر مسلط ہے۔ ہولناک بجلیوں کی کڑک چمک ہے۔ ضعف قلب اور سراسیمگی سے ان کا برا حال ہے تاریکی میں کبھی کبھی ذرہ ذرہ کر بجلی چمکتی ہے تو اس کی مدد سے دو قدم چل لیتے ہیں لیکن جب زور کی بجلی

کوکتی اور کوندتی ہے تو ڈر کے مارے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں اور آنکھیں بند کر لیتے ہیں
کہ کہیں صاعقہ آسمانی آنہ لے اور تار حیات ٹوٹ نہ جائے۔ بس اسی طرح ان منافقین کے لئے بھی رحمت
الٰہی کی وہ بارش جو قرآن کی صورت میں ہوئی، ان کی اپنی کمی عقل، ضعف دماغ اور قلت علم و بصیرت کی
وجہ سے زحمت بن گئی۔ قرآن کے احکام امر و نہی، اس کی دعوتِ جہاد و قتال، اور نفس پرستوں پر اس کی
زجر و توبیخ ان کے لئے بجلی کی کڑک اور چمک بن گئے جن کی تاب لانا ان کے بس میں نہ تھا ہلکی ہلکی نظری
تعلیمات کی روشنی میں تو وہ کچھ چل لیتے ہیں۔ مگر جہاں آزمائش کے معاملات آجائیں، یا جہاں تاویلات
کی گنجائش نہ دے کر دو ٹوک فیصلہ کر دینے والی آیت آجائے وہاں وہ سخت کشمکش اور پریشانی میں مبتلا
ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ جب گمراہ اور بدعتی فرقوں کے سامنے قرآن کی کوئی صریح
آیت پیش کر دی جاتی ہے تو وہ ایسے سٹ پٹاتے ہیں کہ گویا بکریوں کے سامنے شیر آگیا، حالانکہ قرآن کی آیات
تو فی نفسہ رحمت ہے، مگر ان کے لئے سخت مصیبت بن جاتی ہے۔ اس کی چکا چوند میں وہ الٹا اور راستہ
بھول جاتے ہیں اور اس کی آواز ان کے لئے بجلی کا کڑکا بن جاتی ہے جس سے جان بچانے کے لئے انہیں
کانوں میں انگلیاں ٹھونس لینی پڑتی ہیں۔ ان کی یہ حالت کیوں ہوتی ہے؟ صرف اس بنا پر کہ ان کی
عقلوں اور دلوں پر حق سے نامانوسیت اور بیگانگت کا پردہ پڑا ہوا ہے اور ان کے کمزور دل صفاتِ الٰہی
کے روحانی بار کو اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس وجہ سے وہ اعراض و نفرت پر تل جاتے ہیں۔ انہیں کے
مثل ان مشرکوں کا (خواہ ان کے مختلف گروہ اپنے مشرکانہ خیالات میں کتنے ہی مختلف ہوں) حال
بھی ہے جن کے سامنے خالص مسئلہ توحید مبرہن ہو کر آجاتا ہے اور قطعی دلائل و نصوص ان کے مشرکانہ
اوہام کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتے ہیں تب بھی ان کے دلوں میں ایمان کی روشنی پیدا نہیں ہوتی،
بلکہ ان پر قرآن کی آیات اتنی شاق گزرتی ہے اور وہ اس سے اس قدر وحشت کھاتے ہیں کہ اگر ان کا بس
چلے تو اپنے کانوں کو بند کرنے میں بھی دریغ نہ کریں۔ اسی طرح اگر تم اصحابؓ سرور کونین صلعم سے

بھی دشمنی رکھنے والوں کو دیکھو گے تو انہیں بھی اسی مرض میں گرفتار پاؤ گے۔ جب خلفائے راشدین اور صحابہؓ کی حقانیت اور بزرگی ثابت کرنے والی صریح نصوص ان کے سامنے بے نقاب ہو کر آتی ہیں تو ان سے بڑھ کر کوئی چیز ان کیلئے سوہان روح نہیں ہوتی اور نہایت بے باکی کے ساتھ وہ ان حقائق کا انکار کر دیتے ہیں۔ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ان تمام مریضانِ قلوب کو منافقین کی اس معنوی حالت سے جس کی مثال اللہ نے بیان فرمائی ہے ایک خاص مناسبت ہے۔ اس لئے کہ ان کے حالات اور اعمال بالکل انھیں کے سے ہیں اور دلوں کی مشابہت ہی اعمال کی مشابہت کی باعث ہوتی ہے۔ ایک جماعت یا ایک فرد کے افعال و کردار میں اگر ہمرنگی ہے تو جان لو کہ ان کی کیفیت نفسی اور ان کی صورت روحانی میں بھی ضروری مشابہت ہے۔

(۲) سورۂ رعد میں اسی فلسفۂ ہدایت کو دوسرے پہلو سے بیان کیا گیا ہے۔ وہاں مومنین کو سامنے رکھ کر ان کے بارے میں بھی یہی دونوں، ناری و مائی تمثیلیں بیان فرمائی گئی ہیں مگر دیکھو کہ دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے:-

أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ	اللہ نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر اپنی اپنی (سمائی کے) بقدر اس سے
أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا	ندی نالے بہ نکلے۔ پھر (پانی کے) ریلے میں جھاگ بن کر اوپر اٹھ
وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ	آئے۔ اسی طرح زیور یا دوسرے ساز و سامان بنانے کے لئے
أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ	(معدنیات کو) جب لوگ آگ میں تپاتے ہیں تو ان میں بھی اسی
الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً	طرح کا جھاگ ہوتا ہے۔ یوں اللہ حق و باطل کی مثالیں بیان
وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ	فرماتا ہے۔ سو جھاگ تو رائگاں جاتا ہے اور (پانی) جو لوگوں کے
كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ (رعد-۲)	کام آتا ہے زمین میں ٹھیرا رہتا ہے اللہ اسی طرح مثالیں بیان فرماتا ہے

یہاں اللہ تعالے نے اپنی وحی کو جسے وہ قلب انسانی کو زندہ کرنے کے لئے اتارتا ہے پانی سے تشبیہ دی ہے جو زمین کو زندہ کرنے کے لئے برسایا جاتا ہے اور دلوں کو ندی نالوں سے تشبیہ دی ہے جس طرح ندی نالے آسمان کی بارش کو اپنی اپنی وسعت کے مطابق اپنے سینوں میں بھر لیتے ہیں اسی طرح انسانی قلوب بھی دریائے معرفت

سے بقدر ظرف لے لیتے ہیں۔ جو قلب جتنی زیادہ وسعت رکھتا ہے وہ اسی قدر علم و بصیرت کا خزانہ وحی الٰہی کے فیضان عام سے حاصل کرلیتا ہے۔ پانی کے ساتھ وحی اور ندی نالوں کے ساتھ قلوب کی تشبیہ کس قدر بلیغ ہے۔ پھر دیکھو بادلوں سے جب بارش ہوتی ہے اور زمین پر پڑکر دھارے کی شکل میں بہنے لگتی ہے تو اس وقت زمین کی تمام غلاظتیں اور میل کچیل اور خس و خاشاک سب ابھر کر سطح آب پر آجاتے ہیں مگر چند لمحوں کے بعد کہیں ان کا نام و نشان تک نہیں رہتا، اور وہی پاک صاف پانی باقی رہ جاتا ہے جو انسان کے لئے مفید ہے۔ اسی طرح علم و بصیرت اور رشد و ہدایت کا آب حیواں بھی جب قلوب کی وادیوں میں اترتا ہے تو پہلے تمام دبی ہوئی کثافتوں کو ابھار دیتا ہے اور بالآخر نفسانی خواہشوں اور شکوک و اوہام کی گندگیوں کو فنا کرکے دلوں کو انوار الٰہی کا مہبط بنا دیتا ہے۔ اس کی مثال بعینہ دوا کی سی ہے جو جسم کے اندر داخل ہوکر تمام اخلاط جسم کو ابھار دیتی ہے اور مریض ایک طرح کی ناگواری محسوس کرتا ہے حالانکہ اخلاط کا ابھرنا دوا کے فوائد میں سے ہے کیونکہ وہ انھیں ابھارتی ہی اس لئے ہے کہ فنا کردے، جیسا کہ اس کی فطرت کا خاصہ ہے۔ ان حقائق کو سامنے رکھو اور پھر حق و باطل کی باہمی آویزش کا تصور کرو۔ حق نمودار ہوتا ہے تو دلوں میں چھپی ہوئی باطل کی تمام قوتیں سر نکال لیتی ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ حق خود ہی کریدکر ان قوتوں کو ابھارتا ہے تاکہ انھیں باہر نکال پھینکے۔ کچھ مدت تک تو وہ قوتیں ایک بحرانی کیفیت میں ابھری رہتی ہیں لیکن آخر کار فنا ہو جاتی ہیں اور آئینہ قلب بالکل صاف ہوکر چمک اٹھتا ہے۔ یہ تمثیل تو مائی تھی۔ ناری تمثیل بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے:۔

وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ	اور یہ جو لوگ زیور یا دوسرے ساز و سامان کے لئے
ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ	(معدنیات کو) آگ میں تپاتے ہیں اس میں بھی اسی طرح جھاگ اٹھتا ہے

معدنیات جب آگ میں پگھلائی جاتی ہیں تو ان میں سے میل کا جھاگ اٹھتا ہے۔ اصل جوہر نیچے رہ جاتا ہے جو انسانی ضروریات زندگی کے لئے کارآمد ہے اور جھاگ ہوا کر چھنٹ جاتا اور سوخت ہو جاتا ہے۔ ایمان و ہدایت کا معاملہ بھی ایسا ہی کچھ ہے۔ ایمان کی گرمی جب پہنچتی ہے تو مومن کے قلب کو اپنے اندر کی کثافتوں کا شدید احساس

ہوتا ہے اور وہ پریشان ہونے لگتا ہے مگر یہ آگ شہوات اور شبہات کی گندگیوں کو اس طرح چھانٹ کر پھینک دیتی ہے جس طرح بھٹی کی آگ معدنیات کے میل او زنگ کو۔ پھر جس طرح ملاوٹ نکل جانے اور سوخت ہو جانے کے بعد معدنیات کا خالص جوہر انسانوں کو فائدہ پہنچاتا ہے اسی طرح نور ایمان بھی قلب مومن میں متمکن ہو کر نہ صرف اس کو بلکہ اس کے ذریعہ سے ایک جہان کے جہان کو فائدہ پہنچاتا ہے۔

(۳) اب دنیوی زندگی اور صاحب دنیا کی مثال بیان کی جاتی ہے:۔

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ	دنیوی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے مثلاً ہم نے آسمان کا پانی
اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ	برسایا اور اس سے زمین کی نباتات جس کو آدمی اور چوپائے کھاتے
الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ حَتّٰٓى	ہیں سیراب ہوئی، یہاں تک کہ جب زمین نے اپنا سنگھار کر لیا
اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ	اور خوشنما ہو چکی اور اہل زمین نے سمجھ لیا کہ اب وہ ان کی ہو
اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا	تو (ناگاہ) ہمارا حکم اس پر رات یا دن کے وقت نازل ہو گیا
اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ	اور ہم نے اس کا ایسا ستھراؤ کیا کہ گویا کل اس کا نام و نشان
بِالْاَمْسِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ	ہی نہ تھا۔ جو لوگ سوچتے اور سمجھتے ہیں ان کے لئے ہم اپنی
يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (یونس۔ ۳)	نشانیاں اسی طرح تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے دنیوی زندگی کی تشبیہ اس طرح دی ہے کہ دنیا جب زیب و زینت کے لباس میں بن سنور کر سامنے آتی ہے تو انسان اس پر مفتوں ہو جاتا ہے اور حصول دنیا ہی اپنا مطمح نظر قرار دے لیتا ہے حتیٰ کہ فریب نفس اُسے یہاں تک پہنچا دیتا ہے کہ وہ اس زینتِ حیات کو اپنی ملک اور اپنے قبضۂ قدرت میں سمجھنے لگتا ہے۔ اس وقت یکایک کرشمۂ الٰہی نمودار ہوتا ہے اور اس کے ہاتھوں سے یہ محبوب ترین متاع چھین کر اسے خسران و ناکامی کی ناگہانی مصیبتوں اور حیرتوں میں چھوڑ جاتا ہے۔ اس کیفیت زندگی کی تشبیہ اللہ تعالیٰ نے زمین سے دی ہے جس پر بارش کی کرشمہ سازی سے نباتات کی ہری ہری چادریں بچھ جاتی ہیں اور اس باصفا نواز منظر کو

دیکھ کر کسان بیخود بے اختیار ہو جاتا ہے۔ اس وقت خدا اسے یاد نہیں آتا۔ نفس کے فریب میں آکر وہ اسے اپنی تدبیر کا نتیجہ اور اپنی ملک سمجھنے لگتا ہے کہ اچانک حکم الٰہی جاری ہوتا ہے اور یہ سارا سامان غرور آفات و حوادث کی نذر ہو کر رہ جاتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے اس کا طلسم ظن و غرور ٹوٹ جاتا ہے اور اسے دکھائی دیتا ہے کہ جس جگہ اس کے خوش آئند تخیلات کی حسین عمارت قائم تھی وہاں شکستہ کھنڈروں کے نشان بھی اب موجود نہیں ہیں۔ یہی حال دنیا کی رعنائیوں اور اس کے پر امید اور خود فریب پرستاروں کا ہے اگر غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ دنیا اور دنیا پرست کی کتنی بلیغ تشبیہ ہے۔

ضمناً ایک اور نکتہ بھی سمجھ لو۔ چونکہ دنیا آفات و حوادث کا مرکز، اور اس کے بالمقابل جنت اطمینان و سکون اور عافیت و سلامتی کا گہوارہ ہے اس لئے قرآن اس تنبیہ اور تذکیر کے بعد وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ کہہ کر جنت کی زندگی کی طرف بلاتا ہے۔ جنت کو دار السلام (سکھ کا گھر) کہنے کی وجہ یہی ہے کہ یہ مقام اُن تمام آفتوں، پریشانیوں اور بے اطمینانیوں سے امون ہے جن کی شکار دنیا بنی ہوئی ہے۔ قرآن بلا لحاظ خاص و عام سب کو اس امن کی طرف دعوت دیتا ہے کہ عدل الٰہی اسی کا مقتضی ہے، اگرچہ ہدایت و معرفت کی سعادت صرف انہیں کو حاصل ہوتی ہے جن کو پروردگار عالم اس عزت و شرف سے نوازتا ہے وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ الخ۔

(۴) قبول حق کی استعداد اور عدم استعداد کی تمثیل:۔

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ	دونوں فریقوں کی مثال اندھے، بہرے اور آنکھوں والے
وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ	اور سننے والے کی سی ہے، کیا دونوں کی حالت یکساں
مَثَلًا اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝	ہو سکتی ہے؟ کیا تم لوگ غور نہیں کرتے؟

قرآن نے اس آیت میں کفار کا ذکر کرتے ہوئے ان کی صفت یہ بیان کی ہے کہ وہ سننے سے معذور اور بصارت سے محروم ہیں۔ اور پھر ان کے مقابل مومنین کے اوصاف مثلاً ایمان، عمل صالح، محبت الٰہی

اور انابت الی اللہ وغیرہ کو بینائی اور سماعت سے تشبیہ دی۔ پہلے گروہ کو اندھا بہرا اس لئے کہا کہ ان کی پیشانی کی آنکھیں تو دیکھتی ہیں لیکن دلوں کی آنکھیں بے نور ہیں۔ حق کا بے نقاب چہرہ دیکھنے سے قاصر ہیں۔ اسی طرح وہ اوپر کے کانوں سے تو سنتے ہیں مگر اندر کے کانوں تک آوازِ حق کا گذر نہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی تشبیہ ایسے شخص سے دی ہے جس کی دیکھنے اور سننے کی قوتیں سلب کر لی گئی ہوں کہ نہ وہ کسی چیز کو دیکھ سکتا ہو اور نہ کوئی بات سُن سکتا ہے۔ دوسرا گروہ مومنین کا ہے جو بیدار مغز ہے جس کے دل کی آنکھ بھی صحیح سلامت ہے اور کان بھی۔ اس کو ایسے شخص سے تشبیہ دی ہے جو دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والا کان رکھتا ہے۔ یہ تمثیلیں بیان کرکے اللہ تعالیٰ ان دونوں کے برابر ہونے کی خود نفی نہیں کرتا بلکہ مخاطبوں ہی کی عقل وفکر سے سوال کرتا ہے کہ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ اس استفہامِ انکاری میں جو زور ہے وہ خود انکار کرنے میں کہاں ہو سکتا ہے۔

(۵) اولیاءِ مشرکین کی بے بسی کی مثال:-

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن	جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسروں کو اپنا کارساز بنا
دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ	رکھا ہے ان کی مثال مکڑی کی سی ہے کہ اس نے ایک گھر
اتَّخَذَتْ بَيْتًا وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ	بنایا اور کچھ شک نہیں کہ سب گھروں میں کمزور گھر مکڑی
لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝	کا گھر ہے۔ کاش یہ لوگ جانتے۔

(عنکبوت۔ ۴)

یہاں اس حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ مشرکین تو مکڑی کی طرح کمزور و ناتواں ہیں ہی لیکن ان کے اولیاء و شرکاء ان سے بھی زیادہ بے بس اور مجبورِ محض ہیں۔ سو ان مشرکین کی ذاتی کمزوری و بے چارگی اور پھر اپنے سے بھی بے بس تر اولیاء سے مدد و قوت حاصل کرنے کی مثال مکڑی اور اس کے گھر کی سی ہے۔ اس مثل کے تحت مشرکین کے انتہائی خسران کا ذکر ہے کہ اگرچہ وہ بے یار و مددگار ہیں لیکن وہ اپنی محرومی و

کمزوری کے نقطہ کمال پر اس وقت پہنچے جب کہ انھوں نے اپنے سے بھی زیادہ مجبور مخلوق کو اپنا ولی و مددگار بنایا جن سے وہ سوائے ضعف و خسران کے کچھ نہیں پا سکتے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ مشرکین و کفار سبھی جانتے ہیں کہ تار عنکبوت کمزور ترین شے ہے پھر اس سے "لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ" کے ذریعہ ان کی واقفیت وعلم کی نفی کیوں کی گئی ہے؟ اس کا جواب بالکل واضح ہے۔ آیت کا مقصد ان کے اس علم کی نفی کرنا نہیں ہے کہ مکڑی کا گھر سب سے زیادہ کمزور ہے بلکہ اس علم کی نفی کرنا ہے کہ خدائے واحد کے سوا جو معبود اور اولیا ٹھیرائے جاتے ہیں ان کی قوت اور قدرت تار عنکبوت سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر وہ اس حقیقت کو جانتے ہوتے تو ایسا ہرگز نہ کرتے۔ وہ تو یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ یہی اولیاء ان کو قوت و جبروت بخشیں گے لیکن ان کی حقیقت خواب سے زیادہ نہیں ہے اور نہ کبھی ثابت ہوئی۔

اس مضمون کی بکثرت آیتیں ملتی ہیں جن میں یہی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ مثلاً ایک جگہ قرآن کہتا ہے:-

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً	انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر بہت سے خدا بنا رکھے ہیں کہ وہ ان کے مددگار
لِّیَکُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا كَلَّا سَیَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ	ہوں گے۔ مگر وہ ہرگز مددگار نہ ہوں گے۔ قریب ہے کہ وہ خود ان کی
وَیَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِمْ ضِدًّا (مریم - ۵)	بندگی کا انکار کریں گے اور الٹا ان کے دشمن ہو جائیں گے۔

دوسری جگہ ہے:-

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً	ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر بہت سے خدا بنا لیے یہ سمجھ کر کہ وہ ان کی
لَّعَلَّهُمْ یُنْصَرُوْنَ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَهُمْ	مدد کریں گے۔ مگر وہ ان کی مدد نہیں کر سکتے۔ بلکہ یہ بت پرستوں کے
وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ (یٰسین - ۵)	لشکری بنے ہوئے قیامت میں خود جوابدہی کیلئے حاضر ہوں گے۔

ایک مقام پر مشرکین کی ہلاکت و تباہی بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:-

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ	اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انھوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا۔ اور جب
فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِیْ یَدْعُوْنَ مِنْ	تیرے پروردگار کا حکم (عذاب) آیا تو خدا کے سوا وہ جن معبودوں

دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّکَ وَمَا زَادُوْھُمْ غَیْرَ تَتْبِیْبٍ (ہود - ۹)

کو پکارا کرتے تھے وہ ان کے کچھ بھی کام نہ آئے (بلکہ) انھوں نے ان کی تباہی کچھ اور بڑھا دی۔

ان چاروں مقامات پر یہ حقیقت آشکارا کی گئی ہے کہ جس نے خدا کو چھوڑ کر شرکا اور اولیا کا دامن سربلندی وسرفرازی اور نصرت و امداد حاصل کرنے کے لئے پکڑا وہ ناکام رہا اور اس کی یہ عبادت مفید و منفعت بخش ہونے کے بجائے الٹی وبال جان بن گئی۔ یہ مثل جو اوپر بیان ہوئی شرک کے ابطال، مشرکین کے خسران اور ان کے انجام کی ہولناکی اور تباہ کاری کی سب سے زیادہ روشن اور بلیغ تمثیل ہے۔ (باقی)

ترجمان القرآن کے سابق پرچے

ترجمان القرآن کے مندرجۂ ذیل سابق پرچوں کی دفتر ہذا کو ضرورت ہے۔ جو حضرات ان پرچوں کو قیمتاً فروخت کرنا چاہتے ہوں۔ یا جنکے پاس یہ پرچے فالتو موجود ہوں۔ وہ براہ کرم ان پرچوں کو بذریعہ ڈاک ہمارے پاس روانہ کر دیں اور "لفافہ" پر اپنا مکمل پتہ تحریر فرماویں تاکہ ۸/ فی پرچہ کے حساب سے اُن کو قیمت روانہ کی جاسکے۔

رسائل و اخبارات کے ایڈیٹر صاحبان سے بھی گزارش ہے کہ اگر وہ مکمل فائل نہ رکھنا چاہتے ہوں۔ اور ان کے پاس یہ پرچے ہوں تو وہ بھی ان پرچوں کو بھجوا کر قیمت وصول کریں۔

سال ۵۲ھ	جلد۲	عدد۱	ماہ محرم
″	جلد۳	عدد۲	ماہ شعبان
″	جلد۳	عدد۳	ماہ رمضان
سال ۵۴ھ	جلد۶	عدد۱	ماہ محرم
″	″	″ ۲	ماہ صفر
″	″	″ ۳	ماہ ربیع الاول
″	″	″ ۴	ماہ ربیع الثانی

سال ۵۶ھ	جلد۱۰	عدد۲	ماہ صفر
″	″	″ ۳	ماہ ربیع الاول
″	″	″ ۴	ماہ ربیع الثانی
″	جلد۱۱	″ ۲	ماہ شعبان
″	″	″ ۳	ماہ رمضان
سال ۵۷ھ	جلد۱۲	عدد۵	ماہ جمادی الاولیٰ
″	″	″ ۶	ماہ جمادی الاخریٰ
″	جلد۱۳	″ ،	ماہ رجب

منیجر

سورۂ صافات کی قسمیں

از جناب مولوی داؤد اکبر صاحب

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّاۙ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًاۙ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًاۙ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌؕ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِؕ

قرآن مجید کے ایک طالب علم نے سورہ صافات کی قسموں کی غرض اور مقسم بہ اور مقسم علیہ میں ربط دریافت کیا ہے اس باب میں قبل اس کے کہ ہم اپنی کوئی تحقیق پیش کریں مناسب ہوگا کہ مفسرین کرام کی نگاہ کشف و تحقیق نے ہماری رہنمائی کے لئے جو نقوش چھوڑے ہیں ان کی طرف مراجعت کرلی جائے تاکہ اصل مقصود تک پہنچنے میں آسانی ہو۔

پیش نظر سورہ کی قسموں کی بابت یوں تو تمام مفسرین نے کچھ نہ کچھ بحث کی ہے مگر اس بارے میں حضرت امام رازی علیہ الرحمۃ نے جس تمام و کمال سے تحقیق و تدقیق کی ہے یہ کچھ انہیں کا حق ہے۔ فرماتے ہیں اس میں دو احتمال ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ان صفات کا موصوف ایک ہی ہو۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ ان صفات کا موصوف مختلف ہو۔ پہلی صورت لینے میں اس کی مختلف توجیہیں ہوں گی:۔

۱۔ ان صفات کے موصوف ملائکہ قرار دیے جائیں۔ اس لحاظ سے تاویل یوں ہوگی۔

الف۔ وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا یعنی قسم ہے ان ملائکہ کی جو صف بستہ ہیں۔ ملائکہ یا تو عبادت الٰہی کے لئے صف بصف آسمانوں میں مستعد رہتے ہیں جیسا کہ انہیں کی زبانی ارشاد ہے "وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ"۔ یا اس سے یہ مقصود ہے کہ وہ اپنے روحانی بازوؤں کو فضا میں پھیلائے ہوئے امر خداوندی کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اور اس کا بھی احتمال ہے کہ فرشتوں کے صف بصف ہونے کا یہ مفہوم ہو کہ ملائکہ میں سے ہر ایک کے لئے الگ الگ درجہ معین ہے۔

ب۔ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا۔ اس کی بھی مختلف توجیہیں ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے وہ ملائکہ مراد ہیں جو بادلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیے پھرتے ہیں۔ اس کا بھی احتمال ہے کہ اس سے وہ ملائکہ مراد ہوں جو الہام کی صورت سے قلوب انسانی میں تاثیر پیدا کرتے ہیں۔ یا یہ کہ اس سے وہ ملائکہ مراد ہوں جو انسانوں سے ارواح خبیثہ کو دور کیا کرتے ہیں۔ ان اقوال کو بیان کرنے کے بعد حضرت امام رازی علیہ الرحمۃ اس دوسری صفت کے متعلق اپنے مخصوص انداز میں فرماتے ہیں:۔

"فلاسفہ کے نزدیک طے شدہ ہے کہ موجودات کی تین قسمیں ہیں ایک سراپا تاثیر ہے اور وہ خداوند تعالیٰ کی ذات بابرکت ہے۔ دوسرا عالم اجسام ہے اور یہ سراپا تاثر و انفعال ہے۔ تیسرا عالم ارواح (ملائکہ) ہے اور یہ وہ جماعت قدسی ہے جس میں کارساز فطرت کی طرف سے تاثر و تاثیر دونوں طرح کی قوتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ یہ ایک طرف تو انوار الٰہی سے فیضیاب ہوتی ہے اور دوسری طرف قلوب انسانی پر بھی اثر ڈالتی ہے۔"

ج۔ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا۔ اس میں اشارہ ہے کہ یہی وہ صفت ہے جس سے ملائکہ اپنی روحانیت میں ترقی دیکر عالم اجسام پر اثر ڈالتے ہیں۔

اس کے بعد امام صاحب فرماتے ہیں:۔

مقدمہ بالا کی روشنی میں غور کرو تو تم پر یہ حقیقت روشن ہوجائے گی کہ پہلی صفت (وَالصّٰٓفّٰتِ) میں اشارہ ہے کہ ملائکہ صف بصف خداوند تعالیٰ کی بارگاہِ عالی میں سر نیاز خم کئے رہتے ہیں۔ اور یہی وہ طریقہ ہے جس سے ملائکہ انوار الٰہی اور تجلیات ربانی کے مہبط ہوتے ہیں۔ دوسری صفت (فَالزّٰجِرٰتِ) میں اشارہ ہے کہ جواہر ملکیہ (ملائکہ) قلوب انسانی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور انسانی قوی ادراکیہ کو حرکت میں لانے کو ایسے اسباب فراہم کرتے ہیں جو ان کی روحانی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ یہ نظام قدرت کی جانب سے اس لئے ہے کہ ارواح بشری اپنی تکمیل میں ارواح ملکیہ کی محتاج ہے اور یہ تو مسلمات میں سے ہے کہ ارواح بشری کی باتقوی

طاقتوں کے بالفعل ہونے میں ملائکہ کا بہت زبردست ہاتھ ہے۔ یہ محض دعویٰ ہی نہیں بلکہ اس کی سند میں بے شمار دلیلیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں چند ملاحظہ ہوں۔

(۱) یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۔۔ وہ نازل فرماتا ہے ملائکہ کو روح کے ساتھ اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر بھی وہ مناسب سمجھتا ہے۔

ایک دوسری جگہ :-

(۲) نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِكَ روح امین (جبرائیل) نے تمہارے دل پر اسے نازل کیا ہے۔

اس کے بعد امام صاحب نے اس آیت سے متعلق ایک اور نہایت لطیف نکتہ بیان فرمایا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:- حقیقی کمال کسی چیز کو اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب وہ چیز خود مکمل و اکمل ہو۔ مکمل ہونے کا منشا ہے کہ وہ ان تمام خوبیوں سے آراستہ ہو جو اس کے شایانِ شان ہوں۔ اور اکمل ہونے کا یہ منشا ہے کہ اس کا فیض دوسروں تک پہنچے۔ اور یہ مسلم ہے کہ دوسرے کی تکمیل سے مقدم خود باکمال ہونا ہے اس کے بغیر اصلاح و ارشاد بے معنی ہے۔ لہذا پہلی صفت میں اشارہ ہے کہ ملائکہ اپنی تکمیل کے لئے ہمہ تن طاعتِ الٰہی میں جہت زن ہیں اور دوسری صفت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ انسانی قلوب سے وہ تمام کی تمام خرابیاں دور کرنے میں کوشاں رہتے ہیں جو فطرت انسانی کے سر اسر منافی ہیں اور تیسری صفت میں اشارہ ہے کہ وہ ارواح بشری کے انوار الٰہی سے مستنیر ہونے میں شریک ہیں۔

۲۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ یہ اوصاف گروہ انسانی پر محمول کی جائیں اور اس کی دو شکلیں ہیں:-

(۱) وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا سے انسانوں کی وہ صفیں مراد لی جائیں جو نماز کی ادائیگی کے وقت صف بصف قائم کی جاتی ہیں، اور فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا سے نمازیوں کا اعوذ باللہ پڑھنا مراد لیا جائے گویا اس کلمہ سے نمازی اپنے پاس سے شیاطین کو دور بھگاتے ہیں۔ اور فَالتّٰلِیٰتِ ذِكْرًا سے ان کا نماز میں قرآن پڑھنا مراد لیا جائے۔ دوسری صفت کی ایک اور توجیہ بھی بہت مشہور ہے وہ یہ کہ اس کا مقصود یہ ہے کہ نمازی نہایت بلند آہنگی کے ساتھ قرآن پڑھتے ہیں جس کی مصلحت شیاطین کو بھگانا ہے چنانچہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی قرأت والی روایت

میں یہی مصلحت مذکور ہے۔

(۲) دوسری شکل یہ ہے کہ اس سے علمائے محققین کی وہ صف بصف جماعت مراد لی جائے جو دین الٰہی کی تبلیغ میں منہمک رہتی ہے اور دوسری صفت سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اوامر و نواہی میں غایت درجہ دلچسپی رکھتے ہیں اور تیسری صفت میں اشارہ ہے کہ وہ دین الٰہی کی تبلیغ بھی کرتے ہیں اور اتباعِ شرائع پر بھی لوگوں کو ابھارتے ہیں۔

۳۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ ان صفات کو مجاہدین (فی سبیل اللہ) پر منطبق کیا جائے یعنی پہلی صفت سے جنگ کی صفیں مراد لی جائیں اور قرآن پاک میں مذکور بھی ہے کہ "اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا" دوسری صفت سے یہ مقصود ہے کہ وہ اثنائے جنگ میں گھوڑوں کو ڈانٹ بتاتے ہیں۔ اور تیسری صفت سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ میدانِ جنگ کی گرما گرمی کے وقت بھی انکی زبانیں یادِ الٰہی سے غافل نہیں ہوتیں۔

۴۔ چوتھی توجیہ یہ ہے کہ یہ صفات آیاتِ قرآنی کی ہیں اور اس کی توجیہ یوں ہوگی کہ قرآن پاک کی آیات متعدد مباحث سے متعلق ہیں۔ کچھ تو وحدانیت اور علمِ الٰہی پر مشتمل ہیں اور کچھ قدرتِ خداوندی اور حکمتِ ربانی کے بارے میں واقع ہیں اور کچھ اخلاقیات و شرائع سے متعلق ہیں۔ خلاصہ یہ کہ پہلی صفت میں آیاتِ قرآنی کو صف بصف اشخاص کے مشابہ قرار دیا گیا ہے اور دوسری صفت سے ان آیات کی جانب اشارہ ہے جو نواہی پر مشتمل ہیں اور تیسری صفت ان آیات سے متعلق ہے جو اعمالِ خیر کے وجوب پر محرک ہیں۔

اب دوسری صورت لو یعنی یہ کہ ان صفات کا موصوف ایک نہیں بلکہ الگ الگ قرار دیا جائے۔ مثلاً پہلی صفت کے موصوف پرندے ہوں جیسا کہ قرآن پاک میں بھی ہے "وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ"۔ اور دوسری صفت سے وہ تمام کی تمام چیزیں مراد لی جائیں جو معاصی سے روکنے کا ذریعہ ہوں۔ اور تیسری صفت سے (بلا تخصیص) وہ تمام کی تمام باتیں مراد لی جائیں جو کلام الٰہی میں سے پڑھی جاتی ہیں۔

اس دوسری صورت کے متعلق امام صاحب فرماتے ہیں :-

" خداوند تعالیٰ کی مخلوقات یا تو جسمانی ہیں۔ یا روحانی۔ مخلوقات جسمانیہ کے مختلف مدارج وطبقات ہیں جن میں سے مو تفیہ نہیں ہوتا مثلاً زمین وسط عالم ہے اور کرہ مائی سے محیط ہے۔ پانی ہوا سے محیط ہے اور ہوا آگ سے محیط ہے۔ مزید براں یہ کہ عناصر اربعہ طبقات فلکی سے عالم اجسام کے آخری حصہ تک محیط ہیں پس عالم اجسام گویا جلال الٰہی کے سامنے صف بصف کھڑا ہے رہے جواہر روحانیہ ملکیہ ملائکہ تو وہ باوجود اختلاف مدارج وصفات دو صفتوں میں مشترک ہیں۔ ایک تو عالم اجسام میں تاثیر وتصریف ہے جس پر یہ آیت (فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا) صریحاً دلالت کررہی ہے۔ اور دوسری صفت خداوند تعالیٰ کی معرفت میں استغراق ہے۔ چنانچہ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ عالم اجسام درجہ میں عالم ارواح سے ادنیٰ ہے اور جسمانیات میں تصرف بمقابلہ عالم ارواح کے آسان ہے اس لئے پہلے درجہ میں عالم اجسام کو رکھا گیا اور دوسرے درجہ میں ان ارواح طیبہ کو رکھا جو عالم اجسام پر تصرف کرتے ہیں اور تیسرے درجہ میں ان ارواح مقدسہ کو رکھا ہے جو ہمہ تن خدا کی تسبیح وتہلیل میں لگی رہتی ہیں "

اس کے بعد امام موصوف نے دو ایسے گروہوں کے اقوال نقل کیے ہیں جن میں سے ایک کا خیال ہے کہ نفس اشیاء مذکورہ مقسم بہ نہیں ہیں بلکہ ان اشیاء کا خالق مقسم بہ ہے۔ اور دوسرے فریق کے نزدیک نفس اشیاء مذکورہ ہی مقسم بہ ہیں۔ چونکہ امام موصوف نے ہر دو فریق کے اقوال کے نقل کردینے ہی پر اکتفا کیا ہے اور اپنی کوئی رائے نہیں لکھی ہے اس لئے ہم اس بحث کی تفصیل پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتے۔

حضرت امام رازیؒ نے اس سلسلہ میں ایک اور نہایت اہم بحث کی ہے جس کا ایک طالب قرآن کے سامنے ہونا نہایت ضروری ہے اور وہ اس موقع پر قسم کھانے کی ضرورت یا عدم ضرورت کا مسئلہ ہے۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں دو طرح کے شبہات پیدا ہوتے ہیں :-

(۱) ایک یہ کہ قسم کا مقصود یا تو مومن سے کوئی بات منوانا ہو سکتا ہے یا کافر سے۔ پہلی صورت تو باطل ہے اس لئے کہ مومن تو بغیر قسم ہی کے تسلیم کئے ہوئے ہے۔ اور دوسری صورت بھی باطل ہے اس لئے کہ منکر آپ کی بات قسم کھانے سے نہ تسلیم کرے گا بلکہ اسے دلیل ہی سے قائل کیا جا سکتا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ خداوند تعالیٰ نے اس سورہ کے شروع میں وحدانیت پر قسم کھائی ہے اور سورۂ ذاریات کے اوائل میں وقوع قیامت کے ثبوت میں قسم کھائی ہے۔ ان مطالب عالیہ کو (ملاحدہ و دہریہ کے اوہام باطلہ کی تردید کے ساتھ) قسم کے ذریعہ سے ثابت کرنا عقلا اس کے طریقہ کے منافی ہے۔

ان شبہات کے تین جواب ہو سکتے ہیں:-

(۱) خداوند تعالیٰ نے وحدانیت اور بعث و قیامت کو زیادہ تر ابتدائی سورتوں میں یقینی دلائل کے ساتھ ثابت کر دیا ہے۔ پھر جب دلائل قطعیہ پوری طرح بیان کر دئے گئے تو دلائل ماسبق کی تاکید کیلئے قسم کھائی گئی۔ خصوصاً قرآن تو عربوں کی زبان میں نازل ہوا ہے اور قسم کے ذریعہ سے کلام میں زور پیدا کرنا ان کے ہاں کا عام طریقہ تھا۔

(۲) دوسرے یہ کہ جب خداوند تعالیٰ نے ان چیزوں سے وحدانیت کے ثبوت پر قسم کھائی تو اس سے متصل ہی ان براہین قاطعہ کا بھی ذکر کیا جو وحدانیت کے باب میں نہایت روشن دلائل ہیں۔ یعنی فرمایا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ۔ یہ قول اس بنا پر دلیل ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اپنے اس قول میں (لَوْ كَانَ فِيهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا) بیان فرمایا ہے کہ آسمان و زمین کا نظام وحدانیت پر شاہد ہے۔ بعینہٖ یہاں بھی جب یہ کہا گیا کہ (اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ) تو اس کے متصل ہی بطور دلیل کے یہ بیان کیا گیا (رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ) گویا یوں کہا گیا کہ آسمان و زمین کے نظام میں تفکر توحید باری پر شاہد ہے۔ پس اے لوگو! اس دلیل میں غور کرو تاکہ تمھیں توحید کا اذعان حاصل ہو۔

(۳) یہ کلام بت پرستوں کے اعتقاد کثرت آلہہ کے ابطال میں واقع ہے۔ گویا یوں کہا گیا کہ بت پرستوں کا مسلک اتنا بودا ہے کہ اس کے ابطال کے لئے تاکید کے ساتھ بس اتنا ہی کہدینا کافی ہے کہ تمھارا خدا ایک ہے۔

حضرت امام رازی علیہ الرحمۃ نے ان آیات سے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اسے اجمالاً تین سرخیوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :-

(۱) مقسم بہ کی تعیین

(۲) مقسم بہ اشیاء مذکورہ ہی ہیں یا اس کے علاوہ کوئی دیگر شے ہے؟

(۳) مقسم بہ کا مقصود اس موقع پر کیا ہے؟

امام موصوف نے مقسم بہ کے بارے میں بہت سی صورتیں بیان فرمادی ہیں، مگر مقسم بہ اور مقسم علیہ میں مناسبت ڈھونڈھنے کی کوشش نہیں فرمائی، اس لیے بجز احتمالات کے نقل کرنے کے کوئی قطعی اور محکم رائے بھی ظاہر نہ کی۔ ممکن ہے ایسا اس لئے کیا ہو کہ اس سے طلبہ قرآن میں محنت و جانفشانی سے صحیح راہ تلاش کرنے کی قوت پیدا ہو۔ رہی یہ بحث کہ مقسم بہ نفس اشیاء مذکورہ ہیں یا ان کے علاوہ کوئی دیگر چیز ہے تو ہم نے جہاں تک غور کیا ہے اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ قرآن مجید میں قسم کھانے کی غایت و غرض پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ بحث پیدا ہو گئی ورنہ یہ منصۂ شہود پر نہ آتی۔ اسی وجہ سے یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ اس موقع پر قسم کھانا مناسب تھا یا نہیں یا یہ کہ یہاں پر قسم کھانے میں کیا مصالح ہیں؟ امام موصوف نے پہلے تو اس موقع پر قسم کھانے میں چند در چند زحمتیں بیان فرمائی ہیں۔ اس کے بعد ان زحمتوں کے مختلف حل بتائے ہیں لیکن ایک صاحب بصیرت سے پوشیدہ نہیں کہ امام موصوف کے ان جوابات میں بہت ہی تضاد ہے۔ مثلاً پہلے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ قسم دلائل سے مسبوق ہوا کرتی ہے، اور اصل اعتبار دلائل کا ہے، اور قسم تو محض عربوں کے عام طریقہ کے مطابق محض تاکید کے لئے لائی جاتی ہے۔ غور کیجئے ترتیب با قرآن سے یہ جواب کتنا البعد ہے اس لئے کہ قسمیں تو زیادہ تر ان سورتوں میں آئی ہیں جو پہلے نازل ہوئیں۔ اور دلائل بعد کی سورتوں

میں بیان ہوئے ہیں۔ امام موصوف کے دوسرے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ قسم کے بعد اس موقع پر ایک ایسا قول مذکور ہے جس میں حجت و برہان کا بہت ہی زبردست پہلو ہے، اور قسم محض تنبیہ کے لئے ہے۔ دیکھئے! اس جواب میں اور ماقبل والے میں کیا سرمو بھی فرق ہے؟ اور دونوں میں سے کیا ایک میں بھی اصل مسئلہ سے تعلق کچھ کہا گیا ہے؟ تیسرا جواب تو بہت ہی گرا ہوا ہے وہ اس لئے کہ پہلے دونوں جوابوں میں تو امام موصوف نے یہ دعویٰ کیا کہ قسم میں شہادت کا کوئی پہلو نہیں اور تیسرے جواب میں اس کا حجت ہونا خود ہی تسلیم کر لیا ہے گو کہ ہلکے درجہ کی حجت[۱] و دلیل۔

ذیل کی سطروں میں اب ہم مقسم بہ کی تعیین قسم کی اس موقع پر ضرورت، اور مقسم بہ اور مقسم علیہ میں مناسبت کی بابت اپنی رائے پیش کریں گے لیکن مناسب ہوگا کہ قبل اس کے کہ ان مباحث کی تحقیق میں پڑیں ایک نہایت ضروری مرحلہ سے گذر لیا جائے اور وہ پیش نظر سورہ کی قسموں کے عمود کی تعیین ہے۔

سورہ کا مرکز پیش نظر سورہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ توحید اور قیامت کے ثبوت میں وارد ہے یعنی ایک طرف تو اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں جتنی بھی مخلوقات ہیں ان میں سے ہر ایک خدا کی بے پایاں قدرت کا مظہر ہے۔ کوئی چیز اس سے بے نیاز ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہر ایک کی ضروریات کا مرکز وہی ہے۔ اس کے علاوہ تمام کے تمام رشتے بے معنی ہیں۔ مخلوقات کی احتیاج بالخصوص حضرت انسان کی ضروریات یہیں پر ختم نہیں ہوتیں بلکہ کل کی زندگی میں جب خدا کی عدالت عالیہ قائم ہوگی تو وہ رحمت خداوندی کا اور زیادہ محتاج ہوگا۔ الغرض اگر یہ سورہ غور سے پڑھی جائے تو ہر شخص کو بادنیٰ تامل نظر آ سکتا ہے کہ پوری سورہ میں یہی دونوں حقیقتیں پھیلی ہوئی ہیں۔

مقسم علیہ کی تعیین کے بعد اب ہم مقسم بہ کی شرح و تعیین کریں گے۔

مقسم بہ کی شرح و تعیین وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا

[۱] ماخوذ از امعان فی اقسام القرآن مصنفہ صاحب نظام القرآن صفحہ ۵-۶

فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا، تفسیروں کے استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ مفسرین میں سے بیشتر لوگوں کا ان اوصاف کے بارے میں یہی خیال ہے کہ ان کا موصوف گروہ ملائکہ ہے۔ ہمارے نزدیک بھی یہی صورت انسب ہے اس کے علاوہ جتنی صورتیں مذکور ہیں ان میں سے کوئی بھی چسپاں نہیں ہوتی۔ وجوہ ترجیح مناسبت کی بحث سے سمجھ میں آئیں گے۔

قسم کی غرض اوپر کی سطور میں مقسم بہ کی تعیین ہوگئی رہا یہ سوال کہ اس موقع پر قسم کیوں لائی گئی؟ اس کا وہ جواب انسب نہیں جو حضرت امام رازی علیہ الرحمۃ نے اختیار کیا ہے بلکہ اس باب میں صاحب نظام القرآن نے قسم کا جو مفہوم بیان کیا ہے اگر اسے سامنے رکھا جائے تو وہ تمام کی تمام دقتیں جو امام موصوف کے جواب سے پیدا ہوجاتی ہیں یکقلم دور ہوجائیں گی یعنی یہ کہ قسم کا اصل مقصود استشہاد ہے تعظیم واحترام کا پہلو نہیں مواقع پر ہوگا جہاں خداوند تعالیٰ کی ذات بابرکت یا اس کے شعائر کی قسم کھائی گئی ہو۔ اور اس صورت میں بھی تعظیمی پہلو ضمنی ہوگا۔ اصل مقصد استشہاد و استدلال ہی ہوگا۔ کلام عرب سے بھی اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے تفصیل کے لئے امعان فی اقسام القرآن کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

سطور بالا سے مقسم بہ کی تعیین اور قسم کی حقیقت اجمالاً سمجھ میں آگئی ہوگی۔ اب ہم مقسم بہ اور مقسم علیہ میں مناسبت دریافت کریں گے۔

مقسم بہ اور مقسم علیہ میں مناسبت یہ بیان ہوچکا ہے کہ پیش نظر سورہ توحید و قیامت کے ثبوت میں وارد ہے یعنی یہ کہ اس عالم میں جتنے بھی انقلابات و تغیرات ہوتے ہیں سب کا مرکز محض ایک ذات ہے۔ وہی سب کچھ کرتی ہے۔ اس کے ایما کے بغیر کوئی تبدیلی بھی ظہور میں نہیں آسکتی۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکت ہے۔ ایسی ذات جس کی قدرت و تصرف کے بے شمار مظاہر ہیں، ضرور بالضرور اس نے اس عالم کی پیدائش کی کوئی اہم غایت رکھی ہوگی۔ اسی کو قرآن قیامت سے تعبیر کرتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پیش نظر سورہ کے دعویٰ اور دلیل میں کوئی مناسبت ہے یا نہیں؟۔

قرآن مجید کے طالب علم سے یہ مخفی نہیں کہ قرآن پاک میں بے شمار ایسی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ منجملہ جنود الٰہی ہیں۔ ذیل کی آیتوں پر غور کیجئے:۔

سورۂ انفال میں ہے:۔

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّىْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ اِذْ يُوْحِىْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّىْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِىْ فِىْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (رکوع اول)	یاد کرو اس وقت کو جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کرتے تھے پس اس نے تمھاری فریاد سن لی کہ میں لگاتار ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کروں گا اور خدا نے فرشتوں کی مدد تمھیں خوش کرنے کیلئے کی ورنہ فتح تو خدا ہی کے ہاتھ میں ہے بیشک خدا غالب اور حکمت والا ہے۔ یاد کرو اس وقت کو جب کہ خدا تمھاری تسکین کے لئے نیند تم پر طاری کر رہا تھا اور آسمان سے تم پر پانی برسا رہا تھا کہ اس سے تم کو پاک کرے اور شیطانی گندگی تم سے دور کرے اور تاکہ تمھارے دلوں کی ڈھارس بندھائے اور اس کے ذریعہ سے تمھارے قدم جمائے رکھے، یاد کرو اس وقت کو جب کہ تمھارا پروردگار فرشتوں کو حکم دے رہا تھا کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں پس تم مسلمانوں کے قدم جمائے رکھو عنقریب کافروں کے دل میں رعب ڈالیں گے پس مارو گردنوں پر اور مارو ان کے پور پور پر۔

ایک دوسری جگہ ہے:۔

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ	پھر خدا نے اپنے رسول پر اور مسلمانوں پر تسلی نازل فرمائی اور غیر مرئی فوجیں بھیجیں اور کافروں کو سخت مار ماری

تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۝ (توبہ - ۴)

اور کافروں کی یہی جزا ہے۔

ایک دوسرے موقع پر ہے :-

إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ (توبہ - ۶)

اگرتم اس کی مدد نہ کرو (تو کچھ پروا نہیں) اس لئے کہ اس نے اس وقت اپنے رسول کی مدد کی تھی جب کافروں نے گھر سے باہر نکال دیا دو میں دوسرے اس وقت یہ دونوں غار میں تھے، یاد کرو اس وقت کو جبکہ وہ اپنے رفیق سے کہہ رہا تھا غم نہ کرو بیشک خدا ہمارے ساتھ ہے پس اللہ نے اپنی تسلی اس پر نازل فرمائی اور غیر مرئی افواج سے اس کی مدد کی اور کافروں کی بات کو نیچی کر دیا اور خدا ہی کا بول بالا ہے اور خدا غالب حکمت والا ہے۔

ایک اور مقام پر ہے :-

إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَن يَكْفِيَكُمْ أَن يُمِدَّكُمْ رَبُّكُم بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُنزَلِينَ ۝ بَلَىٰ إِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُم مِّن فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ۝

(آل عمران - ۱۳)

یاد کرو جبکہ تم مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمھارے لئے یہ بس نہیں ہے کہ تمھارا پروردگار تین ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے ضرور، بلکہ اگر تم ثابت قدم رہو اور تقویٰ اختیار کرو اور دشمن اسی دم تم پر چڑھ دوڑیں تو تمھارا پروردگار پانچ ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا۔

سورۂ ذاریات میں ہے :-

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝ قَالُوْۤا اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۝ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۝ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ۝ (رکوع ۲)

کہا تمہاری کیا مہم ہے اے فرستادگان.. وہ بولے ہم ایک گنہگار قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ ان پر پتھر اوکریں جو مسرفین کے لئے خدا کے یہاں نامزد ہے۔ . . .

مذکورہ بالا آیات میں تصریح ہے کہ خدا کی غیر مرئی فوجوں میں سے ملائکہ بھی ہیں اور اس غیر مرئی فوج سے بارہا اس نے حق پرستوں کی تائید کی ہے، اور پرستاران باطل کو پسپا کیا ہے۔ ایسا تقریباً ہر پیغمبر کے عہد میں ہوا ہے۔ قرآنی تصریح کے بعد مزید دلائل کی ضرورت نہیں۔

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ مناسبت کے سلسلہ میں جو کچھ تم نے کہا ہے اس سے اصل سوال تو حل نہ ہوا؟ واقعتاً ایسا ہی ہے لیکن جب مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں غور کیا جائے گا تو ہر شخص یہ تسلیم کرے گا کہ دنیا میں رحمت او نقمت کے بے شمار مظاہر فرشتوں کے ہاتھوں ظہور میں آتے ہیں۔ فرشتے ہی تھے جو حضرت ابراہیمؑ کے پاس پیام بشارت لائے تھے۔ اور یہی فرشتے قوم لوط کے لئے صاعقۂ ہلاکت ثابت ہوئے۔ اور یہی فرشتے تھے جو قرن اوّل میں حزب اللہ کے پہلو بہ پہلو حزب الشیطان سے برسرپیکار نظر آتے تھے۔ الغرض ملائکہ کے ہاتھوں دنیا میں جو رحمت و نقمت ظہور میں آتی ہے اس میں وحدانیت اور عدالت کبریٰ کے ثبوت پر کافی شہادت ہے۔ وہ اس طرح کہ ملائکہ کا پرستاران حق کے پہلو بہ پہلو احقاق حق اور استیصال باطل میں جد و جہد کرنا دلیل ہے اس امر کی کہ یہ کسی کے ماتحت ہیں اور یہ ان تمام لوگوں کے دشمن ہیں جو حدود اللہ سے سرکشی کرتے ہیں، اور ان لوگوں کے دوست ہیں جو خدا کی سرزمین پر رشد و ہدایت کی تبلیغ کرتے ہیں نیز یہ کہ فرشتوں کے کارناموں میں جو تضاد پایا جاتا ہے (یعنی مومنین کے ساتھ ان کی شفقت و ہمدردی خواہ ہاتھ سے ہو یا زبان سے اور کفار کے ساتھ ان کی تندی و سختی)[1] یہ شاہد ہے اس امر پر کہ ہو بہو یہی نقشہ (تفریق بین الصالح والمفسد) قیامت کے دن بھی پیش آئے گا۔

[1] قرآن مجید میں بے شمار ایسی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ متمردین کے حق میں بد دعا اور اظہار لعنت کرتے ہیں اور مومنین کے لئے بارگاہ الٰہی میں رحمت کی دعا کرتے ہیں اور ظن غالب یہ ہے کہ پیش نظر سورہ میں "فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا" سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب — (داؤد اکبر اصلاحی)

رسائل و مسائل

صفاتِ باری تعالیٰ

لکھنؤ سے ایک صاحب لکھتے ہیں:۔

"میں ان لوگوں میں زندگی کے بہترین اوقات صرف کر رہا ہوں جو منکر مذہب ہیں اور تنہا وہی گمراہ نہیں ہیں بلکہ ہزاروں کو وہ گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ میں ان میں رہتا ہوں اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان تمام تر گمراہیوں کا منشا صرف دین سے ناواقفیت ہے اور بس۔

فضا اور ماحول کو دیکھتے ہوئے میرا دل بہترین توقعات سے لبریز ہے۔ میں کچھ کام کر چکا ہوں، کچھ کر رہا ہوں اور آئندہ بھی مجھے کچھ کرنا ہے۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ میں آپ کو اپنی امداد کے لئے تکلیف دینی چاہتا ہوں، اس لئے کہ مجھے جو کام لینا ہے آپ کے سوا اس کا کوئی دوسرا اہل نظر نہیں آتا۔

خدا کے وجود کا ہر شخص کو اعتراف ہے خواہ وہ کوئی مذہبی انسان ہو یا دہریہ، کوئی فاطر کہتا ہے اور کوئی فطرت۔ صرف الفاظ کے گورکھ دھندے ہیں، مفہوم سب کا واحد ہے لیکن مسلمان خدا کو "بانوے و نوزدہ" صفات کے تسلیم کرتے ہیں۔

مجھے "وجود خدا باایں ہمہ صفات" کے دلائل درکار ہیں۔ ایک لیں ہو یا چند دلائل ایسے ٹھوس اور مضبوط ہوں کہ اسے "جدید روشنی" خیرہ نہ کر سکے، مختصر ہوں اور جامع ــــــ بس۔"

ترجمان القرآن۔ باری تعالیٰ کے ۹۹ اسما، تو وہ ہیں جو ہمیں بتائے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ

بے حد و حساب اسماء حسنیٰ اور بھی ہیں جن کا ہمیں علم نہیں۔ حدیث میں آیا ہے اسئلک بکل اسم ھولک وسمیت به نفسک او انزلته فی کتابک او استأثرت به فی علم الغیب عندک[1] پس ۹۹ کی تخصیص درست نہیں۔

محض وجود باری کا اقرار صحت ایمان کے لئے کافی نہیں ہے۔ کم از کم ان صفات کا علم و ادراک ضروری ہے جن کی تصریح قرآن میں ہے۔ مثلاً ربّ العٰلمین، رحمٰن، رحیم، سمیع، بصیر، خبیر، فعّال لما یرید، دیّان، منتقم وغیرہ۔ اس لئے کہ صحتِ ایمان اور صحت عمل کا تمام تر انحصار اس امر پر ہے کہ خدا اور کائنات، اور خدا اور انسان کے تعلق کی حقیقی نوعیت ہمیں معلوم ہو، اور یہ اسماء و صفات اسی نوعیت کو واضح کرتے ہیں۔ جو شخص مثلاً وجود باری کا معترف ہے مگر یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کائنات کو پیدا کر کے فارغ ہو بیٹھا ہے (نعوذ باللہ) اور اب اس کائنات کا نظم و نسق خود بخود بالاستقلال (INDEPENDENTLY) چل رہا ہے، اور اس کے انتظام سے بالفعل خدا کا فرمانروایانہ تعلق نہیں ہے، اس کا خدا کو ماننا بے معنی ہے۔ وہ گویا خدا کو اس طرح مانتا ہے جس طرح ایک موٹر خریدنے والا اس بات کو مانتا ہے کہ اس کا میکر فورڈ یا آسٹن ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ماننے سے موٹر کے ساتھ اس کا معاملہ اور برتاؤ معین یا کسی طور پر بھی متاثر نہیں ہوتا۔ اسی طرح محض یہ ماننے سے کہ کائنات کا اور خود انسان کا میکر خدا ہے، کائنات کے ساتھ اور خود اپنے وجود کے ساتھ انسان کے معاملہ کی نوعیت بھی معین نہیں ہوتی، نہ کسی طور پر متاثر ہوتی ہے۔ اسلام کا مقصود تو صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب انسان اپنے ساتھ اور سارے عالم کے ساتھ باری تعالیٰ کے تعلق کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لے۔ اسے معلوم ہونا چاہئے کہ باری تعالیٰ قیوم ہے، فعّال لما یرید ہے، ربّ ہے، علیم و خبیر ہے، قاہر فوق عبادہ ہے، ظالم نہیں ہے بلکہ رحمٰن و رحیم ہے، حکیم ہے (یعنی اس کا

[1] خدایا میں تجھ سے دعا کرتا ہوں ہر اس نام کے ساتھ جو تیرا ہے، جس سے تو نے اپنے آپ کو موسوم کیا ہے، یا جسے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے، یا جو تیرے علم غیب میں ہے اور بندوں کو تو نے اس کی خبر نہیں دی ہے۔

کوئی فعل عبث نہیں ہو سکتا) یوم الدین کا مالک ہے (یعنی اس کی عدالت میں ہم سب کو ایک روز حاضر ہونا اور اپنی دنیوی زندگی کا پورا حساب پیش کرنا ہے)، وغیر ذالک۔ یہ علم دنیا کی زندگی میں ہمارے طرز عمل کو کسی اور صورت سے معین کرے گا، اور اگر ہم اس علم سے خالی ہوں، یا اس علم میں نقص ہو تو ہمارا طرز عمل لازمی طور پر کوئی دوسری ہی صورت اختیار کرلے گا۔ مثلاً جو شخص نہیں جانتا کہ اس ملک کا کوئی بادشاہ ہے اس کا طرز عمل اس شخص سے مختلف ہوگا جو جانتا ہے کہ یہ ملک کسی بادشاہ کا ہے۔ اور جو شخص جانتا ہے کہ بادشاہ ہے مگر یہ سمجھتا ہے کہ وہ بے اختیار ہے، بالفعل حکمراں نہیں ہے، اپنے محل میں پڑا سوتا رہتا ہے، اور حقیقی حکمرانی کے اختیارات کچھ دوسرے لوگوں کو حاصل ہیں یا رعایا فرداً فرداً مختار ہے، اس کا طرز عمل اس شخص سے مختلف ہوگا جسے معلوم ہے کہ بادشاہ بالفعل حاکم ہے اور قادر مطلق ہے اور کوئی اس کی حکومت میں دخیل نہیں۔ اسی طرح جو شخص یہ سمجھتا ہو کہ بادشاہ کے ہاں جانب داری (FAVOURITISIM) کا دور دورہ ہے اس کا طرز عمل کچھ اور ہوگا، اور جو یہ سمجھتا ہے کہ بادشاہ بے لاگ حکومت کرنے والا ہے، اور کسی کے ساتھ اس کا خصوصی تعلق نہیں ہے اس کا طرز عمل کچھ اور ہوگا۔ وقس علیٰ ہذا۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ باری تعالیٰ کی جو صفات ہم مانتے ہیں ان کے لئے دلیل کیا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اس کی دلیل اتنی روشن ہے کہ آنکھ کھولتے ہی نظر آسکتی ہے بشرطیکہ بینائی ہو اور بینائی کا رشتہ مرکز فہم و ادراک سے ٹوٹ نہ گیا ہو۔

آپ کے سامنے ایک کرسی رکھی ہے۔ اس کا بنانے والا آپ کے سامنے نہیں ہے مگر آپ محض کرسی کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ اس کو بنانے والے میں حیات، قدرت، ارادہ، بصارت، حس، شعور، حکمت وغیرہ ضرور موجود ہوں گی ورنہ وہ اس کرسی کو نہیں بنا سکتا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ صانع کی صفات کو جاننے کے لئے اس کی صنعت کو دیکھنا اور غور کرنا کافی ہے۔ اب یہ عظیم الشان کارخانہ جس کا نام کائنات ہے

آپ کے سامنے کھلا ہوا ہے اور ہر آن نت نئی شان سے چل رہا ہے۔ اس کو دیکھئے اور اس میں تفکر کیجئے۔ آپ کا دل خود ہی گواہی دے گا کہ اس کے صانع میں فلاں اور فلاں صفات کا ہونا ضروری ہے۔ بعض صفات بالکل صریح طور پر اول نظر میں معلوم ہو جاتی ہیں، مثلاً ربوبیت، حکمت، علم، قدرت وغیرہ بعض صفات تھوڑے یا بہت تامل سے سمجھ میں آتی ہیں، مثلاً رحمانیت۔ اور بعض صفات ایسی ہیں جن کے متعلق مشاہدہ اور تفکر کے بعد بھی علم الیقین حاصل نہیں ہوتا۔ اس علم الیقین کے حصول کا ذریعہ نبی صادق کی خبر کے سوا کوئی نہیں۔ مثلاً باری تعالیٰ کا دیّان (جزا دینے والا) ہونا، کہ جب تک نبی صادق اس کی خبر نہ دے، بڑے سے بڑا صحیح الفکر آدمی بھی اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آثار کا مشاہدہ اور تفکر فی خلق السموات والارض زیادہ سے زیادہ اسے امکان دینونت تک، یا حد سے حد رجحان دینونت تک لے جا کر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ آفاق و انفس میں خدا کی کاریگری کے نشانات دیکھ کر اس حد تک تو کہہ سکے گا کہ ایسی حکمت کے ساتھ جس نے ہمیں بنایا ہے اس کا فعل عبث تو نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ اس زندگی کے ختم ہونے پر وہ ہمارے کارنامۂ حیات کا حساب لے اور جزا و سزا دے، اور اغلب ہے کہ ایسا ہو۔ لیکن اس اعتقاد کا جزم و یقین، اور حساب و کتاب کی کیفیت کا صحیح علم مجرد تفکر سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے نبی کی ہدایت ناگزیر ہے۔

خطباتِ جمعہ

خطبہ صیام

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ۔ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ واشہد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ۔ واشہد ان سیدنا محمداً عبدہ ورسولہ۔

ہر تعریف اللہ کے لئے ہے اور اللہ ہی کو زیبا ہے۔ ہم اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں، اسی سے مدد مانگتے ہیں، اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں، اس پر ایمان لاتے ہیں، اور اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہم کو خود اپنے نفس کی شرارتوں اور اعمال کی برائیوں سے بچائے۔ اللہ جس کو ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا، اور اللہ ہی جس کو ہدایت نہ دے اسے کوئی سیدھے رستے پر نہیں لگا سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اس اکیلے خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور کوئی اس کا شریک نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ ہمارے آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

برادرانِ اسلام! ہر کام جو انسان کرتا ہے، اس میں دو چیزیں لازمی طور پر ہوا کرتی ہیں۔ ایک چیز تو وہ مقصد ہے جس کے لئے کام کیا جاتا ہے، اور دوسری چیز وہ خاص صورتِ عمل ہے جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اختیار کی جاتی ہے۔ مثلاً کھانا کھانے کے فعل کو لیجئے۔ کھانے سے آپ کا مقصد زندہ

رہنا اور جسم کی طاقت کو بحال رکھنا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی صورت یہ ہے کہ آپ نوالے بناتے ہیں، منہ میں لے جاتے ہیں، دانتوں سے چباتے ہیں اور حلق کے نیچے اتارتے ہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سب سے زیادہ کارگر اور سب سے زیادہ مناسب طریقہ یہی ہو سکتا تھا، اس لئے آپ نے اسی کو اختیار کیا۔ لیکن آپ میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ اصل چیز وہ مقصد ہے جس کے لئے کھانا کھایا جاتا ہے، نہ کہ کھانے کے فعل کی صورت۔ اگر کوئی شخص لکڑی کا برادہ یا راکھ یا مٹی لے کر اس کے نوالے بنائے اور منہ میں لے جائے اور دانتوں سے چبا کر حلق کے نیچے اتار لے تو آپ اسے کیا کہیں گے؟ یہی نا کہ اس کا دماغ خراب ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ احمق کھانے کے اصل مقصد کو نہیں سمجھتا اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ بس فعلِ خوردن کے ان چاروں ارکان کو ادا کر دینے ہی کا نام کھانا کھانا ہے۔ اسی طرح آپ اس شخص کو بھی پاگل قرار دیں گے جو روٹی کھانے کے بعد فوراً ہی حلق میں انگلی ڈال کر قے کر دیتا ہو اور پھر شکایت کرتا ہو کہ روٹی کھانے کے جو فائدے بیان کئے جاتے ہیں وہ تو مجھے حاصل ہی نہیں ہوتے، بلکہ میں تو الٹا روز بروز دبلا ہوا جا رہا ہوں اور مرجانے کی نوبت آگئی ہے۔ یہ احمق اپنی اس کمزوری کا الزام روٹی اور کھانے پر رکھتا ہے، حالانکہ حماقت اس کی اپنی ہے۔ اس نے اپنی نادانی سے یہ سمجھ لیا کہ کھانے کا فعل جتنے ارکان سے مرکب ہے بس ان کو ادا کر دینے ہی سے زندگی کی طاقت حاصل ہو جاتی ہے، اس لئے اس نے سوچا کہ اب روٹی کا بوجھ اپنے معدے میں کیوں رکھو؟ کیوں نہ اسے نکال پھینکا جائے تاکہ پیٹ ہلکا ہو جائے، کھانے کے ارکان تو میں ادا کر ہی چکا ہوں۔ یہ احمقانہ خیال جو اس نے قائم کیا اور اس کی پیروی کی اس کی سزا بھی ظاہر ہے کہ اسی کو بھگتنی چاہئے۔ اس کو جاننا چاہئے تھا کہ جب تک روٹی پیٹ میں جا کر ہضم نہ ہو، اور خون بن کر سارے جسم میں پھیل نہ جائے، اس وقت تک زندگی کی طاقت حاصل نہیں ہو سکتی۔ کھانے کے ظاہری ارکان بھی اگرچہ ضروری ہیں، کیونکہ ان کے بغیر روٹی معدے تک نہیں پہنچ سکتی، مگر محض ان ظاہری ارکان سے کام نہیں چل سکتا۔ ان ارکان میں کوئی جادو بھرا ہوا نہیں ہے کہ انہیں ادا کرنے سے بس طلسماتی طریقہ پر آدمی کی رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہو۔ خون پیدا کرنے کے لئے تو اللہ نے

جو قانون بنایا ہے اسی کے مطابق وہ پیدا ہوگا۔ اس کو توڑو گے تو اپنے آپ کو خود ہلاک کروگے۔

یہ مثال جو اس تفصیل کے ساتھ میں نے آپکے سامنے بیان کی ہے اس پر آپ غور کریں تو آپ کی سمجھ میں آسکتا ہے کہ آج آپ کی عبادتیں کیوں بے اثر ہوگئی ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی آپ سے بارہا بیان کرچکا ہوں سب سے بڑی غلطی یہی ہے کہ آپنے نماز روزے کے ارکان اور ان کی ظاہری صورتوں ہی کو اصل عبادت سمجھ رکھا ہے اور آپ اس خیال خام میں مبتلا ہوگئے ہیں کہ جس نے یہ ارکان پوری طرح ادا کردئیے اس نے بس اللہ کی عبادت کردی۔ آپ کی مثال اُس شخص کی سی ہے جو کھانے کے چاروں ارکان، یعنی نوالے بنانا، مُنہ میں رکھنا، چبانا، اور حلق کے نیچے اتار دینا، بس انہی چاروں کے مجموعے کو کھانا سمجھتا ہے، اور یہ خیال کرتا ہے کہ جس نے یہ چار ارکان ادا کردئیے اس نے کھانا کھالیا اور کھانے کے فائدے اس کو حاصل ہونے چاہئیں، خواہ اس نے ان ارکان کے ساتھ مٹی اور پتھر اپنے پیٹ میں اتارے ہوں، یا روٹی کھاکر فوراً قے کردی ہو۔ اگر حقیقت میں آپ لوگ اس حماقت میں مبتلا نہیں ہوگئے ہیں تو مجھے بتائیے یہ کیا ماجرا ہے کہ جو روزہ دار صبح سے شام تک برابر اللہ کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے وہ اس عبادت کی حالت میں جھوٹ کیسے بولتا ہے؟ غیبت کس طرح کرتا ہے؟ اس کی زبان سے گالیاں کیوں نکلتی ہیں؟ وہ عین عبادتِ الٰہی کی حالت میں لوگوں کے حق کیسے مار کھاتا ہے؟ حرام کھانے اور حرام کھلانے کے کام کس طرح کرلیتا ہے؟ اور پھر یہ سب کام کرکے بھی اپنے نزدیک یہ کیسے سمجھتا ہے کہ میں نے خدا کی عبادت کی ہے۔ کیا اس کی مثال اس شخص کی سی نہیں ہے جو راکھ اور مٹی کھاتا ہے اور محض کھانے کے چار ارکان ادا کردینے کو سمجھتا ہے کہ کھانا اسی کو کہتے ہیں۔ پھر مجھے بتائیے یہ کیا ماجرا ہے کہ رمضان بھر میں تقریباً ۳۶۰ گھنٹے خدا کی عبادت کرنے کے بعد جب آپ فارغ ہوتے ہیں تو اس پوری عبادت کے تمام اثرات شوال کی پہلی تاریخ ہی کو کافور ہوجاتے ہیں۔ ہندو اپنے تہواروں میں جو کچھ کرتے ہیں وہی سب آپ عید کے زمانے میں کرتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ شہروں میں تو عید کے روز بدکاری اور شراب نوشی اور

قمار بازی تک ہوتی ہے۔ اور بعض ظالم تو میں نے ایسے دیکھے ہیں جو رمضان کے زمانے میں دن کو روزہ رکھتے ہیں اور رات کو شراب پیتے اور زنا کاری کرتے ہیں۔ عام مسلمان خدا کے فضل سے اس قدر بگڑے ہوئے تو نہیں ہیں، مگر رمضان ختم ہونے کے بعد آپ میں سے کتنے ایسے ہیں جن کے اندر عید کے دوسرے دن بھی تقویٰ اور پرہیزگاری کا کوئی اثر باقی رہتا ہو؟ خدا کے قوانین کی خلاف ورزی میں کونسی کسر اٹھا رکھی جاتی ہے؟ نیک کاموں میں کتنا حصہ لیا جاتا ہے؟ اور نفسانیت میں کیا کمی آجاتی ہے؟ سوچئے اور غور کیجئے کہ اس کی وجہ آخر کیا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ کے ذہن میں عبادت کا مفہوم اور مطلب ہی غلط ہو گیا ہے۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ سحر سے لے کر مغرب تک کچھ نہ کھانے اور نہ پینے کا نام روزہ ہے اور بس یہی عبادت ہے۔ اس لئے روزے کی تو آپ پوری حفاظت کرتے ہیں۔ خدا کا خوف آپ کے دل میں اس قدر ہوتا ہے کہ جس چیز میں روزہ ٹوٹنے کا ذرا سا اندیشہ بھی ہو اس سے بھی بچتے ہیں۔ اور اگر جان پر بھی بن جائے تب بھی آپ کو روزہ توڑنے میں تامل ہوتا ہے لیکن آپ نہیں جانتے کہ یہ بھوکا پیاسا رہنا اصل عبادت نہیں بلکہ عبادت کی صورت ہے۔ اور یہ صورت مقرر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ آپ کے اندر خدا کا خوف اور خدا کی محبت پیدا ہو، اور آپ کے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ جس چیز میں دنیا بھر کے فائدے ہوں مگر خدا ناراض ہوتا ہو اس سے آپ اپنے نفس پر جبر کر کے بچ سکیں، اور جس چیز میں طرح طرح کے خطرات اور نقصانات ہوں مگر خدا اس سے خوش ہوتا ہو، اس پر آپ اپنے نفس کو مجبور کر کے آمادہ ہو سکیں۔ یہ طاقت اسی طرح پیدا ہو سکتی تھی کہ آپ روزے کے مقصد کو سمجھتے اور مہینہ بھر تک آپ نے خدا کے خوف اور خدا کی محبت میں اپنے نفس کو خواہشات سے روکنے اور خدا کی رضا کے مطابق چلانے کی جو مشق کی ہے اس سے کام لیتے۔ مگر آپ تو رمضان کے بعد ہی اس مشق کو اور ان صفات کو جو اس مشق سے پیدا ہوتی ہیں اس طرح نکال پھینکتے ہیں جیسے کھانا کھانے کے بعد کوئی شخص انگلی ڈال کر قے کر دے۔ بلکہ آپ میں سے بعض لوگ تو روزہ کھولنے کے بعد ہی دن بھر کی پرہیزگاری کو اگل دیتے ہیں۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ رمضان اور اس کے روزے کوئی

طلسم تو نہیں ہیں کہ بس ان کی ظاہری شکل پوری کر دینے سے آپ کو وہ طاقت حاصل ہو جائے جو حقیقت میں روزے سے حاصل ہونی چاہئے۔ جس طرح روٹی سے جسمانی طاقت اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ معدے میں جا کر ہضم نہ ہو اور خون بن کر جسم کی رگ رگ میں نہ پہنچ جائے، اسی طرح روزے سے بھی روحانی طاقت اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ آدمی روزہ کے مقصد کو پوری طرح سمجھے نہیں اور اپنے دل و دماغ کے اندر اس کو اترنے اور خیال، نیت، ارادہ اور عمل سب پر چھا جانے کا موقع نہ دے۔

یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کا حکم دینے کے بعد فرمایا لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ۔ یعنی تم پر روزہ فرض کیا جاتا ہے، شاید کہ تم متقی و پرہیزگار بن جاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ اس سے تم ضرور متقی و پرہیزگار بن جاؤ گے۔ اس لئے کہ روزے کا یہ نتیجہ تو آدمی کی سمجھ بوجھ اور اس کے ارادے پر موقوف ہے۔ جو اس کے مقصد کو سمجھے گا اور اس کے ذریعہ سے اصل مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرے گا وہ تو تھوڑا یا بہت متقی بن جائے گا۔ مگر جو مقصد ہی کو نہ سمجھے گا اور اسے حاصل کرنے کی کوشش ہی نہ کرے گا اسے کوئی فائدہ حاصل ہونے کی امید نہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے روزے کے اصل مقصد کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور یہ سمجھایا ہے کہ مقصد سے غافل ہو کر بھوکا پیاسا رہنا کچھ مفید نہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

من لم یدع قول الزور والعمل بہ فلیس للہ حاجۃ فی ان یدع طعامہ وشرابہ	جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اس کا کھانا اور پانی چھڑا دینے کی اللہ کو کوئی حاجت نہیں ہے۔

دوسری حدیث میں ہے کہ سرکار نے فرمایا:۔

کم من صائم لیس لہ من صیامہ الا الظمأ وکم من قائم لیس لہ من قیامہ الا السھر۔	بہت سے روزہ دار ایسے ہیں کہ روزے سے بھوک پیاس کے سوا ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا، اور بہت سے راتوں کو کھڑے رہنے والے ایسے ہیں کہ اس قیام سے رتجگے کے سوا ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔

ان دونوں حدیثوں کا مطلب بالکل صاف ہے۔ ان سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ محض بھوکا اور

پیاسا رہنا عبادت نہیں ہے، بلکہ اصل عبادت کا ذریعہ ہے، اور اصل عبادت ہے خوف خدا کی بنا پر اس کے قانون کی خلاف ورزی سے بچنا، اور محبت الٰہی کی بنا پر ہر اس کام کے لئے شوق سے لپکنا جس میں محبوب کی خوشنودی ہو، اور نفسانیت سے بچنا جہاں تک بھی ممکن ہو۔ اس عبادت سے جو شخص غافل رہا اس نے خواہ مخواہ اپنے پیٹ کو بھوک پیاس کی تکلیف دی۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی حاجت کب تھی کہ بارہ چودہ گھنٹے کے لئے اس سے کھانا پینا چھڑوا دیتا۔

روزے کے اصل مقصد کی طرف سرکار اس طرح توجہ دلاتے ہیں کہ :۔

من صام رمضان ایماناً واحتساباً غُفِرَ له ما تقدّم من ذنبه

جس نے روزہ رکھا ایمان اور احتساب کے ساتھ اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیئے گئے۔

ایمان کا مطلب ہے کہ ا کے متعلق ایک مسلمان کا جو عقیدہ ہونا چاہئے وہ عقیدہ ذہن میں پوری طرح تازہ رہے۔ اور احتساب کا یہ مطلب ہے کہ آدمی ہر وقت اپنے خیالات اور اپنے اعمال پر نظر رکھے کہ کہیں وہ اپنے ایمان کے خلاف تو نہیں چل رہا ہے۔ ان دونوں چیزوں کے ساتھ جو شخص رمضان کے پورے روزے رکھے گا وہ اپنے پچھلے گناہ بخشوا لے جائے گا اس لئے کہ اگر وہ کبھی سرکش و نافرمان بندہ تھا بھی تو اب اس نے اپنے مالک کی طرف پوری طرح رجوع کر لیا، اور التائب من الذنب کمن لا ذنب له۔

دوسری حدیث میں آیا ہے :۔

الصیام جُنّةٌ واذا کان یومُ صومِ احدکم فلا یرفث ولا یصخب۔ فان سابّه احد او قاتله فلیقل انی امرؤٌ صائم

روزے ڈھال کی طرح ہیں کہ جس طرح ڈھال دشمن کے وار سے بچنے کے لئے ہے اسی طرح روزہ بھی شیطان کے وار سے بچنے کے لئے ہے۔ لہٰذا جب کوئی شخص روزے سے ہو تو اسے چاہئے کہ اس ڈھال کو استعمال کرے اور دنگے فساد سے پرہیز کرے۔ اگر کوئی اس کو گالی دے یا اس سے لڑے تو اس کو کہہ دینا چاہئے کہ بھائی میں روزے سے ہوں۔ مجھ سے تم یہ توقع نہ رکھو کہ تمہارے اس مشغلہ میں حصہ لونگا۔

دوسری احادیث میں حضور نے بتایا ہے کہ روزے کی حالت میں آدمی کو زیادہ سے زیادہ نیک کام کرنے چاہئیں اور ہر بھلائی کا شوقین بن جانا چاہئے۔ خصوصاً اس حالت میں اس کے اندر اپنے دوسرے بھائیوں کی ہمدردی کا جذبہ تو پوری شدت کے ساتھ پیدا ہو جانا چاہئے، کیونکہ وہ خود بھوک پیاس کی تکلیف میں مبتلا ہو کر زیادہ اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے کہ دوسرے بندگانِ خدا پر غریبی اور مصیبت میں کیا گزرتی ہوگی۔ حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ خود سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں عام دنوں سے زیادہ رحیم اور شفیق ہو جاتے تھے۔ کوئی سائل اس زمانے میں حضور کے دروازے سے خالی نہ جاتا۔ اور کوئی قیدی اس زمانے میں قید نہ رہتا تھا۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضور نے فرمایا۔

من فطر فیہ صائماً کان لہ	جس نے رمضان میں کسی روزہ دار کو افطار کرایا تو یہ اس کے
مغفرۃً لذنوبہ وعتق رقبتہ من	گناہوں کی بخشش کا اور اس کی گردن کو آگ سے چھڑانے
النار وکان لہ مثل اجرہ من غیران	کا ذریعہ ہوگا اور اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا
ینتقص من اجرہ شیٔ۔	اس روزہ دار کو روزہ رکھنے کا ثواب ملے گا۔

خطبۂ ثانیہ الحمدُ للہِ العلیِّ العظیمِ والصلوٰۃُ والسلامُ علیٰ رسولِہِ الکریم۔

معاشر مسلمین! اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان ہم پر یہ ہے کہ اس نے ہم کو اسلام کی نعمت سے نوازا، اور اسلام کی نعمت ہم کو جس ذریعہ سے پہنچی ہے وہ اللہ کے رسول برحق کی ذات ہے۔ لہٰذا جس طرح ہم پر اللہ کا شکر اور اس کی حمد و ثنا واجب ہے، اسی طرح اللہ کے رسول پر صلوٰۃ و سلام بھیجنا بھی واجب ہے۔ اللّٰھمّ صل علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ اٰل محمد کما صلیت علیٰ ابراھیم وعلیٰ اٰل ابراھیم انک حمیدٌ مجیدٌ۔ اس کے بعد ہمیں دعائے رحمت کرنی چاہئے حضور کے اصحاب و اہل بیت پر، اور خصوصاً آپ کے خلفائے راشدین حضرات ابوبکر صدیق و عمر بن الخطاب و عثمان ابن عفان و علی ابن ابی طالب پر کہ یہی حضرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح پیروی کر کے ہمارے لئے ایک روشن راستہ چھوڑ گئے ہیں۔

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ۔

اس کے بعد دعا کیجئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہم کو راہِ راست پر قائم رکھے اور گمراہی سے بچائے۔ خدایا ہمیں حق کو حق کرکے دکھا اور اس کی پیروی کی توفیق دے۔ اور ہمیں باطل کو باطل کرکے دکھا اور اس سے بچنے کی توفیق دے۔ خدایا جو تیرے دین کی مدد کرے تو اس کی مدد کر اور ہمیں اس کا ساتھی بنا۔ اور جو تیرے دین سے مُنہ پھیرے تو بھی اس سے منہ پھیر لے اور ہمیں اس کے فتنہ میں پڑنے سے بچا۔ خدایا! دنیا میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ بر وبحر میں فساد پھوٹ پڑا ہے، ایک تلاطم ہے جس میں تیرا نام لینے والوں کی ٹوٹی ہوئی کشتی تھپیڑے کھا رہی ہے۔ خدایا! تو ہی ہم کو علم کا نور دینے والا ہے کہ سیدھا راستہ دیکھ سکیں اور تو ہی ہمیں طاقت بخشنے والا ہے کہ اس طوفان سے صحیح وسالم بچ کر نکل سکیں۔ خدایا! تیرا ہی وعدہ ہے کہ اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ۔ لہٰذا ہم تجھ سے دعا کرتے ہیں اور تو اسے قبول کر! رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔

عباد اللہ! انّ اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشآء والمنکر والبغی۔ یعظکم لعلکم تذکرون۔ اذکروا اللہ یذکرکم وادعوہ یستجب لکم۔ ولذکر اللہ تعالیٰ اعلیٰ واولیٰ واعز واجل واھم واتم واقویٰ واکبر۔

مطبوعات

مقالات شبلی حصہ چہارم، حصہ پنجم، حصہ ششم، حصہ ہفتم تالیفات مولانا شبلی مرحوم۔ ضخامت بالترتیب ۱۸۹، ۱۳۸، ۲۴۰، ۱۰۷ صفحات قیمت عہ، عہ، عمہ ملنے کا پتہ:۔ دار المصنفین اعظم گڈھ

مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے مستقل تصانیف کے علاوہ مختلف عنوانوں پر متعدد مضامین نکلے تھے، جن میں سے اکثر الندوہ میں شائع ہوئے تھے۔ مولانا مرحوم کا محققانہ اصول نگارش جس طرح ان کی مستقل تصنیفات میں نمایاں ہے، اسی طرح ان کے متفرق مضامین میں بھی موجود ہے۔ ادارہ دار المصنفین، جو مرحوم ہی کی یادگار ہے، ان قابل قدر علمی جواہر پاروں کو جو مختلف مقالات میں بکھرے پڑے تھے حسن ترتیب کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کر رہا ہے۔ اب تک اس سلسلہ کی سات جلدیں نکل چکی ہیں۔ آخر کی چار جلدیں اس وقت زیر تبصرہ ہیں۔

حصہ چہارم تنقیدی مباحث پر مشتمل ہے۔ سترہ کتابوں پر تفصیلی تبصرے ہیں۔ ان کتابوں میں اکثر وہ بلند پایہ اسلامی تصنیفات ہیں جو آج یورپ کی بدولت ہر گلی کوچے میں پھیل چکی ہیں، لیکن نصف صدی پیشتر تک خود مسلمان ان کے نام سے بھی بہت کم واقف تھے۔ اگرچہ ان مقالات کی حیثیت محض تبصروں کی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بجائے خود مفید، مدلل اور پر از معلومات مضامین ہیں۔ اور مولانا کا کمال خاص یعنی ان کا ذوق تنقیدی تو ایک ایک فقرہ میں جھلکتا ہے۔ بالخصوص تمدن اسلام کے مصنف جرجی زیدان نے اپنی کتاب میں جن متعصبانہ عیاریوں سے اسلام کی مدح کے پردہ میں تنقیص کی تھی، اور جس کی نظر فریبی اچھے اچھے

دیدہ وروں کو حیرت دے گئی تھی، ان کی پردہ دری نہایت بالغ نظری سے کی گئی ہے۔

حصّہ پنجم تاریخ وسیر سے متعلق ہے۔ اس میں مشاہیر اسلام کے سوانح حیات ہیں۔ تاریخ مولانا مرحوم کا خاص فن تھا، اس لئے ان مضامین کی نسبت کسی تفصیلی اظہار رائے کی ضرورت نہیں۔ معتزلہ اور اعتزال کی تاریخ بیان کرتے ہوئے جگہ جگہ مصنف نے "اعتزال" کو "عقلیت" سے تعبیر کیا ہے مگر یہ تعبیر ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اعتزال کو نہ تو خالص اسلامی عقلیت کہا جا سکتا اور نہ یونانی۔ بلکہ یہ بین بین کی ایک خام فلسفیت ہے جس میں ایک طویل عرصہ تک مسلمان معقولیین اس وقت تک بھٹکتے رہے جب تک علوم عقلیہ نے ان کے اندر پختگی حاصل نہ کر لی۔ قریبی دور میں جس طرح یورپ کے علوم عقلیہ کی نئی نئی چمک دمک دیکھ کر ہماری آنکھیں خیرہ ہوئی تھیں، اور اب آہستہ آہستہ ان علوم کی گہرائیوں تک پہنچ کر یہ خیرگی دور ہو رہی ہے، اسی طرح ابتدائی زمانہ میں بھی جب مسلمان نئے نئے فلسفۂ یونان وعجم سے واقف ہوئے تھے تو ان پر یہی خیرگی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، اور وہ کہیں صدیوں میں جا کر دور ہوئی۔ لہٰذا اگر نئے دور کے اعتزال کو حقیقی معنوں میں "عقلیت" سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا تو پرانے زمانے کا اعتزال بھی اس نام کا مستحق نہیں۔

اسی طرح ایک موقع پر ضمناً مصنف کے بعض بیانات سے اس خیال کی تائید نکلتی ہے کہ اسلامی علوم کا اصلی سرچشمہ یونانی زبان ہے ہمیں اس عمومی فیصلہ کے تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ارتقاء تہذیب کی تاریخ میں ہر بعد کی قوم نے پہلے کی قوموں کے کارناموں سے استفادہ کیا ہے اور یہ استفادہ کوئی عیب نہیں ہے۔ مسلمانوں نے بھی جب اس راہ میں قدم رکھا تو اقوام قدیمہ کے کارناموں سے استفادہ کیا۔ مگر مسلمانوں کا اصلی عطیہ (CONTRIBUTION) جس نے افکار انسانی کی رَو کو خیالیت سے واقعیت کی طرف پھیر دیا، اور خرص وتخمین سے ہٹا کر تحقیق کی طرف متوجہ کیا، اس کا سرچشمہ بجز قرآن حکیم کے کوئی نہیں۔ اس کا نشان ان سے پہلے کی کسی قوم کے علوم میں نہیں ملتا۔

حصّہ ششم بھی تاریخی مقالات کا مجموعہ ہے، جن میں عام تاریخی مباحث پر سیر حاصل بحثیں کی گئی ہیں

یونانی، فارسی، ہندی وغیرہ غیر زبانوں کا قدیم لٹریچر جس طرح عربی زبان کے دامن میں آکر مسلمانوں کے ہاتھوں زندۂ جاوید ہوگیا، اس کی مفصل تاریخ ۱۱۰ صفحوں میں موجود ہے۔ اس سے مسلمانوں کی علم دوستی اور غیر عربی علوم کے ساتھ غیر متعصبانہ رغبت و اعتنا کا حال معلوم ہوسکتا ہے۔ یورپ کی ان افترا پردازیوں میں سے جنھیں اس کے متعصب دماغ نے گھڑ کر مسلمانوں کو بدنام کیا ہے، ایک کتب خانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کا واقعہ بھی ہے۔ مولانا مرحوم نے اس سراپا غلط الزام کی پوری قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ اس مجموعہ میں سات مباحث ہیں اور ساتوں اسلامی تاریخ کی جان ہیں۔

جلد ہفتم میں فلسفیانہ مقالے ہیں۔ مسلمانوں کے متعلق یورپین ججوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ فلسفہ میں ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے، فلسفۂ یونان کی کورانہ تقلید ان کے فلسفہ کا آخری زینہ ہے۔ مولانا نے تاریخی حقائق سے اس بے بنیاد ادعا کی تردید کی ہے، اور بتایا ہے کہ مسلمانوں نے فلسفۂ یونان کو کس طرح محفوظ کیا؟ اس میں کیا اصلاح و ترمیم کی؟ اس پر کس قدر اضافے کئے؟ اس کے ساتھ انھوں نے خود یونانی منطق پر ___ جس کے ساتھ ہمارے علما اب تک چمٹے ہوئے ہیں ___ مجتہدانہ تنقید کرکے اس کی غلطیاں دکھائی ہیں، اور بتایا ہے کہ فلسفۂ اسلام، فلسفۂ یونان اور فلسفۂ جدیدہ کا درمیانی واسطہ ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ اسلامی فلسفہ ہی نے حکمتِ یونان کو ترقی کی منزلیں طے کراکے اس مقام تک پہنچایا جہاں سے فلسفۂ حال کی داغ بیل پڑی۔

فلسفہ کے مختلف ادوار و مدارج کے متعلق مصنف کا یہ ریمارک یہاں تک تو بالکل واقعیت پر مبنی ہے، لیکن اس کے بعد انھوں نے جو قدم اٹھایا ہے اس میں جگہ جگہ فلسفۂ یورپ کے مقابلہ میں اس ذہنی مرعوبیت کے آثار دکھائی دیتے ہیں جو انیسویں صدی کے آخر میں تمام مسلمانوں پر چھاگئی تھی۔ بلاشبہ یورپین فلسفہ کی ابتدا اسلامی فلسفہ کی دست نگر ہے مگر آج وہ اپنی انتہا کو پہنچ کر اسلام سے اسی قدر دور ہوچکا ہے جس قدر یونانی فلسفہ تھا، بلکہ اصول و مبادی کے لحاظ سے اس سے بھی زیادہ۔ حکمتِ جدیدہ

کا نقطۂ آغاز خدا کو نہ ماننے کی خواہش ہے جو بجائے خود کسی علمی استدلال پر مبنی نہیں ہے بلکہ ایک بگڑی ہوئی ذہنیت اور ایک بھٹکے ہوئے رجحان نفس پر مبنی ہے۔ معقولات خالصہ ہوں یا نظری سائنس، دونوں کی بنیاد یہی چیز ہے، اور اسی خشتِ اوّل کی کجی نے ثریا تک اس دیوار کو کج کرکے رکھ دیا ہے۔ ڈارون کی تھیوری بھی جس کی مصنف نے دبی زبان سے تائید کی ہے درحقیقت اسی بنیاد پر مبنی ہے۔ اس نے آثار کائنات کا مشاہدہ اس مفروضہ کے ساتھ کیا کہ اس نظام کا کوئی بنانے اور چلانے والا نہیں ہے، اور پھر اس خواہش کے ساتھ تحقیق شروع کی کہ ایک صانع حکیم کے بغیر اس نظام کے چلنے کا معمہ حل کیا جائے، لہٰذا تمام علمی حقائق (SCIENTIFIC FACTS) جو اس کے سامنے آئے ان کو اس نے اس طور پر مرتب کر دیا کہ ان سے انواع کے خود بخود ایک نوع سے دوسری نوع میں تبدیل ہونے اور ترقی کرنے کا نتیجہ برآمد ہو۔ یہ نتیجہ بجائے خود علمی حقیقت نہیں ہے، بلکہ حقائق کی اس ترتیب سے پیدا ہوتا ہے جو خدا کو نہ ماننے کی مجرد خواہش پر مبنی ہے۔ مولانا مرحوم نے ڈارون کی تھیوری کو محض ارتقاء کی تھیوری سمجھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ حکمائے اسلام بھی اس کے قائل تھے۔ مگر شاید یہ بات مرحوم کے علم میں نہ آئی کہ ڈارون کا اصلی کام نفس ارتقاء کا اثبات نہیں ہے بلکہ اس امر کا ادعا ہے کہ تنازع للبقاء اور انتخاب طبیعی اور بقائے اصلح کے قوانین کے تحت انواع خود بخود ایک دوسرے میں تبدیل ہوتی اور ترقی کرتی ہیں۔ حکمائے اسلام میں سے اس چیز کا نہ کوئی قائل ہوا، نہ کسی خدا پرست کا ذہن اس نظریہ کی طرف منتقل ہو سکتا ہے۔ اور نہ خود ڈارون اس کو علمی حقیقت ثابت کر سکا ہے۔ وہ جو کچھ علمی طور پر ثابت کر سکا ہے وہ صرف یہ ہے کہ عالم طبیعی میں یہ قوانین کام کر رہے ہیں، اور یہ کہ انواع میں ترتیب صعودی پائی جاتی ہے۔ رہا یہ کہ ان قوانین کے تحت نوع سافل سے نوع عالی کی طرف خود بخود صعود ہوتا ہے، تو یہ مجرد قیاس ہے۔ سائنٹفک حقیقت ثابت نہیں ہو سکا۔

قادیانی مذہب تالیف جناب سلاح الدین محمد الیاس صاحب برنی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی علیگ ناظم سررشتہ تالیف و ترجمہ حیدرآباد۔ ضخامت ۷۰۰ صفحات، قیمت ۳، ملنے کا پتہ:۔ تاج کمپنی لاہور۔

ناظرین ترجمان القرآن اس کتاب کے نام سے ناواقف نہیں ہیں۔ ہم اس کے گذشتہ ایڈیشنوں پر برابر تبصرہ کرتے رہتے ہیں۔ اب اسی کتاب کا پانچواں ایڈیشن شائع ہوا ہے جس میں کثرت سے نئے مباحث اور حوالجات اضافہ کئے گئے ہیں۔ اور ان تمام قادیانی کتابوں کا جواب دے دیا گیا ہے جو اس کتاب کے سابقہ ایڈیشنوں کے رد میں شائع کی گئی ہیں۔ کتاب کی جامعیت، ترتیب کی خوبی، طرز بیان کی شگفتگی اور طریقۂ انہام وتفہیم کی جدت کا صحیح اندازہ پڑھنے ہی پر موقوف ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں قادیانیت اور بانی قادیانیت کا ایک ایک خط وخال بے حجاب نظر آتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس کتاب میں جو کچھ کہا گیا ہے، مرزا صاحب اور ان کے اصحاب کی زبان ہی سے کہا گیا ہے۔ یعنی قادیانیت کی کہانی خود اپنی زبانی ہے۔ قادیانیت گو اپنی موت آپ مر رہی ہے، تاہم پھر بھی ضرورت ہے کہ بے خبر مسلمانوں میں یہ کتاب کثرت سے پہنچے، اور لوگ اس فتنہ سے پرحذر رہیں۔ ہم خود اس فرقہ کے حق طلب طبقہ کی خدمت میں بھی مخلصانہ عرض کرتے ہیں کہ تعصب سے بالاتر ہو کر اس کتاب کو پڑھے لعلّہ یتذکّر او یخشیٰ۔

قادیانی قول وفعل | تالیف جناب پروفیسر صلاح الدین محمد الیاس صاحب برنی۔ ضخامت ۳۹۲ صفحات۔ قیمت ۱۲؍، ملنے کا پتہ:۔ تاج کمپنی لاہور۔

اس کتاب کو کتاب "قادیانیت" کا تتمہ یا تشریحی خلاصہ کہنا چاہئے جو "قادیانی مذہب" کے جواب "بشارت احمدیہ" کی تنقیح کے سلسلہ میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب بھی اسی متانت، جامعیت اور تحقیق کی حامل ہے جس کی مولف سے توقع کی جا سکتی ہے۔ اس میں ان تمام عذرات اور بیجا تاویلات کا تشفی بخش جواب دے دیا گیا ہے جنھیں جناب بشارت احمد صاحب قادیانی نے اپنی کتاب میں پیش کیا تھا۔ قادیانی تحریک کی تدریجی قلابازیاں، قادیانی قول وفعل کی مبہم اور مغالطہ آمیز دورنگی، اور احمدیت کی اسلام کے خلاف خطرناک روش بلکہ سازش کا حال جن لوگوں کو نہ معلوم ہو وہ لوگ "قادیانی مذہب" کے ساتھ ساتھ اس کتاب کا بھی مطالعہ کریں۔ ان دونوں کتابوں میں فاضل مؤلف نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا ہے کہ امت قادیان کے ہاتھوں

س کا اعمال نامہ۔ کامل اور مکمل اعمال نامہ جسے اس نے اپنے ہی قلم سے مرتب کیا ہے ـــــ دیباچہ
ف اتنی گذارش کی ہے کہ اِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۔ کیا قادیانی
ت اس گذارش پر توجہ کریں گے ؟۔

ن | مرتبہ سید معین الدین صاحب ایم اے۔ ضخامت ۳۲ صفحات، شرح چندہ سالانہ ۲؎۔ ملنے
۔ انجمن اتحادیہ مہاجرین بخارا و ترکستان گلی پہاڑی درزیاں، چتلی قبر، دہلی۔

روسی مظالم سے تنگ آکر بخارا اور ترکستان کے مسلمان دنیا کے مختلف ممالک میں ہجرت کر رہے ہیں۔
ے تقریباً پچاس لاکھ مہاجرین اپنی متاعِ ایمان کی خاطر اپنے وطن کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ ان میں سے
قافلہ ۱۰ اپریل ۱۹۳۷ء سے ہندوستان بھی آیا ہوا ہے۔ دہلی میں ان مہاجرین نے اپنی تنظیم کو لئے
ن اتحادیہ" کی بنا ڈالی ہے یہ ماہنامہ اسی انجمن کا آرگن ہے، جو چند ماہ سے نہایت کامیابی کے ساتھ
ہا ہے بعض مفید علمی و اسلامی مضامین کے علاوہ جو چیز خاص طور سے قابل توجہ ہے وہ اشتراکی روس
ت آفرینیوں اور فرزندانِ توحید کی خانہ بربادیوں کا وہ دل دوز مرقع ہے جسے یہ ستم زدہ مہاجرین
لم سے کھینچ رہے ہیں۔ دردمند مسلمانوں کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اس رسالہ کی صدا زیادہ سے زیادہ
ے تک پہنچائیں تاکہ ان فریب خوردوں کی آنکھوں سے پردہ ہٹ جائے جو اشتراکی نظام کو دنیا کے لئے
سمجھ رہے ہیں اور جنھیں سوویٹ روس کا جہنم زار جنت نشان نظر آرہا ہے۔ اس وقت انہیں معلوم
ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے وہ جس نظام کی عدل پروری اور انسانیت نوازی کا دن رات قصیدہ
رتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے اور جنھوں نے عملاً اسے دیکھا، بھگتا اور چکھا ہے وہ اس کا کیا حال
کرتے ہیں۔ توقع ہے کہ مسلمانانِ ہند اپنے مظلوم بھائیوں کے تجربہ اور مشاہدہ سے فائدہ اٹھائیں گے
تراکی زہر کو اسلامی تریاق سمجھنے کی خطرناک غلطی نہ کریں گے۔ اس رسالہ میں روسی اور اشتراکی نظام
ن جو کچھ شائع ہو رہا ہے نہ تو وہ کوئی پروپیگنڈا ہے اور نہ اختلافِ نظریات کا اثر ہے بلکہ یہ لوگ خود گھر کر

بھیدی ہیں، جیسا کچھ عملی دنیا میں انھوں نے اس نظام کو پایا ہے، بے کم وکاست بیان کر رہے ہیں۔ اس رسالہ کی توسیع اشاعت نہ صرف اخلاقی وعلمی بلکہ دینی خدمت ہے فَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی۔ اگرچہ ان مہاجرین کو ہندوستان آئے ہوئے ابھی کل سال ڈیڑھ سال ہوئے ہیں لیکن انھوں نے اردو ادب میں حیرت انگیز مہارت پیدا کرلی ہے۔ اس لئے رسالہ کی ادبیت بھی زیادہ "بدیسی" نہیں ہے ہمارے ترک بھائیوں کے لئے اسلام کی قومیت اور ملیت کافی ہے انھیں "چنگیز" جیسے فاتحوں پر فخر کرنے کی ضرورت نہیں۔

قائد | مرتبہ مولوی سید اختر اسلام صاحب قاسمی۔ ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت سالانہ عمدہ کاغذ ۱۲/ معمولی کاغذ عہ۔ پتہ :۔ مولانا حکیم انظار احمد صاحب محلہ فیل خانہ، مراد آباد (یوپی)

یہ ایک علمی، مذہبی اور اقتصادی ماہنامہ ہے جو بعض اکابر دیوبند کی سرپرستی میں مراد آباد سے شائع ہو رہا ہے۔ رسالہ کی جامعیت قابل قدر ہے۔ اس کا نصب العین خود اسی کے لفظوں میں آنحضرت صلعم اور صحابہ کرام کے حالات پیش کرکے مسلمانوں کی اصلاح کرنا اور فلسفہ عروج وزوال پر بحث کرکے جذبات مسلم کو ابھارنا ہے، آخر میں ایک مضمون عربی زبان میں بھی شائع ہو رہا ہے۔ بہت سے مفید مضامین مسلسل شائع کئے جا رہے ہیں۔ سیاسی مباحث بھی موجود ہیں مگر افسوس کہ کبھی کبھی متانت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ بھی جاتا ہے۔ ایک ایسے رسالہ کو جو اسلامی تہذیب کا علمبردار اور "انسائیکلوپیڈیا" ہونے کا داعیہ رکھتا ہو کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ عام اخباری لب ولہجہ اختیار کرے۔ مخالف برسر غلط سہی لیکن لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ کی تعلیم غلط نہیں۔

فردوس | مرتبہ جناب حبیب اشعری صاحب دہلوی، ضخامت ۳۲ صفحات، قیمت عہ ملنے کا پتہ :۔ دفتر رسالہ فردوس، دہلی

سال رواں کے جدید ادبی ماہناموں اور شعر وادب کے ممتاز خدمت گذاروں میں سے ہے۔

افسانے معیاری اور نتیجہ خیز ہیں، "حبل القمر" کے عنوان سے جو افسانہ شائع ہوا ہے اس کی تلخ نگاری کچھ پسندیدہ نہیں۔ علماء سو کی بے اعتدالیوں کا ہم انکار نہیں کرتے مگر علماء کی پوری جماعت کو عمومی حیثیت سے اس بے اعتدالی کا مجرم کیوں ٹھہرایا جائے، اور وہ بھی ایسے غیر مہذب و سخیف انداز میں۔

کانگریس یا مسلم لیگ | تالیف جناب حکیم انصاری صاحب، ضخامت ۴۰ صفحات، قیمت ۲ر
ملنے کا پتہ :- ناظم دار الاشاعت سیاسیات مشرقیہ۔ آفندی لاج۔ قرولباغ۔ نئی دہلی۔

مسلمانوں کی جہالت اور مفلوج ذہنیت سے یورپ ایک مدت سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ہندی سیاست کے موجودہ انقلاب میں ہندو بھی مسلمانوں کے متعلق اسی داؤ سے کام لینا چاہتا ہے بلکہ کانگریس کے اسلحہ خانہ سے اس کا استعمال بھی شروع کر چکا ہے اور مسلم قوم ہے کہ ابھی تک کانگریس کے متعلق یہی طے نہیں کر سکی کہ اس میں مسیحائیت ہے یا دجالیت۔ یہ رسالہ اختصار کے باوجود اس بحث پر ایک حقیقت افروز تبصرہ ہے جس میں مصنف نے نہایت سلجھے ہوئے اور دلنشیں پیرایہ میں، بصورتِ مکالمہ ان تمام غلط فہمیوں کی اصلیت آشکارا کر دی ہے جس میں ہمارا جوشیلا وطن پرست اور کانگریسی مسلمان مبتلا ہے۔ محض حقائق اور واقعات سے بحث کی گئی ہے۔ انداز بیان کی متانت اور شرافت نے اس رسالہ کی قیمت میں خاص اضافہ کر دیا ہے۔ جو سلیم الطبع مسلمان سیاست حاضرہ کی پیچیدگیوں کو سمجھنا چاہے اسے اس رسالہ کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

مولف نے کانگریس پر اجمالاً تنقید کا پورا حق ادا کر دیا ہے لیکن مسلم لیگ سے انھوں نے کوئی خاص تعرض نہیں کیا ہے۔ مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم اور اتحاد کی ضرورت اور اس کے طریقہ کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، نہیں معلوم کوئی مدعی اسلام اس سے کیسے انکار کرے گا؟

آزادی کی جنگ | تالیف عبدالوحید خانصاحب بی، اے، ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ قیمت ۴ر
ملنے کا پتہ :- عبدالوحید خانصاحب۔ ۹ لاٹوش روڈ لکھنؤ۔

یہ کتاب بھی سیاست حاضرہ سے تعلق رکھتی ہے جس میں فاضل مصنف نے نہایت کاوش کے ساتھ سیاسی معلومات کا ایک معقول ذخیرہ جمع کرکے کانگریس کے ادعائے آزادی کی حقیقت کھولی ہے اور کانگریسی قول و فعل کا ایک ایسا مرقع دیا ہے جس میں کانگریس کی مہابھائیانہ ذہنیت اور اسلام دشمنی کا چہرہ بے حجاب نظر آتا ہے۔ جو بات کہی گئی ہے واقعات کی سند کے ساتھ۔ گو مولف کا خلوص آمیز جوش اور اسلامی غیرت ہر ہر فقرہ سے نمایاں ہے مگر باوجود اس کے قلم کہیں بھی حدود متانت سے متجاوز نہیں ہوا ہے۔ مولف مسلم لیگ کا پرجوش حامی ہے، اس لئے فطرتاً اس نے اس کے نقائص سے بحث نہیں کی ہے، حالانکہ یہ چیز بھی خاص توجہ کی مستحق ہے۔ اگر مسلم لیگ اپنی موجودہ کمزوریوں سے پاک ہوتی تو کانگریس کی فریب کاریاں کبھی بار آور ہونے کا حوصلہ نہ کرسکتیں ہاں مولف کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ حریت پسند مسلمان لیگ پر قبضہ کرکے نہایت آسانی کے ساتھ اس کی اصلاح کرسکتے ہیں لیکن آج کا مسلمان جب دن کو رات کہہ دیتا ہے تو سورج اس کی نگاہوں سے چھپ جاتا ہے اور آسمان کے ہر گوشے میں ماہ و پرویں دکھنے لگتا ہے۔

کتاب میں طباعت کی غلطیاں بہت زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی ترتیب میں بھی اصلاح کی کافی گنجائش ہے اگر اس تمام مواد کو سائنٹفک طریقہ سے ترتیب دیکر بحث کو اور سلجھا دیا جائے تو کتاب کا معنوی حسن اور زیادہ جاذب نظر بن جائے گا۔

زبدۃ السیرۃ النبویہ | تالیف جناب مولانا عماد الدین صاحب انصاری۔ ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت ۳ر

ملنے کا پتہ:۔ ناظم کتب خانہ انصاریہ جالندھر۔

یہ کتاب عربی مبتدیوں کے لئے لکھی گئی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ نہایت صاف اور سلیس عبارت میں پیش کی گئی ہے۔ نحو صرف کی ابتدائی کتابوں کے ساتھ اس کا پڑھایا جانا ایک طرف طلبہ کے لئے ادبی مشق کا کام دے گا دوسری طرف دنیا کے سب سے کامل انسان کی سیرت ان کے اخلاق کو سنوارے گی۔

مسلمان

اور

موجودہ سیاسی کشمکش

حصّہ دوم

ترجمان القرآن کی یہ اشاعت خاص جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کو عوام الناس تک پہنچانے کے لئے ہلکے کاغذ پر چھپوا کر ذیل کے نرخوں پر فروخت کیا جا رہا ہے۔ جو مخیر حضرات، یا اسلامی اور سیاسی انجمنیں اپنے اپنے حلقوں میں اس کتاب کو پھیلانا چاہیں۔ وہ ذیل کے نرخوں پر ہم سے طلب کر سکتے ہیں:-

کرایہ ریل و خرچ ڈاک بذمہ خریدار

قیمت ۱ کاپی	۸ آنے
قیمت ۵ کاپی	۲ روپے ۴ آنے
قیمت ۲۵ کاپی	۱۱ روپے ۸ آنے
قیمت ۵۰ کاپی	۲۲ روپے
قیمت ۱۰۰ کاپی	۴۰ روپے

مہتمم شعبۂ اشاعت دارالاسلام (پٹھان کوٹ - پنجاب)

مسلمان

اور

موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ اول

اس کتاب میں ایڈیٹر ترجمان القرآن کے وہ سیاسی مضامین یکجا جمع کرکے شائع کیے گئے ہیں جو ترجمان القرآن کی اشاعتہائے سابقہ میں محرم ۱۳۵۶ھ سے رجب ۱۳۵۶ھ تک لکھے گئے تھے۔ یہ کتاب اصل میں اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت، اور مستقبل کے امکانات پر ایک مدبرانہ تبصرہ ہے، جس سے مسلمانان ہند کے دل و دماغ میں ان کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ کوئی لکھا پڑھا مسلمان اس کے مطالعہ سے محروم نہ رہنا چاہئے۔ یہ کتاب اصل لاگت پر فروخت کی جا رہی ہے۔ ذیل کے نرخوں پر آپ اسے طلب فرما سکتے ہیں۔

ایک روپے میں ۵ نسخے	علاوہ محصول ڈاک	
نو روپے میں ۵۰ نسخے	کرایہ ریل بذمہ خریدار	
پندرہ روپے میں ۱۰۰ نسخے		

نوٹ: محصول ڈاک فی نسخہ سات پیسے بذمہ خریدار۔ ریلوے پارسل کے ذریعہ کم از کم ۲۰ نسخے منگوانے میں فائدہ رہتا ہے۔

شعبۂ اشاعت دار الاسلام (پٹھان کوٹ۔ پنجاب)

ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ

جلد ۱۳ - عدد ۶

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

ملتان روڈ، لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے

قیمت فی پرچہ ۸ آنے

فہرست مضامین

ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۳۹ء جلد ۱۳ عدد ۶

باہتمام سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں طبع ہو کر
دفتر ترجمان القرآن ملتان روڈ لاہور سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں کچھ مدت سے ایک مسودۂ قانون زیر بحث تھا جس میں مسلمان عورتوں کے لیے فسخ و تفریق کی کچھ آسانیاں تجویز کی گئی تھیں۔ اگرچہ اس مسودۂ قانون میں متعدد نقائص تھے، اور اب کہ وہ آخری بار اسمبلی میں منظور ہو کر نکلا ہے، اس کے نقائص پہلے سے بھی کچھ زیادہ بڑھ گئے ہیں، لیکن ہم نے اس پر کسی قسم کا اظہار رائے نہیں کیا۔ اس بنا پر نہیں کہ ہمیں عورتوں کی اصلاح حال سے، یا قانون اسلامی کے صحیح و مکمل نفاذ سے دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ محض اس بنا پر کہ ہم کسی مجلس قانون ساز کے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں کہ وہ شریعت اسلامی کی دفعات کو نافذ کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرے، یا قانونِ شریعت کی دفعات پر اس حیثیت سے بحث کرے کہ ان میں کیا چیز مناسب ہے اور کیا غیر مناسب، اور کسے نافذ کیا جائے اور کسے نہ کیا جائے۔ یہ حق خود مسلمانوں کی اپنی بنائی ہوئی کسی اسمبلی کو بھی نہیں ہے، کجا کہ انگریزوں کی بنائی ہوئی اسمبلی کو حاصل ہو، اور وہ بھی ایسی اسمبلی جس میں غیر مسلم اکثریت کے ووٹوں پر فیصلہ کا مدار ہو۔ قانون اسلامی کے متعلق اس قسم کے مسودات موجودہ حکومت کی بنائی ہوئی مجالس قانون ساز میں پیش کر کے خواہ چھوٹے چھوٹے فوائد کتنے ہی حاصل کر لیے جائیں، مگر سب سے بڑا اور سب سے زیادہ بھاری نقصان اس سے یہ پہنچتا ہے کہ ہم خدا اور اس کے رسول کے مقابلہ میں دوسروں کی رائے اور اپنی رائے کے حق تشریع کو تسلیم کرتے ہیں۔ تمام دنیا کے فوائد اس نقصان عظیم کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ مسلمانوں کے گھروں کا تباہ ہو جانا اور ان کی ہستی کا مٹ جانا اس سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ مسلمان قرآن اور سنت کے احکام و قوانین کو غیر مسلم قانون سازوں کے سامنے منظوری کے لیے پیش کریں، اور ان کے سامنے ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگیں کہ اس قانون کی … جسے ہم قانون الٰہی بھی ساتھ ہی ساتھ کہتے جاتے ہیں ـــ فلاں

فلاں دفعات کو ہمارے لیے قانون بنا دو۔ پھر وہ منظر جبکہ ایک طرف مسلمان یہ بھیک کا ہاتھ پھیلائے ہوئے ہو، اور دوسری طرف وہ غیر مسلم لیجسلیچر جو فیصلہ کا اختیار رکھتا ہے، اس کی آنکھوں کے سامنے شرعی قانون میں کانٹ چھانٹ کر رہا ہو، حقیقتاً ایسا منظر ہوتا ہے کہ اس کو دیکھنے سے پہلے مسلمان کا ڈوب مرنا زیادہ بہتر ہے!

یہ معاملہ کچھ اس قدر ایمان سوز اور غیرت شکن ہے کہ اس پر قلم اٹھاتے ہوئے روح کو اذیت ہوتی ہے۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ عامیوں سے لے کر علمائے کرام تک نے اس مسودۂ قانون کو اسمبلی کے سامنے پیش کرنے میں دلچسپی لی ہے، اور اس پر اس طرح زور دیا ہے کہ گویا دین و دنیا کی فلاح اسی پر منحصر تھی، تو دل پر پتھر رکھ کر جی چاہتا ہے کہ اس آخری منظر کا نقشہ یہاں کھینچا جائے جو مسودہ کی منظوری سے پہلے ۱۴ فروری کو اسمبلی میں دیکھا گیا شاید کہ اسی سے مسلمانوں کی سوئی ہوئی غیرت میں کچھ حرکت پیدا ہو۔

مولوی سید مرتضیٰ صاحب نے ترمیم پیش کی کہ خلع اور فسخ و تفریق کے مقدمات صرف مسلمان جج ہی کے سامنے پیش ہونے چاہئیں۔ اس پر حکومتِ ہند کے رکن قانون سر این این سرکار نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"مگر انتظامی مشکلات سے قطع نظر، حکومت ہند اس اصول ہی کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ ایک خاص فرقہ کے مقدمات کی سماعت اسی فرقہ کے جج کیا کریں۔ اس سے دوسرے فرقوں کے ججوں کی عدالتی امتیازی پر حرف آتا ہے۔"

اس کے معنی و مفہوم پر غور کیجیے۔ جو حکومت اس اصول کو خود قائم کر رہی ہے کہ انگریز کے مقدمہ کی سماعت خود ہمیشہ کا مامور کردہ غیر انگریز جج بھی نہیں کر سکتا، جس حکومت نے اپنے حدود مملکت ہی میں نہیں بلکہ ٹرکی اور مصر اور چین کی حکومتوں کے دائرۂ اختیار میں بھی مدتوں یہ اصول تسلیم کرایا کہ انگریزی قومیت والوں کے مقدمات غیر انگریزی عدالتوں میں پیش نہیں ہو سکتے، وہی حکومت ہم سے کہتی ہے کہ تمہارے شرعی مقدمات کے بارے میں یہ اصول تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ تمہاری ہی شریعت پر ایمان رکھنے والے ان کی سماعت کریں۔ تم کو اپنی عورتوں کے نکاح فسخ کرنے

اور تفریق بین المرء وزوجہ کے نازک معاملات بھی غیر مسلم ججوں کے سامنے پیش کرنے پڑیں گے، چاہے وہ تمہاری شریعت پر ایمان نہ رکھتے ہوں اور تعلقات زن و مرد کے متعلق ان کے نظریات تمہاری شریعت کے نظریات سے بالکل مختلف ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر تمہاری شریعت یہ کہتی ہے کہ فسخ نکاح اور تفریق بین الزوجین قاضی شرعی کے بغیر جائز نہیں، تو کہا کرے۔ اگر تمہارے دین کی رو سے غیر قاضی کے فسخ و تفریق کا اعتبار نہیں، اور اس طرح عورت کا نکاح ثانی درست نہیں ہوتا تو نہیں اس کی کیا پروا۔ جب تم خود اپنی شریعت کو ہمارے سامنے فیصلہ کے لیے پیش کرتے ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم نے خود ہی اپنے خدا اور رسول کے بجائے ہم کو شارع تسلیم کیا ہے۔ لہذا ہمارے اصول تمہاری شریعت پر مقدم ہیں۔ تمہاری شریعت تابع ہے اور ہمارے اصول متبوع!

کاش یہ بات سن کر اسمبلی کے مسلمان ممبروں کی آنکھیں کھلتیں اور وہ اس مسودے کو لا ممبر کے منہ پر مار کر باہر نکل آتے۔

مگر اسمبلی کے مسلمان ممبر! یہ مردم شماری کے مسلمان، جن کو ہماری قوم اپنے ووٹوں سے منتخب کرکے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجتی ہے۔ ان کی دینی حمیت کے نمونے تو بارہا دیکھے جا چکے ہیں۔ مگر کبھی مسلمانوں کو احساس ہی نہ ہوا کہ ہم کس نادانی کے ساتھ اپنا ووٹ استعمال کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب، جناب آصف علی نے کانگریس پارٹی کی طرف سے اس ترمیم کی مخالفت کی۔ دوسرے بزرگ جناب عبدالقیوم نے فرمایا کہ "یہ ترمیم اصلاً غلط ہے۔ ملک میں پہلے ہی جو امتیازات (مثلاً ریلوے اسٹیشنوں پر ہندو پانی اور مسلمان پانی) پھیلے ہوئے ہیں، ان کو قانون کی سرحدوں تک ہیں نہ پہنچا دینا چاہیے"۔ یہ دونوں حضرات نیشنلسٹ مسلم جماعت کے کھلے سربدار اور "متحدہ قومیت" کے علمبردار ہیں۔ یہ کس طرح برداشت کر سکتے ہیں کہ مسلم و کافر کے امتیازات مٹنے کے بجائے اور بڑھیں، یہاں تک بڑھ جائیں کہ اسلامی شریعت کی تعبیر و تفسیر کا حق بھی غیر مسلم سے چھین لیا جائے! مسلمان عورت کا نکاح تک غیر مسلم فسخ نہ کر سکے! "ہندو پانی" اور "مسلمان پانی" کی طرح "ہندو شاستری" اور "مسلم قاضی" کی آوازیں بھی آنے لگیں!

یہ اس "متحدہ قومیت" کی تفسیر ہے جس کے متعلق ہم کو قرآن و حدیث کی سند سے بتایا جاتا ہے کہ خدا بھی اس پر راضی ہے اور رسول کے عمل سے بھی ثابت ہے۔ "امۃ مع المومنین" والے معاہدہ کو پھر ذرا ملاحظہ فرما لیا جائے کچھ اس قومیت کا پتہ نشان بھی وہاں ملتا ہے کہ نہیں؟

مسٹر ایپی کانگریس نیشنلسٹ پارٹی کے لیڈر نے خوب کہا اور بالکل سچ کہا کہ:۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ان مقدمات کی سماعت کے لیے مسلمان جج پر کیوں اصرار کرتے ہیں۔ آپ خود ہی تو اسلامی پرسنل لا کے بجائے مجلس قانون ساز کا بنایا ہوا قانون وجود میں لا رہے ہیں۔ آپ ایک غیر دینی مجلس سے اسلامی قانون کی تعبیر اور اس کے اطلاق کا تصفیہ کرا رہے ہیں۔ اب اگر یہ مجلس قانون بنانے کا اختیار رکھتی ہے تو اس بات کا بھی اختیار رکھتی ہے کہ اس قانون کی تعبیر کا حق جن منصفوں کو چاہے دے، بلا اس لحاظ کے کہ ان کا عقیدہ کیا ہے"۔

یہ سیدھی اور صاف بات ایک غیر مسلم تو سمجھ گیا، مگر نہ سمجھے تو ہمارے وہ ماہرین قانون جنھوں نے مسودہ مرتب اور پیش فرمایا، اور وہ پیشوایان دین اور وہ علمبرداران حریت جنھوں نے انگریز کی قائم کی ہوئی غیر اسلامی مجلس آئین ساز کے سامنے اسلامی قانون کے نفاذ کی بھیک مانگنے کو نہ صرف جائز رکھا بلکہ اس کی پرزور حمایت کی۔

میں مانتا ہوں کہ شریعت کے قوانین پوری طرح نافذ نہ ہونے سے ہمارے معاملات بگڑ رہے ہیں، ہماری معاشرت اور ہمارے تمدن کا نظام مختل ہو رہا ہے، ہمارے گھر تک خراب ہو رہے ہیں۔ ہمیں شرعی قانون کے نفاذ کی بلاشبہ ضرورت اور سخت ضرورت ہے۔ مگر اس کی یہ کونسی صورت ہے کہ ہم خدا اور رسول کے قانون کو انگریزی کی اسمبلی کے سامنے پیش کریں، اور وہ جانچ پڑتال کے لیے سلکٹ کمیٹی کے حوالہ کیا جائے، اور اس کی دفعات پر کوئی سرکار، کوئی ایپی، کوئی آصف علی، کوئی عبدالقیوم رد و قدح کرے، اور ان کی تشریح کی

بنا پر نہ کہ اللہ اور اس کے رسول کی تشریع کی بنا پر، وہ قانون، قانون بنے؟ چھوڑیے غیرت اور حمیت کے سوال کو، میں پوچھتا ہوں کہ یہ کاظمی اور یہ ایچ اور یہ آصف علی اور عبد القیوم ہوتے کون ہیں کہ یہ اسلامی قانون بنائیں اور ان کا بنایا ہوا قانون مسلمانوں پر اسلامی قانون کی حیثیت سے نافذ ہو؟ اسلامی قانون تو وہی ہے جو صرف خدا اور اس کے رسول کی سینکشن سے قانون بنے۔ کسی عمرو زید کا بنایا ہوا قانون، خواہ اس کی دفعات لفظ بلفظ اسلامی قانون سے لی ہوئی کیوں نہ ہوں، اسلامی قانون نہیں ہو سکتا جبکہ اس کا قانون ہونا خدا اور اس کے رسول کے سوا کسی اور کی سینکشن پر مبنی ہو۔ غیر مسلم جج نہ سہی، مسلمان جج بھی اگر مقرر کر دیا جائے تو وہ بھی ایسے قانون کی رو سے مسلمان عورت کا نکاح فسخ نہیں کر سکتا۔ مسلمان عورت خدا کے قانون کی رو سے مسلمان مرد کے لیے حلال ہوتی ہے۔ غیر اللہ کا قانون اس کو اس مرد کے لیے حرام اور دوسرے مرد کے لیے کس طرح حلال کر سکتا ہے؟ آپ پر جو مشکلات اور مصیبتیں نازل ہو رہی ہیں وہ غیر اسلامی نظام کی اطاعت قبول کرنے کی قدرتی پاداش ہیں۔ اس سزا سے بچنے کے لیے اگر آپ غیر شارع کو شارع کا منصب دیں گے تو یہ اسی قسم کی حرکت ہوگی جیسے کوئی شخص ٹپکے کی مصیبت سے بچنے کے لیے چھت ہی گرا دے۔ ایک گناہ کی سزا سے بچنے کے لیے دوسرا گناہ اور عظیم ترین گناہ کرنا بچاؤ کی صورت نہیں ہے بلکہ اور زیادہ بربادی کی صورت ہے۔ بچاؤ کے سارے راستے بند ہیں۔ صرف ایک راستہ کھلا ہے اور وہ یہ ہے کہ غیر اسلامی نظام کو مٹا کر اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے جنگ کیجیے، اس کے لیے جیل جائیے، اس کے لیے لاٹھیاں کھائیے، اس کے لیے سر تک دے دیجیے۔ تمام قربانیوں کا مستحق یہی ایک مقصد ہے اور باقی سب جھوٹے مقاصد ہیں۔

خدا اور اس کے رسول کے احکام سے بغاوت کی وبا مسلمانوں کی جماعت میں جس حد تک پہنچ چکی ہے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے کیجیے جو ابھی پچھلے ہی مہینہ میں پیش آیا ہے۔ اگرچہ جسم قومی کے ان ناصوروں کو بار بار دکھانا نہ میرے لیے خوشگوار ہے، نہ ان کو دیکھنا برادران دینی ہی کے لیے خوشگوار

ہو سکتا ہے، مگر کیا کیجیے کہ یہ ناسور ہیں موجود، اور روز افزوں شدت کے ساتھ رس رہے ہیں، اس لیے آنکھیں بند کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ انھیں دکھانا اور بار بار دکھانا چاہتا ہوں کہ پورے جسم کے سڑنے سے پہلے مسلمان ان کی طرف متوجہ ہوں۔

ریاست کپورتھلہ میں سلطان پور لودی ایک پرانا تاریخی مقام ہے جہاں ہمارے رفیق مستری محمد صدیق صاحب کچھ عرصہ سے مسلمانوں کو اقامت صلوٰۃ کی تلقین کر رہے ہیں۔ اس تلقین و تبلیغ کے مقابلہ میں سب سے زیادہ جس خاندان نے انحراف و استکبار کیا وہ مقامی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب اور ان کا خاندان تھا۔ مستری صاحب نے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر کار انھوں نے باہر کے لوگوں سے مدد مانگی۔ چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن لودھیانوی اور یہ عاجز، دونوں سلطان پور پہنچے اور ہم نے انتہائی نرم طریقہ سے افہام و تفہیم کی، لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى۔ مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد جو اطلاعات مجھ تک پہنچیں وہ یہ ہیں کہ مستری صاحب نے حکم الٰہی کی تبلیغ برابر جاری رکھی، اور اس پر ان لوگوں کا استکبار یہاں تک بڑھ گیا کہ مار پیٹ پر اتر آئے۔ اِدھر سے نہایت عاجزی و مسکنت کے ساتھ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ کا حکم سنایا گیا اور اُدھر سے جواب میں ڈنڈے برسائے گئے۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ کیا اس حد کو پہنچ کر بھی کوئی شخص مسلمان رہ سکتا ہے؟ اوّل تو عادۃً ترک نماز خود ایک ایسا فعل ہے جس پر ایمان کے مسلوب ہو جانے کا ظن غالب ہوتا ہے۔ تاہم زمانہ کے بگڑے ہوئے حالات کی رعایت سے اس بارے میں حکم کو کچھ نرم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب فرض یاد دلایا جائے اور اس کا جواب صریح انکار سے دیا جائے، اور جب انکار پر اتنا اصرار ہو کہ فرمان الٰہی سنانے والے کو مارا جائے تو بتائیے کہ ایسے دل میں ایمان کا شائبہ بھی ہو سکتا ہے؟ ایسے لوگ بھی مسلمان ہوں تو آخر نامسلمان کون ہوں گے؟

مگر واقعہ یہ ہے کہ ہماری قوم میں ایسے ایسے دو نہیں بکثرت لوگ شامل ہیں۔ کریدے نہیں گئے اس لیے ان کا حال چھپا ہوا ہے، اور محض گناہ گار مسلمان سمجھ کر چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ اگر کریدے جائیں تو صاف

کھل جائے کہ شدید قسم کے منافق ہیں جو مسلمان کی حیثیت سے ہماری قوم میں شامل ہیں مسلمانوں کی معاشرت میں گھسے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں میں شادی بیاہ کر رہے ہیں۔ مسلمان بچوں کے معلم ہیں۔ قومی اداراتکے کرتا دھرتا ہیں۔ سیاسی مجالس میں قوم کے نمائندے ہیں۔ غرض ہر جگہ مسلمان کے طور پر لیے جا رہے ہیں۔ یہ نوکروڑ کا عظیم الشان جسم جو آپ کو نظر آرہا ہے، اس کا پھیلاؤ بڑی حد تک اسی آماس، اسی سوجن کا رہین منت ہے۔ اسی لیے جتنا اس جسم کا پھیلاؤ ہے اتنا اس میں زور نہیں ہے۔ سوجے ہوئے جسم کا مٹاپا قوت کا نہیں۔ الٹا ضعف کا سبب ہوتا ہے۔ مردم شماری کا یہ عدد کثیر جس میں ان منافقین کی تعداد کثیر ہی بنا ہے، اور اسی نے ہم کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ ہم اس تعداد کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اللہ اکبر! ہم ہندوستان میں نو کروڑ ہیں۔ بھلا اتنی بڑی قوم بھی کہیں بے بس اقلیت (HOPELESS MINORITY) ہو سکتی ہے۔ مگر سوچنے کا مقام ہے کہ "مسلمان" اور وہ بھی نو کروڑ کسی ایک ملک میں موجود ہوں، اور پھر ان کے دبدبے سے وہ ملک لرزنہ اٹھے، ان کے وزن سے اس ملک کا ہر ذرہ دب نہ جائے، یہ کہیں ممکن ہے؟ کہیں یہ بات تصور میں بھی آسکتی ہے کہ "مسلمان" اتنی بڑی تعداد میں ہو کر بھی غلام ہوں، بے وزن اور بے اثر ہوں؟ یہ دراصل ممکن ہی اس وجہ سے ہوا کہ اس مردم شماری میں اکثریت منافقوں کی ہے۔ خدا کے قانون سے بغاوت کرنے والے اس میں بھرے ہوئے ہیں۔ اس میں ان لوگوں کی کثرت ہے جن کو خدا کی اور اس کے قانون کی ذرہ برابر پروا نہیں۔ یہ بھاری بھرکم تعداد ایسے بہت لوگوں پر مشتمل ہے جو مہاراجہ کپورتھلہ کے تو چپراسیوں تک کا حکم ماننے سے انکار نہیں کر سکتے، اس لیے کہ وہاں سے روٹی بھی ملتی ہے اور جوتی بھی مل سکتی ہے، مگر خدا کے بڑے سے بڑے حکم کو بھی ٹھکرا سکتے ہیں اس لیے کہ نہ وہ انھیں روٹی دیتا نظر آتا ہے، اور نہ انھیں اس سے کسی سزا کا خوف ہے۔ اس قسم کے منافقین کی کثرت ہی نے ہمیں اس قدر کمزور کیا ہے۔ اگر یہ سب کے سب ہماری جماعت سے نکل جائیں اور حقیقی مسلمان نو کروڑ نہیں ۹ لاکھ بلکہ اس سے بھی کم رہ جائیں تو خدا کی قسم ہمارا وزن موجودہ حالت سے بدرجہا زیادہ ہوگا اور ہم اب سے بہت زیادہ زور آور ہوں گے۔

مسلمانوں کو درحقیقت متبعین اسلام کی تعداد بڑھانے کی جس قدر ضرورت ہے اس سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ منافقین کی اس بھرتی سے اپنی جماعت کو صاف کردیں۔ ان کا نکلنا رحمت ہے اور ان کا شامل رہنا لعنت ہے۔ جن کی گردن خدا کے سامنے اکڑتی اور بندوں کے سامنے جھکتی ہے ان کی ہمیں قطعاً ضرورت نہیں۔ ہم کو صرف ان کی ضرورت ہے جو خدا کے سامنے جھکنے والے اور سب کے سامنے اکڑنے والے ہوں۔ آنکھیں یہ دیکھتے دیکھتے تھک گئی ہیں کہ جو لوگ قانونِ الٰہی سے کھلم کھلا باغی ہیں وہ نہ صرف مسلمانوں میں شامل ہیں بلکہ اسلام کے نام سے فائدہ اٹھانے میں سب سے پیش پیش ہیں۔ مسلم قوم کے نام پر حقوق لینے ہوں، روٹیاں حاصل کرنی ہوں، اعزاز اور مناصب اور کرسیاں طلب کرنی ہوں تو یہ درجۂ اول کے مسلمان لیکن اسلامی عقائد اور اسلامی احکام کی پابندی کے لحاظ سے دیکھیے تو کسی درجے کے مسلمان بھی نہیں، بلکہ اسلام سے، اُس کے عقائد سے، اس کے احکام سے، اس کے شعائر سے غرض ہر چیز سے منحرف، اور صرف منحرف ہی نہیں بلکہ علی الاعلان باغی۔ اگر ان لوگوں میں کسی قسم کا اخلاقی احساس موجود ہوتا تو جس وقت یہ اپنے اندر یہ بات پاتے کہ اسلام کی اطاعت پر ان کا نفس آمادہ نہیں ہے، یا اسلام ان کے دل و دماغ میں نہیں اترتا اُسی وقت اپنے غیر مسلم ہونے کا صاف اظہار کر دیتے اور مسلمانوں کی سوسائٹی سے الگ ہو جاتے۔ اس صورت میں ہم ان کو کم از کم انسانی احترام کا مستحق تو ضرور سمجھتے۔ لیکن جو طریقہ انھوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ انہیں کسی عزت اور کسی احترام کا مستحق نہیں رکھتا اس لیے کہ منافق اور جاسوس کے لیے دنیا کے کسی قانون میں بھی کوئی حرمت نہیں۔ آزاد قوموں میں ایسے لوگوں کو پھانسی دی جاتی ہے۔ ہم آزاد نہیں تو کم از کم اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ ان کو اپنی جماعت سے نکال باہر کریں، چاہے یہ ہمارے بھائی بند اور عزیز و اقارب ہی کیوں نہ ہوں

اسلام باپ سے بیٹے کو نطفہ میں نہیں ملتا کہ جو مسلمان کے گھر پیدا ہو وہ لامحالہ مسلمان ہی ہو۔ اسلام کوئی نسلی قومیت نہیں ہے کہ جس طرح انگریز بہرحال انگریز ہے خواہ اس کے عقائد و اصول حیات کیسے ہی

ہوں، اسی طرح مسلمان بھی بہر حال مسلمان ہی رہے، خواہ وہ قرآن کی تعلیم اور اس کے احکام کا متبع ہو یا نہ ہو۔ جن لوگوں نے مسلمان کے معنی یہ سمجھے ہیں، اور اس بنا پر وہ اسلام سے باغی ہونے کے باوجود اپنے آپ کو نہ صرف مسلمان کہتے اور سمجھتے ہیں بلکہ مسلم قومیت کے علمبردار اور حقوق مسلمین کے وکیل بھی بنتے ہیں ہیں ان سے صاف کہتا ہوں کہ وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اسلام محض ایک عقیدہ، ایک مسلک اور ایک نظام زندگی ہے۔ جو اس کی صحت و صداقت پر ایمان لا کر اس کا اتباع کرتا ہے وہی مسلمان ہے، اور جو اعتقاداً و عملاً اس کا متبع نہیں وہ مسلمان بھی نہیں۔ اس کا باپ اگر اس مسلک کا پیرو تھا تو ضرور وہ مسلمان تھا لیکن اگر وہ خود اس کا پیرو نہیں ہے تو وہ مسلمان نہیں ہے، اور مسلمانوں کی جماعت میں اس کا شامل رہنا سراسر ایک جعل ہے۔ مارکس یا لینن کی اولاد اگر سوشلزم کی معتقد نہ ہو تو آپ انہیں محض اس بنا پر سوشلسٹ نہیں کہہ سکتے کہ ان کا باپ سوشلسٹ تھا۔ مسولینی کا بیٹا اگر فاشزم کا معتقد نہ ہو تو آپ اسے فاشسٹ نہیں کہہ سکتے کیونکہ مسولینی کا خون چاہے اس کو نطفہ میں ملا ہو مگر فاشزم تو نہیں ملا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اسلام بھی جب اسی طرح ایک نسلی چیز نہیں بلکہ شعوری اور مسلکی چیز ہے، تو ان لوگوں کو مسلمان کہا جائے جو مسلمان ماں باپ کی اولاد ضرور ہیں مگر نہ اپنے شعور کے اعتبار سے مسلمان ہیں اور نہ مسلک کے اعتبار سے۔ اسی بنا پر تو قرآن نے حضرت نوح کے بیٹے پر اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ کا حکم لگایا ہے۔

اگر کسی دکان پر آپ "ولایتی سودیشی بھنڈار" کا بورڈ لگا دیکھیں، یا کسی سوسائٹی کا نام "اشتراکی مہاجنوں کی جماعت" سنیں تو یقیناً آپ کو یہ چیز مضحکہ انگیز معلوم ہوگی، کیونکہ یہ صریح تناقضِ بیان (CONTRADIC-TION IN TERMS) ہے۔ لیکن آپ "اسلامی بنک" اور "اسلامی انشورنس کمپنی" جیسے نام سنتے ہیں اور آپ کو ہنسی نہیں آتی، اور نہ اس میں آپ کو کسی قسم کا تناقض محسوس ہوتا ہے۔ آخر اس بے شعوری کی وجہ کیا ہے؟ صرف یہ کہ اسلام کے متعلق آپ کا تصور بالکل غلط ہے۔ آپ مسلمان زادے کو لازماً مسلمان سمجھتے ہیں، اور پھر

یہ مسلمان جو کچھ بھی کرے وہ آپ کے نزدیک "اسلامی" ہوتا ہے، خواہ وہ اصول اسلام کی عین ضد ہی کیوں نہ ہو۔ کچھ بعید نہیں کہ اس بے شعوری کی بنا پر آپ رفتہ رفتہ اسلامی شراب خانہ، اسلامی قحبہ خانہ، اسلامی قمار خانہ، اسلامی رقص گاہ وغیرہ ناموں کو سننے اور قبول کرنے کے لیے بھی تیار ہو جائیں!

مسلمانوں کی زندگی میں ہر طرف یہی تناقض مجھے نظر آ رہا ہے۔ ایک صاحب کسی ہوٹل میں بیٹھے خدا اور رسول کا مذاق اڑا رہے ہیں اور اسلام پر پھبتیاں کس رہے ہیں، مگر پھر بھی مسلمان ہیں۔ دوسرے صاحب مارکس پر ایمان لائے ہوئے ہیں اور محمد رسول اللہ کی تعلیم کے متعلق خود کہتے ہیں کہ میرے دماغ میں نہیں سماتی۔ مگر یہ بھی مسلمان ہیں۔ تیسرے صاحب سود کھاتے ہیں اور زکوٰۃ کا نام تک نہیں جانتے مگر یہ بھی مسلمان ایک اور بزرگ بیوی اور بیٹی کو میم صاحبہ یا شریمتی بنائے ہوئے سینما لیے جا رہے ہیں یا کسی رقص و سرود کی محفل میں صاحبزادی سے وایولین بجوا رہے ہیں اور آپ کے ساتھ بھی لفظ مسلمان بدستور چپکا ہوا ہے۔ ایک دوسرے ذات شریف کے لیے نماز روزہ، حج زکوٰۃ سب حرام اور شراب زنا سود اور ایسی ہی سب چیزیں حلال، اسلام اور اس کی تعلیمات کے متعلق ایک حرف نہیں جانتے، زندگی دیکھیے تو ان میں اور ایک ہندو یا عیسائی یا پارسی کی زندگی میں رتی برابر فرق نہیں، مگر ان کو بھی مسلمان ہی کہا جاتا ہے۔ اسی طریقہ سے آپ اپنی جماعت کا جائزہ لیں گے تو اس میں بھانت بھانت کا "مسلمان" آپ کو نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ اس کا شمار نہ کر سکیں گے۔ اسلام کے گھر کو ایک چڑیا گھر سمجھ لیا گیا ہے کہ جس میں چیل، کوّے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے کیونکہ چڑیا گھر میں داخل ہے۔ خدارا کوئی بتائے کہ یہ آخر کیا مذاق ہے، اور کب تک جاری رہے گا؟ کیوں نہ ہم اس چڑیا گھر کو توڑ دیں تاکہ اس "چڑیائی" قومیت کا خاتمہ ہو جائے اور ہر چڑیا اپنی اپنی جنس سے جا ملے؟ یہ ناجنسوں کا اجتماع آخر کس معنی میں ہمارے لیے مفید ہے؟

ابھی ایک صاحب کا خط میرے پاس آیا ہے جس میں انھوں نے مسلمانوں کے ایک بڑے مشہور لیڈر کے ساتھ اپنی گفتگو کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ یہ لیڈر صاحب ہمارے قومی حقوق کے علمبردار اکبر ہیں، اور اس حیثیت سے ان کو مسلم اکبر ہونا چاہیے تھا مگر خیالات یہ ہیں کہ سیاست اور تمدن میں ہم کو لوگ مونا

چاہیے، اور دلیل میں پیش لاتے ہیں کمال اتاترک کی سنت۔

میں اس مقالہ نگار کو جواب دیتا ہوں کہ اپنے ان لیڈر صاحب سے کہہ دیجیے کہ تم جاہل ہو اور تمھارے وہ امام جن کی سنت کا تم اتباع کر رہے ہو، تم سے بڑے جاہل۔ ہو سکتا ہے کہ تم کسی دوسری چیز کے عالم بلکہ ماہر ہو، مگر اسلام میں یقیناً تمھاری حیثیت جاہلِ مطلق کی ہے۔ تم کہتے ہو کہ سیاست کا تعلق اسلام سے کاٹ دیا جائے۔ بہت اچھا مان لیا کہ کاٹ دینا چاہیے، مگر بتاؤ کہ زندگی کی کس چیز کا تعلق تم اسلام سے قائم رکھنا چاہتے ہو؟ تمدن و معاشرت کا؟ معاشی معاملات کا؟ اخلاق و آداب کا؟ تعلیم کا؟ اجتماعی قوانین کا؟ ایک ایک چیز کے حق میں تمھارا یہی فیصلہ ہے کہ اسے بھی کاٹو، اور عملاً تم کاٹ چکے ہو۔ تھوڑی دیر کے لیے ہم مانے لیتے ہیں کہ یہ سب چیزیں بھی اسلام سے الگ کر دی جائیں۔ اچھا اب ان چیزوں کے متعلق کہو جن کو تم کہتے ہو کہ یہ مذہب ہیں۔ عقائد؟ ان کے متعلق تم کہتے ہو کہ خیالاتِ جدید (MODERN THOUGHT) معیارِ حق ہیں۔ جو باتیں ان کے مطابق ہیں وہ تو اسلام میں رہیں اور جو ان کے خلاف ہیں وہ نکالی جائیں یا بدلی جائیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اگر تم سے پوچھا جائے کہ اسلام میں کیا چیزیں خیالاتِ جدید کے موافق ہیں، وہی بتا دیجیے؟ تو تم اس کا جواب بھی نہیں دے سکتے، حتیٰ کہ اسلام کے متعلق تم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے کہ اسلام وہی ہے جو کہ اسلام ہے۔ اس کے بعد احکام اور فرائض کا سوال سامنے آتا ہے۔ ان میں سے کس چیز کی پابندی کے لیے تم تیار ہو؟ نماز کی؟ روزہ کی؟ حج کی؟ زکوٰۃ کی؟ کسی چیز کی پابندی کے لیے بھی تم تیار نہیں۔ درحقیقت ان کو تم فرض ہی نہیں جانتے۔ اچھا نکاح؟ اس باب میں تمھارا فتویٰ یہ ہے کہ یہ کوئی مذہبی چیز نہیں، محض ایک تمدنی معاملہ ہے۔ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان بھی ہو تو مضائقہ نہیں۔ اور اس دائرے سے نکل کر کچھ خوش طبعی کرنی چاہے تو دقیانوسی خیالات کی پیروی نہ کرنی چاہیے کہ اس پر ناک بھوں چڑھائی جائے۔ اب ارشاد ہو کہ یہ سب چیزیں نکل جانے کے بعد اسلام ہے کیا چیز؟ اس میں رہ کیا جاتا ہے؟ فقط نام؟ یہ اسم بے مسمیٰ ہے جس کے علمبردار بن کر آپ اٹھے ہیں؟ اس نام کے لیے ہم دنیا بھر سے لڑائی مول لیں؟ اس کے لیے ہم ہر ایک قوم سے الگ اپنی جمعیت بنائیں؟ اس کے لیے تمھاری جلوس نکالیں اور تمھیں جھنڈے پر چڑھائیں؟ یہ تمھاری چیخ پکار اور یہ تمھاری بلند آہنگیاں اسی بے معنی شے کے لیے ہیں؟

یہ لوگ علم سے تو محروم ہیں ہی۔ مگر ان غریبوں کو معمولی عقلِ عام سے بھی کوئی بہرہ نہیں ملا۔ یہ سوشلسٹ سے نہیں کہہ سکتے کہ تو سوشلزم کو سیاست اور معیشت اور تمدن سے الگ کر دے۔ یہ نازی اور فاشسٹ سے نہیں کہہ سکتے کہ تو نازیت اور فاشزم

کا تعلق تمدنی نظریات اور سیاسی اور معاشی معاملات سے کاٹ دے۔ اگر ان کے سامنے ایسی کوئی تجویز پیش کی جائے تو یہ خود اس پر قہقہہ لگائیں گے اور کہیں گے کہ تمہارا دماغ خراب ہوا ہے۔ یہ غیر معقول بات تمہارے ذہن میں آئی کیسے کہ سوشلسٹ کی سیاست یا اس کی معیشت سوشلزم سے الگ ہوجائے؟ ان چیزوں کی نفی خود سوشلزم کی نفی ہے، اور سوشلسٹ ان کی نفی قبول کرکے سوشلسٹ رہ کیسے سکتا ہے؟ وہ جب دوسرے کسی نظام کے اصول و نظریات اختیار کرے گا تو غیر سوشلسٹ ہوجائے گا ۔۔۔ آپ جب چاہیں اس قسم کی کوئی تجویز ان کے سامنے پیش کرکے دیکھ لیں۔ ان کی طرف سے جو جواب میں دے رہا ہوں، لفظ بلفظ یہی جواب خود ان کے منہ سے آپ سن لیں گے ـــــ مگر یہ عقل کے دشمن جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، سوشلسٹ اور نازی اور فاشسٹ کی پوزیشن تو سمجھ لیتے ہیں، البتہ مسلمان کی پوزیشن نہیں سمجھ سکتے۔ ان کی عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ سیاست میں غیر مسلم، معیشت میں غیر مسلم، تمدن و معاشرت میں غیر مسلم، اخلاق اور قانون میں غیر مسلم، افکار اور نظریات میں غیر مسلم، عقائد اور اعمال میں غیر مسلم ہونے کے بعد آدمی مسلم کیسے ہوسکتا ہے؟ اسلام جن عناصر سے مرکب ہے وہ سب نکل جائیں اور پھر اسلام بدستور قائم کا قائم رہے۔ مسلم جن خیالات کے معتقد اور جن اصولوں کے پیرو کا نام ہے وہ سب اس سے سلب کرلیے جائیں اور پھر وہ مسلم بھی کہلائے۔ کیسی متناقض بات ہے؟ ان لوگوں کا دماغ خراب نہیں ہوا تو اور کیا ہوا ہے کہ مسلمان سے کہتے ہیں کہ تو غیر مسلم ہوجا اور پھر مسلمان بھی رہ؟

یہ ان لوگوں کا حال ہے جو مسلمانوں کی کشتی کے کھویا بنے ہوئے ہیں۔ سبحان اللہ! ایسا وقت آنا بھی ہماری قسمت میں لکھا تھا کہ گندے پانی کے نہنگ کشتی اسلام کے ملاح بنیں۔

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

عجیب فتنہ کا دور ہے، جو زبانیں اس لائق بھی نہ تھیں کہ اسلام کا پاک نام لے سکیں وہ اس کی وکیل، اس کی نقیب اور اس کی حمایت کی ذمہ دار بنی ہیں۔ منافق افراد سے قوم بھری ہوئی ہے۔ رؤسائے منافقین رہنمایان قوم بنے ہوئے ہیں۔ اسلام کا علم رکھنے والے اور ادعا پوشوں پر "قومیت متحدہ" کا بھوت سوار ہے۔ ان کی غیرت ایمانی اتنی سرد ہوچکی ہے کہ کفار کو اپنا امام ماننے میں بھی تأمل نہیں کرتی۔ اب خدا کے سوا کون ہے جس سے فریاد کی جائے۔ یا تو وہ ہمیں ہی پاک دنیا سے اٹھالے، یا پھر اتنی طاقت بخشے کہ ان سارے فتنوں کا سر کچل دینا ممکن ہو۔

مقالات

جواہر حکمت

از افادات علامہ حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ

{علامہ حافظ ابن عبدالبر کا نام کسی صاحب علم کے لئے تعارف کا محتاج نہیں، اور نہ آپ کا مقام علم و اجتہاد کسی پر مخفی ہے۔ آپ کا شمار ائمہ سلف کی صفِ اول میں ہے۔ فقیہ اور مجتہد بھی ہیں اور حافظِ حدیث بھی۔ علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم جیسے اربابِ نظر ان کے خوشہ چینوں میں ہیں۔ وسعتِ نظر، عالمانہ تبحر اور تفقہ فی الدین کے مسلم امام ہیں۔ اندلس کی خاک سے ایسا خادم شریعت شاید ہی کوئی اور اٹھا ہو۔ قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ ۲۵ ربیع الآخر ۳۶۸ھ یوم پیدائش ہے۔ اپنے وطن ہی کے مشہور اہل علم سے استفادہ کیا۔ عمر کے لئے اندلس سے باہر کبھی نہیں گئے لیکن احفظ اہل المغرب تسلیم کئے گئے ہیں۔ بعض وجوہ کی بنا پر جلا وطن بھی کئے گئے۔ کچھ دنوں مغربی حصوں میں رہے، پھر شرقی اندلس میں چلے آئے۔ خلیفہ مظفر کے زمانہ میں اشبونہ کے قاضی رہے۔ ربیع الآخر ۴۶۳ھ میں وفات پائی۔ متعدد تصنیفیں چھوڑی ہیں جن میں سے ایک مشہور تالیف "جامع بیان العلم" ہے۔ اسی سے ہم بعض مفید حصوں کا انتخاب درج کرتے ہیں۔}

تقلید اور اتباع کا فرق ابو عبداللہ بن خویز منداد البصری المالکی فرماتے ہیں:-

"شرع میں تقلید کا مفہوم یہ ہے کہ کسی ایسے قول کی پیروی کی جائے جس کی دلیل صحت پر مقلد کو اطلاع نہ ہو۔ یہ تقلید شریعت کی نگاہ میں ناجائز ہے۔ اور اتباع ایسے قول کی پیروی کو کہتے ہیں جو

دلیل و حجت سے ثابت ہو۔"

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں :۔

"اگر تم کسی شخص کے قول کی اقتدار دلائل کی قوت کے بجائے محض حسنِ ظن کی بنا پر کرتے ہو تو تم اس کے مقلد کہے جاؤ گے اور اللہ کے دین میں تقلید ممنوع ہے۔ اور اگر تم کو حجت و برہان کی طاقت نے کسی قول کی پیروی پر مجبور کر دیا ہے تو تم اس کے متبع کہلاؤ گے۔ اتباع، شریعتِ الٰہی میں جائز ہے بخلاف تقلید کے۔"

مقاصدِ تقلید نقلی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے اپنی اتاری ہوئی کتاب میں جگہ جگہ تقلید کی مذمت کی ہے۔ عدی ابن حاتم رضی دربارِ رسالت میں ایک بار حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلعم سورہ برارت کی تلاوت فرما رہے تھے۔ جب آپ آیت "اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" پر پہنچے تو عدی ابن حاتم نے کہا کہ یا رسول اللہ ہم نے تو اپنے علماء و مشائخ کو کبھی نہیں پوجا۔ آپ نے فرمایا "کیوں نہیں۔ کیا وہ لوگ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو تمھارے لئے حلال نہیں کر دیا کرتے تھے اور تم بلا حیل و حجت انہیں حلال سمجھ لیتے تھے؟ اسی طرح کیا وہ خدا کی حلال ٹھیرائی ہوئی چیزوں کو حرام نہیں کر دیتے تھے اور تم بے چون و چرا انہیں حرام مان لیتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا "ہاں یہ تو صحیح ہے" حضور نے فرمایا تلك عبادتھم "یہی ان کی عبادت ہے"۔

اسی اندھی تقلید کی داستان ایک مقام پر قرآن یوں بیان کرتا ہے :۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝ الخ	اور اسی طرح تم سے پہلے جس ڈرانے والے (نبی) کو بھی ہم نے کسی قریہ میں بھیجا اس قریہ کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے تو اپنے بڑوں کو ایک رستے پر پایا ہے اور ہم تو انھیں کے نقش قدم کی پیروی کریں گے۔

گویا محض تقلیدِ آباء نے انھیں ہدایت قبول کرنے سے روکا۔ اور آخر کار انھوں نے صاف صاف کہہ دیا

کہ ہم تمھاری تعلیم کو کبھی نہیں مان سکتے اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب بت پرستوں سے مذمت، اور تحقیر کے انداز میں فرماتے ہیں کہ:۔

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ۔ یہ مورتیاں کیسی ہیں جن کے تم گرویدہ ہو رہے ہو؟

تو جواب میں وہ بس یہی دلیل دیتے ہیں کہ:۔

وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔

اسی طرح بیشمار آیتوں میں اس آبا پرستی اور اکابر قوم کی کورانہ تقلید کی مذمت کی گئی ہے۔ اگرچہ ان آیتوں میں جن مقلدوں کی مذمت بیان کی گئی ہے وہ کفار میں سے ہیں اور امت اسلامیہ کے مقلدین اہل ایمان میں سے ہیں۔ یہ فرق ضرور ہے لیکن اس کے باوجود علماء نے انہی آیتوں سے ابطالِ تقلید پر استدلال کیا ہے، ان کے نزدیک دونوں گروہوں میں وجہ مشابہت کفر و ایمان نہیں ہے، بلکہ یہ مشابہت دونوں تقلیدوں کی نوعیت کے لحاظ سے ہے یعنی جس طرح پہلی قسم کے مقلدین کا گناہ یہ تھا کہ وہ دلیل و حجت کے بغیر اپنے پیشواؤں اور اپنے اسلاف کی تقلید کرتے تھے اسی طرح یہ دوسری قسم کے مقلدین بھی کسی طریقہ کی پیروی کے لئے خدا کی کتاب اور رسول کی ہدایت سے دلیل ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں سمجھتے بلکہ مجرد ایسے لوگوں کے قول کو سند اور حجت سمجھتے ہیں جن کے ساتھ انہیں حسنِ ظن ہے۔ یہ فرق ضرور ہے کہ ایک شخص تقلید کرتا ہے اور انجام کار کفر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ دوسرا تقلید کرتا ہے اور گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور تیسرا کسی معمولی دنیوی مسئلہ میں تقلید کر کے خطا میں پڑ جاتا ہے۔ اگرچہ ان کا انجام جدا جدا ہوا مگر اس لحاظ سے تو مساوی ہیں کہ ان کے مبتلائے غلط ہونے کی علت ایک ہے یعنی غیر نبی پر اعتمادِ تام، اور کسی ایسے شخص کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چلنا جس کے پاس خدا کی طرف سے براہ راست علم نہیں آتا۔

رسول اللہ صلعم نے ایک بار فرمایا کہ میں اپنے بعد اپنی امت کے لئے اس کے تین اعمال سے اندیشناک

ہوں"۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ وہ اعمال کون سے ہیں؟ آپ نے فرمایا "عالم دین کی لغزش، ظالم بادشاہ کی حکمرانی، اور خواہش نفس کی پیروی"۔

ابوالعالیۃ الریاحی سے مروی ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا "عالم کی لغزشوں سے متبعین کے لئے بڑی خرابی ہے"۔ لوگوں نے کہا اس کی توضیح فرمائیے۔ جواب دیا:۔

"ایک عالم اپنی رائے سے ایک بات کہتا ہے، پھر کسی بڑے عالم بالسنۃ کو پاتا ہے اور اس سے شریعت کا صحیح حکم سُن کر اپنے قول سے رجوع کر لیتا ہے۔ مگر جو لوگ اس کی پیروی کرتے ہیں انہیں اس کے رجوع کی کیا خبر؟ وہ تو اسی پہلے قول کی پیروی کئے چلے جائیں گے جس سے وہ رجوع کر چکا ہے"۔

حکما نے عالم کی ہر غلطی کو کشتی کے ٹوٹنے سے تشبیہ دی ہے، کیونکہ جب وہ ڈوبتی ہے تو اپنے ساتھ ایک کثیر جماعت کو بھی غرق کر دیتی ہے۔ یہی حال عالم کا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت معاذؓ بن جبل نے فرمایا کہ لوگو! تم تین چیزوں کے ساتھ کیا کرو گے؟ دنیا[۱] جو تمہارے لئے سراپا ہلاکت ہے۔ عالم کی لغزش[۲]۔ اور منافق کا قرآن سے استدلال[۳]۔ یہ سوال سُن کر سب لوگ خاموش رہے۔ پھر حضرت معاذ نے خود ہی جواب دیا:۔

"پہلے عالم کو لو۔ عالم اگر ہدایت کی سیدھی شاہراہ پر ہے تو جوشِ عقیدت میں تمہیں نہ چاہئے کہ اپنا دین اس کے سپرد کر دو (یعنی اس کی اندھی تقلید کرنے لگو)۔ اور اگر وہ شاہراہِ ہدایت سے ہٹا ہوا ہے اور فتنوں کا شکار ہو گیا ہے تو اشتعال میں آکر اس سے اپنے تعلقات بالکل منقطع نہ کر لو۔ کیونکہ مومن بھٹک کر تائب ہو جایا کرتا ہے۔۔۔۔ الخ"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ:۔

"دیکھو تم میں سے کوئی اپنے دین کی باگ کسی دوسرے انسان کے ہاتھ میں نہ دے کہ اگر وہ ایمان پر رہے تو تم بھی صاحبِ ایمان رہو اور اگر وہ گمراہ ہو گیا تو تم بھی اسی کے ساتھ گمراہ ہو جاؤ۔

شرع میں آنکھیں بند کر کے چلنے کا کام نہیں ہے۔"

محمد بن حارث سے روایت ہے کہ مالک بن انس اور عبدالعزیز ابن ابی سلمہ اور محمد بن ابراہیم بن دینار وغیرہ ابن ہرمز کے پاس جایا کرتے تھے۔ جب مالک بن انس اور عبدالعزیز ان سے کسی مسئلہ کے متعلق استفسار کرتے تو وہ جواب دے دیتے لیکن جب کبھی ابن دینار وغیرہ کوئی سوال کرتے تو وہ خاموش رہتے۔ ایک دن ابن دینار نے ان سے کسی قدر رسول او کبیدہ خاطر ہو کر پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ ابن ہرمز نے جواب دیا کہ تمھیں میری اس روش سے برا نہ ماننا چاہئے۔ بات یہ ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میری ہڈیاں کمزور اور اعضا مضمحل ہو گئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرے بدن کی طرح میری عقل و فہم بھی ضعیف اور مضمحل نہ ہو گئی ہو اور میں صحیح و حق جواب نہ دے سکوں۔ مالک اور عبدالعزیز عالمانہ نگاہ اور فقیہانہ بصیرت رکھتے ہیں۔ جب مجھ سے کوئی خلافِ حق بات سنیں گے تو اپنے علم و فہم کی کسوٹی پر پرکھ کر رد کر دیں گے۔ لیکن تم لوگوں کا حال بالکل دوسرا ہے۔ میں جو کچھ بھی کہوں گا، خواہ غلط ہو یا صحیح، سب قبول کر لو گے۔" محمد بن حارث یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم یہی دین کامل اور عقل راجح کی شان ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے:-

"ایک وقت آئے گا جب علما ختم ہو جائیں گے اور لوگ کم سواد جاہلوں سے مسائل شرعیہ میں رجوع کریں گے۔ وہ بغیر کسی علم و آگہی کے فتوے دیں گے، خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔"

سفیان ابن عیینہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ربیعہ لیٹے ہوئے منہ ڈھانک کر رو رہے تھے۔ لوگوں نے پوچھا کیا بات ہے؟ فرمایا کھلی ہوئی ریاکاری اور خفیہ نفس پرستی کا عام طوفان آیا ہوا ہے اور لوگ علما کے ہاتھوں میں اس طرح پڑے ہیں جیسے شیر خوار بچے اپنی ماؤں کی آغوش میں کہ جس چیز سے علما روکتے ہیں یہ اس سے رک جاتے ہیں اور جس چیز کا وہ حکم دیتے ہیں یہ بلا چون و چرا اسی کو کرنے لگتے ہیں۔

ایوب رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ:-

"تم اپنے شیخ کی غلطی پر اس وقت تک مطلع نہیں ہو سکتے جب تک دوسرے علماء کی صحبت نہ اختیار کرو۔"

عبید اللہ ابن معتمر فرماتے ہیں کہ :-

"مقلد انسان اور اس جانور میں کوئی فرق نہیں جس کی گردن کی رسی کسی اور کے ہاتھ میں ہو۔"

یہ تمام نصوص اور اقوال تقلید محض کے بطلان پر شاہد ہیں، لیکن اس شہادت کے سننے اور سمجھنے کے لئے عقل و فہم کی ربانی توفیق درکار ہے۔

ابطالِ تقلید نظری حیثیت سے وجوب یا جواز تقلید کے قائل سے سوال یہ ہے کہ اس نے کس دلیل کی بنا پر اسے جائز یا واجب قرار دیا، اور کیونکر تمام سلف کے خلاف راہ اختیار کی ؟ اس لئے کہ سلف صالح میں تو کسی سے بھی تقلید ثابت نہیں۔ اس سوال کے جواب میں اگر وہ یہ کہے کہ میں کتاب وسنت سے واقف نہیں ہوں اور میرا امام ان سے واقف ہے لہٰذا میں اس کی تقلید کر رہا ہوں تو اس سے کہا جائے گا کہ جو مسائل شرعیہ تمام ائمہ مجتہدین کے درمیان متفق علیہ ہیں، وہ یقیناً حق ہیں اور ان کے بارے میں تم تقلید کر سکتے ہو لیکن جن مسائل میں اختلاف ہے، جن میں ایک امام کی رائے کچھ ہے اور دوسرے کی کچھ، ان میں تم کس دلیل کی بنا پر ایک شخص معین کی تقلید کرو گے اور دوسرے کو چھوڑ دو گے درانحالیکہ یہ سب کے سب امام، عالم اور مجتہد ہیں ؟ بہت ممکن ہے کہ وہ مجتہد جس کی رائے کو تم ناقابلِ التفات سمجھ رہے ہو تمھارے امام سے زیادہ صحیح مسلک رکھتا ہو۔ اگر وہ یہ جواب دیتا ہے کہ میں اسے حق وصواب پر سمجھ کر تقلید کر رہا ہوں، تو اس سے پوچھا جائے گا کہ کیا اس کے قول کی صحت کا علم تمھیں کتاب وسنت یا اجماع سے ہوا ہے ؟ اگر اس نے اثبات میں جواب دیا تو خود اس نے تقلید کا ابطال کر دیا۔ پھر اس صورت میں اس سے ان دلائل کا مطالبہ کیا جائے گا جن کا اس نے ابھی ادعا کیا ہے۔ اور اگر وہ پھر وہی جواب دے کہ چونکہ وہ مجھ سے بڑا عالم ہے اس لئے میں نے اس کی پیروی کی، تو اس سے

کہا جائے گا کہ اگر یہی تقلید کا سبب ہے تو ہر اس شخص کی تقلید کرو جو تم سے بڑا عالم ہو۔ اس وقت تمھارے بے شمار امام ہو جائیں گے جن کی پیروی مذکورہ بالا اصول یا علت کی بنا پر تمھارے لئے ضروری ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ تمام علماء بھی ہمیشہ متفق الرائے نہیں رہ سکتے۔ ان میں اکثر اختلاف رائے ہوتا رہے گا۔ پھر تم ان میں سے کس کے قول کی تقلید کروگے اور کیوں؟ اب اگر وہ کہے کہ میں ان میں سے ایک کا اتباع اس وجہ سے کروں گا کہ وہ تمام میں سر برآوردہ اور اعلم الناس ہوگا، تو اس سے کہا جائے گا کہ گویا وہ صحابہؓ سے بھی بڑھ کر صاحبِ علم ہے! اور یہ کس قدر مذموم خیال ہے۔ ہاں اگر وہ یہ کہکر دامن چھڑانا چاہے کہ میں تو صحابہؓ کرام میں سے ایک کی تقلید کرتا ہوں تو پھر سوال ہوگا کہ دیگر صحابہؓ کے اقوال کو ترک کرنے کی وجہ اور دلیل تمھارے پاس کیا ہے؟ ممکن ہے دوسرے صحابہؓ زیادہ علم و معرفت اور عظمت و فضیلت کے مالک ہوں۔ علاوہ ازیں کسی قول کی صحت و سقم کا دارومدار تو تمام تر دلائل پر ہے۔ قائل کی شخصیت اور شانِ فضیلت پر نہیں ہے۔ چنانچہ امام مالک فرماتے ہیں کہ آدمی کا ہر قول خواہ وہ کیسا ہی صاحب علم و فضل ہو، اتباع کے لئے نہیں ہے۔ قرآنِ حکیم مومن کی تعریف یہ کرتا ہے کہ وہ اقوال سُن کر ان میں سے محض حسن قول کی پیروی کرتے ہیں اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ۔

اب اگر وہ اپنے قصور علم اور عدم بصیرت کا عذر کرے تو اس سے کہا جائے گا کہ ہاں ایسی صورت میں تم بلاشبہ کسی عالم کی تقلید کرنے میں نہ صرف معذور ہو بلکہ تم پر اس وقت تقلید کا التزام ضروری ہے، کیونکہ تمھاری مثال بالکل اندھے کی سی ہے جو خود قبلہ کی سمت نہیں معلوم کر سکتا اور اس کے لئے ضروری ہے کہ کسی قابل اعتماد آدمی کی رہنمائی قبول کرے اور جس طرف وہ کہے اسی سمت منہ کرکے نماز پڑھے لیکن ایسے مقلد کے لئے یہ کیسے جائز ہوگیا کہ وہ عالم دین ہونے کا دعویٰ کرے اور دوسروں کو بھی انھیں اقوال کے مطابق فتویٰ دیتا پھرے؟ درانحالیکہ ان کی صحت و سقم کے متعلق خود اُسے کوئی علم نہیں ہے اور وہ اپنی جہالت کا خود معترف ہے اور کم از کم نظریہ کی حد تک تو یہ بھی مانتا ہے کہ نبی کے سوا ہر شخص خواہ وہ کیسا ہی فاضل اجل سہی کبھی غلطیاں بھی کرتا ہے۔

دلیل معلوم کئے بغیر فتویٰ دینا جائز نہیں جب یہ بات طے شدہ ہے کہ عالم غلطی بھی کرتا ہے تو کسی کے لئے جائز نہیں

کہ کسی شخص کے قول کی دلیل کتاب و سنت سے معلوم کئے بغیر اس کے مطابق فتویٰ دے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک خطبے کے دوران میں فرماتے ہیں کہ "افسوس ہے ان حاملینِ علم پر جن کا علم کسی بصیرت پر مبنی نہیں، جن کے قلوب کو شکوک کا ہلکا سا جھونکا مضطرب کر دیتا ہے، جو نہیں جانتے کہ حق کہاں ہے؟ اگر غلطی کرتے ہیں تو نہیں جانتے کہ غلط کہہ رہے ہیں۔ ایسی چیز تو اپنے سینے سے چمٹائے ہوئے ہیں جس کی حقیقت سے بالکل واقف نہیں۔ یہ ایک فتنہ کی کیفیت ہے۔ سب سے بڑا خیر یہ ہے کہ خدا دین کی معرفت و بصیرت عطا کرے۔ کسی شخص کے جہل کے ثبوت کے لئے یہ کافی ہے کہ اسے اپنے دین کا علم نہ ہو۔"

حضرت سعید ابن جبیرؓ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ:-

"اگر کوئی شخص اندھا بن کر بغیر کسی حجت اور بصیرت کے فتویٰ دیتا ہے تو اس فتویٰ پر عمل کرنیوالے کا گناہ مفتی کی گردن پر ہوگا۔"

حضرت ابوہریرہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ:-

"جس شخص نے میرے متعلق ایسی بات کہی جو میں نے نہیں کہی تھی، اسے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنانا چاہئے اور اگر کسی نے اپنے ساتھی سے مشورہ طلب کیا اور اس نے بغیر سوچے سمجھے مشورہ دے دیا تو اس نے اس کے ساتھ خیانت کی۔ اور اگر کسی مفتی نے اطمینان بخش ثبوت حاصل کئے بغیر فتویٰ دیا تو اس کا گناہ عامل کے بجائے مفتی کے سر پر ہوگا۔"

تقلید صرف عوام کے لئے ہے لیکن ان تمام تصریحات سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ حکم عام ہے، اور ہر عالم وجاہل اسی کے ذیل میں آتا ہے۔ یہ حکم محض علماء اور خواص کے لئے ہے۔ عوام کے لئے نہیں، کیونکہ عوام کے لئے واقعات اور معاملات پیش آنے پر علماء کی تقلید کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ ان کے لئے تقلید ضروری ہے اس لئے کہ وہ اپنے قصورِ فہم کی وجہ سے دلائل کی معرفت حاصل ہی نہیں کر سکتے۔ بایں سبب اس امر میں تمام علماء کا اجماع ہے کہ عوام پر تقلید فرض ہے۔ اور ارشاد خداوندی فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

کا روئے سخن نہیں عوام کی طرف ہے۔ جس طرح اس بات میں کسی صاحب علم کو اختلاف نہیں ہے کہ اندھے کو قبلہ معلوم کرنے میں کسی غیر آدمی کی جس کی آگاہی اور قوت تمیز پر اسے اعتبار ہو، تقلید ضروری ہے، اسی طرح اس امر میں بھی دو رائیں نہیں ہیں کہ ایسے شخص کے لئے جو شریعت کے احکام و اسرار سے قطعاً نابلد ہے ضروری ہے کہ کسی امام کی تقلید کرے اور یہی وجہ ہے کہ عوام کو فتوی دینے کا حق کسی نے نہیں دیا ہے کیونکہ وہ اسرار دین اور مصالح شرعیہ سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں۔ البتہ غلطی پر وہ لوگ ہیں جو علم دین حاصل کرنے کے بعد بھی تقلید کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں۔ علم دین حاصل کرنے کی غرض تحقیق حق ہے نہ کہ محض اگلوں کے اقوال سے واقف ہو جانا۔ جب ایک شخص اس ذریعہ کو حاصل کر لیتا ہے جس سے حق معلوم کیا جا سکتا ہے، اور پھر بھی وہ اس سے کام لے کر حق کی جستجو نہیں کرتا، اور یہ سمجھتا ہے کہ جستجوئے حق اس کا کام ہی نہیں ہے، تو اس کی غلط کاری و غلط فہمی ظاہر و باہر ہے۔

ترجمان القرآن — جیسا کہ علامہ ممدوح نے مضمون کے آخر میں بصراحت فرما دیا ہے، تقلید کی مخالفت سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ لوگ علم کے بغیر اجتہاد کرنے لگیں۔ بلکہ مقصد دراصل یہ ہے کہ اول تو ہر مسلمان کو کم از کم اپنے دین سے اس حد تک ضرور واقف ہونا چاہیے کہ وہ ہدایت اور گمراہی میں تمیز کر سکے اور بالکل آنکھیں بند کر کے اپنا دین دوسروں کے ہاتھ میں نہ دے دے۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ دینی علوم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان کے لیے عقلاً و نقلاً کسی طرح بھی یہ درست نہیں ہے کہ اپنے اوپر تقلید کو لازم کریں۔ یہ دراصل ہمارے نظام تعلیمی کا بنیادی نقص ہے کہ اس میں طالب علم کو تحقیق کے بجائے تقلید کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ وہ اس نظام میں داخل ہی اس مفروضہ کے ساتھ ہوتا ہے کہ تمام مسائل کا قطعی تصفیہ پہلے ہو چکا ہے، اب تحقیق کے لیے کوئی چیز باقی نہیں رہی اور اس کا کام فقط یہ ہے کہ اپنے ائمہ کے اقوال سے واقف ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تحقیق کے ذرائع فراہم ہو جانے پر بھی وہ مقلد ہی رہتا ہے۔ تحقیق و اجتہاد کا رجحان ابتدا ہی میں فنا کر دیا جاتا ہے اور اس میں آخر وقت تک یہ صلاحیت پیدا نہیں ہوتی کہ خود کسی مسئلے میں رائے قائم کر سکے۔ ایسے نظام تعلیم سے کس خیر کی توقع کی جا سکتی ہے؟ قرآن و حدیث کو سمجھنے کے وسائل تو فراہم کر دیے جاتے ہیں مگر دل میں یہ بات بٹھا دی جاتی ہے کہ ان سے تمہیں کام کچھ نہیں لینا ہے۔ اس سے بڑھ کر نقص تعلیم اور کیا ہو سکتا ہے۔

دلائل السنن والآثار

۳

از جناب مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی

ضرورت سلسلۂ اسناد یہ ایک واضح ثبوت ہے اس امر کا کہ احادیث نبوی کے ساتھ اصولی احتیاط خلفائے راشدین کے وقت سے شروع ہوتی ہے تابعین کے دور میں جب رفض، خروج، ارجاء، قدر، اعتزال کے قصے پیدا ہو جاتے ہیں تو بنا بر آیت اِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ الخ اور زیادہ تشدد برتا جاتا ہے اور اسناد ایک مستقل فن قرار پاجاتا ہے جس کی بیسیوں شاخیں ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ ایک لطیف اشارہ اہمیت اسناد پر قرآن حکیم میں ہے اِیْتُوْنِیْ بِکِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَا اَوْ اَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ منکرین معاد و قرآن کے رد میں اوپر سے یہ سلسلہ چلا آتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے آسمان و زمین اور کل مخلوقات بنائی، کیا تم دل سے کہہ سکتے ہو کہ زمین کا کوئی ٹکڑا یا آسمان کا کوئی حصہ کسی اور نے بھی بنایا ہے یا بنا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں پھر خدا کے ساتھ معبودان باطل کو کیوں پکارا جاتا ہے؟ لہٰذا اگر تم اپنے دعوائے شرک میں سچے ہو تو کسی آسمانی کتاب کی سند لاؤ یا کسی ایسے علمی اصول سے ثابت کرو جو عقلا کے نزدیک مسلم چلا آتا ہو جس چیز پر کوئی نقلی یا عقلی دلیل نہ ہو آخر اسے کیوں تسلیم کیا جائے؟ ظاہر ہے کہ کسی علمی دعویٰ کے لئے دلیل و سند ہی اصل شے ہے۔ دیکھو قرآن کی صداقت پر جہاں اور بہت سی دلیلیں موجود ہیں ان میں سب سے زبردست سند اس کا تاریخی ثبوت ہے "جتنی مذہبی کتابیں دنیا کی مختلف قوموں کے پاس ہیں ان میں سے ایک کے متعلق بھی تاریخی سند سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ وہ جس نبی کی طرف منسوب ہے واقعی اسی نبی کی ہے۔ بلکہ بعض مذہبی

کتابیں ایسی ہیں جن کے متعلق سرے سے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کس زمانے میں کس نبی پر اتری تھیں۔ مگر قرآن کے متعلق اتنی زبردست تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ کوئی شخص حضرت محمد صلعم کی طرف اس کی نسبت میں شک کر ہی نہیں سکتا۔ اس کی آیتوں تک کے متعلق یہ معلوم ہے کہ کونسی آیت کب اور کہاں نازل ہوئی؟ جس کے روایت کرنے والوں کی اتنی زیادہ تعداد ہر زمانہ میں رہی ہے کہ جن کی صداقت و قطعیت پر ذرہ برابر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ایک آیت اور اس کے تلفظ کی کیفیت، کو ابتدائے نزول سے آج تک اتنے بیان کرنے والے ہیں کہ جن کی تاریخی حیثیت آفتاب سے زیادہ روشن ہے۔ چنانچہ یہی تواتر عملی و قولی ایسا تاریخی ثبوت اور کھلی ہوئی سند ہے کہ جس سے بڑھ کر کسی علمی شے کی ثبوت اور قطعیت کی کوئی دلیل و سند نہیں ہو سکتی۔ پس آیتِ بالا پر غور کرنے سے صاف طور پر یہ اصول ہاتھ آتا ہے کہ جس کسی مذہبی دعویٰ کے لئے یا تو آسمانی کتاب کی سند ہو یا کسی علمی اصول سے ثابت ہو وہ قرآن کے نزدیک حجت و سند دینی ہے۔

یہ تو ہوئی نقلی دلیل۔ اور عقلی دلیل یہ ہے کہ جب کسی بات کی نسبت کسی کی طرف کی جاتی ہے تو سب سے پہلے یہ سوال عقلی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ اس پر کیا ثبوت ہے کہ یہ فلاں کا کلام ہے؟ آدمی کہتا ہے کہ میں نے خود سنا ہے یا دیکھا ہے یا فلاں نے مجھ سے بیان کیا ہے یا دیکھا ہے۔ اگر یہ سلسلہ اس آدمی تک متصل ہے تو بات صاف ہے۔ اب صرف بات کی معقولیت اور ناقل کی صداقت کی بحث باقی رہ جاتی ہے۔ جس پر مفصل بحث آگے آئے گی۔ بہرحال اسی اصول کے ماتحت آسمانی کتابیں، سنن و آثار نبوی، لغت و اشعار، فقہ و اصول حتیٰ کہ ائمہ کے مذاہب اور تصوف کے سلاسل سنداً روایت ہونا شروع ہوئے اور یہ سلسلہ اتنا زبردست اور محکم ثابت ہوا کہ جس کی معقولیت اور ناقابلِ انکار مقبولیت نے مخالفین کی زبانوں پر مہر سکوت لگا دی۔ غور کرو کہ پیغمبر نے ایک بات کہی یا کوئی کام کیا۔ اگر وہ بات اور فعل اس طریقہ پر روایت ہوا اور ذرہ برابر اس کے اندر تغیر و تبدل نہیں ہوا تو ظاہر ہے کہ حق و صداقت اور روحانیت کے اثر اور اس کے برکات ہیں۔ پھر کیا کسی کو کوئی شبہ ہو سکتا ہے؟ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہر علم اپنے اندر ایک خاص کیفیت و اثر رکھتا ہے، جس کی مزاولت و ممارست سے آدمی نیک و بد اور بات کے صحیح و غلط کا فیصلہ کرتا ہے۔

فن حدیث میں سند ایسا علم ہے کہ صرف اسی کے ذریعہ ہر دینی کام کی نسبت پیغمبر صلعم تک صحیح طور پر معلوم کی جاسکتی ہے اور اس وجہ سے گویا آدمی کے اندر معنیٔ صحابیت کا شرف پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ معنیٔ صحابیت نام ہے اطلاع برجزئیاتِ احوال رسول و مشاہدۂ اوضاع وکیفیات کا، خواہ وہ عبادات سے متعلق ہوں یا عادات سے، جو بغیر سند قابل اعتبار نہیں۔ سند کے عالی اور نازل ہونے کے صدہا واقعات کتب رجال وطبقات میں موجود ہیں جو غیر معمولی احتیاط پر دلالت کرتے ہیں۔ صرف ایک واقعہ یہاں پر درج کر دیا جاتا ہے جس سے سند کے عالی وغیر عالی ہونے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

جب حضرت امام علی رضا رضی اللہ عنہ نیشاپور تشریف لے گئے تو حافظ حدیث امام ابوزرعہؒ وامام اسلم طوسیؒ نے خدمت میں حاضر ہو کر امام ممدوح کے آباؤ اجداد کرام کے سلسلے سے روایت حدیث کی درخواست کی۔ حضرت ممدوح نے اپنے والد ماجد سے لے کر جناب رسول خدا صلعم تک مرفوعاً روایت کی "قال حدثنی ابی موسیٰ الکاظم عن ابیہ جعفر الصادق عن ابیہ محمد الباقر عن ابیہ علی زین العابدین عن ابیہ شہید کربلا عن ابیہ علی المرتضیٰ قال حدثنی حبیبی وقرۃ عینی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال حدثنی جبرئیل علیہ السلام قال حدثنی رب العزۃ سبحانہ وتعالیٰ کلمۃ لا الہ الا اللہ حصنی فمن قالہا دخل حصنی ومن دخل حصنی امن من عذابی"۔ جب شمار اہل محابر ودوادین کا کیا گیا تو ۲۰ ہزار اشخاص وہاں حاضر پائے گئے۔ چنانچہ اسی سند کے متعلق امام الجرح والتعدیل حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں "لو قری ھذا الاسناد علی مجنون لافاق من جنونہ" حتی کہ امام ابوالقاسم قشیریؒ نے لکھا ہے "اتصل ھذا الحدیث بھذا السند ببعض امراء السامانیۃ فکتبہ بالذھب واوصی ان یدفن معہ فی قبرہ فرأی فی المنام بعد موتہ فقیل لہ ما فعل اللہ بک فقال غفرلی بتلفظی لا الہ الا اللہ وتصدیقی ان محمد الرسول اللہ، اوردہ المنادی فی شرحہ الکبیر علی الجامع الصغیر (تقصار جیود الاحرار)

چنانچہ اسی بنا پر امام ابن سیرینؒ جو فن حدیث کے رکن اعظم ہیں ان کو کہنا پڑا، ان ھذا العلم دین فانظروا عمن تاخذون دینکم۔ قال لم یکونوا یسألون عن الاسناد فلما وقعت الفتنۃ قالوا سموا لنا رجالکم۔ الاسناد من الدین۔ ولولا الاسناد لقال من شاء ما شاء۔ الاسناد سلاح المومن۔ امام زہری بڑے رتبہ کے آدمی ہیں ایک روز سفیان بن عیینہ سے ایک حدیث بیان کرنی چاہی۔ سفیان نے فرمایا کہ آپ مجھ سے بلاسند بیان کیجئے کیونکہ ان کو امام زہری پر کامل اعتماد تھا۔ امام زہری نے فرمایا کیا تو بلا زینہ چھت پر چڑھ سکتا ہے؟[1]۔

اور یہ واقعہ تو موطا امام مالکؒ کے پڑھنے والے تک کو یاد ہوگا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے جو تبع تابعی اور خلفاء بنی امیہ میں بڑے رتبہ کے بزرگ ہیں جن کا شمار خلفاء راشدین کے ساتھ ہوتا ہے، ایک روز نماز عصر میں دیر کردی۔ عروہ بن مسعود تابعی نے ٹوکا اور رسول اللہ صلعم کا جبریل کے ساتھ نماز پڑھنا اور جبریل کا ابتدائی و انتہائی اوقات نماز بتانا بیان کیا۔ خلیفہ وقت کو سخت تعجب ہوا۔ استعجاباً پوچھا، اعلم ما تقول یا عروہ۔ دیکھو کیا کہہ رہے ہو۔ عروہ نے فوراً اس طرح سند پڑھ کر خلیفہ کو ساکت کر دیا کہ مغیرہ بن شعبہؓ نے کوفہ میں ایک روز نماز میں دیر کردی تو ابو مسعود انصاریؓ نے ٹوک دیا اور کہا کہ مغیرہ یہ کیا ہے؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ جبریل نے دو روز آکر آنحضرت صلعم کو نماز پڑھ کر نماز کی ابتدا و انتہا کو بیان کر دیا۔ بہرکیف یہ شہادتیں اس امر کی دلیل ہیں کہ اسناد ہی ایک ایسی کسوٹی ہے کہ جس کے ذریعہ صحیح و غلط اور روایت و خبر کے پرکھنے اور جانچنے کا اصول ہاتھ آتا ہے، انھیں اسناد میں سے بعض کو محدثین و فقہاء نے سلسلۃ الذہب سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً حضرت امام اعظمؒ کا جو سلسلۃ الذہب بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے، ابوحنیفہ عن حماد بن ابی سلیمان عن ابراہیم عن علقمہ عن عبداللہ بن مسعودؓ۔ اسی طرح حضرت امام بخاری کے کئی سلسلے ہیں مثلاً محمد بن اسمٰعیل عن محمد بن عبداللہ الانصاری عن حمید عن انس بن مالکؓ۔ یہی امام بخاری کے بعض شیوخ حضرت امام ابوحنیفہؒ و امام مالکؒ کے ہم طبقہ ہیں۔ اور ثلاثیات بخاری، بخاری شریف کی ایک اہم اور محیر العقول چیز ہے۔ امام مالکؒ

[1] تدریب الراوی

کا سلسلۃ الذہب بقول امام بخاریؒ یہ ہے: مالک عن نافع عن عبداللہ بن عمر۔ اسی قسم کی سندوں کے متعلق محدثین یہ الفاظ بھی بولتے ہیں، فھم اشھر من نار علی علم۔ تفصیل کے لئے فنی اعتبار سے معرفۃ علوم الحدیث للحاکم از صفحہ ۵۲ تا صفحہ ۵۸ مطبوعہ مصر ملاحظہ ہو۔ ثبوت بالا مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر درج کردئے گئے ہیں ورنہ ایں رشتہ بانگشت نہ پیچی کہ دراز است۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ ہر فن میں فن والے کی رائے اور اس کی تحقیق و تشریح ہی حجت و سند ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ سنن و آثار نبوی کے معلوم کرنے کے لئے سند کو اصل الاصول نہ قرار دیا جائے درانحالیکہ کوئی اور ذریعہ اس کے مستحکم اور محتاط اذعان و یقین کا موجود نہ ہو۔ بلاریب عمل بھی ایک اہم مستحکم اور محتاط ذریعہ ہے لیکن یہاں بھی یہ بحثیں پیدا ہوجاتی ہیں کہ کس کا عمل؟ ایا فرق باطلہ کا یا اہل حق وارباب نقل کا؟ کیونکہ بہت سے ایسے مسائل پیدا ہوگئے ہیں کہ جن کا ثبوت صدر اول میں نہ تھا اور نہ کتاب و سنت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ مگر جماعتی عصبیت جاہلیت کا یہ عالم ہے کہ اسے بھی کتاب و سنت ہی سے ثابت کیا جاتا ہے اور مزید ثبوت کے لئے سواد اعظم اور عملی تواتر کا نام لیا جاتا ہے کہ برابر اہل علم اس پر عمل کرتے آئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عمل بھی وہی صحیح اور حق ہوگا جس کا سلسلہ صحابہ رضی اور آنحضرت صلعم تک ثابت ہو اور یہ چیز بھی بدون سند صحیح قابل پزیرائی نہیں ہوسکتی۔ لہذا یہ مختصر گذارش ایک منصف اور محقق کے لئے بس ہے، تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل۔

عدالت و ثقاہت صحابہؓ یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن حکیم خدا کا آخری پیغام ہے جو تمام عالم کی رہنمائی کے لئے نازل کیا گیا ہے۔ یہ مقدس اور برگزیدہ صحیفۂ یزدانی حضرات صحابہؓ ہی کے ذریعہ سارے عالم میں پہنچا اگر ان حضرات کی عدالت اور ثقاہت وغیرہ مشتبہ ہے تو پھر دین و مذہب کی ساری اساس و بنیاد معرض بحث میں آجاتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم ہی نے سب سے پہلے صحابہ کے فضائل و اخلاق اور عدالت و ثقاہت کو مفصل بیان فرمایا ہے اور جو لوگ قرآن سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کی آیات پر کامل تدبر و تفکر کرنے کے عادی ہیں ان کے سامنے یہ حقیقت (کہ صحابہ عادل اور ثقہ تھے) آفتاب سے زیادہ واضح ہے۔ استیعاب لابن عبدالبرؒ وغیرہ میں مفصل گفتگوئیں

اس پر موجود ہیں۔ اس موقع پر میں شیخ الاسلام حافظ ابن حجرؒ کی ایک تقریر کا خلاصہ اصابہ سے نقل کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جو لمبی چوڑی تحریر و تقریر سے بے نیاز کر دینے والا ہے اور جو تمام تر قرآن مجید سے ماخوذ ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"حضرات اہل سنت اس پر متفق ہیں کہ صحابہ عدول ہیں۔ اس باب میں کوئی اختلاف نہیں ہے سوا مبتدعہ کی ایک مختصر سی ٹولی کے۔ خطیب نے کفایہ میں نہایت نفیس بحث اس موضوع پر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صحابہ کی عدالت و ثقاہت تو خود خدا کی تعدیل کے بموجب ہم مانتے ہیں۔ مثلاً کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ اور کَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا۔ اور لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ الخ۔ اور اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُھَاجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْھُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ۔ اور یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ حَسْبُکَ اللّٰہُ وَمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ اور لِلْفُقَرَآءِ الْمُھَاجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاَمْوَالِھِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ غرض بہت سی آیتوں میں یہ ذکر موجود ہے کہ صحابہ عادل اور ثقہ ہیں۔ ان سب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تعدیل کے بعد اب وہ کسی تعدیل کے محتاج نہیں ہیں۔ اور اگر خدا اور رسول کی طرف سے یہ کچھ وارد نہ ہوتا جو ہم نے ذکر کیا ہے تب بھی ان کی گراں قدر خدمات، ہجرت، جہاد، اسلام کی مدد، جانی و مالی قربانی، باپ اور بیٹے تک سے لڑ جانا، راہ اسلام میں مناصحۃ فی الدین، قوت ایمان اور عزم و ثبات، یہ سب اس پر شاہد عادل ہیں کہ وہ عادل اور تمام امت سے اعلیٰ و افضل ہیں، اور ان معدلین سے بھی جو ان کے بعد ان پر جرح کرنے پر آمادہ ہیں، یہی تمام علماء کا مسلک ہے۔ ابو زرعہ رازی کہتے ہیں کہ جب تم کسی ایسے آدمی کو دیکھو جو صحابہ میں سے کسی کی تنقیص کر رہا ہو تو سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے اور اس پر اپنا ایمان رکھو کہ رسول حق ہے قرآن حق ہے اور جو کچھ وہ لایا برحق ہے" یہ کہ وہ تمام لوگ جو ان پر جرح کرنا چاہتے ہیں وہ کتاب و سنت کو باطل کرنا چاہتے ہیں، اور بہتر یہ ہے کہ خود ان پر جرح کی جائے وہ سب کے سب زنادقہ ہیں۔"

لفظ عدالت ایک مشترک لفظ ہے جس کے مختلف معنیٰ ہیں لیکن محدثین کے نزدیک عدالت کے معنیٰ اجتناب عن الکذب کے ہوتے ہیں یعنی اس معنیٰ کر کے عادل اس شخص کو کہیں گے جو روایات میں دروغ بیانی نہ کرتا ہو۔ تمام صحابہ کو اسی معنیٰ میں عدول کہا جاتا ہے۔ یہ کسی محدث کا دعویٰ نہیں ہے کہ صحابہ کوئی بات انصاف کے خلاف نہیں کر سکتے یا ان سے کوئی فعل تقویٰ و طہارت کے خلاف صادر نہیں ہو سکتا یا وہ انبیاء کی طرح معصوم ہیں، یا وہ تمام گناہوں سے محفوظ ہیں۔ چنانچہ محدثین نے صاف صاف یہ تصریح کر دی ہے۔ علامہ سخاوی فتح المغیث میں اور قاضی شوکانی ارشاد الفحول[1] میں لکھتے ہیں:۔

"ابن انباری کا قول ہے کہ اتہامات کے ثبوت کے بعد یہ مطلب نہیں کہ صحابہ معصوم ہیں اور ان سے گناہوں کا سرزد ہونا محال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی روایتوں کو اسباب عدالت و ثقاہت کی چھان بین کئے بغیر قبول کر لینا چاہئے۔ بجز اس صورت کے جب وہ ایسے امر کا ارتکاب کریں جو روایات میں قادح ہو اور یہ ثابت نہیں ہے۔"

مولانا شاہ عبد العزیز صاحب دہلویؒ لکھتے ہیں:۔

"اہل سنت کا یہ مقررہ عقیدہ ہے کہ صحابہ کل کے کل عادل ہیں۔ یہ لفظ بار بار بولا گیا اور میرے والد مرحوم (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) نے اس لفظ کی حقیقت سے بحث کی تو یہ ثابت ہوا کہ اس موقع پر عدالت کے متداول معنی مراد نہیں ہیں۔ بلکہ صرف عدالت فی روایۃ الحدیث مراد ہے۔ اس کے سوا اور کچھ مراد نہیں، اور اس عدالت کی حقیقت "روایات میں اجتناب عن الکذب" ہے کیونکہ ہم نے تمام صحابہ کی سیرت کو خوب ٹٹولا، یہاں تک کہ ان لوگوں کی سیرت کا بھی تتبع کیا، جو خانہ جنگیوں، فتنوں اور لڑائی جھگڑوں میں شریک ہوئے، تو ہم کو معلوم ہوا کہ وہ رسول اللہ صلعم کے متعلق دروغ بیانی کو سخت ترین گناہ سمجھتے ہیں اور اس سے شدت کے ساتھ احتراز کرتے ہیں[2] (ظفر الامانی)۔"

[1] صفحہ ۷۶ مطبوعہ مصر، [2] مقدمہ اسوۂ صحابہ،

یہ ایک واضح امر ہے کہ مدارج روایت اور تفقہ و اجتہاد کے اعتبار سے صحابہؓ کے مختلف طبقات تھے لیکن فضل و مناقب کے لحاظ سے خلفاء راشدین، ازواجِ مطہرات، مہاجرین اولین، انصار، اہل عقبہ و اہل بدر و مشاہد وغیرہ ایک دوسرے سے افضل ہیں۔ مزیت و فضیلت اضافی چیزیں ہیں ورنہ اس اختلاف مراتب کے باوجود مومن صالح ہونے میں تمام صحابہ برابر ہیں، اور سب کے سب اہل جنت ہیں۔ "وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ"

کتاب و سنت کی اہم شہادتوں اور ائمہ کرام کی تصریحات کے بعد بھی اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ "صحابہ کی عدالت و ثقاہت غیر صحیح، قرآن کے خلاف اور محض عقیدتمندی کا فیصلہ ہے" تو حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ خدایا یہ کیا مصیبت ہے؟ اب تک تو یہی رونا تھا کہ محدثین نے جو کچھ الفاظ جرح و تعدیل رواۃ حدیث کے متعلق وضع اور استعمال کئے وہ محض ظن اور تخمین تھے، اور ان کا فیصلہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا لیکن صحابۂ کرام جن کی عظمت و بزرگی، جلالتِ شان اور تقدس وغیرہ پر تو خود قرآن ناطق ہے، جب ان حضرات رضی اللہ عنہم کے متعلق بھی فضا خراب کر دی جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ ایسا شخص اہل علم سے بہت دور ہے۔ ورنہ اگر تحقیق مدنظر ہوتی تو سب سے پہلے وہ قرآن کی آیات پر تدبر کرتا۔ وہیں سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ کی روشنی اس کے لئے شمع راہ ہوتی۔ اور رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کی تعدیل نہ صرف صحابۂ کرام کے متعلق ملتی بلکہ تابعین کے بارے میں بھی سندِ ثقاہت ہاتھ آتی۔ اور "خَیْرَ اُمَّةٍ" الخ اور "اُمَّةً وَّسَطًا" کے اولین مخاطب کا سراغ ملتا۔ لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ ..... وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی" کا طغرائے امتیاز میزان عدل و قسط قرار پاتا۔ قرآن مجید کے عموم کے مطابق تو جملہ صحابہ و تابعین، صالح اور مومن قطعی طور پر ثابت ہیں۔ جو لوگ روایتوں سے صرف تاریخیت کے قائل اور حجت دینی کے منکر ہیں ان کو تو بہرحال صحابہ و تابعین کی عدالت و ثقاہت قرآن ہی سے ماننی پڑے گی صحابۂ کرام کے غیر ثقہ ہونے پر چاہے ہزاروں جرحیں احادیث و سیر سے پیش کی جائیں، مگر ان سے قرآن کے فیصلہ "رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ" وغیرہ آیات پر تو ذرہ برابر اثر نہیں پڑ سکتا۔ رہ گئے وہ لوگ جو روایتوں یعنی سنن و آثار نبوی کو حجت دینی

مانتے ہیں تو وہ نہ تو صحابہ کو معصوم سمجھتے ہیں نہ خطا ولغزش بشری سے پاک۔ ہاں خواہ مخواہ ان کی نیتوں کے متعلق سوء ظنی رکھنا جس پر نہ قرآن راضی نہ اللہ و رسول کا حکم کسی طرح جائز نہیں رکھتے۔ مشاجرات صحابہ محض ایک اجتہادی غلطی تھی ورنہ واقعات شاہد ہیں کہ باوجود شدید اجتہادی اختلاف کے ایک دوسرے کا احترام فرماتے تھے۔ حضرت علیؓ حضرت عائشہؓ کو ام المومنین ام المومنین کہتے رہے۔ خود حضرت عائشہ جن کی برأت و تطہیر قرآن نے کی اور حضرت علیؓ جن کو آنحضرت صلعم نے بمنزلہ ہارونؑ کے کہا کیونکر غلطی فرما سکتے تھے۔ کیا قرآن اس ہستی کی برأت کر سکتا تھا جو فتنہ میں ملوث ہونے والی ہو؟ کیا پیغمبر ایسے شخص کو بمنزلہ ہارون کہتا جو باطل کے لئے جنگ و جدل کریں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ یہی وجہ تو تھی کہ باوجود ان باتوں کے کوئی ایک صحیح واقعہ موجود نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ یہ حضرات ایک دوسرے کو (معاذ اللہ) برا کہتے یا سمجھتے تھے۔

یہ ہے واقعہ کی اصلی تصویر اور صحابہ کی عدالت کی حقیقی تعبیر۔ کیا یہ بات آج کل کے آزاد اور نام نہاد مفسرون کے لئے حیرت انگیز نہیں ہے کہ حضرت موسیٰؑ جو بحکم قرآن نبی و رسول ہیں، ان سے "لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي" اور "أَلْقَى الْأَلْوَاحَ وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُ إِلَيْهِ" کا صدور ہو جائے۔ انتہائی غیظ و غضب میں حضرت ہارون کی ڈاڑھی اور سر کے بال پکڑیں اور کھینچنے لگیں۔ یہی کہا جائے گا ناکہ (حاشا) ہارون کی اہانت کی نیت سے ایسا نہیں کیا تھا؟ اور حضرت موسیٰ اس حالت میں شرعاً معذور تھے۔ فرط غضب اور ہنگامہ دار و گیر میں الواح ہاتھ سے چھوٹ گئیں جسے عدم تحفظ کی وجہ سے تغلیظاً القاء سے تعبیر فرمایا گیا کیونکہ بظاہر "خُذْهَا بِقُوَّةٍ" کا امتثال نہ کر سکے۔ مگر چونکہ ان دونوں معاملات کی سطح جو ہارون یا الواح کے متعلق ظہور میں آئی بہر حال صورت پسندیدہ نہ تھی گو موسیٰؑ باعتبار نیت معذور تھے، اس لئے آئندہ "رَبِّ اغْفِرْ لِي" کہکر حق تعالیٰ سے عفو کی درخواست کی یا اس کے سوا اور کوئی تاویل ہوگی؟ یہ باتیں ان حضرات کے لئے زیادہ غور کرنے کی ہیں جو محض قرآن کو آڑ بنا کر عصمت انبیاء و عظمت صحابہ کا نام لے کر سنن و آثار نبوی کو مجروح کرنے کے عادی ہیں۔ ایک طرف تو زبانی ادعائے قرآن دانی اور دوسری جانب علوم و فنون اسلامیہ سے بیگانگی، ہجر و فقدان کا یہ عالم کہ اگر کوئی روایت ذرا بھی بظاہر معارض نظر آئی جمع و توفیق کی بیسیوں

مشکلوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور فوراً یہ کہنا شروع کر دیا جاتا ہے کہ قرآن کے خلاف ہے عقل کے منافی ہے آنحضرت صلعم کی عصمت اور صحابہ کرام کی عظمت و رفعت، ازواج مطہرات کی عفت و طہارت کا مقام اس سے بلند ہے سننے والا مرعوب ہو جاتا ہے اور یارانِ طریقت اپنا کام کر جاتے ہیں۔ حالانکہ سیدھی سی منطق ہے کہ اگر قول و فعل پیغمبر صلعم کا ہے تو وہ قیامت تک بیان بالا کے مخالف نہیں ہو سکتا۔ صحیح عقل و نقل میں کبھی تعارض نہیں رہا ہے۔

یہ حال ہے ان بخاری وقت لوگوں کا۔ یہ حضرات تو پیغمبر اور صحابہ وغیرہ کی عظمت و عصمت کو سمجھیں اور سمجھیں تو امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ، بخاریؒ، مسلمؒ، علی بن المدینیؒ، یحییٰ بن سعید القطانؒ، ابو حاتم رازیؒ، ابو زرعہؒ، عبداللہ بن مبارکؒ، یحییٰ بن معینؒ، علامہ ابن حزمؒ، ابن قیمؒ و شاہ ولی اللہؒ وغیرہ، یہ ایک ایسی جماعت ہے جو اسلام کے لئے سنت مضر اور سم قاتل ہے۔ اس کے دام تزویر میں آکر بڑے بڑے عباد و زہاد اور مغربدہ سعادتِ ازلی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ایسی بے اصول جماعت سے گفتگو ہو بھی تو کیوں کر؟۔

بحث و مناظرہ سے بجائے اس کے کہ حق کو حق سمجھا جائے زیادہ تر معاملہ برعکس ہی ہوتا ہے، ورنہ قرآن کریم تو بآواز بلند مدعی ہے کہ اصحاب محمد رسول اللہ صلعم کی قدوسیت توریت و انجیل میں بھی بیان ہوئی ہے ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:۔

"وہ کوہِ فاران سے جلوہ گر ہوا اور لاکھوں قدوسیوں میں سے آیا، .... اس کے سب مقدس لوگ تیرے ہاتھ میں ہیں،، (استثنا، باب ۳۳ صفحہ ۲۰۱)

کیا مذکورہ پیشینگوئی فتح مکہ کے دن پوری نہیں ہوئی؟ قرآن کو پڑھو تو اس میں اصحاب رسول اللہ کے ایک ایک خدوخال کو واضح کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ" آخر اس سے کون لوگ مراد ہیں؟ کیا اس زبردست شہادت کے بعد بھی کسی کو صحابہ کی عدالت و ثقاہت میں شبہ رہتا ہے؟ کون مسلمان ہے جو پنجوقتہ نمازوں میں سورہ فاتحہ نہ پڑھتا ہوگا مگر کیا کبھی اس حقیقت پر بھی غور کیا گیا کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" سے

کن کے راستے کی طلب مراد ہے اور وہ کون لوگ ہیں جن پر انعام واکرام باری کی بارش ہوئی اور منعم علیہم قرار پائے؟ اس کا جواب قرآن خود دیتا ہے "مِنَ النَّبِیِّینَ وَالصِّدِّیقِینَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصَّالِحِینَ" کیا صالح مومنوں میں خلفاء راشدین کے علاوہ صحابہ کی جماعت داخل نہیں ہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ ان کی اجتہادی غلطیوں کو نفاق و شقاق، (معاذ اللہ) عدوان اور سرکشی سے تعبیر کرکے اپنے نامۂ اعمال کو خراب کیا جاتا ہے "کل مجتھد مصیب والمصیب واحد والمخطی معذور بل ماجور" کی توجیہ ایک منصفانہ اور عالمانہ فیصلہ ہے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہی حق پسندانہ بات فرمائی ہے کہ "تلك دماء طھر اللہ منھا اسیوفنا فلا نخضب بھا السنتنا"[1] تلاش حق و صداقت اور غور و فکر کے لئے اتنے اشارات کافی ہیں، بشرطیکہ تحقیق مد نظر ہو۔

سنن و آثار نبوی کے مرکزی مقامات اور ان کی نشر و اشاعت

مذکورہ مباحث کے بعد یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے آنحضرت صلعم کے وصال کے بعد مختلف مقامات پر اپنے مراکز اور چھاؤنیاں قائم کر لی تھیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ خدا کی راہ میں جہاد وغیرہ کے لئے نکلے۔ لوگ ان کے پاس جمع ہوتے۔ وہ ان کے سامنے خدا کی کتاب اور پیغمبر کی سنت کو ظاہر فرماتے اور کسی چیز کو کبھی نہ چھپاتے۔ مکہ، مدینہ، کوفہ، شام، بصرہ، یمن، جزیرہ، خراسان، مصر میں صحابہ کی جماعت موجود تھی لیکن سیاسی اور مذہبی اعتبار سے اول الذکر ہر سہ مقامات کو خاص اہمیت حاصل تھی۔

صحابہ میں حضرات خلفاء اربعہ اور ابن مسعودؓ، ابی بن کعبؓ، معاذ بن جبلؓ، زید بن ثابتؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، عمار بن یاسرؓ، حذیفہؓ، سلمانؓ، ابو درداءؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ فقہائے صحابہ کے نام سے موسوم ہیں اور اکثر آنحضرت صلعم کے عہد میں فتویٰ دینے کے مجاز تھے۔ ان کے علاوہ مفتیان صحابہ کی تعداد ۱۲۰ سے متجاوز ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ، انس بن مالکؓ، جابر بن عبداللہؓ، عبداللہ بن عمرؓ، ابو سعید خدریؓ، عائشہؓ، علامہ ابن جوزی کی

[1] ارشاد الفحول

اصطلاح میں رواۃ صحابہ ہیں۔[۱]

سنن وآثار نبوی سے جو احکامات ثابت ہیں بقول علامہ خطلی صرف حضرت ابوہریرہ سے ڈھائی ہزار مروی ہیں۔[۲] اور جنھوں نے سنن ابی داؤد وجامع ترمذی، الامام ابن دقیق العید، منتقی الاخبار لابن تیمیہؒ وغیرہ کا مطالعہ کیا ہے وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ احکامات اسلامی کی فہرست کس درجہ طویل اور معاشرتی وتمدنی زندگی کو حاوی ہے لیکن بقول علی بن المدینی جس کو ابوبکر خطیب نے روایت کیا ہے تین شخص ایسے ہیں جن پر احکامات نبوی صلعم کا علم منتہی ہوتا ہے، وہ درج ذیل ہیں:۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلبؓ آپ ہجرت کے دو سال پہلے پیدا ہوئے اور رسول اللہ صلعم نے آپ کے لئے دعا کی کہ "خدا ان کو دین میں فقیہ بنا اور ان کو تاویل کتاب الہٰی سکھا"۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ ابن عباس قرآن کے کس قدر اچھے ترجمان ہیں۔ اگر ان کو ہمارا سن وسال ملتا تو ہم میں کوئی ان کا ہمسر نہ ہوتا۔ معمرؒ کا قول ہے کہ ابن عباس کا عام علم تین بزرگوں سے ماخوذ ہے۔ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابی بن کعبؓ۔ شوق کا یہ عالم تھا کہ خود حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ میں جب یہ سنتا تھا کہ ایک آدمی کے پاس حدیث ہے تو اس کے ہاں جاتا تھا اور اس کے انتظار میں بیٹھ جاتا تھا یہاں تک کہ جب وہ نکلتا تو میں اس سے پوچھ لیتا"۔ تفسیر اور فقہ میں اہل مکہ کے علم کا دارومدار حضرت ابن عباس ہی پر ہے۔ آپ نے ۳۸ھ میں بمقام طائف وفات پائی۔[۳] آپ کے ممتاز تلامذہ میں سعید بن جبیر، عطاء بن ابی رباح، عکرمہ، مجاہد، جابر، زید، طاؤس وغیرہ ہیں۔ ان تمام کے علم کا سلسلہ عمرو بن دینار پر منتہی ہو کر روئے زمین پر چھا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے فتاووں کو مامون عباسی کے پوتے نے جمع کرایا تو ۲۰ کتابیں ہوئیں۔[۴]

(۲) حضرت زید بن ثابت کاتب الوحیؓ۔ آپ کے والد کا نام ضحاک تھا اور انصار کے قبیلہ بنو نجار سے تعلق رکھتے تھے۔ رسول اللہ صلعم جب مدینہ آئے تو آپ کی عمر ۱۱ سال کی تھی۔ سب سے پہلے آپ نے غزوہ خندق میں شرکت کی۔

---

[۱] تلقیح فہوم الاثر [۲] فصول الحواشی [۳] تاریخ فقہ اسلامی [۴] المدخل لابن بدران

تبوک کی جنگ میں بنو مالک بن النجار کا جھنڈا حضرت عمارہ بن حزم کے ہاتھ میں تھا لیکن رسول اللہ صلعم نے ان سے لے کر حضرت زید بن ثابت کے حوالہ کر دیا۔ عمارہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا میرے متعلق آپ کو کوئی بات معلوم ہوئی ہے؟ فرمایا "نہیں لیکن قرآن مقدم ہے اور زید نے تم سے زیادہ قرآن پڑھا ہے"۔ حضرت زید بن ثابتؓ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں کاتب کی خدمت انجام دیتے تھے۔ حضور کے پاس سریانی زبان میں بہت سے خطوط آتے تھے۔ اس لئے حضرت زید بن ثابت نے آپ کے ارشاد سے سریانی زبان سیکھی۔ آنحضرت صلعم کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بھی کاتب رہے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو تین بار مدینہ میں اپنا جانشین بنایا۔ حضرت عثمانؓ بھی جب حج کو جاتے تھے تو آپ کو اپنا جانشین کر جاتے تھے۔ آپ صحابہ میں سب سے زیادہ فرائض کے عالم تھے چنانچہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ زید تم میں سب سے زیادہ علم فرائض کو جانتے تھے۔ آپ صحابہ میں بہت بڑے عالم اور راسخین فی العلم میں تھے۔

آپ جمع و ترتیب قرآن کے رکن اعظم ہیں۔ آپ کا عمل یہ تھا کہ صرف اپنی یاد اور اپنے لکھے ہوئے اجزا ہی پر قناعت نہیں فرماتے تھے بلکہ اور حفاظ کی یاد اور دوسرے کاتبوں کے صحیفوں اور ان اجزا سے بھی آپنے مدد لی جو رسول صلعم کے گھر میں لکھے ہوئے موجود تھے۔ آپنے مہاجرین اور انصار کے اتفاق سے اس مجموعہ کو مکمل کیا اور حضرت شیخینؓ کے ذریعہ خدا نے اپنی اس ضمانت "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ" کو پورا فرمایا۔ حضرت عثمانؓ نے جب اپنے زمانہ میں اس کام کے لئے لوگوں کو متعین فرمایا تو حضرت زید بھی بحیثیت رکن اعظم شریک تھے۔ بہت سے صحابہؓ و تابعین نے آپ سے روایتِ حدیث کی مثلاً فقہاء سبعہ مدینہ منورہ، قبیصہ بن ذویب، ابوسلمہ بن عبدالرحمن، سالم بن عبداللہ، ابان بن عثمان وغیرہ۔ ان تمام لوگوں کا علم تین حضرات پر منتہی ہوتا ہے، ابن شہابؒ، بکر بن عبداللہ الاشج اور ابوالزنادؒ۔ پھر ان تمام کا علم حضرت امام مالکؒ تک پہنچ کر دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل پڑتا ہے۔

(۳) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہذلی۔ بنو زہرہ کے حلیف اور قدیم الاسلام ہیں۔ آپ کا بیان ہے کہ میں نے اپنے آپ کو چھ مسلمانوں میں کا چھٹا مسلمان پایا۔ اس وقت سطح زمین پر ہم لوگوں کے سوا کوئی اور مسلمان نہ تھا۔

مکہ میں سب سے پہلے آپ ہی نے باعلان قرآن مجید پڑھا۔ جب آپ اسلام لائے تو رسول اللہ صلعم نے آپ کو اپنی خدمت میں رکھ لیا۔ آپ خدمت کرنے لگے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تم کو اندر آنے کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں، تمھاری اجازت صرف یہ ہے کہ تم میری بات سُن لو اور پردہ اٹھا ہوا ہو۔ چنانچہ وہ آپ کے پاس اندر آتے جاتے، آپ کو جوتا پہناتے، آپ کے ساتھ آگے آگے چلتے، جب آپ غسل فرماتے تو پردہ کرتے، اور جب آپ سوتے تو آپ کو بیدار کرتے۔ حبشہ اور مدینہ دونوں جگہ ہجرت کی اور دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی۔ رسول اللہ کے ساتھ بدر، احد، اور خندق، بیعۃ الرضوان اور تمام لڑائیوں میں شریک ہوئے اور آپ کے بعد معرکۂ یرموک میں شرکت کی۔ آپ سے بہت سے صحابہ اور تابعین نے حدیث کی روایت کی ہے۔ حضرت حذیفہؓ سے کہا گیا کہ ہم کو ایسا شخص بتائیے جو طور وطریقے میں آنحضرت صلعم سے سب سے زیادہ قریب ہو تا کہ ہم اس سے حدیث سنیں اور اخذ کریں۔ بولے طرز وروش میں آنحضرت صلعم سے سب سے زیادہ قریب ابن مسعود ہیں۔ اصحابِ محمدؐ میں جو لوگ محفوظ ہیں وہ جانتے ہیں کہ ابن ام عبد، سب سے زیادہ مقرب بارگاہِ الٰہی ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو بغیر مشورہ خلیفہ بناتا تو ابن ام عبد کو بناتا۔ حضرت عمر نے آپ کو کوفہ بھیجا اور باشندگانِ کوفہ کو لکھا کہ "میں نے عمار بن یاسر کو امیر اور عبداللہ بن مسعود کو معلم اور وزیر بنا کر بھیجا ہے۔ یہ دونوں رسول اللہ صلعم کے شریف ترین بدری صحابی ہیں۔ ان کی پیروی اور اطاعت کرو اور ان کا کہنا مانو۔ میں نے عبداللہ بن مسعود کو بھیج کر تمھارے ساتھ ایثار سے کام لیا ہے۔" آپ اہل کوفہ کے معلم اور قاضی کی حیثیت سے وہاں مقیم رہے اور وہاں کے باشندوں نے آپ سے اخذ حدیث کیا۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ عبداللہ بن مسعود نے قرآن پڑھا۔ اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھا۔ مذہب کے فقیہ اور حدیث کے عالم تھے۔ حضرت عمرؓ و حضرت علیؓ سے باقاعدہ علم شریعت حاصل کیا تھا۔ حضرت عثمان غنی کے عہد خلافت میں ۳۲ھ میں آپ کی وفات مدینہ منورہ میں ہوئی۔[1]

اس موقع پر یہ جاننا ضروری ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے علقمہ، اسود، عبیدہ، حارث بن قیس، مسروق،

[1] تاریخ فقہ اسلامی و کوکب الدری

عمرو بن شرحبیل وغیرہ نے علوم حاصل کئے اور ان حضرات سے ابراہیم نخعی اور شعبی نے اور ان سے امام ابوحنیفہؒ ابو اسحٰق اور اعمش نے اور ان سے حضرت سفیان ثوری وغیرہ نے۔ علمائے کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علیؓ کے تلامذہ کی فہرست بہت ہی طویل ہے (تفصیل کے لئے "معرفۃ علوم الحدیث" للحاکم وغیرہ ملاحظہ ہو) ان سے صدہا بلکہ ہزارہا مخلوق الٰہی نے سنن وآثار نبوی کی تعلیم حاصل کی اور اسی علم کے ذریعہ سے معاملات مذہبی وسیاسی کو انجام دیا اور پھر یہ علوم دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے۔ (باقی)

ترجمان القرآن کے سابق پرچے

ترجمان القرآن کے مندرجہ ذیل سابق پرچوں کی دفتر ہذا کو ضرورت ہے۔ جو حضرات ان پرچوں کو قیمتاً فروخت کرنا چاہتے ہوں۔ یا جنکے پاس یہ پرچے زائد موجود ہوں وہ براہ کرم ان پرچوں کو بذریعہ ڈاک ہمارے پاس روانہ کردیں۔ اور "لفافہ" پر اپنا مکمل پتہ تحریر فرمادیں تاکہ ۸ر فی پرچہ کے حساب سے ان کو قیمت روانہ کی جاسکے۔

رسائل واخبارات کے اڈیٹر صاحبان سے بھی گزارش ہے کہ اگر وہ مکمل فائل نہ رکھنا چاہتے ہوں۔ اور ان کے پاس یہ پرچے ہوں تو وہ بھی ان پرچوں کو بھجوا کر قیمت وصول کرلیں۔

سال ۱۳۵۲ھ	جلد ۲	عدد ۱	ماہ محرم	سال ۱۳۵۶ھ	جلد ۱۰	عدد ۳	ماہ ربیع الاول
″	جلد ۳	عدد ۲	ماہ شعبان	″	″	عدد ۴	ماہ ربیع الثانی
″	جلد ۳	عدد ۳	ماہ رمضان	″	جلد ۱۱	عدد ۲	ماہ شعبان
سال ۱۳۵۴ھ	جلد ۶	عدد ۱	ماہ محرم	″	″	عدد ۳	ماہ رمضان
″	″	عدد ۲	ماہ صفر	سال ۱۳۵۷ھ	جلد ۱۲	عدد ۵	ماہ جمادی الاولیٰ
″	″	عدد ۳	ماہ ربیع الاول	″	″	عدد ۶	ماہ جمادی الاخریٰ
″	″	عدد ۴	ماہ ربیع الثانی	″	جلد ۱۳	″	ماہ رجب
سال ۱۳۵۶ھ	جلد ۱۰	عدد ۲	ماہ صفر				

منیجر

اسلام اور وطنیت

از جناب مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی

{پچھلے دنوں قومیت اور وطنیت پر جو گرماگرم بحثیں ہو چکی ہیں، ان سے اس مضمون کو کوئی تعلق نہیں۔ یہاں ان لفظی نزاعات سے بالکل صرف نظر کرکے وطن کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ کوئی محتاج توضیح چیز نہ تھی اور اس عنوان پر قلم اٹھانا خواہ مخواہ ایک ایسے مسئلے کو اہمیت دیدینا ہے جو مسلمان کی نگاہ میں کبھی اہم نہ تھا، مگر زمانہ کی ستم ظریفی کو کیا کہیے کہ اس بے حقیقت چیز کو حقیقت کی حد تک پہنچا دیا ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان علی الاعلان اسے حقیقت ہی کی حیثیت سے قبول کرتے جارہے ہیں حتیٰ کہ اب تو اسلام اور وطن پرستی ایک کرکے رکھ دی گئی ہے}

حب وطن اور وطنی عصبیت نئی چیزیں نہیں ہیں۔ آغاز تمدن سے چلی آرہی ہیں لیکن عملاً جتنا فروغ اور احترام انھیں نئی تہذیب نے بخشا ہے پرانی دنیا اس کا تصور بھی نہ کرسکی ہوگی۔ اب وقت کی نیاضی نے وطن کو وہ تمام حقوق دے دیے ہیں جو کسی معبود ہستی ہی کے شایان شان ہوسکتے ہیں یعنی وطن ہی وہ چیز ہے جس کی حرمت، خدمت، حمایت اور تقدیس شرف انسانی کی آخری معراج اور نظام حیات کے دائرہ کا مرکزی نقطہ ہے۔ اصول اخلاق، آئین سیاست، ضابطۂ تہذیب اور قانون معیشت و معاشرت مستقل حقایق کے بجائے وقتی مفروضات ہیں جو وطنی مصالح کے اشارہ پر ہر آن ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ خدا میرے وطن کے ساتھ ہے کوئی کہتا ہے میرا وطن خدا کا اپنا وطن ہے۔ اور کوئی یہ کہہ کر کہ "میرا وطن ہی خدا ہے" آگے بولی بولنے والوں کی زبان ہی بند کردیتا ہے۔ گویا پہاڑ اور دریا صرف زمین ہی کے خطوں کو الگ نہیں کرتے بلکہ انسانیت کے

مفہوم کو بدل دیتے ہیں۔ خدائی تک کو تقسیم کر ڈالتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب وطن کی عظمت و کبریائی کا یہ عالم ہے تو اس کی محبت اور عصبیت مقدس ترین جذبہ کیوں نہ ہو؟ اس کی پرستش روشن خیالی کا منتہی کیوں نہ ٹھیرے؟ اس کی راہ میں لڑنے والا غازی اور مجاہد کیوں نہ مانا جائے؟ اور اس کی آن پر سر دینے والا شہید اور زندۂ جاوید کیوں نہ کہا جائے؟ ۔

مہذب دنیا نے وطن کے ان حقوق کی حمایت میں اتنا شدید پروپگنڈا کیا کہ مشرق کی "نیم مہذب" اقوام کو ان کی واقعیت کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔ اسلامی ممالک کے وہ حصے جو اس سرچشمۂ تہذیب سے نسبتہً زیادہ قریب تھے سب سے پہلے انھوں نے عملاً اس تصور کو قبول کیا اور خدا جانے مغرب کے اس ظاہر فریب اور ہلاکت بداماں تصور کی گرفت سے ان کے ذہن کب آزاد ہوں گے لیکن اب تو اس ذہنی غلامی کا ماتم کرنے کے لیے نہیں نہ اصفہان جانے کی ضرورت ہے نہ انقرہ، یہ رو ہمالہ کی دیواروں کو توڑ کر ہندوستان میں بھی داخل ہو چکی ہے اور طوفان کی سی تیزی کے ساتھ پھیلتی جا رہی ہے، اور جو ایک دو شکستہ اور نیم جان بند ہماری امیدوں کا آخری سہارا تھے کہ وہ اس رو کو روکیں گے وہ بھی رہ رہ کے بہے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ تو وہ ہیں جو علیٰ وجہ البصیرت اسے اسلام کے خلاف سمجھ رہے ہیں لیکن آزادی کے جوش اور سیاستِ حاضرہ کے مصالح نے ان کی زبانیں گنگ کر دی ہیں۔ دوسرا گروہ ذرا ان سے زیادہ "روشن خیال" اور ساتھ ہی "حری" اور "باحمیت" بھی ہے۔ اس سے غیر مسلموں کا یہ طعنہ کہ "مسلمانوں میں وطن کی محبت نہیں وہ بھارت ماتا سے زیادہ عرب کا درد رکھتے ہیں" سہا نہ گیا اور اس نے اس دلخراش طعنہ کے جواب میں ع

کہ حب الوطن ہے نشانِ مومنیں کا

کا ترانہ گاتے ہوئے چیلنج کیا کہ جسے وطن پرستی کا دعویٰ ہو سامنے آئے اور بتائے کہ کس کی شریعت "حب الوطن من الایمان" کی تعلیم دیتی ہے؟ پھر اس سراسر مادہ پرستانہ جملہ کو ارشاد نبوی کی حیثیت سے اس قدر مشہور کیا گیا کہ اچھے اچھے ارباب فہم اس دھارے میں بہ گئے۔ اور اگر روایتہً نہیں تو معنیً اسے فطرت اسلام کی صحیح ترجمانی سمجھنے لگے۔

ظاہر ہے کہ حب وطن کی محبت جزو ایمان ہے تو وطن کی راہ میں لڑے اور مرے بغیر (یعنی جہاد کئے اور سر میں سودائے شہادت رکھے بغیر) ایمان کی تکمیل کیوں کر ہو سکتی ہے۔ اور کسی مسلمان کے خلوص ایمان کے ثبوت میں اس کی وطن پرستی سے بڑھ کر اور کون سی دلیل ہو سکتی ہے؟

لیکن کیا حب وطن کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر یہی ہے؟ سطور ذیل میں ہم اسی سوال پر غور کرنا چاہتے ہیں، اور قطع نظر اس سے کہ فقیہان قوم کیا کہتے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ خدا اور اس کا رسول کیا کہتا ہے۔

حب وطن کا وجود ایک بدیہی اور مسلّمہ حقیقت ہے، ایسی بدیہی اور مسلّم کہ اس پر کسی عقلی یا نقلی دلیل پیش کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہر انسان کی طبیعت بجائے خود اس پر گواہ ہے۔ اسے جتنا لگاؤ کافر کی فطرت سے ہے اتنا ہی ایک مومن کی فطرت سے بھی ہے۔ اس کے وجود سے بڑے سے بڑے صاحب ایمان کا دل و دماغ خالی نہیں ہو سکتا۔ اس نے تو اپنے وجود کا اعلان اس قلب اور زبان سے کرایا جسے مہبط وحی اور لسان وحی کہا جاتا ہے۔ مکہ سے نکلتے وقت ایک طرف چشم مبارک سے غم و حسرت کے آنسو بہہ رہے تھے، دوسری طرف زبان بے اختیار کہہ رہی تھی کہ "اے مکہ تو مجھے ساری دنیا سے زیادہ عزیز ہے، پر کیا کروں تیرے ہی فرزند تیری آغوش سے مجھے محروم کر رہے ہیں"۔ اور پھر بلال رضی اللہ عنہ کے وہ نغمات درد تو آج تک ضرب المثل ہیں جو ان کی مضطرب روح کی گہرائیوں سے یاد وطن میں نکل نکل کر مدینہ کی پہاڑیوں میں گونجا کرتے تھے۔ غرض ایمان یا عدم ایمان کوئی شئے بھی اس جذبۂ بشری پر اثر انداز نہیں ہو سکتی، بعینہٖ اسی طرح جس طرح ماں کی، باپ کی، بیٹے کی، بیوی کی، بھائی کی، بہن کی، احباب اور اقارب کی، کسی کی بھی محبت پر ان اعتقادی نزاعات کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ یہ تو سب کے سب خالص بشری جذبات ہیں جو بلا لحاظ کفر و ایمان بنی نوع انسان کی سرشت میں صناع ازل نے اس وقت سے ودیعت رکھے ہیں جب خود انسان کو ان کے وجود کا احساس بھی نہ تھا۔ چنانچہ قرآن حکیم خود اس حقیقت کو تسلیم کر کے فطرت انسانی کی ساخت کے متعلق فرماتا ہے:-

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ — بنی نوع انسان کو فطرتاً مرغوبات دنیوی یعنی بیویوں،

النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ الخ (آل عمران رکوع ۲)

بیٹوں، سونے چاندی کے بڑے بڑے ڈھیروں، عمدہ عمدہ گھوڑوں، مویشیوں اور کھیتوں کی محبت بھلی معلوم ہوتی ہے۔

وطن کی محبت بھی اس "حُبُّ الشَّهَوَاتِ" کے دائرہ سے خارج نہیں۔ حُبِّ شہوات سے مراد ہے مادیات کی محبت۔ وطن کی محبت بھی دیگر تعلقات دنیوی کی طرح ایک مادّی اور دنیوی تعلق کا نام ہے۔ بلکہ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو انہیں تمام اشیا کی محبت ہی حب الوطن کی محرک اور علت بلکہ عین حبّ وطن ہے۔ انسان جس ماحول اور سوسائٹی میں، جن احباب اور متعلقین کے درمیان اور جن لوازم زندگی کے ساتھ رہتا سہتا ہے، ان سے اسے ایک خاص انس پیدا ہو جاتا ہے، اسی انس کا دوسرا نام حُبِّ وطن ہے۔ اس انس کے وجود کو قرآن تمام نوعِ انسانی یعنی "النَّاس" کی جبلت میں مرکوز بتاتا ہے۔ اس "النَّاس" کے فرد جس طرح ابوجہل اور ابولہب ہیں اسی طرح صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ بھی۔ کسی کی خلقت "زُيِّنَ لِلنَّاسِ" کے حکم عام سے باہر نہیں ہے۔ پھر ان عام جذباتِ انسانی کو کفر و ایمان کے جھگڑوں سے کیا تعلق؟

مادّی تعلقات کے متعلق اسلام کا نظریہ

سب سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حبِّ وطن کے مخصوص تعلق کے بجائے عام تعلقاتِ دنیویہ کے بارے میں ہم اسلام کا نقطۂ نظر سمجھ لیں۔ کیونکہ زیر بحث مسئلہ بھی اسی ضمن میں خود بخود حل ہو جائیگا اور یوں بھی قرآن جب کبھی ان دنیوی تعلقات اور مادّیات سے متعلق جذباتِ انسانی کے بارے میں کچھ فرماتا ہے تو زیادہ تر ان کی مجموعی حیثیت کو ہی سامنے رکھ کر فرماتا ہے کسی تعلق کی جداگانہ حیثیت اس کے دائرہ بحث میں بہت کم آتی ہے۔

یقیناً جہاں تک ان جذبات کے نفس وجود کا تعلق ہے، وہ دیر و حرم کے جھگڑوں سے بے نیاز ہیں۔ وہ اپنا یہ حق ہر شیخ و برہمن سے حاصل کئے ہوئے ہیں۔ محل نزاع یہ نہیں ہے کہ یہ جذبات آدمی میں ہونے چاہئیں یا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ ان جذبات کی جائز حد کیا ہے، اور انسان کے نفس پر ان کے حقوق کس قدر ہیں۔

اسی سوال پر پہنچ کر اسلام اور جاہلیت کے راستے الگ الگ ہوجاتے ہیں۔ اسلام ہر مادی تعلق کو چند حدود سے مقید کرتا ہے اور جاہلیت انھیں توڑنے پر اصرار کرتی ہے۔ (حبِّ وطن کے بارے میں بھی دونوں کے تصورات بالکل ایسے ہی جداگانہ واقع ہوئے ہیں۔ جاہلیت وطن ہی کو دین وملت بلکہ خدا بھی سمجھ لے تو بعید نہیں، مگر اسلام وطن کی محبت کو نہ اتنی تقدیس کا مستحق سمجھتا ہے اور نہ اسے اتنے غیر محدود حقوق دیتا ہے)۔ اسلام دنیا کی تمام مرغوبات سے حظ اٹھانے کی اجازت تو دیتا ہے لیکن اپنے نظام اور اصولِ کار میں کسی مادی شئے کے اثر اور اقتدار کو قبول نہیں کرتا۔ بالفاظ دیگر وہ دنیا کو برتنے تو دیتا ہے لیکن پوجنے نہیں دے سکتا۔ اس کے دستور العمل (قرآن) کے قریباً ہر صفحہ میں یہ وضاحت موجود ہے۔ چنانچہ آیت مذکورہ بالا کے آخری الفاظ ہی میں ارشاد ہوتا ہے ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ یعنی یہ دنیا اور اس کی تمام چیزیں جن کی طرف میلان انسان کی فطرت میں داخل ہے، "متاعِ قلیل" ہیں۔ ان سے تمتع تو ضرور کرو لیکن انھیں کو مقصود بالذات سمجھ کر ان کی پرستش میں نہ لگ جاؤ، تمھاری منزلِ مقصود اس سے بلند تر ہے۔ ان حیاتِ دنیوی کی زینتوں پر اگر تم فریفتہ ہوگئے اور انھیں کے ہاتھوں میں اپنے نظامِ حیات کی باگیں دے دیں تو یقین کرو تم مقصدِ حیات کی تکمیل میں ناکام اور زندگی کی آزمائش گاہ میں فیل ہوگئے۔ کیونکہ ہم نے تمھیں اس واسطے نہیں پیدا کیا کہ دنیوی علائق کی سرمستیوں میں غرق ہوجاؤ، بلکہ اس آزمائش کے لیے پیدا کیا ہے کہ ان بندشوں کے اندر بھی کون اپنی عقل اور روح کو آزاد اور زندہ رکھتا ہے اور ان میں گرفتار ہونے کے بجائے ان سے خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتا ہے۔

الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا — وہ اللہ جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمھیں آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرتا ہے۔

اور یہ آزمائش اس وقت تک نہیں ہوسکتی تھی جب تک کہ اس امتحان گاہ (دنیا) کے اندر بنی آدم کے لیے مزلّاتِ اقدام نہ پیدا کیے جاتے۔ چنانچہ وہ پیدا کیے گئے اور اس کثرت اور قوت کے ساتھ کہ آدمی میں اگر حقیقی

بینائی ہو تو اپنی کمزوریوں کے مقابلہ میں ان کی بے پناہی اور آفاق گیری کو دیکھ کر چیخ اٹھے۔ وہ مزلات کیا ہیں؟ یہی مرغوباتِ نفس جن کی طرف آیتِ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے، اور جن کا ایک جامع نام کتاب اللہ نے "متاعِ حیاتِ دنیا" رکھا ہے۔ یہی متاعِ دنیا انسان ظلوم و جہول کے لیے مزلۂ اقدام ہے۔ یہ نہ ہوتی تو یہ عالمِ عنصری، دار ابتلا بھی نہ بنتا۔ اسی لیے انسان کو بار بار چوکنا رہنے کی تاکید کرتا ہے:۔

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۔ (لقمان - ۴)

پس تمھیں یہ دنیوی زندگی (اصل مقصد و انجام کی طرف سے) دھوکہ میں نہ ڈال دے اور نہ خدا کے بارہ میں فریب کار شیطان تمھیں دھوکہ دینے پائے

اور پھر یہی وہ خطرناک پہلوان زخارفِ ارضی کا ہے جس کی وجہ سے انھیں قرآن میں جگہ جگہ "فتنہ" کہا گیا ہے، اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (تغابن - ۲) وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (انفال - ۳) "فتنہ" قرآنی اصطلاح میں ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جن میں خیر و شر دونوں پہلو موجود ہوتے ہیں۔ اگر انسان ان کے حدود پہچان کر ان کا صحیح استعمال اور استفادہ کرے تو وہ اس کے لیے سراپا خیر ثابت ہوتی ہیں لیکن اگر اس نے اس امتیاز اور استعمال میں غلطی کی تو یہی چیزیں اس کے حق میں شر بن جاتی ہیں، اور انسان اپنی آزمائش میں ناکام ہو کر معتوبِ الٰہی قرار پاتا ہے، اور دنیا کی یہ ساری نعمتیں اس کے لیے دشمن ثابت ہوتی ہیں۔ اسی نقطۂ نظر سے انھیں انسان کا "عدو" بھی کہا گیا ہے یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ (تغابن - ۲) یعنی اے ایمان والو تمھاری بیویوں اور بچوں ہی میں سے تمھارے دشمن ہیں پس ان کی محبت کے فتنوں سے بچتے رہو۔ کیونکہ انسان کے راہ قسط و عدل سے ہٹنے کا سب سے بڑا واحد سبب یہی عشقِ مال اور حبِّ عیال ہی تو ہے جو انسان کو ادائے فرض سے روکتا ہے۔

یہیں سے عملاً کافر اور مومن کا امتیاز شروع ہوتا ہے۔ کافر، مشرک اور ملحد انھیں چیزوں میں اپنے کو گم کر دیتے ہیں۔ یہ دنیا اور اس کے علائق ان کی روح کو، ان کے قلب کو، ان کے دماغ کو اپنی اسیری میں اس طرح لے لیتے ہیں کہ وہ انھیں کو حاصلِ زندگی اور منتہائے حیات سمجھنے لگتے ہیں، یعنی تفاوت کے اس درجۂ کمال

پر پہنچ جاتے ہیں جسے قرآن بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا سے تعبیر کرتا ہے۔ اور ان کے برعکس مومن اس متاعِ ارضی کو اپنے دل و دماغ کا معبود نہیں بناتا۔ وہ ان سے ایک فطری رغبت تو ضرور رکھتا ہے مگر یہ رغبت اس کو اصل مقصدِ حیات سے بے گانہ نہیں کر سکتی۔ جہاں متاعِ دنیا نے معبودیت کا مطالبہ کیا اور مومن کے لیے وہ عدو ؑ کے حکم میں ہو گئی۔ پھر مومن کا فرض ہو جاتا ہے کہ اپنے ہاتھ سے اس "عدو" کے حلق پر چھری پھیر دے، خواہ یہ چھری اس رغبت کے ساتھ ساتھ خود اس کے دل کے ٹکڑے ہی کیوں نہ کر ڈالے۔ بیٹے سے بڑھ کر اس آسمان کے نیچے اور کون سی چیز محبوب بنائی گئی ہے؟ لیکن جب ایسی محبوب ترین متاع کو طوفان کی موجیں نگلنے کے لیے لپکتی ہیں اور وقت کا سب سے بڑا خدا پرست انسان باوجود پیغمبرانہ عزیمت کے پدرانہ محبت سے مغلوب ہو کر بیتابانہ بیٹے کو پکارتا ہے کہ یٰبُنَیَّ ارْکَبْ مَّعَنَا اور کبھی آسمان کی طرف مترحم نگاہیں اٹھا کر کہتا ہے کہ یٰرَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَھْلِیْ تو معلوم ہے کہ خدا کی بے نیاز عدالت سے اس درخواست کا کیا جواب ملتا ہے؟ عقیدت اور ممتا کی اس فطری کشمکش پر پیغمبر کو کن لفظوں میں تنبیہ ہوتی ہے؟ صدا آتی ہے کہ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّیْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ (ھود۔۴) اے نوحؑ! بیٹے کے ساتھ تمہاری شیفتگی مسلّم مگر یہ حق و باطل کے امتیاز کا وقت ہے، اس وقت تمہارے بشری جذبات کا اقتضا کوئی چیز نہیں۔ خبردار جذبات کے طوفان میں تمہارے پائے ثبات و استقامت کو لغزش نہ ہونے پائے اِنِّیْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ۔ حق کی راہ میں جو محبت حائل ہو اس کو دل میں رکھنا جاہلوں کا کام ہے، ایمان کی آزمائش گاہ میں ناکام ہونے والوں کی راہ ہے۔ اس وقت بیٹے کی محبت ایک خطرناک فتنہ کی شکل میں تمہارے سامنے آئی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو اپنے پیروں سے کچل کر رکھ دو۔ حق پرستی کا دشمن ہو کر تمہارا بیٹا، تمہارا لختِ جگر ہونے کے باوجود، تمہاری کسی محبت اور سفارش کا مستحق نہیں، حتیٰ کہ وہ اب تمہارا بیٹا بھی نہیں کہا جا سکتا، لہٰذا تم اپنے اس جگر کے ٹکڑے کو نہنگِ اجل کے منہ میں جانے دو۔

اسوۂ ابراہیمی کو لیجیے۔ باپ سے بڑھ کر مخلصانہ ہمدردی اور تعظیم کا مستحق کون ہے؟ لیکن جب توحید پرست بیٹے کو یقین ہو جاتا ہے کہ باپ کی سیاہ فطرت پر شعاعِ حق کا انعکاس ناممکن ہے تو وہ نہ صرف اس سے ترکِ موالات کرتا ہے بلکہ اس کے لیے ہدایت اور مغفرت کی تمنا بھی اپنے اوپر حرام کر لیتا ہے۔ اور باپ بیٹے جیسا گہرا فطری (لیکن مادّی) تعلق ایک منٹ کے لیے بھی اس کے ارادہ میں تزلزل نہیں پیدا کرتا۔

اور قریب آئیے، اسوۂ فاروقی پر نگاہ ڈالیے کہ اس سراپائے ایمان کی سیرت بجائے خود حقیقتِ اسلام کی ایک مکمل اور خالص تصویر ہے۔ بدر کے میدان سے اسیرانِ جنگ گرفتار ہو کر آتے ہیں۔ دربارِ نبوت میں معاملہ پیش ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ کیا کیا جائے۔ سب سے پہلے سیدنا عمرؓ کی آواز آتی ہے کہ یا رسول اللہ میں جانتا ہوں کہ ہمارے سامنے یہ سب ہمارے اپنے ہی دست و بازو بلکہ دل و جگر پارۂ جگر کھڑے ہیں لیکن ہیں یہ سب کے سب حق کے دشمن اور توحید سے برگشتہ۔ لہٰذا حکم دیجیے کہ ہم میں ہر ایک خود اپنے قریبی عزیز کی گردن مارے کیونکہ ہمارے ان سے الگ ہی اور مادّی تعلقات ہیں۔ مگر ایمان کے دشمن کی نہ صلۂ رحمی اور ان کی محبت ہی، رعایت کی مستحق نہیں۔ اس مشورہ پر خواہ عمل نہ ہوا ہو لیکن اس معاملہ کے متعلق حاکمِ اعلیٰ کا جو فیصلہ آیا، اس کی روشنی میں کون ہے جو اس مشورہ کی ایمان نوازی اور حمیت و عظمت کا منکر ہو سکے۔

اسلام اور ایمان کے ضابطہ میں مادّی تعلقات اور بشری جذبات کی قدر اور رعایت جو کچھ ہے بس اتنی ہے۔ اس کے آگے اسلام کی سرحد ختم اور کفر کی مملکت اور اس کا آئین شروع ہو جاتا ہے جہاں یہی دنیا اور اسی دنیا کی لگاوٹیں ہی سب کچھ ہیں۔ ان حدود میں رہنے والے خدا کے پیدا کیے ہوئے ان تمام فتنوں کے سامنے سر جھکائے ان کی پرستش میں دن رات مشغول رہتے ہیں اور دیدۂ عبرت رکھنے والوں کو دکھاتے رہتے ہیں کہ دنیا کے تعلقات اپنی جائز حد سے گذرنے کے بعد کس طرح انسان کے دشمن بن جاتے ہیں اور اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ

کی شکل کیا ہوتی ہے۔

خدا کی سنت یہی ہے کہ وہ انھیں فتنوں کے ذریعے اپنے فرمانبردار بندوں اور سرکش و نافرمان باغیوں کو الگ کیا کرتا ہے، اور کسی فرد یا جماعت کو اس وقت تک اپنی مقبولیت کا شرف نہیں بخشتا جب تک کہ وہ فتنوں کی اس بھٹی میں تپا کر جانچ نہ لیے جائیں، اور آزمائشوں سے یہ بات کھل نہ جائے کہ کھرا کون ہے جو اپنے اصلی مقصدِ آفرینش کو یاد رکھتا اور دنیا کے سارے علائق پر اسے ترجیح دیتا ہے، اور کھوٹا کون ہے جو دنیا کے عشق میں سرشار ہو کر اپنے منتہا سے غافل ہو بیٹھا ہے۔ اسی بات کو یوں فرمایا گیا ہے کہ:-

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (عنکبوت - ۱)

کیا لوگوں کو گمان ہے کہ وہ صرف اتنا کہنے پر کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، چھوڑ دیے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہ ہوگی؟

یعنی "فتنہ" اور آزمائش کی راہ سے بہرحال گذرنا ہوگا تاکہ معلوم ہو جائے کہ کون مال و اولاد، اعزہ و اقارب اور گھر بار کے رشتوں کو اپنی فطری حد میں رکھ کر اللہ کے تعلق کو سب پر بالا و برتر رکھتا ہے، اور کون ایسے فریب کار ہیں جو نام تو توحید کا لیتے ہیں لیکن ان کے قلوب انھیں دنیوی رشتوں کی مضبوط گرفت میں جکڑے ہوئے ہیں، اور ضرورت کے وقت اس گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:-

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۔ (بقرہ - ۱۹)

اور ہم تمھیں کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جان اور پیداوار کی کمی سے ضرور آزمائیں گے اور اے پیغمبر ان مصائب پر صبر کرنے والوں اور ہماری آزمائش میں پورا اترنے والوں کو فلاح کی خوشخبری سناؤ۔

اس آیت اور پہلی آیت (زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ) دونوں کو ایک دوسری کی روشنی میں دیکھیے تو صاف نظر آتا ہے کہ جن چیزوں کی محبت انسانی سرشت میں رکھی گئی ہے انہی میں انسان کی اخلاقی طاقت کے لیے آزمائش بھی رکھ دی گئی ہے اور یہی آزمائش وہ فیصلہ کن چیز ہے جس سے خدا پرست اور دنیا پرست ممیز ہوتا ہے۔ سارے مادی علائق دنیوی رشتے، اور بشری جذبے اسی امتحان کے لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ انسانوں میں سے کون اتنا بودا اور کمزور ہے کہ ان کا

بندہ اور پرستار بن کر خدا کی محبت کو ان کی محبت پر سے قربان کر دیتا ہے، اور کس میں اتنی طاقت ہے کہ ان سب چیزوں کو اپنے لیے اور اپنے آپ کو خدا کے لیے سمجھے اور آزمائش کے وقت ہر ایک چیز کو خدا کی خوشنودی کے لیے قربان کر سکے۔ اسی لیے مومن کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ اس کی جان اور مال یعنی اس کی پوری دنیا خدا کے ہاتھوں بکی ہوئی ہے اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ (توبہ-۱۴) اور اگر کوئی مدعی ایمان اس ذوقِ تسلیم و رضا سے آشنا نہیں تو وہ نیکی اور تقویٰ کا مقام رفیع ہرگز نہیں پا سکتا لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران-۱۰) گویا اسلام نام ہی ہے قربانی کا یعنی جان اور مال کی قربانی کا، مرغوباتِ نفس اور لذاتِ زندگی کی قربانی کا، مودّتِ قربیٰ اور حبِ وطن کی قربانی کا اور ان تمام دنیوی تعلقات اور مادّی رغائب کی قربانی کا جن کی کشش اور محبت خالقِ کائنات کی طرف سے انسانی سرشت میں سمو دی گئی ہے، وہی کشش اور محبت جس کے وجود کا اعتراف آیت زُیِّنَ لِلنَّاسِ الخ میں کیا گیا ہے۔

اب ان ساری تفصیلات کے بعد سوال پیدا ہوگا کہ آخر یہ تمام چیزیں، جن کی قربانی کا نام ہی قرآن کی اصطلاح میں اسلام ہے، کس چیز پر قربان کی جانی چاہئیں؟ بالفاظ دیگر انسان کا وہ "منتہائے حیات" اور "اصل مقصدِ زندگی" کیا ہے جس کے مقابل دنیا کی بڑی سے بڑی متاعِ محبوب ناقابلِ التفات اور فراموش ہو جانی چاہیے؟ اس کا جواب قرآن یہ دیتا ہے:-

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ	اے پیغمبر مسلمانوں سے کہہ دو کہ اگر تمھارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں
وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِیْرَتُكُمْ	اور تمھارا خاندان اور تمھارا کمایا ہوا مال، اور تمھاری تجارت
وَاَمْوَالُ ِۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ	جس کے مندا پڑ جانے کا تمھیں ڈرا اندیشہ رہتا ہے، اور تمھارے دل پسند
كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَیْكُمْ	مکانات، یہ ساری متاعِ دنیوی تمھارے نزدیک خدا اور اس کے
مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ	رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں

فَتَرَبَّصُوا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (التوبہ ۔ ۳)

تو انتظار کرو یہاں تک کہ خدا اپنا حکم اور فیصلہ صادر کردے اور اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

غور فرمائیے۔ پھر انھیں متاع ہائے ارضی کا ذکر ہے جنھیں گذشتہ آیات میں انسان کی مرغوب خاطر ظاہر کیا گیا تھا۔ یہاں بھی ان اشیا سے انسان کی فطری دلبستگی کا نہ انکار کیا گیا ہے اور نہ اسے مذموم اور مخالف ایمان قرار دیا گیا ہے، بلکہ اثبات اس کا وجود بطور حقیقت مسلمہ کے تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ مطالبہ یہ کیا گیا ہے کہ عشق و طلب اور محبت کا اصلی منتہا صرف ذات خداوندی ہے جب تک دنیا کی محبتیں خدا کے اس حق پر اثر انداز نہیں ہوتیں، انسان ان سے تعلق رکھنے میں حق بجانب ہے، اس پر کوئی گرفت اور الزام نہیں لیکن جب مال و دولت، یہ فرزند و زن، یہ خویش و اقارب، یہ نسل و خاندان، یہ دیار و وطن اور یہ سب سامان زندگی انسان کے لیے قفس روح اور زنجیر پا بن جائیں اور محبوب حقیقی کی طلب و دعوت پر اسے حاضر نہ ہونے دیں تو ان سب چیزوں کی محبت حرام ہو جاتی ہے اور یہ حرام محبت کفر کا سرچشمہ ہے، جس طرح خدا کی طلب میں اس محبت کو قربان کر دینا اسلام کا سرچشمہ ہے۔

خدا کی محبت اور عشق ایک باطنی کیفیت کا نام ہے اور اس کی خارجی تفسیر یا اس کا مظہر عبادت ہے، یعنی دائماً خدا کی خوشنودی کے مطابق عمل کرنا۔ اس شے کو آپ ایمان سے اور اس کے مظہر کو اسلام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہی ایمان، انسانی ضابطۂ حیات کی تشکیل میں اساس کی حیثیت رکھتا ہے اور اس اساس پر جو عمارت کھڑی ہوتی ہے، اسی کا نام اسلام ہے۔ گذشتہ آیات میں جس چیز کے لیے دنیا اور اس کے تعلقات کی قربانی کا ذکر ہے وہ یہی "اساس" اور یہی "عمارت" ہے۔ قرآن دنیا کی محبوب سے محبوب چیز کو بھی یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اس عمارت کی صحیح تعمیر میں خلل انداز ہو اور اس کی وجہ سے اس میں رخنے پڑیں۔ وہ اسے تو تسلیم کرتا ہے کہ دنیا اور اس کی ساری متاع سے انسان تعلق رکھے اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو، اور تسلیم کیا معنی وہ تو اس پر زور دیتا ہے مگر ساتھ ہی اس کا یہ بھی مطالبہ ہے

کہ جب کبھی ایمان اور اسلام کے مصالح سے اس دنیا کے کسی بڑے سے بڑے تعلق کے مصالح متصادم ہوں تو انسان کو اس کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ ایسے تعلق کو نہایت صبر و سکون کے ساتھ توڑ دے خواہ وہ موجودہ تہذیب کا "صنم اکبر" ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ یہ دنیا انسان کے برتنے کے لیے بنائی گئی ہے نہ کہ پوجنے کے لیے۔ خادم بنائی گئی ہے نہ کہ آقا۔ تابع اور مسخر بنائی گئی ہے نہ کہ الٰہ اور معبود۔ الدنیا خُلِقت لکم وانتم خلقتم للاٰخرۃ۔

مادی تعلقات اور بشری جذبات کے متعلق قرآن کا اجمالی طور پر یہی اصولی نظریہ ہے۔ آئندہ ہم اسی اصل کی روشنی میں مخصوص طور پر وطنیت کے متعلق اسلام کے نقطۂ نظر کی وضاحت کریں گے۔

(باقی)

تنزیل و تاویل

امثال القرآن

(۲)

از جناب مولوی محمد ایوب صاحب جیراجپوری

(۶) کفار کے اعمال کا، اور ان امیدوں کا جو انھوں نے اپنے اعمال کے نتیجہ سے وابستہ کر رکھی ہیں، کیا حشر ہوگا؟ قرآن ایک تمثیل کے پیرایہ میں اس کی توضیح یوں کرتا ہے :۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللَّهَ عِندَهُ فَوَفَّاهُ حِسَابَهُ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ سَحَابٌ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ (نور ۔ ۵)

اور کافروں کے اعمال کی حقیقت چٹیل میدان کی اس چمکتی ہوئی ریت کی سی ہے جسے پیاسا دور سے دیکھ کر پانی خیال کرتا ہے یہاں تک کہ جب اس کے قریب آیا تو کچھ نہ پایا۔ البتہ اس نے اللہ کو وہاں موجود پایا جس نے اس کا حساب چکا دیا اور اللہ پل بھر میں حساب لے لینے والا ہے۔ یا ان کے اعمال کی مثال ان تہ بہ تہ تاریکیوں کی سی ہے جو ایک ایسے اتھاہ سمندر میں ہیں جسے موج نے ڈھانک رکھا ہو، پھر اس موج کے اوپر بھی موج ہو اور اس کے اوپر بھی بادل چھایا ہو۔ غرض ایک کے اوپر ایک کئی تاریکیاں جمع ہیں کہ اگر کوئی آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھ پائے۔ اور جسے اللہ ہی روشنی (ہدایت) نہ دے

اسے کہیں سے بھی روشنی نہیں مل سکتی۔

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے بارے میں دو مثلیں بیان فرمائی ہیں، ایک دور سے چمکتی ہوئی ریت کی۔ دوسری تہ بہ تہ تاریکیوں کی۔ اس لیے کہ حق و ہدایت سے اعراض کرنے والے دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں:

ایک تو وہ لوگ ہیں جنھیں اپنے اوہام و خرافات کی بابت یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ بے بنیاد نہیں ہیں بلکہ کوئی نہ کوئی بنیاد رکھتے ہیں لیکن جب حقیقت بے نقاب ہوتی ہے تو ان کے گمان کی اصلیت آشکارا ہو جاتی ہے اور خیالات و اوہام کا تار پود بکھر جاتا ہے۔ جاہل بدعتیوں اور ہوا پرستوں کا یہی حال ہو کہ یہ لوگ اپنے اہواء و آراء کو علم و بصیرت اور رشد و ہدایت سمجھے رہتے ہیں، لیکن جب اصل حقائق ان کے سامنے آتے ہیں اس وقت ان پر ان کے ظن بے بنیاد کا راز کھلتا ہے اور واضح ہوتا ہے کہ ان کے عقائد اور ان کے اعمال کی یہ عمارت جو ان بے اصل عقائد کی بنیاد پر کھڑی ہے، ایسی ہی ہے جیسے چٹیل میدان کی چمکتی ہوئی ریت، جو دور سے دیکھنے والوں کی نگاہوں میں پانی نظر آتی ہے اور حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ یہی کیفیت اور یہی انجام ہے اُن اعمال کا جو نہ اللہ کے لیے کیے گئے ہیں نہ احکام الٰہی کے اتباع میں، ان اعمال کو صاحب عمل نجات اور سود و بہبود کا ذریعہ سمجھتا ہے حالانکہ اس غلط توقع کا انجام حسرت کے سوا کچھ نہیں۔ یہی وہ اعمال ہیں جن کی بابت حتمی وعدہ بلکہ فیصلہ ہے کہ وَقَدِمْنَا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَّنثُورًا۔

تشبیہ کی بلاغت پر غور کرو! اللہ تعالیٰ نے سراب کے ساتھ "بِقِيعَةٍ" کی قید بھی لگائی ہے۔ قیعہ اس چٹیل میدان کو کہتے ہیں جہاں حیوانی اور نباتی وجود کا نام و نشان تک نہ ہو، یعنی محل سراب اس سنسان صحرا کو بتایا جو بالکل بے آب و گیاہ اور ہر غیر جمادی وجود سے خالی ہو؛ اور خود سراب ایک ایسی شے ہے جو بالکل بے حقیقت و بے اصل ہے۔ اب ان کے اعمال اور قلوب کو، جہاں ایمان و ہدایت کی کسی کرن کا گذر ممکن نہیں، سراب اور اس کے مذکورہ بالا موقع و محل سے مطابقت دو کیسی چول سے چول بیٹھ جاتی ہے۔ جس طرح اس محل سراب میں کسی چیز کا وجود نہیں اسی طرح ان کے دلوں میں آفتاب ہدایت کی کرنوں کا گذر نہیں، اور جس طرح

سراب کی کوئی حقیقت نہیں اسی طرح ان کے اعمال بھی فریب محض ہیں جن سے انھیں توقعات تو بہت ہیں مگر وقت پر ان کے لیے سراب کی طرح معدوم الحقیقت ثابت ہوں گے۔

پھر "یحسبہ الظمان ماءً" کی قید مزید پر غور کرو۔ "ظمان" اس شخص کو کہتے ہیں جو سخت پیاسا ہو۔ ایسا شخص پیاس کی شدت سے بیتاب ہو کر چمکتی ہوئی ریت کو پانی سمجھ کر پاس آتا ہے اور وہاں کچھ نہیں پاتا بلکہ تشنگی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کفار کا یہی حال ہوگا ان کے اعمال غیر اللہ کے لیے ہونے اور اطاعت رسول پر مبنی نہ ہونے کی وجہ سے بالکل سراب کے مشابہ ہیں۔ جس طرح پیاسا آدمی چمکتی ہوئی ریت کی طرف، پانی سمجھ کر لپکتا ہے اور ناکہانی یاس و حسرت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا اسی طرح میدان حشر میں کفار نہایت احتیاج کی حالت میں، بڑی امیدوں کے ساتھ اپنے اعمال کی طرف بڑھیں گے لیکن اعمال کا کہیں نام و نشان نہ ہوگا البتہ خدا موجود ملے گا اور ان کا حساب چکا دے گا۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ باری تعالی کی (قیامت کے دن) تجلی کا ذکر کرتے ہوئے آنحضرت صلعم نے فرمایا:۔

"پھر جہنم لا کر پیش کی جائے گی جس کی شکل بالکل سراب کی سی ہوگی۔ اور یہود سے سوال ہوگا کہ تم نے کس کی عبادت کی؟ کہیں گے خدا کے بیٹے عزیر کی، کہا جائے گا تم جھوٹے ہو، خدا کے نہ بیوی تھی نہ بیٹا۔ اچھا اب کیا چاہتے ہو؟ کہیں گے، پانی پینا۔ کہا جائے گا جاؤ پیو۔ چنانچہ وہ جہنم کی طرف ٹوٹ پڑیں گے۔ پھر نصاریٰ سے خطاب ہوگا، تم نے کس کو پوجا؟ جواب دیں گے مسیح خدا کے بیٹے کو۔ کہا جائے گا تم جھوٹ بکتے ہو، خدا بیوی، بیٹے والا کب تھا۔ کہو اب کیا چاہتے ہو؟ کہیں گے سیراب ہونا۔ حکم ہوگا جاؤ پیو۔ سو وہ بھی دوزخ میں گرے جا رہے ہوں گے الخ"

ہر باطل پرست کا یہی حال ہوگا یعنی باطل اس کے ساتھ اس وقت دغا کرے گا جبکہ اسے مدد کی سخت ضرورت ہوگی کیونکہ باطل کی کوئی اصلیت نہیں ہوتی، اس کا مسمّٰی بھی ویسا ہی باطل ہوتا ہے جیسا کہ اس کا اسم۔ پس جب اعتقاد میں حق کی مطابقت نہ پائی جائے گی تو اس سے جو چیز متعلق ہوگی وہ بھی باطل ہوگی۔ اسی طرح عمل کی غرض و غایت اگر باطل ہو

مثلاً عمل خالصۃً لوجہ اللہ نہ ہو یا احکام الٰہی پر مبنی نہ ہو، تو وہ باطل ہوگا اور عمل کرنے والا اپنی توقع کے خلاف اس کی بدولت مضرت سے دوچار ہوگا۔ نیز اس کے اعتقاد و عمل کی طرف سے غفلت نہ ہوگی کہ مالہ وما علیہ کا فرق و امتیاز کیے بغیر فیصلہ ہو جائے بلکہ اسے نفع سے محروم رہنا اور مضرت و عذاب کا مزہ چکھنا ہوگا۔ وَوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۔

یہ اس گم کردہ راہ جماعت کی تصویر و تمثیل تھی جس نے غلط گمان کی وجہ سے اپنے آپ کو ہدایت اور راہ راست پر سمجھا تھا۔ اب منکرین حق کی دوسری قسم کو لو جس کے حالات کی تشبیہ ظلماتِ بحر سے دی گئی ہے۔ یہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو حق اور رشد و ہدایت کو جان پہچان کر ترک کر دیتے اور باطل ہی کی تاریکیوں کو اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔ ان لوگوں پر ایک دو نہیں کئی طرح کی تاریکیاں چھا جاتی ہیں۔ ایک طرف سے فطرت کی ظلمت کا شکار ہوتے ہیں۔ دوسری طرف روح کی ظلمت کا۔ تیسری سمت سے جہل کی تاریکی مسلط ہوتی ہے (کیونکہ وہ اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتے، انجام کار جہل کا زنگ ان پر بیٹھ جاتا ہے) اور چوتھی طرف اتباع ہوا کی۔ ان تہ بہ تہ ظلمتوں میں گھر جانے کے بعد ان کا حال بالکل اس شخص کے مشابہ ہو جاتا ہے جو ایک ایسے دریائے ناپیدا کنار میں جا پہنچا ہو جس میں لہروں پر لہریں اٹھ رہی ہوں اور ساتھ ہی اوپر سے سیاہ بادلوں کی تاریکی بھی اس پر چھائی ہوئی ہو یعنی اس پر تین طرح کی تاریکیاں بیک وقت چھائی ہوئی ہوں، دریا کی تاریکی، موجوں کی تاریکی، اور بادل کی تاریکی۔ غور کرو، انھیں تاریکیوں کے مشابہ کفار کے قلوب کی تاریکیاں بھی ہیں۔ فطرت کی تاریکی، روح کی تاریکی، اور دماغ کی تاریکی۔

سراب (جسے دور سے پانی یعنی مادۂ حیات سمجھا گیا) اور ظلمات (جو نور کی ضد ہے) کی یہ دونوں مثلیں اُن دونوں (ناری و مائی) مثلوں کے مشابہ ہیں جو منافقین اور مومنین کے بارے میں اوپر بیان کی جا چکی ہیں اور جن میں مومنین کا حصہ "زندگی" اور "نور" دکھایا گیا ہے اور منافقین کا حصہ ان کے برعکس ظلمت اور موت کی ہولناکی بتائی گئی ہے۔ یہی حالت منکرین و منافقین کی زیر بحث مثلوں میں بھی بیان ہوئی ہے کہ پانی کی تلاش میں انھیں سراب ملا جو دھوکے سے پانی نظر آرہا تھا اور جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی، اسی طرح نور کے بجائے ظلمت،

جو ایک طرح کی روحانی موت ہے، ان کے مقدر میں نکلی۔

ہوسکتا ہے کہ اس تمثیل میں بحیثیت مجموعی کفار کی تمام جماعتوں کی حالت کی طرف اشارہ ہو اور ان سب کی اس مشترک بدبختی کا اظہار مقصود ہو کہ انھوں نے وحی الٰہی کی طرف اعتنا اور توجہ نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "روح حیات" اور "نور" سے محروم ہوگئے (کیونکہ قرآن وحی کو روح اور نور سے تعبیر کرتا ہے) اس صورت میں یہ دونوں مثلیں ایک ہی موصوف کی دو صفتیں ہوں گی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کفار کے مختلف گروہوں کا الگ الگ حال بیان کرنا مقصود ہو۔ اس صورت میں پہلی مثل ان لوگوں سے متعلق ہوگی جنھوں نے علم و بصیرت کی روشنی کے بجائے محض ظن اور جہل اور اپنے اسلاف کے حسن ظن پر اپنے اعمال کی بنا رکھی، اور آخر دم تک یہ سمجھتے رہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں نہایت ہی بہتر کر رہے ہیں یعنی گمرہی کے باوجود انھیں اپنے حسن عمل کا پورا یقین تھا۔ اور دوسری مثل اس جماعت کے بارے میں ہوگی جس نے ہدایت کو چھوڑ کر ضلالت اختیار کی اور حق وصداقت پر باطل کو ترجیح دی اور حق اور ہدایت کا چہرہ دیکھنے کے بعد اندھے بنے یعنی حق کو پہچان کر انکار کی شقاوت میں مبتلا ہوئے۔ دونوں گروہوں کا فرق ظاہر ہے۔ پہلا گروہ ضالین کا ہے اور دوسرا مغضوب علیہم کا۔ اور ان دونوں گروہوں کا حال اس منعَم علیہ گروہ کے حال سے بالکل مختلف بلکہ مقابل ہے جس کا ذکر آیۃ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ میں کیا گیا ہے۔ اس پورے سلسلے کو سامنے رکھو تو معلوم ہوگا کہ ان آیات میں تینوں جماعتوں کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں، ایک تو وہ گروہ ہے جس کے لیے نور کی مثل بیان کی گئی ہے۔ دوسری جماعت ضالین کی ہے جو ضلالت کی تاریکیوں میں ٹھوکر کھاتی رہی، جس کے لیے سراب کی مثال دی گئی ہے۔ اور تیسری جماعت مغضوب علیہم کی ہے جس پر خدا کی پھٹکار اور غضب کی لعنت پڑی۔ "اَوْکَظُلُمٰتٍ" میں انھیں کی تصویر کھینچی گئی ہے مختصر لفظوں میں ان تینوں گروہوں کا نام، اہلِ نور، اہل سراب، اور اہل ظلمات رکھا جاسکتا ہے۔ پس ان دونوں مثالوں میں پہلی مثل ارباب عمل باطل کی ہے جنھوں نے عمل باطل کا (نفع اور فائدہ سے بالکل خالی) ذخیرہ جمع کیا۔ اور دوسری اُن اصحاب علم باطل کی ہے جنھوں نے علم حق کو چھوڑ کر غلط اعتقاد اور فاسد اور غیر نافع علم اختیار کیا۔

اور یہ دونوں چیزیں، باطل عمل اور باطل علم، دین حق سے فطری تضاد رکھتی ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فریق ثانی کے شکوک و شبہات اور علوم فاسدہ سے گھرے ہوئے دلوں کی تشبیہ اس دریا کی متلاطم حالت سے دی ہے جس میں موجیں اُٹھ رہی ہوں اور تہ بتہ بادلوں کی تاریکی بھی اوپر سے مسلط ہو کیونکہ بعینہٖ یہی تصویر ان تاریک اور مضطرب دلوں کی ہیئت نفسی کی ہوتی ہے جن کے اندر شکوک و شبہات کے دریا موجزن ہوتے ہیں، اور جن پر دانستہ گمراہی، ہوا پرستی اور باطل کا سیاہ ابر بھی محیط ہوتا ہے۔ اگر علم و بصیرت کے ساتھ ان دونوں مثالوں پر اور کفار کی ہیئتِ نفسانیہ سے ان کے کمال تطابق پر غور کیا جائے تو فطرتِ انسانی قرآن کی عظمت و جلالت کے سامنے سر اعتراف جھکا دے گی اور اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ اسی ذاتِ واحد کا کلام ہو سکتا ہے جو ہر طرح کی ستائشوں اور تعریفوں کی تنہا مستحق اور تمام حِکَم و اسرار فطرت کی تنہا راز داں ہے۔

(۷) کفر کے ناممکن العلاج مریضوں کی حالت کی مثال :۔

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ	یا تم خیال کرتے ہو کہ ان میں اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں؟ نہیں،
اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ	یہ تو بالکل چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی
هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا۔ (فرقان ۱۴)	گئے گذرے۔

اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر نسل انسانی کے کج فطرت طبقہ کی تشبیہ چوپایوں سے دی ہے۔ وجہ مشابہت ہدایت کا عدم قبول ہے جس میں دونوں گروہ یکساں طور پر شریک ہیں۔ یہ لوگ باطنی تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں اور فہم و ادراک کی صلاحیت فنا کر کے جہل کے قالب میں ایسے ڈھل گئے ہیں کہ گویا حیوانات کی طرح انہیں سرے سے عقل و ہوش اور بصیرتِ قلب کی استعداد حاصل ہی نہیں ہوئی۔ پھر اس تشبیہ کے بعد قرآن نے ان لوگوں کو جانوروں سے بھی زیادہ جادہ فراموش اور شاہراہ ہدایت سے دور بتایا ہے، کیونکہ بہائم و انعام اگرچہ ایک بے عقل و خرد مخلوق ہیں لیکن پھر بھی چرواہے کی رہنمائی کے ذریعہ صحیح راہ انھیں مل بھی جاتی ہے، جسے وہ اختیار کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے اور نہ زیادہ تر دُئیں بائیں کترانے کی کوشش کرتے

ہیں لیکن حضرتِ انسان کو دیکھو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ان کو حق و معرفت کی تلقین کرتے، ہدایت کی راہ سمجھاتے اور نجات کی طرف دعوت دیتے ہیں تو ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی اور اس دعوت کو قبول کرنے کے بجائے الٹے اس کے دشمن بن جاتے ہیں، اور اپنے نفع نقصان تک کی تمیز روا نہیں رکھتے کہ جو چیز ان کی نوع (انسانیت) کے لیے مفید ہو اسے اختیار کریں اور جو چیز اس کے لیے مہلک ہو اسے ترک کر دیں لیکن حیوان پھر بھی باایں ہمہ حیوانیت اپنے بھلے برے کی تمیز کرتا ہے، مضر نباتات اور مہلک پودوں کے کھانے اور خطرناک راستوں پر چلنے سے پوری طرح اجتناب کرتا ہے، حالانکہ خداوند عالم نے اس کو قلب ایسا دیا ہے جس میں فہم و بصیرت کی روشنی مفقود ہے اور زبان ایسی دی ہے کہ نطق و گویائی سے قطعاً محروم۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ان تمام نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہے جو ان کے لیے ہر قدم پر دلیل راہ بن سکتی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اُن سے فائدہ اٹھانے اور ہدایت و معرفت کی سعادت حاصل کرنے سے محروم ہی رہے، اور عقل کی روشنی، قلب کی بصیرت، زبان کی گویائی، کان کی سماعت اور آنکھ کی بصارت رکھتے ہوئے بھی انھوں نے ان تمام آلاتِ تمیز سے حق و باطل کی راہیں متعین کرنے اور کھرے کھوٹے کو پہچان لینے میں کام نہ لیا۔ پھر وہ حیوانات سے بھی زیادہ گمراہ اور "اضل" کیوں نہ ہوں کیونکہ جو ہاتھوں میں چراغ رکھتا ہو اور اس کے باوجود گڑھے میں جا گرے وہ اس شخص کی بہ نسبت بہت زیادہ قابلِ ملامت ہے جو بغیر چراغ کے ٹھوکر کھائے۔

(۸) شرک کی نامعقولیت:-

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔ (روم - ۴)

اللہ تمھارے سامنے خود تمھارے اپنے ہی حال سے ایک مثال بیان کرتا ہے۔ جن غلاموں کے تم مالک ہو کیا ان میں سے کوئی بھی اس روزی میں، جو ہم نے تم کو دے رکھی ہے، تمھارا شریک ہے کہ تم اور وہ اس میں برابر کا حق رکھتے ہو، اور آپ بھی ویسا ہی اندیشہ رکھتے ہو جیسا اپنے (جیسے آزاد حق تصرف رکھنے والوں) سے؟ ایسا ہی

ہم سمجھنے والوں کے لیے کھول کر نشانیاں بیان کرتے ہیں۔

آیتِ کریمہ میں جس دلیل سے اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے بے بنیاد مسلک کے خلاف استدلال کیا ہے اسے اصطلاح میں دلیل قیاس کہا جاتا ہے۔ استفہاماً ان کے غلاموں کو ان کا شریک و سہیم قرار دے کر ان کے خلاف ایسی حجت قائم کی ہے جس کی صحت کے وہ کلی طور پر ایسے معترف ہیں کہ ان کے دماغ میں کبھی اس کی غلطی کا وہم بھی نہیں گذرتا اور یہ دلیل و حجت کا بہترین و بلیغ ترین اسلوب ہے کہ مخالف پر خود اسی کے مسلمات اور بدیہی کلیات سے حجت قائم کی جائے۔ اللہ تعالیٰ ان نادان انسانوں سے خطاب کر کے فرماتا ہے کہ تمہارے یہ غلام اور لونڈیاں جو تمہارے دستِ تصرف میں ہیں کیا یہ تمہارے مال و متاع میں شریک ہیں؟ کیا اپنے ان ممالیک کے متعلق تم یہ تصور کر سکتے ہو کہ تمہاری جائداد میں یہ مساویانہ حصہ داری رکھتے ہیں؟ اور اس تصور کے تحت تمہارے دلوں میں کبھی یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ کبھی وہ تمہارے مال و متاع میں سے اپنا حصہ بٹائیں گے یا اپنے حصے سے زائد تمہارا حق بھی مار لیں گے جس طرح کہ ایک شریک دوسرے شریک سے عموماً خوف و بے اطمینانی محسوس کیا کرتا ہے؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے "تَخَافُونَهُمْ كَخِيفَتِكُمْ" کی تاویل یہ فرمائی ہے کہ کیا تم کو ان غلاموں سے یہ اندیشہ اور خوف ہے کہ وہ تمہارے مال و اسباب کے وارث ہو جائیں گے جس طرح کہ تم میں سے بعض کو بعض کے ترکہ میں حق وراثت حاصل ہوتا ہے؟ بہرکیف آیت کا مقصد یہ ہے کہ تم میں سے کون ہے جو اس بات پر راضی ہوگا کہ اس کا غلام اس کے سرمایہ اور اہل و اولاد میں شریک ہوتی کہ اس کے برابر حق تصرف رکھے، اور اس حق تصرف کی وجہ سے لئے یہ اندیشہ لاحق ہو کہ کہیں وہ (غلام) موقع پاکر ساری ملکیت پر ہی نہ قابض ہو جائے، جیسا کہ برابر کے شرکاء میں یہ خطرہ ہر دم موجود رہتا ہے؟ اگر تم اس پر راضی نہیں اور نہ کبھی ایسی نامعقول بات تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو تو پھر وہی بات میرے لیے کیوں پسند کرتے ہو؟ اور میری مخلوقات کو، جو میرے حلقہ غلامی میں ہیں، کیونکر میرا ہمسر اور ہم پایہ قرار دیتے ہو؟ اور جبکہ غلام و آقا کی اس مساوات کے تخیل کو تمہاری عقل اور فطرت بداہتہً غلط سمجھتی ہے (حالانکہ تمہارے حق میں اس کا بہت کچھ امکان بھی ہے اس لیے کہ حقیقت کے اعتبار سے تو تمہارے

غلام تمہاری ملک کسی طرح نہیں ہیں، بلکہ درصل وہ تمہارے برابر کے بھائی ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہارے قبضۂ اقتدار میں دے رکھا ہے، اس لیے محض عرضی طور پر نہ کہ حقیقی طور پر دونوں کے مرتبے جداگانہ ہو گئے ہیں اور دونوں کو مجازاً "آقا" اور "غلام" کے الگ الگ نام مل گئے ہیں، ورنہ حقیقتاً تم اور تمہارے غلام دونوں کے دونوں ہی کسی اور ہی حقیقی آقا کے غلام اور بندے ہیں) تو میرے حق میں تمہارا ضمیر اسی تخیل کے تسلیم کرنے کی اجازت کیوں کر دیتا ہے حالانکہ یہ تمام کے تمام میرے ہی بندے، میری ہی ملکیت اور میری ہی مخلوق ہیں جن کو تم نے میرا ہم پایہ وہم مرتبہ اور شریک بنا رکھا ہے؟ یہ ہے تفصیل آیات، یعنی کَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ کا مطلب۔

(۹) ابطال شرک:۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا هَلْ يَسْتَوٗنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (نحل۔ ۱۰)

خدا نے ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک غلام ہے جو دوسرے کی ملک ہے کسی بات کا اختیار نہیں رکھتا۔ دوسرا شخص ہے (خود مختار) جس کو ہم نے اپنی سرکار سے اچھی روزی دے رکھی ہے تو وہ اس میں سے کچھ چھپا کر اور کچھ کھلے طور پر خرچ کرتا ہے کیا ایسے دو شخص برابر ہو سکتے ہیں؟ (یہ مثال سن کر مشرکین ضرور پکار اٹھیں گے "نہیں") الحمد للہ کہ اتنا تو سمجھے، لیکن ان میں بہتیرے ایسے بھی ہیں جو (اتنا بھی) سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اور خدا نے ایک دوسری مثل دو آدمیوں کی بیان فرمائی ان میں کا ایک گونگا (اور کسی کا غلام بھی) ہے جو کچھ نہیں کر سکتا (نیز) وہ اپنے آقا کا بار خاطر بھی ہے کہ جہاں کہیں اس کو بھیجو اس سے کچھ بھی ٹھیک نہیں بن آتا۔ کیا ایسا غلام اور وہ جو عدل کا حکم کرتا ہے اور خود بھی سیدھی راہ پر ہے، برابر ہو سکتے ہیں۔

ان آیات میں قرآن نے دو مثلیں بیان کی ہیں اور دونوں میں استدلال کا وہ طریقہ اختیار کیا ہے جسے اصطلاح میں قیاس عکس کہا جاتا ہے یعنی کسی شے سے علت حکم کی نفی کر کے اصل حکم کی نفی کرنا۔ کیونکہ قیاس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو قیاس عام جس میں ثبوت علت کی وجہ سے فرع میں اصل کا حکم لگایا جاتا ہے۔ دوسرا قیاس عکس جس میں

نفی علت کی وجہ سے فرع سے اصل کے حکم کی نفی کی جاتی ہے۔ یہاں اسی طرز استدلال سے زیر بحث مثلوں میں کام لیا گیا ہے۔
پہلی تمثیل اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت اور شان ملوکیت، اور بتوں کے عجز اور بیکسی کی دی ہے۔ اور بت پرستی کی نامعقولیت پر روشنی ڈالی ہے کہ دیکھو اللہ تعالیٰ، عالم کی تمام اشیا کا مالک کل اور ذرہ ذرہ کا فرمانروا ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے مخفی طور پر، اور کھلے بندوں شب و روز اپنے بندوں کو انواع و اقسام کی نعمتوں سے نوازتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بے حد و حساب دے ڈالتا ہے۔ اس کا خزانۂ رزق اتنا وسیع اور لامحدود ہے کہ شبانہ روز کی پیہم بخششوں اور فیاضیوں کے باوجود بھی کم ہونے والا نہیں۔ اس کے برعکس اصنام و اوثان ایک محکوم اور درماندہ مخلوق ہیں جن کو کسی چیز پر بھی قدرت و اختیار نہیں تو پھر مشرکین کو کیا ہوگیا ہے کہ اس عظیم الشان اور روشن از آفتاب فرق کے باوجود، کہ میں قادر مطلق ہوں اور یہ بت مجبور محض، میں مالک ہوں اور یہ مملوک، وہ کس طرح ان بے بس اور درماندہ مورتوں کو میرا شریک و ہمتا سمجھتے ہیں۔ اور مجھے چھوڑ کر ان کی پرستش کرتے ہیں۔

آیت کی یہ تاویل امام مجاہد وغیرہ نے کی ہے لیکن حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک دوسری تاویل بیان فرمائی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی اور معبودان باطل کی مثال نہیں دی ہے بلکہ مومن اور کافر کی دی ہے، اور بتایا ہے کہ صالح مومن کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اللہ کی طرف سے بہترین رزق سے نوازا گیا ہے جسے وہ اپنے مصارف میں بھی خرچ کرتا ہے اور دوسروں کی بھی، چھپکر اور برملا، ہر طریقہ سے حاجت روائی کرتا ہے۔ بخلاف اس کے خیر و صلاح سے عاری کافر کی مثال اس بیکس اور زیر اقتدار غلام کی سی ہے جو مجبور محض اور بالکل ہی قدرت و اختیار سے محروم ہے اور جو ایک حبہ بھی خرچ کرنے پر قادر نہیں۔ کیونکہ اس کے پاس کچھ ہے ہی نہیں۔ اس توضیح اور تفریق کے بعد سوال کرتا ہے کہ کیا کسی صاحب عقل کے نزدیک یہ دونوں یکساں اور ہم پلہ ہوسکتے ہیں؟

آیت کی یہ دو تاویلیں کی گئی ہیں لیکن پہلی تاویل زیادہ معنی خیز اور لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اصل مقصد یعنی ابطال شرک کے لیے یہ زیادہ مؤثر بھی ہے اور واضح بھی۔ اور نظم کلام بھی اسی کا مقتضی ہے، چنانچہ اس سے پہلے آیت وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

شَيْئًا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ہے جس میں شرک کی بے بنیادی ثابت کی گئی ہے۔ اور اس کے بعد ہی ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ الخ کی تمثیل بیان کی گئی ہے جس سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ یہ تمثیل آیت ما سبق کی توضیح ہے۔ ہاں اس مثل سے لازمی طور پر یہ مفہوم بھی خود بخود کھل جاتا ہے کہ توحید پر کامل اعتقاد رکھنے والے مومن کا حال اس شخص کا سا ہے جس کو بارگاہِ خداوندی سے رزق کا بہترین حصہ ملا ہو اور اس کو اس سے فائدہ اٹھانے کا پورا پورا اختیار حاصل ہو، اور کافر مشرک کی مثال اس زیر اقتدار اور مملوک غلام کی سی ہے جس کو کچھ بھی قدرت و اختیار حاصل نہیں لیکن یہ آیت کا اصل معنی نہیں ہے بلکہ بطور اشارۃ النص کے اس سے یہ مفہوم بھی ضمناً نکلتا ہے۔ لہذا حضرت عبد اللہ بن عباسؓ رضی اللہ عنہما کا یہ فرمانا کہ اس مثل میں مومن و کافر کی حالت بیان ہوئی ہے، دراصل اسی حقیقت کا حامل ہے اور ان کے کہنے کا مقصد یہی ہے کہ ابطال شرک کے ساتھ ساتھ مومن و کافر کی واقعی حیثیت بھی اشارتہ اس آیت سے روشنی میں آجاتی ہے۔ یہ مقصد نہیں ہے کہ آیت کا اصلی اور متعین مفہوم ہی یہی ہے۔ اور قرآن کے فہم اور اس کی تفسیر کا یہ بھی ایک عام انداز ہے جس کی تائید چاہو تو قدما کے اقوال کی طرف مراجعت کرو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور دیگر سلف صالحینؒ کے اقوال میں تو اس کی بے شمار نظیریں موجود ہیں۔ وہ اکثر آیات میں ان کے اصل معانی کو بیان کرنے کے بجائے ان کے لوازم اور ضمنی احکام پر اشارہ کر کے خاموش ہو جاتے ہیں لیکن عام لوگوں کو گمان ہوتا ہے کہ آیات کی متعین تاویل ان کے نزدیک یہی ہے، اور اس کو تہ نظری کی وجہ سے لوگ اقوال سلف کو تفسیر آیات کی حیثیت سے پیش کرنے لگتے ہیں۔

تقریظ و انتقاد

"متحدہ قومیت اور اسلام"

اس عنوان سے جناب مولانا حسین احمد صاحب صدر دارالعلوم دیوبند کا ایک رسالہ حال میں شائع ہوا ہے[1]، اور ہمارے پاس تنقید کے لیے بھیجا گیا ہے۔ ایک نامور عالم دین، اور ہندوستان کی سب سے بڑی دینی درسگاہ کے صدر ہونے کی حیثیت سے مصنف کا جو مرتبہ ہے، اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمیں توقع تھی کہ اس رسالہ میں "قومیت" کے اہم اور نہایت پیچیدہ مسئلہ کی تنقیح و تحقیق خالص علمی طریقہ پر کی گئی ہوگی، اور اس باب میں اسلام کا نقطہ نظر پوری طرح واضح کر دیا گیا ہوگا۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے اس رسالہ کو اپنی توقعات سے اور مصنف کی ذمہ دارانہ حیثیت سے بہت فروتر پایا۔

یہ ایسا زمانہ ہے جس میں جاہلی تصورات نے ہر طرف سے اسلامی حقائق پر زغہ کر رکھا ہے، اور اسلام اپنے گھر ہی میں غریب ہو رہا ہے۔ خود مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ خالص اسلامی نگاہ سے مسائل کو نہیں دیکھتے، اور کمی علم کی وجہ سے نہیں دیکھ سکتے۔ پھر قومیت کا مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اسی کے صاف اور واضح فہم و ادراک پر ایک قوم کی زندگی کا مدار ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم اپنی قومیت کے اساسیات ہی کو اجنبی اصول و مبادی میں خلط ملط کر دے تو وہ قوم سرے سے قوم ہی نہیں رہ سکتی۔ ایسے نازک زمانے میں ایسے نازک مسئلے پر قلم اٹھاتے ہوئے مولانا حسین احمد صاحب جیسے شخص کو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ وہ امانتِ انبیاء کے امین ہیں اور جب اسلامی حقائق جاہلیت کے گرد و غبار میں چھپ رہے ہوں تو یہ انہی جیسے لوگوں کا کام ہے کہ انھیں صاف اور منقح کر کے روشنی میں لائیں۔ ان کو یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ اس فتنہ کے دور میں ان کی ذمہ داری عام مسلمانوں کی ذمہ داری

[1] مجلس قاسم المعارف دیوبند سے ۸ ؍ میں مل سکتا ہے

سے زیادہ سخت ہے اور اگر مسلمان کسی گمراہی میں مبتلا ہوں تو سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر وہی ماخوذ ہونے والے ہیں۔

لیکن ہمیں پھر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا کا یہ رسالہ اس ذمہ داری کے احساس سے بالکل خالی ہے۔ اس میں مسئلے کی حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے، جن الجھنوں میں یہ مسئلہ اس وقت الجھا ہوا ہے ان کو سلجھانے کے بجائے فاضل مصنف خود انہی میں الجھ گئے ہیں، اور انھوں نے اپنا تمام تر زور صرف اس پر صرف کر دیا ہے کہ "متحدہ قومیت" کو محض لفظی حیثیت سے ایک اسلامی چیز ثابت کر دکھائیں، بلا اس لحاظ کے کہ معنی اور مآل کے اعتبار سے بھی وہ اسلامی ہو یا نہ ہو۔

غیر علمی زاویۂ نظر ایک مصنف کی تصنیف میں سب سے پہلے جس چیز کو تلاش کرنا چاہیے وہ اس کا زاویۂ نظر ہے۔ اس لیے کہ اپنے موضوع کے ساتھ مصنف کا برتاؤ، اور اس کا صحیح یا غلط نتائج پر پہنچنا، تمام تر اس کے زاویۂ نظر ہی پر منحصر ہوتا ہے۔ سیدھا اور صحیح زاویۂ نظر یہ ہے کہ آدمی محض امر حق کا طالب ہو اور مسئلے کو، جیسا کہ وہ فطرۃً وحقیقۃً ہے، اس کے اصلی رنگ میں دیکھے، اور حقیقت کا یہ مشاہدہ جس نتیجہ پر بھی پہنچاتا ہو اس پر پہنچ جائے بلا اس لحاظ کے کہ وہ کس کے خلاف پڑتا ہے اور کس کے موافق۔ یہ بحث وتحقیق کا فطری اور علمی زاویۂ نظر ہے اور اسلامی زاویۂ نظر بھی اس کے سوا کوئی نہیں کہ اسلام کی روح ہی الحب فی اللہ والبغض فی اللہ ہے۔ اس سیدھے زاویۂ نظر کے علاوہ بہت سے ٹیڑھے زاویائے نظر بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ آپ کسی کی محبت میں مبتلا ہیں، اس لیے صرف اسی نتیجہ کی طرف جانا چاہتے ہیں جو اس کے موافق ہو، اور دوسرا یہ کہ آپ کو کسی سے بغض وعداوت ہے اس لیے آپ کی تلاش صرف انہی چیزوں کی ہے جو آپ کے مبغوض کی مخالف ہوں۔ اس قسم کے ٹیڑھے زاویے جتنے بھی ہیں سب کے سب خلاف حق ہیں۔ انھیں اختیار کر کے کوئی بحث کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتی۔ کسی عالم اور متقی انسان کے لیے زیبا نہیں کہ ایسے کسی زاویہ سے کسی مسئلے پر نگاہ ڈالے اس لیے کہ یہ "اسلامی" نہیں بلکہ "جاہلی" زاویۂ نظر ہے۔

اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ مولانا نے اس رسالہ میں کونسا زاویۂ نظر اختیار فرمایا ہے۔ اپنی بحث کے آغاز میں وہ فرماتے ہیں:۔

"ضروری معلوم ہوا کہ . . . . ان غلطیوں کا ازالہ کر دوں جو اس قسم کی قومیت متحدہ سے ممانعت اور

اس کو خلافِ دیانت قرار دینے کے متعلق شائع ہوئی ہیں یا شائع کی جا رہی ہیں۔ کانگریس ۱۸۸۵ء سے اہل ہندوستان سے بنا بر وطنیت اس (اتحاد قومی کا مطالبہ کرتی ہوئی بیش از بیش جد وجہد عمل میں لا رہی ہے۔ اور اس کے مقابل (مخالف توتیں) اس کے غیر قابل قبول ہونے بلکہ ناجائز اور حرام ہونے کی انتہائی کوششیں عمل میں لا رہی ہیں۔ یقیناً برٹش شہنشاہیت کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خطرناک چیز نہیں ہے۔ یہ چیز میدان میں آج سے نہیں بلکہ تقریباً ۱۸۸۷ء یا اس سے پہلے سے لائی گئی ہے اور مختلف عنوانوں سے اس کی وحی ہندوستانیوں کے دل و دماغ پر عمل میں لائی جا رہی ہے۔" (صفحہ ۵-۶)

پھر چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں :۔

"اگرچہ بہت سے ان لوگوں سے جن کو برطانیہ سے گہرا تعلق ہے یا جن کے دماغ اور قلب برطانوی مدبرین کے سحر سے ماؤف ہو چکے ہیں امید نہیں ہے کہ وہ اس کو قبول کریں گے۔"

اسی سلسلہ میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان کی ہستی کوئی معمولی ہستی نہ تھی۔ وہ ایسے تھے اور ایسے تھے مگر "باوجود کمالات گوناگوں ساحرین برطانیہ کے سحر میں مبتلا" ہو گئے تھے۔

پھر ایک طویل بحث کے بعد اپنے زاویۂ نظر کا صاف صاف اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

"ہندوستانیوں کا وطنیت کی بنا پر متحدہ قومیت بنا لینا انگلستان کے لیے جس قدر خطرناک ہے وہ ہماری اس شہادت سے ظاہر ہے جو کہ ہم نے پروفیسر سیلے کے مقالہ سے نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جذبہ ضعیف سا ضعیف بھی اگر ہندوستانیوں میں پیدا ہو جائے تو اگرچہ ان میں انگریزوں کے نکالنے کی طاقت موجود بھی نہ ہو مگر فقط اس وجہ سے کہ ان میں یہ خیال جاگزیں ہو جائے گا کہ اجنبی قوم کے ساتھ ان کے لیے اشتراک عمل شرمناک امر ہے، انگریزی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔" (صفحہ ۳۸)

آگے چل کر ایک ایسی حیرت انگیز رائے کا اظہار فرماتے ہیں جسے پڑھ کر آدمی ششدر رہ جاتا ہے کہ کیا یہ کسی متقی عالم کی تحریر ہو سکتی ہے :۔

"اگر وطنیت ایسی ہی ملعون اور بدترین چیز ہے تو چونکہ یورپ نے اس کو استعمال کر کے اسلامی بادشاہوں اور عثمانی خلافت کی جڑ کھودی ہے مسلمانوں کو چاہیے تھا کہ اسی ملعون ہتھیار کو برطانیہ کی جڑ کھودنے کے لیے استعمال کرتے۔" (صفحہ ۳۸)

اسی بحث کے دوران میں مولانا پہلے تو اس امر کا اعتراف فرماتے ہیں کہ پچھلی دو صدیوں میں اسلامی سلطنتوں کو جس قدر بھی نقصان پہنچا ہے اسی وجہ سے پہنچا ہے کہ یورپ نے اسلامی وحدت کے خلاف سخت پروپیگنڈا کیا، "اور مسلمانوں میں نسلی، وطنی، لسانی امتیاز و افتراق پیدا کر دیا" اور ان میں یہ اسپرٹ پیدا کی کہ "جہاد مذہبی و روحانی نہ ہو بلکہ نسلوں اور اوطان کے لیے کیا جائے اور مذہبیت کی اسپرٹ درمیان سے نکال دی جائے" (صفحہ ۳۵-۳۶) لیکن امر حق کے اس قدر قریب پہنچ جانے کے بعد پھر وہی برطانیہ کا ہوّا مولانا کے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ :-

"افسوس مسلمانوں میں اُس وقت کوئی شخص مسلمانوں کی متحدہ قومیت اور ازالہ وطنیت و نسل و لسان وغیرہ کا واعظ کھڑا نہ ہوا اور نہ یورپ کے اخباروں رسائل، لکچراروں کی بے حد و بے شمار آندھیوں کا مقابلہ کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پان اسلام ازم ایک قصہ پارینہ ہو کر فنا کے گھاٹ اتر گیا اور ممالک اسلامیہ یورپین اقوام کے لقمۂ تر بن کر رہ گئے۔ اب جبکہ مسلمانوں کو افریقہ، یورپ، ایشیا وغیرہ میں پارہ پارہ کر کے فنا کی گود میں ڈال دیا گیا ہے تو ہم کو کہا جاتا ہے کہ اسلام صرف ملی اتحاد کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ کسی غیر مسلم جماعت سے متحد نہیں ہو سکتا اور نہ کسی غیر مسلم قوم کے ساتھ متحدہ قومیت بنا سکتا ہے۔" (صفحہ ۳۶-۳۷)

یہ عبارات جنھیں اوپر لفظ بلفظ نقل کیا گیا ہے مولانا کے زاویۂ نظر اور ان کے اندازِ فکر کو بالکل بے نقاب کر دیتی ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ مولانا کی نگاہ میں حق اور باطل کا معیار صرف برطانیہ بن کر رہ گیا ہے۔ حق وہ ہے جو برطانیہ کے خلاف ہو اور باطل ہر وہ چیز ہے جس کے متعلق انھیں وہم ہو جائے کہ وہ برطانیہ کی اغراض کے لیے مفید ہے۔ وہ مسئلہ کو نہ تو علمی زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ حقائق اپنے اصلی رنگ میں انھیں نظر آ سکیں، نہ وہ مسلمانوں کی خیر خواہی کے زاویۂ نظر سے اس پر نگاہ ڈالتے ہیں کہ جو کچھ مسلمانوں کے لیے زہر ہے وہ انھیں زہر دکھائی

دے سکے۔ ان دونوں زاویوں کے بجائے ان پر فقط برطانیہ کی عداوت کا زاویۂ نظر مستولی ہوگیا ہے جس کی وجہ سے ہر وہ چیز ان کو تریاق نظر آتی ہے جس کے متعلق کسی طرح ان کو معلوم ہو جائے کہ وہ برطانیہ کے لیے زہر ہے۔ اب اگر کوئی شخص اسی چیز کو مسلمانوں کے لیے زہر سمجھتا ہو اور اس بنا پر اس کی مخالفت کرے تو وہ ان کے نزدیک برطانیہ پرست کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ ان کو مسلمانوں کی زندگی سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی برطانیہ کی موت سے ہے اور جب یہ بات ان کے دل میں بیٹھ چکی ہے کہ "متحدہ قومیت" برطانیہ کے لیے مہلک ہے تو جو شخص اس کی مخالفت کرتا ہے وہ "برطانیہ پرست" کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے!۔۔۔۔۔ خیریت یہ ہوئی کہ کسی نے مولانا کو برطانیہ کی ہلاکت کا ایک دوسرا نسخہ نہ بتا دیا جو متحدہ قومیت سے بھی زیادہ کارگر ہے یعنی یہ کہ ہندوستان کی ۳۵ کروڑ آبادی یک بارگی خودکشی کرلے جس سے برطانوی سلطنت آن کی آن میں ختم کی جا سکتی ہے۔ یہ تیر بہدف تدبیر اگر مولانا کے دل میں بیٹھ جاتی تو وہ بے تکلف فرماتے کہ جو شخص ہندوستان کے باشندوں کو خودکشی سے روکتا ہے وہ برطانیہ پرست ہے۔ خودکشی اگرچہ ملعون اور بدترین فعل سہی، مگر جب کہ اس سے برطانیہ کی جڑ کھودی جا سکتی ہے تو فرض ہو جاتا ہے کہ اس فعلِ قبیح کا ارتکاب کیا جائے!۔۔۔۔۔ ایسی ہی باتوں سے یہ راز سمجھ میں آتا ہے کہ دین میں الحب فی اللہ والبغض فی اللہ کو معیار حق کیوں قرار دیا گیا ہے۔ اگر خدا کا واسطہ درمیان سے ہٹ جائے اور بجائے خود کوئی شے محبوب یا مبغوض بن جائے تو عصبیت جاہلیہ کی سرحد شروع ہو جاتی ہے جس میں وہ تمام ذرائع و وسائل جائز کر لیے جاتے ہیں جن سے انسان کے جذبات محبت و عداوت کی تشفی ہو سکے، قطع نظر اس کے کہ وہ قانون الٰہی کے مطابق ہوں یا اس کے خلاف۔ اسی لیے کہنے والے نے کہا کہ ذاتی عداوت تو شیطان سے بھی نہ ہونی چاہیے۔ اس میں بھی خدا کا واسطہ بیچ میں رہنا ضروری ہے ورنہ وہ خود ایک قانون بن جائے گی اور تم شیطان کی دشمنی میں خدا کے حدود توڑ دو گے، یعنی اپنے دشمن شیطان ہی کا کام کرو گے۔

اثبات مدعا کے لیے حقائق سے چشم پوشی

اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ مولانا اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے تاریخ کے مشہور اور بین واقعات کو بھی صاف نظر انداز کر جاتے ہیں۔ یورپ جب مسلمانوں پر نسلی، وطنی اور لسانی قومیتوں کی تبلیغ کر رہا تھا تو کیا مسلمانوں میں کوئی اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کھڑا نہیں ہوا؟ کیا ٹیپو سلطان، جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ،

مصطفےٰ کامل مصری، امیر شکیب ارسلان، انور پاشا، جلال نوری بے، شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، محمود الحسن، محمد علی، شوکت علی، اقبال، ابو الکلام مرحوم، کسی کا نام بھی مولانا نے نہیں سنا؟ کسی کے کارنامے ان تک نہیں پہنچے؟ کیا ان میں سے کسی نے بھی مسلمانوں کو متنبہ نہیں کیا کہ یہ جاہلیت کی تفریق تم کو تباہ کرنے کے لیے برپا کرائی جا رہی ہے؟ شاید مولانا ان سوالات کا جواب نفی میں نہ دیں گے۔ مگر وہ ان سب واقعات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے بے تکلف دعویٰ فرماتے ہیں کہ "افسوس مسلمانوں میں اُس وقت کوئی مسلمانوں کی متحدہ قومیت کا واعظ کھڑا نہ ہوا"۔۔۔۔ ایسا غلط دعویٰ کرنے کی آخر ضرورت کیا تھی؟ مقصود صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ پہلے مسلمانوں کی قومی وحدت برطانوی مفاد کے خلاف تھی اس لیے سب مسلمان نسلی، وطنی اور لسانی امتیازات پھیلانے میں لگے ہوئے تھے، اور اب اسلامی وحدت برطانوی اغراض کے لیے مفید ہو گئی ہے، اس لیے اس کا وعظ بھی شروع ہوا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ وطن پرستی کے مخالف سب کے سب برطانیہ پرست ہیں اور محض ساحر برطانیہ کا سحر ان کے اندر بول رہا ہے!۔۔۔ یہ ہے نتیجہ عصبیت جاہلیہ کا۔ چونکہ حق و باطل کا معیار "برطانیہ" ہو گیا اس لیے خلاف واقعہ باتوں کی تصنیف بھی جائز ہو گئی اگر ان سے برطانیہ کے خلاف کوئی کام لیا جا سکے۔

یہی ذہنیت ہے جو ہمیں پورے رسالہ میں کارفرما نظر آتی ہے۔ لغت کو، آیات قرآنی کو، اخبار و احادیث کو، تاریخی واقعات کو، غرض ہر چیز کو توڑ مروڑ کر اپنا مدعا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور ہر اس چیز کو بلا تکلف نظر انداز کر دیا گیا ہے جو مدعا کے خلاف ہو، چاہے وہ کیسی ہی ظاہر و باہر حقیقت کیوں نہ ہو۔ حد یہ ہے کہ لفظی مغالطے دینے اور قیاس مع الفارق اور بناء فاسد علی الفاسد کا ارتکاب کرنے میں بھی تامل نہیں فرمایا گیا۔ ایک عالم اور متقی عالم کا یہ کارنامہ دیکھ کر انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے کہ اسے کیا کہیے۔

قومیں اوطان سے کہاں بنتی ہیں؟ مولانا فرماتے ہیں کہ "فی زمانا قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ لیکن یہ ایک قطعی غلط اور سراسر بے بنیاد دعویٰ ہے۔ پوری انسانی تاریخ سے ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی کہ کوئی قوم وطن سے بنی ہو۔ آج اس زمانہ میں بھی دنیا کی تمام قومیں مولانا کے سامنے موجود ہیں۔ وہ فرمائیں کہ ان میں سے کون سی قوم وطن سے بنی ہے؟ کیا امریکہ کے حبشی اور ریڈ انڈین اور سفید فام ایک قوم ہیں؟ کیا جرمنی کے یہودی اور جرمن ایک قوم ہیں؟

کیا پولینڈ، روس، ٹرکی، بلغاریہ، یونان، یوگوسلاویا، چیکوسلوواکیا، لتھوانیا، فنلینڈ کسی جگہ بھی خاکِ وطن کے اشتراک نے ایک قوم بنائی؟ کیا انگلستان، فرانس، اٹلی اور جاپان میں وحدت کا رنگ محض خاکِ وطن نے پیدا کیا ہے؟ کیا ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ یہودی جو روئے زمین کے اطراف واکناف میں منتشر ہیں کسی جگہ بھی وطنی قومیت میں جذب ہو گئے؟ کیا یورپ کے مختلف ممالک میں جرمن، مگیر، سلافی، موراوین وغیرہ مختلف قومی اقلیتیں کسی جگہ بھی وطنی رشتۂ اشتراک میں گم ہوئیں؟ واقعات تو بہرحال واقعات ہیں۔ آپ ان کو اپنی خواہشات کا تابع نہیں بنا سکتے۔ آپ کو یہ کہنے کا حق ہے، اگر آپ ایسا کہنا چاہیں، کہ اب قوموں کو اوطان سے بننا چاہیے۔ لیکن آپ کو ثبوت اور شہادت سے بے نیاز ہو کر دنیا کو یہ غلط خبر دینے کا کیا حق ہے کہ اب قومیں اوطان سے بننے لگی ہیں؟ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ۔

اس میں شک نہیں کہ ایک ملک کے باشندوں کو باہر والے ان کے ملک کی طرف منسوب کرتے ہیں، مثلاً امریکن، خواہ حبشی ہو یا فرنگی، باہر والے اس کو امریکن ہی کہیں گے۔ مگر کیا اس سے یہ حقیقت بدل جاتی ہے کہ امریکہ میں یہ الگ الگ قومیں ہیں نہ کہ ایک قوم؟ یہ بھی صحیح ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں ایک شخص اصطلاحاً اس سلطنت کا "نیشنل" کہلاتا ہے جس کی وہ رعایا ہو۔ مثلاً اگر مولانا حسین احمد صاحب بیرون ہند تشریف لے جائیں تو ان کو "برٹش نیشنیلیٹی" (برطانوی قومیت) سے منسوب کیا جائے گا۔ لیکن کیا یہ اصطلاحی قومیت حقیقت میں بھی مولانا کی قومیت بدل دے گی؟ پھر بھلا علمی حیثیت سے اس استدلال کی کیا وقعت ہو سکتی ہے کہ "اس وطن کے رہنے والے کی حیثیت سے سب (یعنی ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی وغیرہ) ایک ہی قوم شمار ہوتے ہیں"؟ شمار ہونے اور فی الواقع ہونے میں بڑا فرق ہے۔ ایک کو دوسرے کے لیے نہ تو دلیل بنایا جا سکتا ہے، اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کو فی الواقع وہی ہونا چاہیے جیسے وہ شمار کیے جاتے ہیں۔

لغت اور قرآن سے غلط استدلال

اس کے بعد مولانا لغت عرب کی طرف رجوع فرماتے ہیں، اور شواہد سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ عربی زبان میں قوم کے معنی ہیں "مردوں کی جماعت"، یا "مردوں اور عورتوں کا مجموعہ"، یا "ایک شخص کے اقربا"، یا "دشمنوں کی جماعت"۔ اس کا ثبوت انھوں نے آیات قرآنی سے بھی پیش فرمایا ہے۔ مثلاً وہ آیات جن میں کفار کو نبی کی یا مسلمانوں کی "قوم" قرار دیا گیا ہے جو صریحاً تیسرے اور چوتھے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ یا وہ آیات جن میں

لفظ قوم پہلے یا دوسرے معنی میں مستعمل ہوا ہے لیکن اس پوری بحث میں مولانا کو ایک مرتبہ بھی یہ خیال نہ آیا کہ اس وقت جو بحث درپیش ہے وہ لفظ قوم کے لغوی معنی یا قدیم معنی سے متعلق نہیں ہے بلکہ موجودہ زمانہ کی اصطلاح سے تعلق رکھتی ہے جواہل لاہور اور سید محمود لغت عرب در قرآنی زبان میں کلام نہیں کرتے۔ نہ کانگریس کی کارروائیوں میں یہ پرانی زبان استعمال ہوتی ہے۔ ان کے الفاظ کا تو وہی مفہوم ہے اور وہی ہوسکتا ہے جو آج کل ان سے مراد لیا جاتا ہے۔ آج کل اردو زبان میں "قوم" اور "قومیت" کے الفاظ انگریزی زبان کے الفاظ Nation اور Nationalism کے مقابلہ میں بولے جاتے ہیں جن کی تشریح لارڈ برائس نے اپنی کتاب "بین الاقوامی تعلقات" International Relations میں ان الفاظ کی ہے:۔

"ایک قومیت سے مراد اشخاص کا ایسا مجموعہ ہے جس کو چند مخصوص جذبات (Sentiments) نے ملا کر باہم مربوط کر دیا ہو۔ ان میں سے بڑے اور طاقت ور جاذبے تو دو ہیں۔ ایک جاذبہ نسل۔ دوسرا جاذبہ دین لیکن ایک مشترک زبان کے استعمال اور مشترک لٹریچر سے دلچسپی، اور زمانہ ماضی کے مشترک قومی کارناموں اور مشترک مصائب کی یاد، اور مشترک رسوم وعوائد مشترک تخیلات و افکار اور مشترک مقاصد اور حوصلوں کا بھی اس احساس جمعیت کی پیدائش میں بہت کچھ دخل ہوتا ہے کبھی یہ سب رابطے یکجا موجود ہوتے ہیں اور مجموعہ افراد کو لبستہ و پیوستہ رکھتے ہیں۔ اور کبھی ان میں سے بعض رابطے موجود نہیں ہوتے لیکن قومیت پھر بھی موجود ہوتی ہے"۔ (صفحہ ۱۱۶)

اسی کی تشریح "اخلاق و ادیان کی دائرۃ المعارف" Encyclopaedia of Religion and Ethics میں یوں کی گئی ہے:۔

قومیت وہ وصف عام یا متعدد اوصاف کا ایسا مرکب ہے جو ایک گروہ کے افراد میں مشترک ہو اور ان کو جوڑ کر ایک قوم بنا دے۔۔۔۔۔ ہر ایسی جماعت ان افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو نسل، مشترک روایات، مشترک مفاد، مشترک عادات و رسوم اور مشترک زبان کے رابطوں سے باہم مربوط ہوتے ہیں، اور ان سب سے زیادہ اہم رابطہ ان کے درمیان یہ ہوتا ہے کہ وہ باہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، بلا ارادہ ایک دوسرے کے ساتھ

وابستہ ہوتے ہیں، اور ان کے درمیان مختلف حیثیات سے الفت و موانست ہوتی ہے۔ غیر قوم کا آدمی ان کو غیر اور اجنبی محسوس ہوتا ہے اس لیے کہ اس کی دلچسپیاں اور اس کی عادات انھیں نرالی معلوم ہوتی ہیں اور ان کے لیے اس کے انداز طبیعت اور اس کے خیالات وجذبات کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے قدیم زمانے کے لوگ غیر قوم والوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے، اور اسی وجہ سے آج کا مہذب آدمی بھی غیر قوم والے کی عادات اور طرز زندگی کو اپنے مذاق کے خلاف پا کر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔"

کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ قرآن مجید نے اس معنی میں کفار و مشرکین اور مسلمانوں کا ایک قومیت میں جمع ہونا جائز رکھا ہے؟ یا کوئی نبی دنیا میں کبھی اس غرض کے لیے بھی بھیجا گیا ہے کہ مومن اور غیر مومن سب کو اس معنی میں ایک قوم بنا لے؟ اگر نہیں تو یہ فضول لغوی بحث آخر کیوں چھیڑی جاتی ہے؟ لفظ اپنے معنی تاریخ کے دوران میں بارہا بدلتا ہے۔ کل ایک لفظ کسی معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ آج کسی اور معنی میں ہوتا ہے۔ اب یہ لفظی مغالطہ نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ معنوی تغیرات کو نظر انداز کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائیں کہ قرآن کی رو سے "قومیت میں اشتراک مسلم اور کافر کا ہو سکتا ہے"، درآنحالیکہ قومیت کا جو مفہوم قرآن کی زبان میں تھا اس کو آج کے مفہوم سے ذرہ برابر کوئی علاقہ نہیں۔ متقدمین نے "مکروہ" اور "حرام" میں اصطلاحی فرق نہیں کیا تھا اس لیے اکثر مقامات پر ان کی عبارتوں میں مکروہ بمعنی حرام مستعمل ہوا ہے۔ لیکن اب کہ ممنوعیت کے ان دونوں مدارج کے لیے الگ اصطلاحیں بن چکی ہیں، اگر کوئی شخص کسی حرام کو محض مکروہ بمعنی اصطلاحی ٹھیرائے اور حجت کے طور پر سلف کی کوئی عبارت پیش کرے تو کیا یہ مغالطہ کے سوا کچھ اور ہوگا؟ اسی طرح لفظ قومیت بھی اب اصطلاح بن چکا ہے۔ اب مسلم و کافر کے لیے مشترک قومیت کا لفظ استعمال کرنا، اور معترض کا منہ بند کرنے کے لیے اس لفظ کے پرانے استعمالات کو حجت میں پیش کرنا بھی محض ایک مغالطہ ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

ایک اور لفظی مغالطہ آگے چل کر مولانا دعویٰ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں یہود اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت بنائی تھی، اور اس کے ثبوت میں وہ معاہدہ پیش کرتے ہیں جو ہجرت کے بعد حضور اکرم اور یہودیوں کے درمیان ہوا تھا۔ اس معاہدہ میں کہیں یہ فقرہ مولانا کے ہاتھ آگیا کہ

وان یھود بنی عوف امۃ مع المومنین بنی عوف کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ ایک امت ہوں گے۔

بس یہ فقرہ کہ "یہودی اور مسلمان ایک امت ہوں گے"، یہ دعویٰ کرنے کے لیے کافی سمجھ لیا گیا کہ آج بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت بن سکتی ہے۔ لیکن یہ پھر لفظی مغالطہ ہے۔ لغت عرب میں امت سے مراد ہر وہ جماعت ہے جس کو کوئی چیز جمع کرتی ہو، عام اس سے کہ وہ زمانہ ہو، مقام ہو، دین ہو یا کوئی اور چیز۔ اس لحاظ سے اگر دو مختلف قومیں کسی ایک مشترک مقصد کے لیے عارضی طور پر متفق ہو جائیں تو ان کو بھی ایک امت کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ صاحب لسان العرب لکھتے ہیں:-

وقولہ فی الحدیث ان یھود بنی عوف امۃ من المومنین، یرید انھم بالصلح الذی وقع بینھم وبین المومنین کجماعۃ منھم کلمتھم وایدیھم واحدۃ	حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ ان یھود بنی عوف امۃ من المومنین، اس سے مراد یہ ہے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو صلح واقع ہوئی ہے اس کی وجہ سے وہ گویا مسلمانوں ہی کی ایک جماعت ہو گئے ہیں اور ان کا معاملہ واحد ہے

اس لغوی "امت" کو آج کی اصطلاحی "متحدہ قومیت" سے کیا واسطہ؟ زیادہ سے زیادہ اس کو آج کل کی سیاسی زبان میں فوجی اتحاد (Military alliance) کہہ سکتے ہیں۔ یہ محض ایک تحالف تھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہود اپنے دین پر اور مسلمان اپنے دین پر رہیں گے، دونوں کی تمدنی و سیاسی ہیئتیں الگ الگ رہیں گی، البتہ ایک فریق پر جب کوئی حملہ کرے گا تو دونوں فریق مل کر لڑیں گے، اور دونوں اس جنگ میں اپنا اپنا مال خرچ کریں گے۔ دو تین سال کے اندر ہی اس تحالف کا خاتمہ ہو گیا اور مسلمانوں نے کچھ یہودیوں کو جلا وطن اور کچھ کو ہلاک کر دیا۔ کیا اسی کا نام "متحدہ قومیت" ہے؟ کیا کسی معنی میں بھی یہ چیز اس "متحدہ قومیت" سے مماثلت رکھتی ہے جو اس وقت معرض بحث میں ہے؟ کیا وہاں کوئی مشترک اسٹیٹ بنایا گیا تھا؟ کیا وہاں کوئی مشترک مجلس قانون ساز بنائی گئی تھی اور یہ طے ہوا تھا کہ یہودی اور مسلمان ایک مجموعہ ہوں گے اور اس مجموعہ میں سے جس کی اکثریت ہو گی وہی مدینہ پر حکومت کرے گا اور اسی کے منظور کیے ہوئے قوانین مدینہ میں نافذ ہوں گے؟ کیا وہاں مشترک عدالتیں قائم ہوئی تھیں جن میں یہودیوں اور

مسلمانوں کے قضایا کا یکجا اور ایک ہی ملکی قانون کے تحت فیصلہ ہوتا ہو؟ کیا وہاں کوئی وطنی کانگریس بنائی گئی تھی جس میں یہودی اکثریت کا منتخب کیا ہوا ہائی کمانڈ اپنی انگلیوں پر یہودی اور مسلمان سب کو رقص کراتا ہو؟ کیا وہاں رسول اللہ سے معاہدہ کرنے کے بجائے کعب بن اشرف اور عبداللہ بن ابی براہ راست افراد مسلمین سے ماس کانٹیکٹ کرنے گئے تھے؟ کیا وہاں وردھا اسکیم کے طرز کی کوئی تعلیمی اسکیم تصنیف کی گئی تھی تاکہ مسلمان اور یہودی بچے ایک مشترک سوسائٹی بنانے کے لیے تیار کیے جائیں اور ان کو یہودیت اور اسلام کی صرف مشترک سچائیاں ہی پڑھائی جائیں؟ کیا وہاں بھی کسی ابورافع نے کوئی "صومعہ اسکیم" تمام اہل مدینہ کے لیے بنائی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تعلیمی صومعوں میں مسلمان بچوں کا بھیجا جانا قبول فرمایا تھا؟ مولانا آخر فرمائیں تو کہ جس "متحدہ قومیت" کو وہ رسولِ خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں اس میں آج کل کی "متحدہ قومیت" کے عناصر ترکیبی میں سے کونسا عنصر پایا جاتا تھا؟ اگر وہ کسی ایک عنصر کا بھی پتہ نہیں دے سکتے، اور میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہرگز نہیں دے سکتے تو کیا مولانا کو خدا کی بازپرس کا خوف نہیں کہ محض امۃ من المومنین یا امۃ مع المومنین کے الفاظ معاہدۂ نبوی میں دیکھ کر وہ مسلمانوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ جیسی متحدہ قومیت آج کانگریس بنا رہی ہے ویسی ہی متحدہ قومیت کل نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی بنا چکے ہیں لہٰذا آؤ اور اطمینان سے اس میں جذب ہو جاؤ؟ الفاظ کا سہارا لے کر مولانا نے اپنا مدعا ثابت کرنے کی کوشش تو بہت خوبی کے ساتھ کر دی، مگر انھیں یہ خیال نہ آیا کہ حدیث کے الفاظ کو مفہوم نبوی کے خلاف کسی دوسرے مفہوم پر چسپاں کرنا، اور اس مفہوم کو نبی کی طرف منسوب کر دینا من کذب علی متعمداً کی زد میں آجاتا ہے۔ مولانا خود ایک جلیل القدر عالم اور محدث ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی شخص حدیث عائشہ کان النبی صلعم یقبل و یباشر و ھو صائم۔ کے لفظ مباشرت کو اردو کے معروف معنوں میں لے لے اور اس سے یہ استدلال کرے کہ روزے میں مباشرت کرنا نعوذ باللہ سنت سے ثابت ہے۔ لہٰذا سب مسلمانوں کو روزے میں مباشرت کرنی چاہیے تو آپ اس پر کیا حکم لگائیں گے؟ دونوں استدلالوں کی نوعیت ایک ہے لہٰذا ان کا حکم بھی ایک ہی ہونا چاہیے اور کوئی وجہ نہیں کہ مستدل کی شخصیت کو دیکھ کر اس باب میں رعایت کی جائے۔ بلکہ اگر مستدل ان لوگوں میں سے ہے جن کی طرف

مسلمان اعتماد اور بھروسے کے ساتھ اپنے دین کا علم حاصل کرنے کے لیے رجوع کرتے ہیں، تو معاملہ اور زیادہ اشد ہو جاتا ہے جب شفاخانے ہی سے زہر تقسیم ہونے لگے تو امن کہاں تلاش کیا جائے؟

بناء فاسد علی الفاسد | پھر مولانا اس متحدہ قومیت کے جواز میں ایک اور دلیل پیش فرماتے ہیں اور وہ یہ ہے:-

"ہم روزانہ مفاد ہائے مشترکہ کے لیے ہیآت اجتماعیہ بناتے ہیں اور ان میں نہ صرف شریک ہوتے ہیں بلکہ ان کی ممبری، در شرکت کے لیے انتہائی جد وجہد کرتے ہیں..... ٹاؤن ایریا، نوٹیفائیڈ ایریا، میونسپل بورڈ، ڈسٹرکٹ بورڈ، کونسلات، اسمبلیاں، ایجوکیشنل ایسوسی ایشن اور اس قسم کی سینکڑوں انجمنیں اور ایسوسی ایشنیں ہیں جو کہ انہی اصولوں اور قواعد سے عبارت ہیں جو کہ خاص مقصد کے ماتحت ہیئت اجتماعیہ کے لیے بنائے گئے ہیں۔ تعجب ہے کہ ان میں حصہ لینا اور مکمل یا غیر مکمل جد وجہد کرنا ممنوع قرار نہیں دیا جاتا مگر اسی قسم کی کوئی انجمن اگر آزادی ملک اور برطانوی اقتدار کے خلاف قائم ہو تو وہ حرام خلاف دیانت، خلاف تعلیمات اسلامیہ اور خلاف عقل و دانش وغیرہ ہو جاتی ہے۔" (صفحہ ۴۱)

یہ بناء فاسد علی الفاسد ہے۔ ایک گناہ کو جائز فرض کر کے اس کی حجت پر مولانا اُسی قسم کے دوسرے گناہ کو جائز ثابت کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ دونوں میں ایک ہی علت حرمت پائی جاتی ہے اور مقیس و مقیس بہ دونوں ناجائز ہیں تاوقتیکہ یہ علت اُن سے دور نہ ہو۔ علمائے کرام مجھے معاف فرمائیں، میں صاف کہتا ہوں کہ ان کے نزدیک کونسلوں اور اسمبلیوں کی شرکت کو ایک دن حرام اور دوسرے دن حلال کر دینا ایک کھیل بن گیا ہے ایسے کہ ان کی تحلیل و تحریم حقیقت نفس الامری کے ادراک پر تو مبنی ہے نہیں، محض گاندھی جی کی جنبش لب کے ساتھ ان کا فتویٰ اگر دش کیا کرتا ہے۔ لیکن میں اسلام کے غیر تغیر پذیر اصولوں کی بنا پر یہ کہتا ہوں کہ ہر اس اجتماعی ہیئت کو تسلیم کرنا مسلمانوں کے لیے ہمیشہ گناہ تھا، آج بھی گناہ ہے اور ہمیشہ گناہ رہے گا جس کا دستور انسانوں کو اس امر کا اختیار دیتا ہو کہ وہ اُن مسائل کے متعلق قانون بنائیں یا ان مسائل کا تصفیہ کریں، جن پر خدا اور اس کا رسول پہلے اپنا ناطق فیصلہ دے چکا ہو۔ اور یہ گناہ اس صورت میں اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے جبکہ ایسے اختیارات رکھنے والی

اجتماعی ہیئت میں اکثریت غیر مسلموں کی ہو، اور فیصلہ کا مدار کثرت رائے پر ہو۔ ان اجتماعی ہیئتوں کے حدود اختیار و عمل کو خدا کی شریعت کے حدود سے الگ کر دینا مسلمانوں کا اولین فرض ہے اور اصلی جنگ آزادی ان کے لیے یہی ہے۔ اگر یہ حدود الگ ہو جائیں تو بلاشبہ ہر اُس جماعت میں شریک ہونا اور پورا پورا تعاون کرنا مسلمانوں کے لیے جائز ہو گا جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کی مشترک اغراض کے لیے بنائی جائے عام اس سے کہ وہ آزادی ملک کے لیے ہو یا انتظام مملکت کے لیے، یا معاشی و صنعتی کاروبار کے لیے لیکن جب تک حدود ایک دوسرے گڈمڈ ہیں، اشتراک و تعاون تو درکنار، ایسے دستور کے تحت زندگی بسر کرنا بھی مسلمانوں کے لیے گناہ ہے۔ اور یہ اجتماعی گناہ ہے جس میں من و تو کی تمیز نہیں۔ ساری قوم اس وقت تک گناہ گار رہے گی جب تک کہ وہ اس دستور کو پارہ پارہ نہ کر دے۔ اور اس میں ان لوگوں کا گناہ شدید تر ہو گا جو اس دستور پر راضی ہوں گے اور اسے چلانے میں حصہ لیں گے۔ اور اس شخص کا گناہ شدید ترین ہو گا جو خدا کی شریعت اور اس کے رسول کی سنت کو اس کے لیے دلیل جواز بنائے گا، کائناً من کان۔

میرے نزدیک یہ نہ تفقہ ہے اور نہ تقویٰ کہ جس چیز میں ایک علت حرمت کی اور دوسری علت جواز کی بیک وقت پائی جاتی ہو، اس میں سے محض علتِ جواز کو الگ نکال کر حکم لگا دیا جائے اور علتِ حرمت کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ آپ آزادی ملک اور برطانوی اقتدار کے خلاف جدوجہد کا نام تو جھٹ لے دیتے ہیں کہ اسے کون نہ جائز بلکہ فرض کہے گا۔ لیکن یہ نام لیتے وقت آپ کو یہ یاد نہیں آتا کہ جو انجمن آپ کے زعم کے مطابق آزادی کے لیے جدوجہد کر رہی ہے، وہی انجمن اُس دستور کو قبول کرتی ہے، اُسے چلاتی ہے، اور اُسی کو درجہ کمال تک پہنچانے کے لیے لڑ رہی ہے جو انسانی مجلس قانون ساز کو خدا کے قانون میں ترمیم کرنے کا اختیار دیتا ہے، جس کی رو سے خدا کا قانون اگر نافذ ہو بھی سکتا ہے تو صرف اس وقت جبکہ اسے لیجسلیچر کی منظوری حاصل ہو جائے، جس کے تحت غیر مسلم اکثریت کو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا نقشہ بنانے اور بگاڑنے کے پورے اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور وہ ان کے اخلاق، ان کی معاشرت اور ان کی آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت پر ہر قسم کے اثرات ڈال سکتی ہے۔ ایسے دستور کے ساتھ جو آزادی ملک حاصل ہوتی ہو آپ اس کے پیچھے دوڑ سکتے ہیں کیونکہ آپ کو صرف برطانوی اقتدار کا زوال مطلوب ہے عام اس سے کہ وہ کسی صورت میں ہو۔ اسی لیے آپ ایسی

انجمن کے معاملہ میں صرف علت جواز ہی ڈھونڈھتے ہیں اور علتِ حرمت جو سامنے منہ کھولے کھڑی ہے، آپ کو کسی طرح نظر نہیں آتی لیکن ہم مجبور ہیں کہ ان دونوں پہلوؤں کو ساتھ ساتھ دیکھیں اور علت حرمت کو دفع کیے بغیر علتِ جواز کو قبول نہ کریں، اس لیے کہ ہم کو برطانوی اقتدار کا زوال اور اسلام کا بقا دونوں ساتھ ساتھ مطلوب ہیں۔ اس کا نام اگر کوئی برطانیہ پرستی رکھتا ہے تو رکھے، ہمیں اس کے طعن کی ذرہ برابر پروا نہیں۔

افسوسناک بے خبری مولانا ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

"(متحدہ وطنی قومیت) کی مخالفت کا قوی صرف اس بنا پر کہ وطنیت کا مفہوم مغرب کی اصطلاح میں آج ایسے اصولوں پر اطلاق کیا جاتا ہے جو کہ ہیئت اجتماعیہ انسانیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ یکسر مخالف مذہب ہیں، اسی مفہوم مصطلح سے مخصوص ہوگا۔ مگر یہ مفہوم نہ عام طور پر لوگوں کے ذہن نشین ہے اور نہ اس کا کوئی مسلمان دیانت دار قائل ہو سکتا ہے اور نہ ایسے مفہوم کی اس وقت تحریک ہے۔ کانگریس اور اس کے کارکن اس کے محرک نہیں ہیں اور نہ اس کو ہم ملک کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔"
(صفحہ ۴۱)

اس دعوے کے ثبوت میں وہی پامال چیز پھر سامنے لائی گئی ہے جس کی حقیقت ایک سے زیادہ مرتبہ کھولی جا چکی ہے، "یعنی بنیادی حقوق" کا اعلان اور اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ:۔

"خود کانگریس بھی جس متحدہ قومیت کو ہندوستان میں پیدا کرنا چاہتی ہے اس میں کوئی ایسی بات نہیں چاہتی جس سے اہل ہند کے مذاہب یا ان کے کلچر و تہذیب اور پرسنل لا پر کسی قسم کا ضرر رساں اثر پڑے۔ وہ فقط انہی امور کو درست کرنا اور سلجھانا چاہتی ہے جو کہ مشترک مفاد اور ضروریاتِ ملکیہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور جن کو پردیسی حکومت نے اپنے قبضہ میں لے کر عام باشندگانِ ہند کو فنا کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ عموماً یہ امور وہی ہیں جو کہ ٹاؤن ایریا، نوٹیفائڈ ایریا، میونسپل بورڈوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، کونسلوں، اسمبلیوں وغیرہ میں داخلی اور خارجی حیثیات سے طے کیے جاتے ہیں۔ ان میں کسی قوم یا مذہب

کا دوسری قوم یا مذہب میں جذب ہو جانا ملحوظ نظر نہیں ہے"۔ (صفحہ ۵)

یہ تحریر ایک روشن نمونہ ہے اس امر کا کہ اس نازک وقت میں کیسی سطح بینی اور کیسی سہل انگاری کے ساتھ مسلمانوں کی پیشوائی کی جارہی ہے۔ جن مسائل پر آٹھ کروڑ مسلمانوں کے مستقبل کا انحصار ہے، جن میں ایک ذراسی چوک بھی قوم کی آئندہ صورتِ اجتماعی و اخلاقی کو بگاڑ کر کچھ سے کچھ کر دے سکتی ہے، ان کے تصفیہ کو ایسا ہلکا اور آسان سا کام سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کے لیے اُتنے مطالعہ اور غور و خوض اور تدبر کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی جس کا اہتمام ایک فرد واحد کو طلاق اور وراثت کا کوئی جزئی مسئلہ بتانے میں کیا جاتا ہے۔ عبارت کا ایک ایک لفظ شہادت دے رہا ہے کہ مولانا نہ تو قومیت کے اصطلاحی مفہوم کو جانتے ہیں، نہ کانگریس کے مقصد و مدعا کو سمجھتے ہیں، نہ بنیادی حقوق کے معنی پر انھوں نے غور کیا ہے، نہ ان کو یہ خبر ہے کہ جن اجتماعی مجلسوں کا وہ بار بار اس قدر سادگی کے ساتھ ذکر فرما رہے ہیں ان کے حدود اختیار و عمل موجودہ دستور کے تحت کس طرح اور کن کن راہوں سے اُس دائرے میں نفوذ کرتے ہیں جس کو تہذیب و تمدن اور عقائد و اخلاق کا دائرہ کہا جاتا ہے۔ حد یہ ہے ـــــ اور یہ بات میں خوب سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں کہ مولانا باایں ہمہ علم و فضل کلچر، تہذیب، پرسنل لا وغیرہ الفاظ بھی جس طرح استعمال کر رہے ہیں اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ ان کے معنی و مفہوم سے ناآشنا ہیں۔ میری یہ صاف گوئی ان حضرات کو یقیناً بہت بری معلوم ہوگی جو رجال کو حق سے پہچاننے کے بجائے حق کو رجال سے پہچاننے کے خوگر ہیں، اور اس کے جواب میں [illegible] گالیاں سننے کے لیے میں نے اپنے آپ کو پہلے ہی تیار کر لیا ہے۔ مگر میں جب دیکھتا ہوں کہ مذہبی پیشوائی کی مسند سے مسلمانوں کی غلط رہنمائی کی جارہی ہے، ان کو حقائق کے بجائے اوہام کے پیچھے چلایا جارہا ہے، اور خندقوں سے بھری ہوئی راہ کو شاہراہِ مستقیم بتا کر انھیں اس کی طرف دھکیلا جارہا ہے، تو میں کسی طرح اس پر صبر نہیں کر سکتا، کوشش بھی کروں تو میرے اندر اس پر صبر کی طاقت نہیں ہے، لہٰذا مجھے اس پر راضی ہو جانا چاہیے کہ جو کوئی میری صاف گوئی پر ناراض ہوتا ہو ہو جائے وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰهِ۔

وطنی قومیت کا حقیقی مدعا | وطنی قومیت کی تشریح کے لیے اُن عبارات پر پھر ایک نظر ڈال لیجیے جو اسی مضمون میں

لارڈ برائس کی کتاب "بین الاقوامی تعلقات" اور "اخلاق وادیان کی دائرۃ المعارف" سے نقل کی گئی ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے افراد کو قوم بنانے والی چیز اصلاً اور ابتداءً ایک ہی ہے اور وہ کوئی ایسا جاذبہ ہے جو ان سب میں روح بن کر پھیل جائے اور ان کو ایک دوسرے سے مربوط کردے۔ لیکن محض اس جاذبہ کا موجود ہونا قوم بنانے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ اس کو اتنا طاقت ور ہونا چاہیے کہ وہ تمام اُن داعیات کو دبا دے جو افراد کو، یا افراد کے چھوٹے چھوٹے مجموعوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والے ہوں۔ اس لیے کہ علٰحدہ کرنے والی چیزیں اگر اس جوڑنے والے جاذبہ کی مزاحمت کرنے کے لیے کافی مضبوط ہوں تو وہ جوڑنے کے عمل میں کامیاب نہیں ہوسکتا، یا بالفاظ دیگر "قوم" نہیں بناسکتا۔ علاوہ بریں تشکیل قومیت کے لیے زبان، ادب، تاریخی روایات، رسوم وعادات، معاشرت اور طرز زندگی، افکار و تخیلات، معاشی مفاد اور مادّی اغراض کی مدد بھی درکار ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں ایسی ہونی چاہئیں جو اس جوڑنے والے جاذبہ کی فطرت سے مناسبت رکھتی ہوں، یعنی ان کے اندر کوئی عنصر ایسا نہ ہو جو علٰحدگی کے احساس کو زندہ رکھنے والا ہو، اس لیے کہ یہ سب کی سب ایسی طاقتیں ہیں جو افراد کو مجتمع کرنے میں اثر رکھتی ہیں اور یہ جوڑنے کے عمل میں اس کلمۂ جامعہ کی مددگار صرف اسی طرح ہوسکتی ہیں کہ ان سب کا میلان اسی مقصود کی طرف ہو جو اس کلمۂ جامعہ کا مقصود ہے۔ ورنہ بصورت دیگر یہ دوسرے ڈھنگ پر جماعت سازی کریں گی اور قوم بنانے کا عمل ناقص رہ گا۔

اب غور کیجیے کہ جس ملک میں اس معنی کے لحاظ سے مختلف قومیں رہتی ہوں ان کو متفق کرنے کی کیا صورتیں ممکن ہیں۔ آپ جتنا بھی غور کریں گے، آپ کو صرف دو ہی ممکن العمل صورتیں نظر آئیں گی:-

ایک یہ کہ ان قوموں کو ان کی قومیتوں کے ساتھ برقرار رکھ کر ان کے درمیان واضح اور متعین شرائط کے ساتھ ایک ایسا وفاقی معاہدہ ہوجائے جس کی رو سے وہ صرف مشترک اغراض ومقاصد کے لیے مل کر عمل کریں اور باقی امور میں بالفعل خود مختار ہوں۔ کیا کانگریس نے فی الواقع یہ طریقہ اختیار کیا ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ان قوموں کو "ایک قوم" بنادیا جائے۔ یہی دوسری صورت کانگریس چاہتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ قومیں ایک قوم کس طرح بن سکتی ہیں؟ لامحالہ ان کے لیے سب سے پہلے تو ایک مشترک جاذبہ،

ایک جامع کلمہ درکار ہے، اور وہ جاذبہ یا کلمہ صرف تین چیزوں ہی سے مرکب ہوسکتا ہے: وطن پرستی، بیرونی دشمن سے نفرت اور معاشی مفاد سے دلچسپی۔ پھر جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں، قوم بنانے کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ یہ جاذبہ اتنا قوی ہو کہ دوسرے تمام جاذبے جنھوں نے ان قوموں کو الگ الگ اقوام بنا رکھا ہے اس کے سامنے دب جائیں۔ کیونکہ اگر مسلمان کو اسلام سے، ہندو کو ہندویت سے، سکھ کو سکھیت سے اتنی دلچسپی ہو کہ جب مذہب یا قومیت کا معاملہ سامنے آئے تو مسلمان، مسلمان کے ساتھ، اور ہندو ہندو کے ساتھ اور سکھ سکھ کے ساتھ جڑ جائے اور اس قومی (یا وطن پرستوں کی زبان میں فرقہ وارانہ) معاملہ کی حمایت کے لیے ایک جماعت بن کر اٹھ کھڑا ہو، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جاذبۂ وطن نے ان کو ایک قوم نہیں بنایا۔ یہ امر دیگر ہے کہ مسلمان اسلام کا قائل رہے اور نماز بھی پڑھ لیا کرے، اور ہندو، ہندویت کا معتقد رہے اور مندر بھی چلا جایا کرے، لیکن ایک قوم بننے کے لیے شرط اول یہ ہے کہ اس کی نگاہ میں وطنیت کی کم از کم اتنی اہمیت ضرور ہو کہ اسلام کو اور ہندویت یا سکھیت کو وہ اس پر قربان کرسکتا ہو۔ اس کے بغیر "وطنی قومیت" قطعاً بے معنی ہے۔

یہ تو وطنی قومیت کا تخم ہے۔ مگر یہ تخم بار آور نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کے لیے مناسب آب وہوا، مناسب زمین اور مناسب موسم نہ ہو۔ اوپر عرض کرچکا ہوں کہ جاذبۂ قومی کی مدد کے لیے ضروری ہے کہ زبان، ادب، تاریخی روایات، رسوم وعادات، معاشرت اور طرز زندگی، افکار اور تخیلات، معاشی اغراض اور مادی مفاد، غرض تمام وہ چیزیں جو انسانی جماعتوں کی تالیف وترکیب میں فی الجملہ اثر رکھتی ہیں، اسی ایک جاذبۂ قومی کی فطرت میں ڈھلی ہوئی ہوں۔ اس لیے کہ افراد کو جوڑنے والی ان مختلف طاقتوں کا میلان اگر علیحدگی کی جانب ہو تو یہ جذب اور تالیف اور اجتماع کے عمل میں اس جاذبہ کی الٹی مزاحمت کریں گی اور متحد قوم نہ بننے دیں گی۔ لہذا ایک وطنی قوم بنانے کے لیے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ ان سب چیزوں میں سے اُن عناصر کو نکالا جائے جو مختلف قوموں کے اندر جداگانہ قومیت کی روح پیدا کرتے اور زندہ رکھتے ہیں، اور ان کے بجائے اپنے رنگ میں ان کو ڈھالا جائے کہ وہ آہستہ آہستہ تمام افراد اور طبقوں اور گروہوں کو ہم رنگ کردیں، ان کو ایک سوسائٹی بنا دیں، ان کے اندر ایک مشترک

اجتماعی مزاج اور مشترک اخلاقی روح پیدا کردیں۔ ان کے اندر ایک طرح کے جذبات و احساسات پھونک دیں، اور ان کو ایسا بنا دیں کہ ان کی معاشرت ایک ہو، طرز زندگی ایک ہو، ذہنیت اور انداز فکر ایک ہو، ایک ہی تاریخی سرچشمے سے وہ افتخار کے جذبات اور روح کو حرکت میں لانے والے محرکات حاصل کریں، اور ان کے درمیان ایک دوسرے کے لیے کسی چیز میں بھی کوئی نرالا پن باقی نہ رہے۔

اسی مقصد کے لیے وردھا اسکیم بنائی گئی ہے اور یہی مقصد ودیا مندر اسکیم کا ہے، جیسا کہ دونوں اسکیموں میں صاف صاف لکھ بھی دیا گیا ہے۔ مگر مولانا نے ان اسکیموں اور ان کے نصاب کو نہیں دیکھا۔ اسی قومیت کا صور برسوں سے پنڈت جواہر لال پھونک رہے ہیں مگر ان کی بھی کوئی تحریر و تقریر مولانا کی سماعت و بصارت تک پہنچنے کا موقع نہ پاسکی۔ یہی چیز کانگریس کا ایک ایک ذمہ دار آدمی کہہ رہا ہے، لکھ رہا ہے، اور اس کے لیے اُن حاکمانہ طاقتوں سے کام لے رہا ہے جو نئے دستور نے عطا کی ہیں، مگر نہ مولانا کے کان ان باتوں کو سنتے ہیں اور نہ ان کی آنکھیں ان چیزوں کو دیکھتی ہیں۔ اسی چیز کے لیے ان تمام اجتماعی ہیئتوں اور مجلسوں سے کام لیا جا رہا ہے جن کی فہرست مولانا بار بار گنایا کرتے ہیں، اور یہ مجالس محض اس وجہ سے اس کام میں ان کی مددگار بن گئی ہیں کہ ان کا دائرۂ عمل ان تمام معاملات پر چھایا ہوا ہے جن کو آپ تہذیب، کلچر، پرسنل لا وغیرہ ناموں سے یاد فرماتے ہیں۔ مگر یہ عمل جو ہر آن ہندوستان کے ہر حصہ میں ہو رہا ہے اس کی بھی کسی جنبش کو مولانا کے حواس خمسہ تک رسائی حاصل نہ ہوسکی۔ اس پورے مواد میں سے صرف ایک ہی دستاویز ان تک پہنچی ہے جس کا نام "بنیادی حقوق" ہے اور بس اُسی کے اعتماد پر مولانا اس "متحدہ قومیت" کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے تشبیہ دینے کی جرأت فرما رہے ہیں، حالانکہ ان بنیادی حقوق کی حیثیت ملکۂ وکٹوریہ کے مشہور اعلان سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے اور مغربی ڈپلومیسی کی ایسی چالوں کا رشتہ رسولِ پاک کے عمل سے جوڑنے کی جسارت ہم جیسے گناہ گاروں کے بس کی بات تو نہیں ہے۔ ہاں جن کے پاس تقویٰ کا زادِ راہ اتنا زیادہ ہے کہ وہ ایسی جسارتیں کرنے پر بھی بخشش کی امید رکھتے ہیں، انھیں اختیار ہے کہ جو چاہیں کہیں اور جو چاہیں لکھیں۔

اشتراک لفظی کا فتنہ

مولانا نے اپنے ذہن میں "متحدہ قومیت" کا ایک خاص مفہوم متعین کر رکھا ہے جس کے حدود انھوں نے تمام شرعی شرائط کو ملحوظ رکھ کر اور تمام امکانی اعتراضات سے پہلو بچا کر خود مقرر فرمائے ہیں، اور انکو وہ ایسی پر احتیاط مفتیانہ زبان میں بیان فرماتے ہیں کہ قواعد شرعیہ کے لحاظ سے کوئی اس پر حرف نہ لاسکے لیکن اس میں خرابی بس اتنی ہی ہے کہ اپنے مفہوم ذہنی کو مولانا کانگریس کا مفہوم و مدعا قرار دے رہے ہیں حالانکہ کانگریس اس سے بمراحل دور ہے۔ اگر مولانا صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتے کہ "متحدہ قومیت" سے میری مراد یہ ہے، تو ہمیں ان سے جھگڑا کرنے کی ضرورت نہ تھی لیکن وہ آگے قدم بڑھا کر فرماتے ہیں کہ نہیں، کانگریس کی مراد بھی یہی ہے، اور کانگریس بالکل نبی صلعم کے اسوہ پر چل رہی ہے، اور مسلمانوں کو مامون و مطمئن ہو کر اپنے آپ کو اس متحدہ قومیت کے حوالہ کر دینا چاہیے جسے کانگریس بنانا چاہتی ہے۔ یہیں سے ہمارے اور ان کے درمیان نزاع کا آغاز ہوتا ہے۔ فرض کیجیے کہ "پانی ڈالنے" سے آپ کا مفہوم ذہنی "پانی ڈالنا" ہی ہو، لیکن دوسرے نے "آگ لگانے" کا نام "پانی ڈالنا" رکھ چھوڑا ہو، تو آپ کتنا ظلم کریں گے اگر اختلاف معنی کو نظر انداز کر کے لوگوں کو مشورہ دینے لگیں کہ اپنا گھر اس شخص کے حوالہ کر دو جو "پانی ڈالنے" کے لیے کہتا ہے۔ ایسے ہی مواقع کے لیے تو قرآن مجید میں ہدایت کی گئی تھی کہ جب ایک لفظ ایک صحیح معنی اور ایک غلط معنی میں مشترک ہو جائے اور تم دیکھو کہ اعداء دین اس اشتراک لفظی سے فائدہ اٹھا کر فتنہ برپا کر رہے ہیں تو ایسے لفظ ہی کو چھوڑ دو۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا وَلِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (بقرہ۔۱۲) لہذا مولانا کو اپنے مفہوم ذہنی کے لیے تحالف، یا وفاق یا اسی قسم کا کوئی مناسب لفظ اختیار کرنا چاہیے تھا، اور اس وفاق یا تحالف کو بھی اپنی تجویز کی حیثیت سے پیش کرنا چاہیے تھا نہ اس حیثیت سے کہ یہ کانگریس کا عمل ہے۔ کم از کم اب وہ امت پر رحم فرما کر اپنی غلطی محسوس فرمالیں ورنہ اندیشہ ہے کہ ان کی تحریریں ایک فتنہ بن کر رہ جائیں گی اور اس پرانی سنت کا اعادہ کریں گی کہ ظالم امراء اور فاسق اہل سیاست نے جو کچھ کیا اس کو علماء کے ایک گروہ نے قرآن و حدیث سے درست ثابت کر کے ظلم و طغیان کے لیے مذہبی ڈھال فراہم کر دی۔ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۔

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینہ کے آخری ہفتہ میں شائع ہوا کریگا۔ دوسرے مہینہ کے پہلے ہفتہ تک اگر کسی خریدار کو پرچہ نہ پہنچے تو بر وقت اُن کو شکایت کرنی چاہیئے۔

رسالہ کی قیمت میں رعایت ممکن نہیں ہے۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیئے۔ جو حضرات نمبر درج نہ کریں گے۔ اُن کی شکایات پر کوئی توجہ نہ کی جائے گی۔

جن معاملات کا تعلق دفتر سے ہے اُن میں ایڈیٹر کو مخاطب نہ کیا جائے۔

منیجر

نرخنامہ و قواعدِ اشتہار

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	عـہ ۱۰	عـہ ۲۵	للعـہ ۴۵	لـہ ۹۰
نصفِ صفحہ	۶	عـہ ۱۵	عـہ ۲۵	للعـہ ۴۵
رُبع صفحہ	للعہ ۴	عـہ ۱۰	معـہ ۱۷	عـہ ۲۵

۱۔ کوئی خلافِ شریعت یا خلافِ تہذیب و اخلاق اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

۲۔ اشتہار کی اشاعت سے پہلے اُجرت پیشگی وصول ہونی ضروری ہے۔

۳۔ صرف وہی چربے قبول کیے جائیں گے جو اس رسالہ کے مسطر کے مطابق ہوں

۴۔ نرخنامہ میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی۔

۵۔ ٹائیٹل کے صفحات پر کوئی بیرونی اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

صرف سرحدی پرنٹنگ پریس نیل روڈ لاہور میں طبع ہوا